زیر نظر استاد محقق آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

١٦

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی

اثر نگارش
اہل قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

زیر نظر، استادِ محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

۱۶

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی
پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور

اثر نگارش
اہل قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

Marfat.com

پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

کتاب	تفسیر نمونہ جلد ۱۶
زیر نظر	اُستادِ محقق آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی
مترجم	سید صفدر حسین نجفی، پرنسپل جامعۃ المنتظر۔ لاہور
تصحیح و تجدید نظر	سید ثاقب نقوی
کتابت	خاور بٹ۔ کھوکھر کی گوجرانوالہ
ناشر	مصباح القرآن ٹرسٹ۔ گنگارام بلڈنگ، شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور
مطبع	معراج دین پرنٹرز
تاریخ اشاعت	ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ
ایڈیشن	اوّل
ہدیہ	۷۵/- روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام !

سلام مسنون

قرآن کریم کی تبلیغ و تفہیم کے عظیم الشان سلسلۂ اشاعت ـــ تفسیر نمونہ ـــ کی سولہویں جلد بہت ہی کم وقفے سے منصۂ شہود پر آگئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی طرف سے مسلسل حوصلہ افزائیوں نے ہماری ہمتوں میں دوچند اضافہ کر دیا ہے۔ اس طرح ہم اپنے اس وعدے کو ایفا کرنے کے قابل ہو گئے جو ہم نے چودھویں جلد کی انہی سطور میں آپ سے کیا تھا۔ (یعنی اس وقت ہم نے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ انشاء اللہ اس تفسیر کے آئندہ مراحل نسبتاً جلد تکمیل کو پہنچیں گے)۔

اس بات سے ہم آپ یقیناً آگاہ ہیں کہ تفسیر نمونہ اب کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے کیونکہ اس نے شہرت تام اور قبولِ عام کی وہ منزلت حاصل کر لی ہے جو تا حال اس زمرے کی کسی بھی کتاب کے حصے میں نہ آئی تھی۔ اس کے لیے ہم بارگاہِ خداوندی میں نہایت عجز کے ساتھ سرِ نیاز جھکاتے ہیں کہ اس نے تفسیر نمونہ کی اشاعت میں ہمارے اہتمام کو موردِ عنایت ٹھہرایا اور آپ کی طرف سے اس کے والہانہ استقبال کو پسند فرمایا ـــ ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا ؟

Marfat.com

ہم نے اس کتاب کو صوری و معنوی ہر اعتبار سے بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ تاہم اس سلسلے میں آپ کی جو قیمتی آراء اور صائب مشورے ہمیں موصول ہوں گے۔ حسبِ سابق ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

تفسیر نمونہ کی زیرِ نگاہ جلد کے اُردو ترجمے کو علمی و ادبی لحاظ سے معیاری اور خُوب سے خُوب تر بنانے میں پروفیسر نصیر شادانی نے جو زحمات اُٹھائی ہیں۔ ان کے لیے وہ یقیناً ہمارے بہترین شکریے کے حقدار ہیں۔ اسی طرح اس کے مسودۂ کتابت میں عربی و اُردو کی اصلاح اغلاط کے کٹھن مرحلوں میں، حافظ قاری محمد طفیل اور سید اعجاز محمد نے جس عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ نیز اس جلد کی طباعت و اشاعت میں لاہور سے ایک مخیّر شخصیت ___ سید حسین نقوی نے جو مالی تعاون فرمایا ہے۔ وہ بالخصوص لائقِ ستائش ہے ہم دُعاگو ہیں کہ مالکِ تنزیلِ قرآن ___ ربُّ العزت ان سبھی خادمانِ قرآن کو بحقِ معصومین بہترین جزا سے بہرہ مند فرمائے۔

آخر میں ہم حضور پروردگار میں عرض گزار ہیں کہ وہ اس عظیم تفسیر کی اشاعت میں حائل ہونے والی تمام مشکلوں کو حل فرما کر ہمیں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ وصلی اللہ علیٰ محمدؐ و آلِ محمدؐ

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور

Marfat.com

اِهداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش
تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

Marfat.com

یہ تفسیر

حسب ذیل علما و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبداللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

Marfat.com

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر بُرہان	از	مرحوم سیّد ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمّد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمّد عبدہٗ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سیّد قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمّد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفٰی مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابو الفتوح رازی

Marfat.com

اس تفسیر میں مدِّ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

باالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پَرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

Marfat.com

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی پندرہ جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی سولہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا میں ازحد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)
[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

Marfat.com

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بارالٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

Marfat.com

فہرست

سورۂ قصص : ۲۵

مندرجات سورۂ قصص ۲۷

فضیلتِ تلاوت سورۂ قصص ۲۹

آیت ۱ تا ۶ ۳۱

ارادۂ الٰہی ہے کہ مستضعفین کامیاب ہوں ۳۲

چند اہم نکات : ۳۹

۱۔ مستضعفین کی عالمگیر حکومت ۳۹

۲۔ "مستضعفین" اور "مستکبرین" کون ہیں ؟ ۴۰

۳۔ مستکبرین کی عام روش ۴۲

آیت ۷ تا ۹ ۴۳

فرعون کی آغوش ۴۴

اللہ کی عجیب قدرت ۵۰

آیت ۱۰ تا ۱۳ ۵۱

موسیٰ پھر آغوشِ مادر میں ۵۲

آیت ۱۴ تا ۱۷ ۵۶

موسیٰ مظلوموں کے مددگار کے طور پر ۵۷

چند اہم نکات : ۶۰

۱۔ حضرت موسیٰ کا یہ کام اور مقام عصمت ۶۰

۲۔ مجرموں کی مدد کرنا بہت بڑا گناہ ہے ۶۱

آیت ۱۸ تا ۲۲ ۶۴

موسیٰ کی مخفیانہ مدین روانگی ۶۵

آیت ۲۳ تا ۲۵ ۶۸

ایک نیک عمل نے موسیٰ پر بھلائیوں کے دروازے کھول دیئے ۶۹

چند اہم نکات : ۷۲

۱۔ مدین کہاں تھا ؟ ۷۲

۲۔ بہت سی سبق آموز باتیں ۷۲

آیت ۲۶ تا ۲۸ ۷۴

حضرت موسیٰ حضرت شعیبؑ کے گھر میں ۷۴

چند اہم نکات ۷۶

۱۔ ادارتِ کار کی درستی کے لیے دو بنیادی شرائط ۷۶

۲۔ حضرت شعیبؑ کا حضرت موسیٰ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح ۷۷

۳۔ ایک مروجہ رسم کی نفی ۷۸

آیت ۲۹ تا ۳۵ ۷۹

وحی کی تابشِ اول ۸۰

آیت ۳۶ تا ۳۷ ۸۶

موسیٰ فرعون کے مقابلے میں ۸۶

آیت ۳۸ تا ۴۲ ۸۹

ظالموں کا انجام ۹۰

چند اہم نکات : ۹۴

آیت ۴۳ تا ۴۶ ۹۷

یہ غیبی خبریں اللہ نے دی ہیں ۹۸

آیت ۴۷ تا ۵۰ ۱۰۱

گریز از حق کے لیے نو بہ نو بہانے ۱۰۲

Marfat.com

خواہشات پرستی گمراہی کا سبب ہے ۱۰۵
آیت ۵۱ تا ۵۵ ۱۰۶
شانِ نزول ۱۰۷
حق طلب اہل کتاب ۱۰۷
قلوب با ایمان ۱۱۰
آیت ۵۶ تا ۵۷ ۱۱۳
ہدایت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے ۱۱۴
حضرت ابوطالبؑ کا ایمان اور معاندین کا منشور ۱۱۶
آیت ۵۸ تا ۶۰ ۱۲۰
دُنیا کی دلچسپیاں تمہیں فریب نہ دیں ۱۲۰
آیت ۶۱ تا ۶۴ ۱۲۴
وہ لوگ صرف اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے ۱۲۵
آیت ۶۵ تا ۷۰ ۱۲۹
آیت ۷۱ تا ۷۵ ۱۳۴
رات اور دن کا وجود عظیم نعمت ہے۔ ۱۳۵
آیت ۷۶ تا ۷۸ ۱۳۹
بنی اسرائیل کے خود پرست سرمایہ دار ۱۴۰
آیت ۷۹ تا ۸۲ ۱۴۷
نمائش ثروت کا جنون ۱۴۸
چند اہم نکات: ۱۵۳
۱۔ ماضی اور حال کے قارون ۱۵۳
۲۔ قارون یہ دولت کہاں سے لایا تھا؟ ۱۵۵
۳۔ دولت کے بارے میں اسلام کا مؤقف ۱۵۶
آیت ۸۳ تا ۸۴ ۱۵۸
فساد فی الارض اور ہوس اقتدار کا نتیجہ ۱۵۸
آیت ۸۵ تا ۸۸ ۱۶۳
شانِ نزول ۱۶۴
حرم امن خدا کی طرف بازگشت کا وعدہ ۱۶۴
"کل شیءٍ هالك الّا وجهه" ۱۶۸
چند نکات: ۱۷۰
۱۔ تمام اشیاء کس طرح فنا ہوں گی؟ ۱۷۰
۲۔ "ولا تدع مع الله الٰهًا اٰخر" ۱۷۱

سُورۃ عنکبوت ۱۷۳

سُورۃ عنکبوت کے مضامین ۱۷۵
اس سُورہ کی فضیلت ۱۷۷
آیت ۱ تا ۳ ۱۷۹
شانِ نزول ۱۷۹
آزمائش ایک دائمی سنّتِ الٰہی ہے ۱۸۰
آزمائش مختلف رنگ میں ۱۸۳
آیت ۴ تا ۷ ۱۸۵
قدرت خدا کی حدود سے فرار ممکن نہیں ۱۸۶
آیت ۸، ۹ ۱۸۹
شانِ نزول ۱۸۹
ماں باپ کی نسبت بہترین نصیحت ۱۹۰
ماں باپ سے حُسن سلوک ۱۹۲
آیت ۱۰ تا ۱۳ ۱۹۴
وہ لوگ جو کامیابیوں میں شریک ہیں مگر مشکلات میں نہیں ۱۹۵
چند اہم نکات: ۱۹۸
۱۔ اچھی اور بُری رسمیں ۱۹۸
۲۔ ایک سوال کا جواب ۱۹۹
آیت ۱۴ تا ۱۹ ۲۰۰
سرگزشتِ نوحؑ اور ابراہیمؑ کا ذکر ۲۰۱

Marfat.com

آیت ۲۰ تا ۲۳ — ۲۰۷
خدا کی رحمت سے مایوس لوگ — ۲۰۸
دو سوال اور اُن کا جواب — ۲۱۰
آیت ۲۴ تا ۲۷ — ۲۱۲
حضرت ابراہیمؑ کو متکبرین کا طرزِ جواب — ۲۱۲
چند اہم نکات: — ۲۱۷
۱۔ عظیم ترین افتخار — ۲۱۷
۲۔ حضرت ابراہیمؑ پر خدا کی عظیم برکات — ۲۱۸
آیت ۲۸ تا ۳۰ — ۲۲۰
بے شرم گناہ گار — ۲۲۰
ہم جنسی کا رُجحان بدترین لعنت ہے — ۲۲۲
آیت ۳۱ تا ۳۵ — ۲۲۴
گناہ گاروں کا انجام — ۲۲۵
آیت ۳۶ تا ۴۰ — ۲۳۰
ظالموں کے ہر گروہ کی سزا مختلف تھی — ۲۳۱
آیت ۴۱ تا ۴۴ — ۲۳۶
مکڑی کے جالے کی مانند کمزور اُمید گاہیں — ۲۳۷
آیت ۴۵ — ۲۴۱
نماز اعمالِ قبیح سے روکتی ہے — ۲۴۱
چند توجہ طلب احادیث — ۲۴۳
فرد اور جماعت کی تربیت میں نماز کا اثر — ۲۴۰
آیت ۴۶ تا ۴۹ — ۲۵۱
بحث کے لیے بہترین روش اختیار کرو — ۲۵۲
چند اہم نکات: — ۲۵۸
۱۔ ہمارے محبوب پیمبر جو کبھی مکتب میں نہیں گئے — ۲۵۸
۲۔ دُوسروں کے دلوں میں نفوذ کا طریقہ — ۲۵۹
۳۔ کفار اور ظالمین — ۲۶۲
آیت ۵۰ تا ۵۵ — ۲۶۳
کیا قرآن بطور معجزہ کافی نہیں ہے؟ — ۲۶۵
چند اہم نکات: — ۲۷۱
۱۔ دلائل اعجازِ قرآن — ۲۷۱
۲۔ انکارِ معجزات کا ثبوت — ۲۷۱
۳۔ من پسند معجزات — ۲۷۲
آیت ۵۶ تا ۶۰ — ۲۷۳
شانِ نزول — ۲۷۴
ہجرت کرنی چاہیے — ۲۷۴
آیت ۶۱ تا ۶۶ — ۲۸۰
دل میں خدا زبان پر بُت — ۲۸۲
سختیوں میں فطرتِ انسانی کے جوہر کھُلتے ہیں — ۲۸۷
آیت ۶۷ تا ۶۹ — ۲۸۹
شانِ نزول — ۲۹۰
چند اہم نکات: — ۲۹۲
۱۔ جہاد و اخلاص — ۲۹۲
۲۔ لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں — ۲۹۴
سورۂ روم — ۲۹۷
سورۂ روم کے مندرجات — ۲۹۸
فضیلت سورۂ روم — ۲۹۹
آیت ۱ تا ۷ — ۳۰۱
شانِ نزول — ۳۰۲
ایک عجیب پیش گوئی — ۳۰۳
چند اہم نکات: — ۳۰۷
۱۔ اعجازِ قرآن — ۳۰۷
۲۔ ظاہر بین لوگ — ۳۰۸

Marfat.com

۳۔ تاریخی مطابقت ۲۰۹
آیت ۸ تا ۱۰ ۲۱۱
بدکاروں کا انجام ۲۱۲
آیت ۱۱ تا ۱۶ ۲۱۷
قیامت میں مجرمین پر کیا گزرے گی ۲۱۸
قیامت کا ایک نام "ساعت" کیوں ہے؟ ۲۲۱
آیت ۱۷ تا ۱۹ ۲۲۲
تسبیح و حمد ہر حال میں خدا کے لیے ہے ۲۲۲
آیت ۲۰ تا ۲۲ ۲۲۷
انفس و آفاق میں خدا کی آیات ۲۲۸
آیت ۲۳ تا ۲۵ ۲۳۴
انسان کے نفس اور خارجی دُنیا میں خدا کی عظمت کی نشانیاں ۲۳۵
چند اہم نکات: ۲۳۸
۱۔ درس خداشناسی کا ایک مکمل نصاب ۲۳۸
۲۔ کون لوگ ان آیات سے کسبِ حکمت کرتے ہیں؟ ۲۳۹
۳۔ عالم خواب کے عجائبات ۲۴۰
۴۔ میاں بیوی کی باہمی محبت ۲۴۱
آیت ۲۶ تا ۲۹ ۲۴۲
خدائے واحد ہی مالک حقیقی ہے ۲۴۳
آیت ۳۰ تا ۳۲ ۲۴۹
چند اہم نکات: ۲۵۴
۱۔ توحید انسان کی داخلی قوی قوتِ جاذبہ ہے ۲۵۴
۲۔ احادیث اسلامی میں فطرتِ خداشناسی کا ذکر ۲۵۸
آیت ۳۳ تا ۳۶ ۲۶۱
آیت ۳۷ تا ۴۰ ۲۶۷
آیت ۴۱ تا ۴۵ ۲۶۹
لوگوں کے اعمال ہی سرچشمۂ فساد ہیں ۲۷۷
چند اہم نکات: ۲۸۱
۱۔ گناہ و فساد کا باہمی ربط ۲۸۱
۲۔ زمین پر سیاحت میں پوشیدہ حکمتیں ۲۸۳
۳۔ دینِ قیم اور آئینِ محکم ۲۸۴
۴۔ روزِ قیامت ٹل نہیں سکتا ۲۸۵
آیت ۴۶ تا ۵۰ ۲۸۶
خدا کے آثارِ رحمت کو دیکھو ۲۸۸
آیت ۵۱ تا ۵۴ ۲۹۴
مُردے اور بہرے تیری بات نہیں سُنتے ۲۹۵
آیت ۵۵ تا ۶۰ ۴۰۱
وہ دن جب کہ عُذر خواہی بے سُود ہوگی ۴۰۲

Marfat.com

تفسیر نمونہ

جلد ۱۶

اس میں :

- سورہ قصص
- سورہ عنکبوت اور
- سورہ روم

کی تفسیر ہے

اس تفسیر کا آغاز یکم رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ کو ہوا

Marfat.com

سورۂ قصص

☆ مکّہ میں نازل ہوئی
☆ اِس میں ۸۸ آیتیں ہیں

Marfat.com

سُورَہٗ قصص

مندرجات سُورَہٗ قصص :

مشہور یہ ہے کہ یہ سُورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی ۔ اس وجہ سے اس کے مندرجات اور اس کا اسلوب وہی ہے جیساکہ دیگر مکی سُورتوں کا ہے۔ؔ[۱]

اگرچہ بعض مفسّرین نے اس سورۃ کی آیت نمبر ۸۵ یا ۵۲ سے ۵۵ تک کو اس سے مُستثنیٰ کیا ہے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے آیہ ۸۵ جحفہ (جو کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے) میں نازل ہوئی اور باقی چار آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ لیکن اُن کے قول پر کوئی محکم دلیل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اہلِ تفسیر کے اس خیال کا سبب یہ ہو کہ ان پانچ آیات میں اہلِ کتاب کا ذکر ہے۔ اور اہلِ کتاب کثرت سے مدینہ میں رہتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کہ قرآن کا جو حصّہ مکہ میں نازل ہوا ہے، اُس میں صرف مشرکینِ مکہ ہی کا ذکر ہو۔ جب کہ مکہ اور مدینہ کے لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔

البتہ مفسّرین نے آیات ۵۲ تا ۵۵ کی شانِ نزول کا جو ذکر کیا ہے وہ ان آیات کے مدنی ہونے سے مناسبت رکھتی ہے۔ ان شاء اللہ ہم مناسب مقام پر اُس کا ذکر کریں گے۔

آیت نمبر پچاسی میں پیغمبرِ خداؐ کے اپنے اصلی وطن یعنی مکہ کا ذکر ہے اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ یہ آیت ہجرت کے وقت جب کہ آپؐ مکہ سے باہر تشریف لیے جا رہے تھے، اسی مقدس سرزمین پر نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ جناب رسالتمآبؐ کو سرزمین مکہ سے جو کہ حرمِ اَمنِ خُدا اور مرکزِ توحید تھا بہت محبت تھی۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ اُنھیں بشارت دیتا ہے کہ آخر کار میں تم کو اس شہر میں واپس لے آؤں گا۔

مذکورہ بالا مفہوم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت مکی ہو۔ اور اگر بالفرض یہ آیت جحفہ میں بھی نازل ہوئی ہو تو وہ مقام بھی بہ نسبت مدینہ کے مکہ سے نزدیک تر ہے۔

بنا براں جب ہم آیاتِ قرآنی کو مکی اور مدنی میں تقسیم کرتے ہیں تو اس آیت نمبر پچاسی کو غیر آیات مکی میں جگہ نہیں دے سکتے مسلّماً یہ سُورۃ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ ان حالات میں جب کہ باایمان افراد قوی دشمنوں کے پنجہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ دشمن بھی ایسے تھے جو اپنی جمعیت و تعداد اور قدرت و قوت ہر دو لحاظ سے مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے۔ یہ مسلمان اقلیت اُس اکثریت کے تحت ایسی دبی ہوئی تھی کہ ان میں کچھ لوگ اسلام کے مستقبل کے متعلق خوف زدہ اور فکر مند رہتے تھے۔

چونکہ مسلمانوں کی یہ حالت بنی اسرائیل کی اُس وضع کے زیادہ مشابہ تھی جب کہ وہ حکومتِ فرعون کے پنجہ میں گرفتار تھے۔ اس لیے اس سورۃ کے ایک حصّہ میں حضرت موسیٰؑ، بنی اسرائیل، اور فرعون کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ حصّہ اتنا طویل ہے کہ

[۱] دیکھیے "تاریخ القرآن" ابوعبداللہ زنجانی ، اور "فہرست" ابن ندیم اور کتب تفسیر۔

Marfat.com

سورۃ مذکورہ کے قریباً نصف حصّہ پر مشتمل ہے۔

اس میں خصوصاً حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اُس حصّہ کا ذکر ہے جب کہ وہ ایک طفل ضعیف شیر خوار اور فرعون کے گھر میں پرورش پا رہے تھے۔ مگر قادرِ مطلق کی اُس شکست ناپذیر قدرت نے، جو تمام کائنات پر سایہ فگن ہے، اس کمزور بچّے کو طاقتور دشمنوں کے زیرِ دامن پرورش کرا کے بڑا کر دیا اور آخرکار خدا نے اُسے اِس قدر قوت عطا فرمائی کہ اُس نے فرعون کی تمام شوکت و ثروت کا خاتمہ کر دیا اور اس کے ظلم کے محل کو مسمار کر دیا۔

یہ قصّہ اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ مسلمان پروردگار کے لطف و کرم کے اُمیدوار رہیں اور اس کی لامحدود قدرت پر اعتماد کر کے اپنے دل کو مطمئن رکھیں۔ اور دشمن کی تعدادِ کثیر اور اُس کی طاقت سے ہرگز خوف زدہ نہ ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ اس سُورۃ کا ابتدائی حصّہ اسی پُر معنیٰ اور دانش آموز تاریخی واقعہ پر مشتمل ہے۔

بالخصوص آغازِ بیان میں مستضعفین کے لیے حق و عدالت پر مبنی حکومت کی نوید ہے اور ظالمین کی شان و شوکت کے برباد ہونے کی بشارت ہے۔ یہ بشارت مظلومین کے لیے آرام بخش اور قدرت آفرین ہے۔

اس سُورۃ کا مغزِ بیان یہ ہے کہ جس وقت تک بنی اسرائیل رہبر و پیشوا سے محروم رہے اور اُن کے سروں پر سائبانِ ایمانُ توحید کا سایہ نہ ہوا تھا، اُس وقت تک نہ تو اُن میں کوئی ایسی تحریک رُونما ہوئی اور نہ وہ کوئی ایسی سعی و کوشش کر سکے جو اُنہیں من حیث القوم منظم و متحد کر دے۔ اندریں حال وہ غلامی اور اسیری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

مگر جیسے ہی اُنھیں ایک رہبر مل گیا اور اُن کا دل نورِ علم و توحید سے روشن ہو گیا، وہ فرعون اور آلِ فرعون پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے حکومت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی اور بنی اسرائیل آزاد ہو گئے۔

اس سُورۃ کے حصّہ دوم میں اُس دولت مند اور متکبر قارون کا ذکر ہے جسے اپنے علم اور دولت پر بڑا بھروسہ تھا۔ اس غرور و تکبّر کے نتیجہ میں اُس کا انجام بھی بالکل فرعون جیسا ہوا۔ فرعون پانی میں غرق ہوا، اور یہ مٹی میں۔ فرعون کو اپنی فوجی طاقت پر گھمنڈ تھا اور قارون کو اپنی دولت پر۔

خُدائے حکیم نے یہ واقعات اِس لیے بیان کیے ہیں تاکہ اہلِ عالم پر یہ واضح ہو جائے کہ :-

خواہ وہ مکّہ کے اہلِ ثروت ہوں، اس علاقہ کے مُشرک صاحبانِ اقتدار ہوں یا اس دَور کے سیاسی بازی گر ہوں، ان میں سے کسی میں بھی یہ قدرت نہیں ہے کہ مستکبرین پر مستضعفین کے غلبے کے بارے میں جو ارادۂ الٰہی ہے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ واقعات اس سورہ کے آخری حصّہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

اِن دو حصّوں کے درمیان توحید، معاد، اہمیتِ قرآن، قیامت میں مشرکین کی حالت، مسئلہ ہدایت و ضلالت اور کمزور افراد کی بہانہ جوئی کا جواب مذکور ہے۔ یہ بیان نہایت قیمتی اور سبق آموز ہے۔ درحقیقت یہ بیان سُورۃ کے حصّہ اوّل کا نتیجہ اور حصّہ دوم کے لیے مقدّمہ کا حکم رکھتا ہے۔

Marfat.com

فضیلتِ تلاوتِ سُورۂ قصص

جناب رسالتمآبؐ سے مروی ایک حدیث میں ہم یوں پڑھتے ہیں:

من قرء طسٓم القصص اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من صدق بموسٰی وکذب به ، ولم یبق ملك فی السماوات والارض الا شهدله یوم القیامة انه کان صادقا

جو آدمی سورۂ قصص کو پڑھے گا تو اسے اُن لوگوں کہ جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کی تصدیق یا تکذیب کی تعداد کی نسبت سے دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔ اور زمین اور آسمان میں کوئی فرشتہ ایسا نہ ہوگا جو بروز قیامت اس شخص کی صداقت پر گواہی نہ دے۔[1]

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ:

جو شخص طٰواسین ثلاثہ یعنی سُورۂ قصص، نمل اور شعراء کو ہر شب جمعہ میں پڑھے گا، اُس کا شمار دوستانِ خدا میں ہوگا اور وہ جوارِ الٰہی اور اُس کے سایۂ حمایت میں رہے گا۔ وہ دُنیا میں کبھی بے امن، ناراحت اور فقیر نہ رہے گا۔ اور آخرت میں خدا اس کو اس قدر انعامات عنایت کرے گا کہ وہ نہ صرف راضی ہو جائے گا بلکہ اُس کی مسرّت کی کیفیت اس سے بھی زیادہ ہوگی۔[2]

یہ امر بدیہی ہے کہ یہ تمام اجر و ثواب اُن لوگوں کے لیے ہے جو اس سُورۃ کو پڑھ کر دُنیا کے قارونوں اور فرعونوں کے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ اور راست باز مومنین کی صف میں کھڑے ہو کر باطل کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور مشکلات کے وقت دشمن کے مقابلہ میں ہار نہیں مانتے اور شکست کی ذلّت کو گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ نعماتِ الٰہی کسی کو مُفت میں نہیں مل جاتیں۔ یہ نعمات و برکات اُنہیں لوگوں کے لیے مخصوص ہیں جو کلامِ الٰہی کو پڑھتے ہیں، اُس پر غور کرتے ہیں اور اُس کی تعلیم کو اپنی زندگی کا دستور العمل بناتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان در آغاز سورۃ القصص۔

[2] تفسیر نور الثقلین سورۂ قصص کے آغاز میں، بحوالہ ثواب الاعمال۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ طٰسٓمّٓ ۝

۲۔ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۝

۳۔ نَتۡلُوۡا عَلَيۡكَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰى وَ فِرۡعَوۡنَ بِالۡحَقِّ
لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝

۴۔ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ
طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ يُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ‌ اِنَّهٗ كَانَ
مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝

۵۔ وَنُرِيۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَنَجۡعَلَهُمۡ
اَئِمَّةً وَّنَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِيۡنَ ۝

۶۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَنُرِىَ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا
مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَحۡذَرُوۡنَ ۝

Marfat.com

ترجمہ

۱۔ طٰسٓمٓ

۲۔ یہ کتابِ مُبین کی آیات ہیں۔

۳۔ ہم تجھ سے موسٰی اور فرعون کا مبنی برحق کچھ قصہ ایمان لانے والوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔

۴۔ فرعون نے زمین میں اپنے آپ کو برتر سمجھ لیا تھا۔ اور وہاں کے رہنے والوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس نے ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کر دیا تھا۔ ان کے لڑکوں کو قتل کر دیتا تھا اور اُن کی لڑکیوں کو (کنیزی کے لیے) زندہ رہنے دیتا تھا۔ یقیناً وہ مفسدین میں سے تھا۔

۵۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ اُن لوگوں پر ہم احسان کریں جو زمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں اور انہیں زمین کا وارث اور اہل زمین کا پیشوا بنا دیں۔

۶۔ انہیں زمین میں ثباتِ قدم عطا کریں (اُن کی حکومت کو مستحکم کر دیں) اور فرعون، ہامان اور اُن کے لشکر کو وہ چیز دکھائیں جس کا انہیں خوف ہے۔

Marfat.com

تفسیر

ارادۂ الٰہی ہے کہ مستضعفین کامیاب ہوں :

اِس دفعہ قرآن کی سُورتوں کے آغاز میں " حروفِ مقطعہ " سے ہمارا چودھویں بار سابقہ پڑ رہا ہے۔ ان میں طٰسم تیسری اور آخری مرتبہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کے حروفِ مُقطعہ کی مختلف تفاسیر کی گئی ہیں۔ اِس موضوع پر ہم نے سورہ بقرہ ، سُورہ آلِ عمران اور سورہ اعراف کے آغاز میں مشرح بحث کی ہے۔

جہاں تک " طٰسٓمٓ " کا تعلق ہے مختلف روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف صفات باری تعالیٰ کی مختصر علامات ہیں۔ یا اِن سے مراد مُقدس مقامات ہیں۔

تاہم یہ امر اُس معروف تفسیر کے جس پر ہم نے بارہا زور دیا ہے مانع نہیں ہے کہ خدا اس حقیقت کو سب پر روشن کردینا چاہتا ہے کہ یہ کتابِ مقدس آسمانی جو انسان کی ارتقائی تاریخ میں عظیم انقلاب کا سرچشمہ ثابت ہوئی اور جس میں انسان کی طرزِحیات کے لیے ایک سعادت بخش پروگرام موجود ہے، اِس کی تشکیل بھی " الف با " جیسے سادہ حروف سے ہوئی ہے۔ ہر بچہ اس کے کلمات کا تلفظ کرسکتا ہے۔ یہ کتنی اہم اور غیر معمولی بات ہے کہ ایسے سادہ وسائل کی ترتیب و تنظیم کا نتیجہ ایسی عظیم المرتبت کتاب ہو کہ جو سب لوگوں کی دسترس میں ہے۔

٭　٭　٭

غالباً یہی وجہ ہے کہ حروفِ مقطعہ کے بعد بلافاصلہ عظمتِ قرآن کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے :

" یہ باعظمت آیات کتاب مُبین کی آیات ہیں " یہ ایسی کتاب ہے کہ جو خُود بھی روشن ہے اور انسانوں کے لیے راہِ سعادت کو بھی روشن کرنے والی ہے : (تلك اٰیات الکتاب المبین)[1]

اگرچہ کلمہ " کتاب مبین " بعض آیاتِ قرآن میں مثلاً سُورۂ یونس کی اکسٹھویں آیت :

ولا اصغر من ذٰلك ولا اکبر الا فی کتاب مبین

---

[1] " تلك " اسم اشارہ دُور کے لیے ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اِس سے اِن آیات کی عظمت مراد ہے۔

Marfat.com

اور سورۂ ھود کی اس آیت میں :

کل فی کتاب مبین

"لوح محفوظ" کے معنی لیے گئے ہیں۔ لیکن یہ آیت جو اس وقت زیر بحث ہے اس میں کلمہ "آیات" استعمال ہوا اور اسی طرح اگلی آیت میں جملۂ "نتلوا علیك" آیا ہے۔ ان الفاظ کے قرینہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں "کتاب مبین" سے مراد قرآن ہے۔

اس مقام پر قرآن کی صفت "مبین" ذکر کی گئی ہے۔ کلمہ "مُبین" لغوی لحاظ سے لازم اور متعدی دونوں معنی میں آیا ہے۔ یعنی وہ چیز جو خود بھی واضح ہے اور دوسری شے کو بھی آشکار کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے روشن پیغام اور مطالب کے ذریعہ حق کو باطل سے آشکار کرتا ہے اور راہِ راست کو گمراہی سے مُنفصل کردیتا ہے۔

* * *

قرآن اس مختصر سے مقدمہ کے بعد موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے یوں فرماتا ہے :

"ہم گروہ مومنین کے لیے تجھ سے موسیٰ اور فرعون کی سچی داستان کا کچھ حصہ بیان کرتے ہیں"۔ (نتلوا علیك من نبأ موسٰی وفرعون بالحق لقوم یؤمنون)۔

آیت میں حرف جار "من" استعمال ہوا ہے۔ اصطلاح نحو میں اسے "تبعیضیہ" کہتے ہیں۔ اس کے معنی قدرے یا تھوڑا سا کے ہیں۔ حرف "من" استعمال کرنے میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ جو کچھ اس مقام پر ذکر کیا جارہا ہے وہ اس طویل داستان کا صرف ایک گوشہ ہے جو مناسبتِ مقام کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

آیت میں کلمہ "بالحق" سے اس امر کی تاکید ہوتی ہے کہ جو کچھ یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ہر قسم کی خرافات، اباطیل، اساطیر اور غیر واقعی مطالب سے پاک و منزہ ہے۔ "بالحق" کے معنی ہیں "تواٴم باحق" یعنی عین واقعیت۔

کلمہ "لقوم یؤمنون" یہ ایک توضیح ہے اور تاکید ہے اس حقیقت پر کہ جو اس وقت مکہ میں جو مومنین کفار کے ظلم و ستم سہہ رہے تھے یا اُن جیسے لوگ جو کہیں اور ہوں اس داستان کو سُن کر اُن پر یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ خواہ دشمن کی طاقت کتنی ہی زیادہ ہو اور اُن کی جمعیت، شمار اور وسائل کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ اُن کے مقابلہ میں اہل ایمان خواہ کتنے ہی قلیل التعداد، بظاہر کم طاقت اور اُن کے نیچے پِس رہے ہوں' اُنھیں ہرگز خوف زدہ و ہراساں نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اُس قادرِ مطلق کے لیے ہر چیز آسان ہے۔ مومنین پر یہ امر روشن رہے کہ :

وہ خدا جس نے فرعون کو نابود کرنے کے لیے مُوسیٰ کو اُسی کے گھر میں پرورش دلوائی۔

وہ خدا جس نے مظلوم غلاموں کو رُوئے زمین کی سلطنت عطا کی۔ اور مغرور ظالموں کو ذلیل و خوار اور نابود کردیا۔ وہ خدا جس نے ایک شیر خوار بچے کی پُر شور لہروں میں حفاظت کی اور فرعون اور اُس کے لاکھوں پُرزور ساتھیوں کو نیل کی موجوں میں دفن کردیا ___ تمھیں بھی ان مصائب سے نجات دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

یقیناً ان آیات کے اصلی مخاطب مومنین ہی ہیں۔ اُنھیں کے لیے یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ اُن مومنین کے لیے جو ان

Marfat.com

آیات کے منشا کو اپنے قلب میں جگہ دیتے ہیں اور ہجوم مصائب میں بھی اپنی منزلِ مقصود کی طرف راہ رو رہتے ہیں۔

ٌ ٌ

درحقیقت یہ ایک مجمل بیان تھا۔ آئندہ آیات میں اس کی تفصیل آتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : فرعون نے خدا کی زمین پر تکبر، آمریت اور خودسری اختیار (انّ فرعون علا فی الارض)۔

حالانکہ وہ ایک ناچیز انسان تھا مگر اُس نے اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اپنی ہستی کو نہ پہچانا اور اپنی حد سے یہاں تک بڑھ گیا کہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔

اس آیت میں الارض سے مُراد ملک مصر اور اُس کے اطراف کا علاقہ ہے۔ اور چونکہ اُس زمانہ میں زمین کا وہی حصہ آباد تر تھا اس لیے قرآن میں یہ کلمہ بصورتِ عام استعمال کر کے خاص معنیٰ مراد لیے گئے ہیں۔

اس کلمہ کے محل استعمال سے یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ "ارض" سے پہلے "ال" اُس عہد کی تخصیص کے لیے آیا ہو اور زمینِ مصر کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال فرعون نے اپنی متکبرانہ حکومت کے استقلال کے لیے چند گناہانِ عظیم کا ارتکاب کیا۔

اوّل تو اُس نے یہ چال چلی کہ ساکنانِ مصر کے درمیان نفاق پیدا کر دیا (وَجَعَلَ اَھۡلَھَا شِیَعًا)۔

یہ وہی سیاست تھی جس کے ذریعہ جابر اور ملوکیت پرستانہ حکومتیں اپنی بنیاد کو مستحکم کرتی رہی ہیں۔ کیونکہ کسی اکثریت پر کسی اقلیت کی حکومت کا پائیدار رہنا اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے پروگرام پر عمل نہ کرے۔

اس قسم کی جابر حکومتیں ہمیشہ "توحیدِ کلمہ" اور "کلمۂ توحید" سے خائف رہتی ہیں۔ ایسی حکومتیں عوام میں اتفاق و اتحاد کے جذبات سے ہمیشہ ڈرتی رہتی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنا تحفظ اسی میں سمجھتی ہیں کہ حکومت طبقاتی بنیادوں پر رہے۔ یہی پالیسی ہے جس پر تاریخ کے ہر عہد اور ہر زمانے کے فراعنہ کاربند رہے ہیں۔

البتہ فرعون نے خصوصیت سے باشندگانِ مصر کو دو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ اوّل قبطی جو ملک کے اصل باشندے تھے اور ملک کے تمام رفاہی وسائل، دولت و محلات اور کلیدی اسامیاں اُن کے اختیار میں تھیں۔ دوسرے سبطی یعنی مہاجر بنی اسرائیل جو اُن قبطیوں کے ہاتھ میں غلاموں اور کنیزوں کی طرح پھنسے ہوئے تھے۔

ان بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ یہ انتہائی فقر و ناداری میں گرفتار تھے۔ اُن سے نہایت سخت مشقت لی جاتی تھی۔ مگر اُنھیں اُس کا اجر کچھ نہ ملتا تھا۔ کلمہ "اھلھا" میں قبطی اور بنی اسرائیل دونوں شامل ہیں۔ اس اعتبار سے کہ بنی اسرائیل ملک مصر میں ایک طویل مدت سے رہتے تھے۔ تاآنکہ وہ وہیں کے باشندے ہو گئے تھے۔

تاریخ کہتی ہے کہ ملوکِ فراعنہ میں سے بعض نے اپنے لیے ایک "ہرم" بنانے کے لیے ایک لاکھ غلاموں کو بیس سال تک کام پر لگائے رکھا (مثلاً خوفو بادشاہ کا مشہور ہرم جو موجودہ پایۂ تخت قاہرہ کے نزدیک ہے) اور اُن میں سے ہزاروں آدمیوں کو دورانِ کار میں سخت کام لے کر یا کوڑے مار مار کر قتل کر دیا — بنی اسرائیل کے مصائب کا اس مختصر واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے حدیث کی کتابوں سے رجوع کرنا چاہیئے۔

Marfat.com

فرعون کا دوسرا جُرم یہ تھا کہ اُس نے اُس ملک کے ایک طبقہ پر ظلم و قہر کے پہاڑ توڑ کر اُنھیں بالکل بے دست و پا کر دیا تھا اس حالت کو قرآن شریف میں یوں بیان کیا گیا ہے :

(یستضعف طآئفة منھم یذبح ابناءھم ویستحی نساءھم)

فرعون نے اس گروہ کو اتنا ضعیف اور ناتوان کر دیا تھا کہ اُن کی اولادِ نرینہ کو قتل کرتا تھا۔

اور اُن کی لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا۔

اُس نے یہ حکم دے دیا تھا کہ اچھی طرح خیال رکھو۔ بنی اسرائیل میں جو بچہ بھی پیدا ہو۔ اگر وہ لڑکا ہو تو اُسے اسی وقت قتل کر دو۔ اور اگر لڑکی ہو تو اسے کنیزی اور خدمت گاری کے لیے زندہ رکھو۔

دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے اس فعل سے کونسا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا ؟

مشہور یہ ہے کہ اُس نے عالمِ خواب میں یہ دیکھا تھا کہ بیت المقدس کی طرف سے آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا ہے جس نے مصر کے تمام گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ قبطیوں کے تو تمام گھر جل گئے ہیں مگر بنی اسرائیل کے گھر سلامت رہے ہیں۔

اُس نے علماء اور خواب کی تعبیر بتانے والوں سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔ انھوں نے کہا :

بیت المقدس کی سرزمین سے ایک آدمی خروج کرے گا۔ اُس کے ہاتھ سے فراعنہ کی حکومت اور ملک مصر تباہ ہو جائے گا[۱]

نیز یہ بھی روایت ہے کہ بعض کاہنوں نے اُس سے کہا تھا کہ :

بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت کو برباد کر دے گا[۱]

بالآخر اسی سبب نے فرعون کو اس امر پر آمادہ کیا کہ اُس نے بنی اسرائیل کے نومولود فرزندانِ نرینہ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا۔

بعض مفسرین نے فرعون کے آمادہ بہ تعدی ہونے کے متعلق ایک اور بھی احتمال ظاہر کیا ہے کہ :-

" گزشتہ پیغمبروں نے حضرت موسیٰ کی پیدائش اور اُن کی خصوصیات کے متعلق پیش گوئی کی تھی اور خاندانِ فراعنہ اُن سے واقف ہو کر خوف زدہ رہتا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ بنی اسرائیل کے دشمن ہو گئے "[۲]

لیکن " یذبح ابناءھم " کا جملہ جو " یستضعف طآئفة منھم " کے بعد آیا ہے، اس سے ایک اور مفہوم بھی مترشح ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ حکومتِ فرعون نے بنی اسرائیل کو قومی حیثیت سے کمزور اور ناتوان کرنے کے لیے یہ پالیسی اختیار کی تھی۔ تاکہ اُن کی اولاد ذکور کو (جس کے متعلق اندیشہ تھا کہ کسی وقت بغاوت کر کے فرعون کا تختہ اُلٹ دے) ختم کر دے اور صرف عورتوں اور لڑکیوں کو کہ جن میں بغاوت اور جنگ کی طاقت نہیں ہوتی، اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھے۔

قولِ بالا کی تائید " سورۂ مومن " کی آیت نمبر پچیس سے ہوتی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ فرعون میں اولاد ذکور کو قتل کرنے اور اولادِ اُناث کو زندہ رہنے دینے کا طرزِ عمل حضرت موسیٰ کے دعوئ نبوت کے بعد بھی جاری رہا۔ آیت یوں ہے :

---

[۱] تفسیر مجمع البیان - جلد ۷ - صفحہ ۲۳۹ - فخر رازی -

[۲] تفسیر کبیر فخر رازی - ذیل آیت مورد بحث -

Marfat.com

فلما جآء ھو بالحق من عندنا قالوا اقتلوا ابنآء الذین اٰمنوا معہ
واستحیوا نسآء ھو وما کید الکٰفرین الا فی ضلٰل

پس جب موسٰی ہمارے پاس سے حق لے کر اُن کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے کہا کہ اُن لوگوں کے لڑکوں کو جو موسٰی پر ایمان لائے ہیں قتل کر دو اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دو لیکن کافروں کی تدبیریں ہمیشہ گمراہی میں رہیں گی۔

آیہ زیر بحث کا جملہ "یستحی نسآء ھو" (اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دو) یہ واضح کرتا ہے کہ فرعون کا عورتوں کی بقائے حیات پر اصرار یا تو اُن سے خدمت لینے کے لیے تھا یا جنسی ہوس رانی کے لیے۔

آیہ کے آخری کلمات میں بطور مجموعی اور بیانِ علت کے طور پر فرمایا گیا ہے: بطور مُسلّم وہ مفسدوں میں سے تھا (انہ کان من المفسدین)۔

فرعون کے اعمال کا خلاصہ صرف اِن الفاظ میں کیا جا سکتا ہے کہ "اُس کا کام رُوئے زمین پر فساد کرنا تھا۔"

اپنے آپ کو مخلوق سے برتر سمجھنا ایک فساد تھا۔ دوسرا فساد یہ تھا کہ اُس نے مصر میں طبقاتی زندگی پیدا کر دی تھی۔ بنی اسرائیل کو رنج و عذاب میں مبتلا کرنا، اُن کے لڑکوں کو قتل کرنا اور اُن کی لڑکیوں کو کنیزیں بنانا تیسرا فساد تھا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے مفاسد اور بُرائیاں تھیں۔

یہ امر قدرتی ہے کہ خود پرست اور جاہ پسند لوگ صرف اپنی ذاتی منفعت کے تحفظ کا خیال رکھتے ہیں۔ اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ شخصی منافع کا خود غرضانہ تحفظ، انسانی معاشرہ کے مفادات کے تحفظ (جس کے لیے عدالت، قربانی اور ایثار کی ضرورت ہے) سے ہم آہنگ ہو۔ خود غرضی کا نتیجہ ہر شعبۂ زندگی میں بصورت فساد نمودار ہوتا ہے۔

آیت میں کلمہ "یذبح" استعمال ہوا ہے۔ جو ذبح سے مشتق ہے۔ اِس سے ثابت ہے کہ آلِ فرعون کا سلوک بنی اسرائیل کے ساتھ ایسا تھا جیسا کہ بھیڑوں اور چوپایوں کے ساتھ ہو۔ یعنی وہ ظالم اِن بے گناہوں کو حیوانات کی طرح ذبح کرتے تھے [۱]۔

وابستگانِ فرعون کی سفاکیوں کے متعلق بہت سے قصّے بیان کیے گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ:-

فرعون نے حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں کی نگرانی کی جائے اور صرف قبطی اور فرعون کی نامزد دائیاں ہی وضع حمل میں مدد کریں۔ تاکہ اگر طفل نوزاد لڑکا ہو تو فوراً مصری حکومت کے دفتر میں اطلاع دیں۔ تاکہ جلاد آئیں اور اُسے ذبح کر دیں [۲]۔

یہ قطعی واضح نہیں ہے کہ کتنے نومولود بچے اِس پروگرام کے مطابق قربان کیے گئے۔ بعض لوگوں نے اُن کی تعداد نوّے ہزار اور بعض نے لاکھوں لکھی ہے۔ فرعون اور اُس کے ہواخواہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اِن ہولناک مظالم کے ذریعے قوم بنی اسرائیل کے قیام اور مشیت الٰہی کے پُورا ہونے کی راہ مسدود کر دیں گے۔

۱۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ "ذبح" کا مادہ فعل ثلاثی مجرد میں متعدی ہے۔ لیکن اِس مقام پر وہ باب تفعیل میں استعمال ہوا ہے تاکہ کثرت کے مفہوم کو ظاہر کرے۔ نیز یہاں فعل مضارع کا استعمال اِس جُرم کے استمرار کی دلیل ہے۔

۲۔ تفسیر کبیر از فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

اِس آیت کے بعد بلا فاصلہ یہ بیان کیا گیا ہے: ہمارے ارادہ اور ہماری مشیت نے یہ طے کیا ہے کہ زمین پر جو ضعیف الحال اور مظلوم ہیں ہم اُن پر احسان کریں اور اُنھیں اپنی عنایات اور نوازشات سے سرفراز کریں: (و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض)۔

اور ہم اُن کو نوعِ انسانی کا پیشوا اور رُوئے زمین کا وارث بنا دیں: (و نجعلھم ائمۃ و نجعلھم الوارثین)۔

٭ ٭ ٭

ہم اُن کو قوی، صاحب قدرت اور توانا کر دیں گے اور اُن کی حکومت کو ثبات بخشیں گے: (و نمکن لھم فی الارض)۔
اور ہم فرعون، ھامان اور اُس کی فوج کو اُسی انجام سے دوچار کریں گے جس کا اُنھیں اِن کمزور لوگوں کی طرف سے خطرہ لگا رہتا ہے:
(و نری فرعون و ھامان و جنودھما منھم ما کانوا یحذرون)۔

یہ دونوں آیات کس قدر اپنے مطلب میں واضح اور اُمید بخش ہیں کیونکہ اِن آیات میں جو بھی اُمید افزا وعدہ ہے وہ ایک قانون کُلی کی شکل میں، فعل مضارع کے ساتھ بیان ہوا ہے جس میں استمرار کا مفہوم شامل ہے۔ تاکہ اُن مومنین کو (جو قرآن کے مخاطب ہیں) یہ تصور نہ ہو کہ یہ وعدہ صرف بنی اسرائیل کے ظلم کشیدہ اور ستم دیدہ لوگوں کے لیے ہے اور یہ وعید محض فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے لیے ہے۔ کیونکہ قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ "ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں"۔

یعنی فرعون کا ارادہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد کر دے اور اُن کی قدرت و شوکت کو نابود کر کے رکھ دے—— لیکن "ہم یہ چاہتے تھے کہ وہ قوی اور کامیاب ہوں"۔

وہ چاہتا تھا کہ حکومت ہمیشہ مستکبرین کے قبضے میں رہے۔ لیکن ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ حکومت کمزوروں اور مستضعفوں کے سپرد کر دیں اور آخر کار ایسا ہی ہوا۔

اس مقام پر کلمہ "منت" جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بھی کہا ہے "نعمات اور عطایا" کے بخشنے کے معنیٰ میں ہے۔ "منت" کے یہ معنیٰ اُس مفہوم سے مختلف ہیں جو اس کا روزمرہ کی بول چال میں لیا جاتا ہے یعنی کسی کو کچھ دے کے اُس پر احسان کرنا۔ اس مفہوم میں طرف ثانی کی تحقیر ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے۔

اِن دو آیتوں میں خدا نے کمزوروں اور پسے ہوئے لوگوں کے بارے میں اپنے ارادے کو بے نقاب کیا ہے اور اس ضمن میں پانچ باتوں کا ذکر کیا ہے جو باہم مربوط اور متعلق بیک دیگر ہیں:

اوّل یہ کہ: ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہماری نعمتوں سے فیض یاب ہوں: (و نرید ان نمن ...)۔
دوسرے یہ کہ: ہم چاہتے ہیں کہ اُنھیں پیشوا بنائیں: (و نجعلھم ائمۃ)۔
تیسرے یہ کہ: ہم چاہتے ہیں کہ اُنھیں جابروں اور ستمگاروں کی حکومت کا وارث بنا دیں: (و نجعلھم الوارثین)۔
چوتھے یہ کہ: ہم اُنھیں ایک مستقل اور پائیدار حکومت دیں گے: (و نمکن لھم فی الارض)۔
آخری اور پانچویں بات یہ ہے کہ: وہ پیش آمد جس کا ان کے دشمنوں کو خوف تھا اور اپنی تمام قوتیں اور وسائل کو اس کے ٹالنے پر صرف کر رہے تھے، ہم اُس حادثے سے اُنھیں ضرور دوچار کریں گے:

Marfat.com

(ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ماکانوا یحذرون)۔

ستم دیدہ اور مظلوم لوگوں پر خدا کی عنایات و الطاف اسی طرح نازل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں ؟ اور ان کی صفات کیا ہیں ؟ آئندہ **نکات** کی بحث میں ان شاء اللہ ہم اُن پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

ھامان فرعون کا مشہور و معروف وزیر تھا اور فرعون کی حکومت میں اس کا اتنا اثر تھا کہ آیت مذکورۂ بالا میں ملک مصر کی فوج کو " جنود فرعون و ھامان " کہا گیا ہے۔

(ھامان کے متعلق آیت ۳۸ کی تفسیر میں تشریحًا بیان کیا جائے گا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **مستضعفین کی عالمگیر حکومت** : سطورِ بالا میں ہم نے یہ کہا ہے کہ آیات بالا میں خدا کا پروگرام کوئی ہنگامی یا صرف بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ان آیات میں ایک کُلّی قانون بیان کیا گیا ہے جو تمام قرون و اعصار اور جملہ اقوام اور جماعتوں کے لیے ہے۔ چنانچہ الفاظ یہ ہیں کہ : ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ستم رسیدہ اور مستضعف لوگوں کو اپنی نعمات عطا کریں اور ہم اُنھیں اقوام کا پیشوا اور زمین کی حکومت کا وارث قرار دیں۔

درحقیقت یہ ایک بشارت ہے کہ " حق ، باطل پر اور ایمان ، کفر پر غالب ہو کے رہے گا۔"

نیز یہ کہ :۔ یہ اُن تمام آزاد لوگوں کے لیے بشارت ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ ظلم و جور کی بساط اُلٹ کر عدل و انصاف کی حکومت قائم ہو۔

اس مشیتِ الٰہی کے بروئے کار آنے کا ایک نمونہ خاندان فرعون کی حکومت کا زوال اور بنی اسرائیل کی حکومت کا قیام تھا۔ اور اس بشارت کا کامل تر ثبوت ظہورِ اسلام کے بعد پیغمبر اسلامؐ اور اُن کے اصحاب کی حکومت کا قیام تھا۔ یہ حکومت اُن پا برہنہ ، تہی دست ، مظلوم اور پاک دل مومنین کی تھی جو ہمیشہ اپنے زمانے کے فرعونوں کی طرف سے تحقیر اور تمسخر کا نشانہ بنتے رہتے تھے اور اُن کے ظلم وستم برداشت کرتے رہتے تھے۔

لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ خدا نے اسی واماندہ اور اُفتادہ گروہ کے ہاتھ سے قیصر و کسریٰ کے محلات کے دروازے شکستہ کروائے۔ اُنھیں زور اور قدرت کے تخت سے محروم کردیا اور ان متکبرین کی ناک کو زمین پر رگڑ دیا۔

اس بشارت کا وسیع ترین نمونہ وہ مبنی برحق و عدالت حکومت ہوگی جو امام مہدیؑ (ہماری جانیں ان پر فدا ہوں) کے ہاتھوں تمام رُوئے زمین پر برپا ہوگی۔

یہ آیات من جملہ اُن آیات کے ہیں جن میں واضح طور پر ایک ایسی حکومت کے ظہور کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اسلامی روایات میں ہماری نظر سے وہ ارشادات گزرتے ہیں جو اس آیت کی تفسیر میں اس " ظہور عظیم " کے متعلق ہیں۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے یوں منقول ہے :

Marfat.com

لتعطفن الدنیا علینا بعد شماسها عطف الضروس علی ولدها وتلی عقیب ذٰلک و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ....

دنیا اپنی لکذزنی اور سرکشی کے بعد "اُس اونٹنی کی طرح جو دُودھ دوھنے والے سے اپنے دُودھ کو اپنے بچہ کے لیے بچا لیتی ہے" ہماری طرف رُخ کرے گی۔

اِس کے بعد آپ نے آیت " ونرید ان نمن ..." کی تلاوت فرمائی[1]

ایک اور حدیث میں جو امام علی علیہ السلام ہی سے مروی ہے ہم یوں پڑھتے ہیں کہ آیت فوق کی تفسیر میں فرمایا :

ھو اٰل محمدؐ یبعث اللہ مہدیھو بعد جھدھو فیعزھو و یذل عدوھو۔

وہ آل محمدؐ ہیں کہ اُن زحمات و مصائب کے بعد جو اُن پر وارد ہوں گے اُن میں سے خدا مہدی کو پیدا کرے گا۔ جو اُن کو عزت دے گا اور اُن کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے گا۔[2]

ایک اور حدیث میں جو جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، اس میں ہے :

والذی بعث محمدًا بالحق بشیرًا و نذیرًا ، ان الابرار منا اھل البیت و شیعتھو بمنزلة موسٰی و شیعتہ ، وان عدونا و اشیاعھو بمنزلة فرعون و اشیاعہ

قسم ہے اُس خدا کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا کہ ہم اہلبیت میں ابرار اور اُن کے پیرو مثل موسٰی کے ہیں اور ہمارے دشمن اور اُن کے پیرو فرعون اور اُس کے مقلدین کے سے ہیں۔[3]

امامؑ کا مقصد یہ ہے کہ آخر کار ہم کامیاب اور فتح مند ہوں گے اور ہمارے دشمن نابود ہو جائیں گے اور ہم ہی حق و عدل پر مبنی حکومت قائم کریں گے۔

البتہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کی عالمگیر حکومت اُن حکومتوں کے خلاف اور مانع نہ ہو گی جو مظلوم لوگ ظالموں کے خلاف محدود علاقوں میں قائم کر لیں گے اور یہ مستضعف لوگ جس وقت مبنی برحق و عدل حکومت کی شرائط کو پُورا کریں گے تو خدا کا حتمی وعدہ اور اُس کی مشیت اُن کے حق میں پوری ہو جائے گی اور اُنھیں یہ کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

۲۔ **"مستضعفین" اور "مستکبرین" کون ہیں؟** ہم جانتے ہیں کہ کلمہ "مستضعف" مادہ "ضعف" سے مشتق ہے۔ لیکن چونکہ اس مادہ کو باب استفعال میں لے جایا گیا ہے (لہذا خاصیت باب کی وجہ سے) اس کے معنی ہیں وہ

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار ۲۰۹۔

[2] "غیبت شیخ طوسی" مطابق نقل تفسیر نور الثقلین، ج ۴ ص ۱۱۰۔

[3] "مجمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

شخص جسے کمزور کر دیا گیا ہو اور اُسے بیڑیاں پہنا کر قید کر دیا گیا ہو۔

ایک اور تعبیر کے مطابق "مستضعف" وہ نہیں ہے کہ جسمانی لحاظ سے کمزور و ناتواں ہو اور کسی قسم کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ اصطلاحاً "مستضعف" وہ ہے کہ اُس میں بالقوۃ اور بالفعل کام کرنے کی استعداد تو موجود ہو، مگر وہ ظالموں کے ظلم اور جبر کے نیچے پسا ہوا ہو۔ لیکن بایں حال کہ اُس کے دست و پا قید و بند میں گرفتار ہیں وہ اِس حالت پر خاموش اور مطیع نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ جابروں اور ستمگروں کے ہاتھ کاٹ دے اور دُنیا میں ایسا قانون نافذ کرے جو حق اور عدل پر مبنی ہو۔

اللہ نے ایسے گروہ سے اُن کی مدد کرنے اور اُنھیں زمین کی حکومت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ خدا کا یہ وعدہ اُن بے دست و پا بُزدل اور ڈرپوک لوگوں کے لیے نہیں ہے جو ظلم کے خلاف فریاد کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ بھلا، اُن سے اِس بات کی کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ میدانِ نبرد میں آئیں اور قربانی دیں۔

بنی اسرائیل بھی فرعونوں کی حکومت کے وارث اُس وقت ہو سکے جب وہ اپنے رہبر حضرت موسیٰؑ کے حلقۂ اطاعت میں آگئے۔ اپنے وسائل کو جمع کیا اور سب کے سب من حیث القوم ایک مرکز پر اکٹھے ہو گئے۔ وہ ایمانی اثرات جو اُنھیں حضرت ابراہیمؑ سے ورثے میں ملے تھے، حضرت موسیٰؑ کی تبلیغ و تعلیم نے اُنھیں تازہ اور مکمل کیا، خرافات کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

البتہ "مستضعف" بھی کئی قسم کے ہیں مثلاً مستضعفِ فکری و علمی و ادبی، مستضعفِ اقتصادی، مستضعفِ اخلاقی اور مستضعفِ سیاسی، قرآن مجید میں یہ کلمہ عام طور پر مستضعفینِ سیاسی و اخلاقی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ جب آمر طبع ظالم مسلط ہوتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اپنی تسلط پسندانہ سیاست کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے محکوموں کے علوم و تہذیب کو تباہ اور اُن کی فکر کو ضعیف کر دیتے ہیں۔ اُس کے بعد وہ، اُن کی اقتصادی حالت کو کمزور کر دیتے ہیں تاکہ اُن میں یہ قوت و توانائی باقی نہ رہے کہ وہ کبھی یہ سوچ سکیں کہ بغاوت کر کے متکبر و ظالم آمر کے ہاتھ سے عنانِ حکومت چھین لی جائے۔

قرآن مجید میں پانچ مقامات پر "مستضعفین" کا ذکر آیا ہے۔ اِن سب مقامات پر اِس کلمے سے مراد وہ مومنین ہیں جو ظالموں کے جبر کے نیچے دبے ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر مومنین کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اور مستضعفین کی نجات کے لیے جہاد کریں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

> تم خدا کی راہ میں اور اُن لوگوں کی نجات کے لیے جو قہر و ستم کا شکار ہیں، جہاد کیوں نہیں کرتے؟ جب کہ یہ ستم دیدہ لوگ کہتے ہیں:-
>
> اے خدا! تو ہمیں اس شہر (مکہ) سے جس کے باشندے ستمگر ہیں باہر لے جا۔ اور ایک مددگار مقرر کر۔ (نسا ۷۵)

Marfat.com

قرآن میں صرف ایک جگہ اُن لوگوں کا ذکر آیا ہے جو ظالم ہیں اور کافروں سے میل جول رکھتے ہیں اور ریاکاری سے اپنے کو "مستضعف" کہتے ہیں۔ قرآن نے اُن کے اس اِدّعا کی نفی کی ہے اور کہا ہے :۔

"تم یہ کر سکتے تھے کہ کفر و فساد کے علاقے سے ہجرت کر کے اُن ظالموں کے پنجے سے رہائی حاصل کر لیتے ۔ مگر، چونکہ تم نے ایسا نہیں کیا اس لیے تمہاری جگہ دوزخ میں ہے ۔" (نساء : ۹۷)

تاہم، قرآن مجید میں ہر مقام پر مستضعفین کی حمایت کی گئی ہے اور ان کا ذکر بھلائی کے ساتھ کیا گیا ہے اور اُنھیں ایسے مومنین شمار کیا گیا ہے جو زیر تسلط پس رہے ہیں۔ یہ مومن مجاہد اور دینِ خدا کے لیے سعی و کوشش کرنے والے ہیں اور لطفِ خداوندی ان کے شاملِ حال ہے۔

۲۔ **مستکبرین کی عام روش** : صرف یہ فرعون کی خصوصیت نہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو اسیر رکھنے کے لیے اُن کے مردوں کو قتل کرتا تھا اور اُن کی عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ تمام جابروں کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنے محکوموں کی عملی قوتوں کو ختم کرتے رہے ہیں ۔

اُن میں سے جو جابر حکمران مردوں کو قتل نہ کر سکتے تھے وہ اُن کے جوہرِ مردانگی کو قتل کر دیتے تھے۔ وہ لوگ بُرائی کے وسائل کے ذریعے یعنی لہو ولعب کو پھیلا کر، منشیات کا عادی بنا کر فُحشیات کو عام کر کے، جنسی لذائذ کو بے لگام کر کے، شراب اور جُوئے بازی کو جائز کر کے اور طرح طرح کے غیر صحت مندانہ مشاغل کی ترغیب دلا کے اپنی محکوم قوم کی غیرت وحمیت، دلاوری، جنگی رُوح اور قوتِ ایمانی کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ تاکہ بالکل مطمئن ہو کر اپنی استحصالی حکومت کو دوام دے سکیں۔

لیکن — پیمبرانِ الٰہی، بالخصوص پیمبرِ اسلامؐ نے یہ کوشش کی کہ جوانوں کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کریں۔ یہاں تک کہ عورتوں کو بھی بہادری کا سبق سکھائیں اور اُنھیں مستکبرین کے مقابلے میں مردوں کی صف میں لا کھڑا کریں ۔

اِن دونوں چیزوں کے شواہد گزشتہ تاریخ میں اور زمانۂ حال میں تمام اسلامی ملکوں میں اچھی طرح نمایاں ہیں۔ ہم اس مقام پر اُن کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

Marfat.com

۷۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ
فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ
وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝
۸۔ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۗ اِنَّ
فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝
۹۔ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰٓى
اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۔ ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ اسے دُودھ پلا اور جب تجھے اس کے بارے میں کچھ خوف پیدا ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور ڈرنا نہیں اور نہ غمگین ہونا کیونکہ ہم اُسے تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اُسے رسولوں میں سے قرار دیں گے۔

۸۔ (جب ماں کو بچے کے بارے میں سخت تشویش ہوئی تو اس نے حکم خدا سے اُسے دریا میں ڈال دیا) فرعون کے خاندان والوں نے اُسے پانی میں سے اُٹھالیا۔ تاکہ انجام کار وہ اُن کا دشمن اور باعثِ اندوہ ہوجائے۔ مسلّمًا فرعون، ھامان اور اُن کا لشکر خطا کار تھے۔

۹۔ اور فرعون کی بیوی نے (جب دیکھا کہ وہ بچے کو قتل کر دینا چاہتے ہیں تو) کہا کہ یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو۔ ممکن ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور وہ انجام سے بے خبر تھے (انہیں معلوم نہ تھا کہ جسے وہ اپنی آغوش میں پال رہے ہیں وہی ان کا اصلی دشمن ہے)۔

Marfat.com

تفسیر

فرعون کی آغوش میں :

اس جگہ سے قرآن مستکبرین پر مستضعفین کی فتح و غلبہ کو ذہن نشین کرانے کے لیے موسٰی اور فرعون کے قصہ کو بالشرح بیان کرتا ہے۔ بالخصوص واقعہ کا وہ حصہ جس میں حضرت موسٰیؑ ضعیف ترین حالات میں تھے اور فرعون قوی ترین اسباب و شرائط کا حامل تھا، وضاحت سے بیان کیا گیا ہے "تاکہ جابروں اور ظالموں کے ارادے پر مشیت الٰہی کے غلبے کو آشکار کیا جا سکے۔

اس سلسلے میں قرآن شریف میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ" ہم نے موسٰی کی والدہ کو وحی کی کہ موسٰی کو دُودھ پلا اور جس وقت تمہیں اُس کے بارے میں کچھ خوف ہو تو اُسے دریا میں ڈال دو"۔ (واوحینا الٰی ام موسٰی ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم) ۔ اور تم اپنے دل میں کسی قسم کا خوف اور ملال نہ آنے دینا۔ (ولا تخافی ولا تحزنی)۔ کیونکہ ہم اُسے یقیناً تمہارے پاس لوٹا دیں گے اور اُسے رسولوں میں سے قرار دیں گے ؛ (انا رآدوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین)۔

اس مختصر سی آیت میں دو " امر" ہیں ، دو " نہی " ہیں اور دو بشارتیں ہیں۔ یہ آیت بحیثیت مجموعی خلاصہ ہے ایک پُراز واقعات داستان کا ، جس کا ماحصل یہ ہے :

حکومت فرعون نے بنی اسرائیل کے ہاں جو نومولود بیٹے ہوتے تھے انہیں قتل کرنے کا ایک وسیع پروگرام بنایا تھا۔ یہاں تک کہ فرعون کی مقرر کردہ دائیاں بنی اسرائیل کی باردار عورتوں کی نگرانی کرتی رہتی تھیں۔

ان دائیوں میں سے ایک والدہ موسٰی کی دوست بن گئی تھی۔ شکم مادر میں موسٰی کا حمل مخفی رہا اور اس کے آثار ظاہر نہ ہوئے جس وقت مادرِ موسٰی کو یہ احساس ہوا کہ بچے کی ولادت کا وقت قریب ہے تو اس نے کسی کو اپنی دوست دائی کو بُلانے بھیجا۔ جب وہ آگئی تو اس سے کہا "میرے پیٹ میں ایک فرزند ہے آج مجھے تمہاری دوستی اور محبت کی ضرورت ہے"۔

جس وقت حضرت موسٰیؑ پیدا ہوئے تو آپ کی آنکھوں سے ایک خاص نور چمک رہا تھا۔ چنانچہ اُسے دیکھ کر وہ دایہ کانپنے لگی اور اُس کے دل کی گہرائی میں محبت کی ایک بجلی سما گئی ۔ جس نے اُس کے دل کی تمام فضا کو روشن کر دیا۔

یہ دیکھ کر ـــ وہ دایہ مادرِ موسٰیؑ سے مخاطب ہو کر بولی کہ میرا یہ خیال تھا کہ حکومت کے دفتر میں جا کے اس بچے کے پیدا ہونے کی خبر دوں تاکہ جلاد آئیں اور اسے قتل کر دیں اور میں اپنا انعام پا لوں۔ مگر میں کیا کروں کہ میں اپنے دل میں اس نوزائیدہ بچے کی شدید محبت محسوس کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ اس کا بال بھی بیکا ہو۔ اس کی اچھی طرح حفاظت کرو۔ میرا خیال ہے کہ آخر کار یہی ہمارا دشمن ہو گا۔

وہ دایہ مادر موسٰی کے گھر سے باہر نکلی۔ تو حکومت کے بعض جاسوسوں نے اُسے دیکھ لیا اُنھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ گھر میں داخل ہو جائیں گے۔ موسٰی کی بہن نے اپنی ماں کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا۔ ماں یہ سُن کے گھبرا گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے۔

Marfat.com

اِس شدید پریشانی کے عالم میں جب کہ وہ بالکل حواس باختہ ہو رہی تھی، اُس نے بچّے کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور تنور میں ڈال دیا۔۔۔ اِس دوران میں حکومت کے آدمی آگئے۔ مگر وہاں اُنھوں نے روشن تنور کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ اُنھوں نے مادرِ موسیٰ سے تفتیش شروع کر دی ۔۔۔ پوچھا۔ دایہ یہاں کیا کر رہی تھی۔ ؟ موسیٰؑ کی ماں نے کہا کہ وہ میری سہیلی ہے مجھے ملنے آئی تھی۔ حکومت کے کارندے مایوس ہو کے واپس ہوگئے۔

اب موسیٰ کی ماں کو ہوش آیا۔ اُس نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ بچہ کہاں ہے ؟ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ناگہاں تنور کے اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اب ماں تنور کی طرف دوڑی۔ کیا دیکھتی ہے کہ خدا نے اُس کے لیے آتشِ تنور کو "ٹھنڈا اور سلامتی کی جگہ" بنا دیا ہے، وہی خدا جس نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے آتشِ نمرود کو "بردو سلام" بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بچے کو صحیح و سالم باہر نکال لیا۔

لیکن پھر بھی ماں محفوظ نہ تھی۔ کیونکہ حکومت کے کارندے دائیں بائیں پھرتے رہتے اور جستجو میں لگے رہتے تھے۔ کسی بڑے خطرے کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سُن لیتے۔

اِس حالت میں خدا کے ایک الہام نے ماں کے قلب کو روشن کر دیا۔ وہ الہام ایسا تھا کہ ماں کو بظاہر ایک خطرناک کام پر آمادہ کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی ماں اُس ارادے سے اپنے دل میں سکون محسوس کرتی تھی۔

اُس نے کہا ۔۔۔ "خدا کی طرف سے مجھ پر یہ فرض عائد ہوا ہے۔ میں اسے ضرور انجام دوں گی"۔ اُس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں اِس الہام کو ضرور عملی جامہ پہناؤں گی اور اپنے نوزائیدہ بچے کو دریائے نیل میں ڈال دوں گی۔

اُس نے ایک مصری بڑھئی کو تلاش کیا (وہ بڑھئی قبطی اور فرعون کی قوم میں سے تھا) اُس نے اُس بڑھئی سے درخواست کی کہ میرے لیے ایک چھوٹا سا صندوق بنا دے۔

بڑھئی نے پوچھا: جس قسم کا صندوقچہ تم بنوانا چاہتی ہو اُسے کس کام میں لاؤ گی ؟

موسیٰ کی ماں جو دروغ گوئی کی عادی نہ تھی اِس نازک مقام پر بھی سچ بولنے سے باز نہ رہی۔ اُس نے کہا:۔ مَیں بنی اسرائیل کی ایک عورت ہوں۔ میرا ایک نوزائیدہ بچّہ لڑکا ہے۔ میں اُس بچّے کو اُس صندوق میں چھپانا چاہتی ہوں۔

اُس قبطی بڑھئی نے اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ جلادوں کو یہ خبر پہنچا دے گا۔ وہ تلاش کر کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ مگر جب وہ اُنھیں یہ خبر سنانے لگا تو اُس کے دل پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ اُس کی زبان بند ہوگئی۔ وہ صرف ہاتھوں سے اشارے کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُن علامتوں سے اُنھیں اپنا مطلب سمجھا دے۔ حکومت کے کارندوں نے اُس کی حرکات دیکھ کر سمجھا کہ یہ شخص ہم سے مذاق کر رہا ہے۔ اِس لیے اُسے مارا اور باہر نکال دیا۔

جیسے ہی وہ اُس دفتر سے باہر نکلا اُس کے ہوش و حواس بجا ہوگئے۔ وہ پھر جلادوں کے پاس گیا اور اپنی حرکات سے پھر مار کھائی۔ آخر اُس نے یہ سمجھا کہ اس واقعے میں ضرور کوئی الٰہی راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ اُس نے صندوق بنا کے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو دے دیا۔

غالباً صبح کا وقت تھا۔ ابھی اہلِ مصر محوِ خواب تھے۔ مشرق سے پُو پھٹ رہی تھی۔ ماں اپنے نوزائیدہ بچے اور صندوق کو دریائے نیل

Marfat.com

کے کنارے لائی۔ بچے کو آخری مرتبہ دُودھ پلایا۔ پھر اُسے، اُس مخصوص صندوق میں رکھا (جس میں یہ خصوصیت تھی کہ ایک چھوٹی کشتی کی طرح پانی پر تیر سکے) پھر اُس صندوق کو نیل کی موجوں کے سپرد کر دیا۔

نیل کی پُر شور موجوں نے اُس صندوق کو جلد ہی ساحل سے دُور کر دیا۔ ماں کنارے پر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ معاً اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل سینے سے نکل کر موجوں کے اوپر تیر رہا ہے۔ اُس وقت، اگر الطافِ الٰہی اُس کے دل کو سکون و قرار نہ بخشتا تو یقیناً وہ زور زور سے رونے لگتی ـــ اور ـــ پھر سارا راز فاش ہو جاتا۔

کسی آدمی میں یہ قدرت نہیں ہے کہ اُن حساس لمحات میں ماں پر جو گزر رہی تھی۔ الفاظ میں اُس کا نقشہ کھینچ سکے۔ مگر ـــ ایک فارسی شاعرہ نے کسی حد تک اُس منظر کو اپنے فصیح اور پُر از جذبات اشعار میں مجسّم کیا ہے: ؎

۱. مادر موسیٰ چو موسیٰ را بہ نیل
در فگند از گفتۂ ربّ جلیل

۲. خود ز ساحل کرد با حسرت نگاہ
گفت کای فرزند خرد بی گناہ!

۳. گر فراموشت کند لطف خدای
چون رہی زین کشتی بی ناخدای

۴. وحی آمد کاین چہ فکر باطل است
رہرو ما اینک اندر منزل است

۵. ما گرفتیم آنچہ را انداختی
دست حق را دیدی و نشناختی

۶. سطح آب از گاہوارش خوشتر است
دایہ اش سیلاب و موجش مادر است

۷. رودھا از خود نہ طغیان می کنند
آنچہ می گوئیم ما آن می کنند

۸. ما بہ دریا حکم طوفان می دہیم
ما بہ سیل و موج فرمان می دہیم

۹. نقش ہستی نقشی از ایوان ما است
خاک و باد و آب سرگردان ماست

۱۰. بہ کہ برگردی بہ ما بسپاریش
کی تو از ما دوستر می داریش؟ [1]

[1] پروین اعتصامی کے دیوان سے

Marfat.com

۱۔ جب موسیٰ کی ماں نے حکم الٰہی کے مطابق موسیٰ کو دریائے نیل میں ڈال دیا۔

۲۔ وہ ساحل پر کھڑی ہوئی حسرت سے دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اے میرے بے گناہ ننھے بیٹے!

۳۔ اگر لطفِ الٰہی تیرے شاملِ حال نہ ہو تو، تُو اس کشتی میں کیسے سلامت رہ سکتا ہے جس کا کوئی ناخدا نہیں ہے۔

۴۔ حضرت موسیٰؑ کی ماں کو اُس وقت وحی ہوئی کہ تیری یہ کیا خام خیالی ہے۔ ہمارا مسافر تو سُوئے منزل رواں ہے۔

۵۔ تُو نے جب اس بچے کو دریا میں ڈالا تھا تو ہم نے اُسے اُسی وقت سنبھال لیا تھا۔ تو نے خدا کا ہاتھ دیکھا مگر اُسے پہچانا نہیں۔

۶۔ اِس وقت پانی کی سطح (اُس کے لیے) اُس کے گہوارے سے زیادہ راحت بخش ہے دریا کا سیلاب اُس کی دایہ گیری کر رہا ہے اور اُس کی موجیں آغوشِ مادر بنی ہوئی ہیں۔

۷۔ دیکھو دریاؤں میں اُن کے ارادہ و اختیار سے طُغیانی نہیں آتی۔ وہ ہمارے حکم کے مطیع ہیں وہ وہی کرتے ہیں جو ہمارا امر ہوتا ہے۔

۸۔ ہم ہی سمندروں کو طوفانی ہونے کا حکم دیتے ہیں اور ہم ہی سیل دریا کو روانی اور امواجِ بحر کو تلاطم کا فرمان بھیجتے ہیں۔

۹۔ ہستی کا نقش ہمارے ایوان کے نقوش میں سے ایک نقش ہے جو کچھ ہے یہ کائنات تو اُس کا مُشتے از خروارے نمونہ ہے۔ اور خاک، پانی، ہوا اور آتش ہمارے ہی اشارے سے متحرک ہیں۔

۱۰۔ بہتر یہی ہے کہ تو بچے کو ہمارے سپرد کر دے اور خود واپس چلی جا۔ کیونکہ تو اُس سے ہم سے زیادہ محبت نہیں کرتی۔

یہ منظر تو یہیں ختم ہوتا ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ فرعون کے محل میں کیا ہو رہا تھا؟

روایات میں مذکور ہے کہ فرعون کی ایک اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ ایک سخت بیماری سے شدید تکلیف میں تھی۔ فرعون نے اُس کا بہت کچھ علاج کرایا مگر بے سُود۔ اُس نے کاہنوں سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا: "اے فرعون ہم پیش گوئی کرتے ہیں کہ اس دریا میں سے ایک آدمی تیرے محل میں داخل ہوگا۔ اگر اُس کے منہ کی رال اس بیمار کے جسم پر مَلی جائے گی تو اسے شفا ہو جائیگی۔

چنانچہ فرعون اور اُس کی ملکہ آسیہ ایسے واقعے کے انتظار میں تھے کہ ناگہاں ایک روز اُنھیں ایک صندوق نظر آیا جو موجوں کی سطح پر تیر رہا تھا۔ فرعون نے حکم دیا کہ سرکاری ملازمین فوراً دیکھیں کہ یہ صندوق کیسا ہے اور اسے پانی میں سے نکال لیں۔ دیکھیں

Marfat.com

اُس میں کیا ہے ؟

نوکروں نے وہ عجیب صندوق فرعون کے سامنے لاکے رکھ دیا۔ کسی کو اُس کا ڈھکنا کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مطابق مشیتِ الٰہی ، یہ لازمی تھا کہ حضرت موسیٰ کی نجات کے لیے صندوق کا ڈھکنا فرعون ہی کے ہاتھ سے کھولا جائے ، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جس وقت فرعون کی ملکہ نے اُس بچّے کو دیکھا تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ ایک بجلی چمکی ہے جس نے اُس کے دل کو منوّر کر دیا ہے۔

اُن دونوں ـــ بالخصوص فرعون کی ملکہ کے دل میں اُس بچے کی محبت نے گھر کر لیا اور جب اِس بچّے کا آبِ دہن اُس کی لڑکی کے لیے موجب شفا ہو گیا تو یہ محبت اور بھی زیادہ ہو گئی۔[1]

اب ہم پھر قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اِس سرگزشت کا خلاصہ قرآن کی زبان سے سُنتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

قرآن میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ :ـــ فرعون کے اہلِ خانہ نے مُوسیٰ کو نیل کی موجوں کے اُوپر سے پکڑ لیا۔ تاکہ وہ اُن کا دُشمن اور اُن کے لیے باعثِ اندوہ ہو جائے : (فالتقطہ اٰل فرعون لیکون لھم عدوًا وحزنًا) ۔

" التقط " مادہ " التقاط " سے مشتق ہے ۔ جس کے وضعی معنیٰ ہیں ۔" کسی شی کو بغیر تلاش و کوشش پا لینا " اِسی وجہ سے اگر انسان کسی گم شدہ چیز کو پالے تو اُسے " لقطہ " کہتے ہیں ۔

یہ امر بدیہی ہے کہ فرعون کے اہلِ خانہ نے اس بچّے کے قنداقہ (وہ کپڑا جس میں بچہ کو لپیٹتے ہیں) کو اِس نیت سے دریا سے نہیں نکالا تھا کہ اپنے جانی دشمن کو اپنی گود میں پالیں ۔ بلکہ وہ لوگ بقول ملکہ فرعون اپنے لیے ایک نورِ چشم حاصل کرنا چاہتے تھے ۔

لیکن انجام کار ایسا ہی ہوا ۔ علمائے ادب کی اصطلاح میں " لیکون " میں جو " لام " سابق ہے ۔ وہ " لام " عاقبت کہلاتا ہے ۔ نہ کہ " لامِ علّت " اور اس معنیٰ و مراد کی تعبیر میں لطافت یہی ہے کہ خدا اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح اِس گروہ کو جنھوں نے اپنی تمام قوتیں اور وسائل ، بنی اسرائیل کی اولادِ ذکور کو قتل کرنے کے لیے وقف کر دیئے تھے ، اِس خدمت پر مامور کرے کہ جس بچّے کو نابود کرنے کے لیے اُنھوں نے یہ پروگرام بنایا تھا ، اُسی کو وہ اپنی جان کی طرح عزیز رکھیں اور اسی کی پرورش کریں ۔

قرآن مجید میں کلمہ " اٰلِ فرعون " استعمال ہوا ہے ۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ صندوقِ مُوسیٰ کو صرف ایک آدمی نے نہیں نکالا ، بلکہ اُس کے نکالنے میں خاندانِ فرعون کے متعدد افراد شریک تھے ۔ اور یہ عمل اِس امر کا شاہد ہے کہ وہ کسی ایسے واقعے کے منتظر تھے ۔

---

[1] روایت کا یہ حصہ ابنِ عباس سے منقول ہے جو تفسیر فخر رازی میں مذکور ہے ۔ دوسری روایات تفسیر ابوالفتوح اور مجمع البیان میں سے لی گئی ہیں ۔

Marfat.com

آیت کا اختتام اِن کلمات پر ہوتا ہے کہ " مُسلمًا فرعون، ھامان اور اُن دونوں کے اہلِ لشکر خطار کار تھے ":
(انّ فرعون وھامان وجنودھما کانوا خاطئین)۔
وہ دونوں ہر جہت سے خطا کار تھے۔ اِس سے بڑی خطا اور کیا ہوگی کہ اُنھوں نے حق و عدالت کی راہ سے رُوگردانی کر کے اپنی حکومت کی بنیاد، ظلم، جور اور شرک پر رکھی تھی۔ اس سے زیادہ عُریاں خطا اور کیا ہوگی کہ اُنھوں نے ہزاروں بچوں کے سر قلم کر دیئے تاکہ " کلیم اللہ " کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں مگر خدا نے اُسے اُنھیں کے سپرد کیا اور فرمایا :
اپنے اِس دشمن کو لو، اُسے پالو اور بڑا کرو۔[1]

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد کی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس بچے کی بابت فرعون، اُس کی ملکہ اور دیگر اہلِ خاندان میں باہم نزاع اور اختلاف بھی ہوا تھا۔ کیونکہ قرآن شریف میں یہ بیان ہے : فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کا نُور ہے اسے قتل نہ کرو۔ ممکن ہے یہ ہمارے لیے نفع بخش ہو یا ہم اسے متبنیٰ کر لیں : (وقالت امرأت فرعون قرّت عینٍ لی ولك لا تقتلوہ عسٰی ان ینفعنا او نتخذہٗ ولدًا)۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرعون بچے کے چہرے اور دیگر علامات سے، من جملہ اُن کے اُسے صندوق میں رکھنے اور دریائے نیل میں بہا دینے سے یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے کسی کا بچہ ہے۔
یہ سمجھ کر ناگہاں، بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کی بغاوت اور اُس کی سلطنت کے زوال کا کابوس اُس کی رُوح پر مسلط ہوگیا اور وہ اِس امر کا خواہاں ہوا کہ اُس کا وہ ظالمانہ قانون، جو بنی اسرائیل کے تمام نوزائیدہ اطفال کے لیے جاری کیا گیا تھا اس بچے پر بھی نافذ ہو۔
فرعون کے خوشامدی درباریوں اور رشتہ داروں نے بھی اِس امر میں فرعون کی تائید و حمایت کی اور کہا اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ بچہ قانون سے مستثنیٰ رہے۔
لیکن فرعون کی بیوی آسیہ جس کے بطن سے کوئی لڑکا نہ تھا اور اُس کا پاک دل فرعون کے درباریوں کی مانند نہ تھا، اِس بچے کے لیے محبت کی کان بن گیا تھا۔ چنانچہ وہ اُن سب کی مخالفت پر آمادہ ہوگئی اور چونکہ اس قسم کے گھریلو اختلافات میں فتح ہمیشہ عورتوں کی ہوتی ہے، وہ بھی جیت گئی۔
اگر اِس گھریلو جھگڑے پر، دخترِ فرعون کی شفایابی کے واقعے کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو اِس اختلاف باہمی میں آسیہ کی فتح کا اِمکان روشن تر ہو جاتا ہے۔
مگر آیت کے اخیر میں ایک بہت ہی پُر معنیٰ فقرہ ہے : " وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کر رہے ہیں ": (وھو لا یشعرون)۔
البتہ وہ بالکل بے خبر تھے کہ خدا کا واجب النفوذ فرمان اور اُس کی شکست ناپذیر مشیت نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ یہ طفلِ نوزاد انتہائی

---

[1] امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ " خاطی " اور " مخطی " میں یہ فرق ہے کہ " خاطی " وہ شخص ہے جو کسی کام کو اچھی طرح نہ کر سکے اور " مخطی " اپنے کام کو اچھی طرح کرتا ہے مگر اُس سے اتفاقاً غلطی ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

خطرات میں پرورش پائے۔ اور کسی آدمی میں بھی ارادہ و مشیت الٰہی سے سرتابی کی طاقت و جرأت نہیں ہے۔

❁　❁　❁

اللہ کی عجیب قُدرت:

اس چیز کا نام قدرت نمائی نہیں ہے کہ خُدا آسمان و زمین کے لشکروں کو مامور کرکے کسی پُر قوت اور ظالم قوم کو نیست و نابود کردے۔

بلکہ ـــ قدرت نمائی یہ ہے کہ اُن ہی جباران متکبر سے یہ کام لے کر وہ اپنے آپ کو خود ہی ـــ نیست و نابود کرلیں اور اُن کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا ہو جائیں کر بڑے شوق سے لکڑیاں جمع کریں اور اُن کی آگ میں جل مریں، اپنے لیے خود ہی قید خانہ بنائیں اور اُس میں اسیر ہو کے جان دے دیں، اپنے لیے خود ہی صلیب کھڑی کریں اور اُس پر چڑھ مریں۔

فرعون اور اُس کے زور مند اور ظالم ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی پیش آیا۔ چنانچہ تمام مراحل میں حضرت موسیٰؑ کی نجات اور پرورش اُن ہی کے ہاتھوں سے ہوئی:

حضرت موسیٰؑ کی دایہ قبطیوں میں سے تھی،

صندوق موسیٰ کو امواج نیل سے نکالنے اور نجات دینے والے متعلقین فرعون تھے،

صندوق کا ڈھکنا کھولنے والا خود فرعون یا اُس کی اہلیہ تھی،

اور ـــ آخر کار فرعون شکن اور مالک غلبہ و اقتدار موسیٰ کے لیے امن و آرام اور پرورش کی جگہ خود فرعون ہی کا محل قرار پایا۔

یہ ہے پروردگار عالم خدا کی قُدرت!

❁　❁　❁

Marfat.com

۱۰۔ وَاَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا ؕ اِنۡ کَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِہٖ لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِہَا لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

۱۱۔ وَقَالَتۡ لِاُخۡتِہٖ قُصِّیۡہِ ۫ فَبَصُرَتۡ بِہٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ○

۱۲۔ وَحَرَّمۡنَا عَلَیۡہِ الۡمَرَاضِعَ مِنۡ قَبۡلُ فَقَالَتۡ ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰۤی اَہۡلِ بَیۡتٍ یَّکۡفُلُوۡنَہٗ لَکُمۡ وَہُمۡ لَہٗ نٰصِحُوۡنَ ○

۱۳۔ فَرَدَدۡنٰہُ اِلٰۤی اُمِّہٖ کَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُہَا وَلَا تَحۡزَنَ وَلِتَعۡلَمَ اَنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّلٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۰۔ موسٰی کی ماں کا دل (اپنے بیٹے کی یاد کے سوا) ہر چیز سے خالی ہوگیا۔ اگر ہم اُس کا دل ایمان اور اُمید سے محکم نہ کر دیتے تو قریب تھا کہ وہ راز فاش کر دیتی۔ (مگر ہماری) غرض یہ تھی کہ وہ مومنین میں سے رہے۔

۱۱۔ ماں نے موسٰی کی بہن سے کہا تو اُس کے پیچھے پیچھے چلی جا۔ پس وہ اُسے دُور سے دیکھتی رہی اور وہ لوگ اس حال سے بے خبر تھے۔

۱۲۔ اور ہم نے پہلے ہی سے اُس پر دُودھ پلانے والیوں کے دُودھ اُس پر حرام کر دیئے تھے (تاکہ وہ اپنی ماں ہی کی گود میں پھر سے آجائے) پس موسٰی کی بہن نے (جب دیکھا کہ حکام کسی دایہ کی تلاش میں بے تاب ہیں تو) کہا۔ کیا میں تمہیں ایسے گھر والے بتاؤں جو اس نومولود کی کفالت کریں اور اُس کے خیر خواہ بھی ہوں؟

۱۳۔ پس ہم نے اُس (موسٰی) کو اُس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو نیز وہ جان لے کہ خدا کا وعدہ سچا ہے، مگر اُن میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

Marfat.com

تفسیر

موسیٰؑ پھر آغوشِ مادر میں :

ان آیات میں اس داستان کا ایک اور حصّہ بیان کیا گیا ہے ۔

حضرت موسیٰؑ کی ماں نے اُس طرح سے جیسا کہ ہم نے پیشتر بیان کیا ہے، اپنے فرزند کو دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کردیا۔ مگر اس عمل کے بعد اُس کے دل میں جذبات کا ایک شدید طوفان اُٹھنے لگا۔ نوزائیدہ بیٹے کی یاد، جس کے سوا اُس کے دل میں کچھ نہ تھا اُس کے احساسات پر غالب آگئی تھی۔

قریب تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور اپنا راز فاش کردے ۔

قریب تھا کہ چیخ مارے اور اپنے بیٹے کی جدائی میں نالے کرے ۔

لیکن ـــــ عنایتِ خداوندی اُس کے شاملِ حال رہی جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے : موسیٰ کی ماں کا دل اپنے فرزند کی یاد کے سوا ہر چیز سے خالی ہو گیا۔

اگر ہم نے اُس کا دل ایمان اور اُمید کے نُور سے روشن نہ کیا ہوتا تو قریب تھا کہ وہ راز فاش کردیتی۔ لیکن ہم نے یہ اس لیے کیا تا کہ وہ اہلِ ایمان میں سے رہے :(واصبح فؤاد ام موسٰی فارغًا ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علٰی قلبھا لتکون من المؤمنین)۔

" فارغ " کے معنی ہیں خالی۔ اِس جگہ " ہر چیز سے خالی " سے مراد یہ ہے کہ " بجز یادِ فرزند ہر شئے سے خالی تھا۔"

ہر چند کہ بعض مفسرین نے یہ مراد لی ہے کہ مادرِ موسیٰ کا دل غم و اندوہ سے خالی تھا۔

یا ـــ اُس الہام اور خوش خبری سے خالی تھا جو اُسے پہلے دی گئی تھی لیکن اگر سیاقِ عبارت پر غور کیا جائے تو یہ مفاہیم درست نہیں معلوم ہوتے۔

یہ قطعی فطری امر ہے کہ :۔ ایک ماں جو اپنے بچے کو اس صورتِ حال سے اپنے پاس سے جُدا کرے وہ اپنی اولاد کے سوا ہر شے کو بھول جائے گی۔ اور اُس کے حواس ایسے باختہ ہو جائیں گے کہ اُن خطرات کا لحاظ کیے بغیر جو اُس کے اور اس کے بیٹے دونوں کے سر پر منڈلا رہے تھے فریاد کرے اور اپنے دل کا راز فاش کردے۔

لیکن ـــــ وہ خدا جس نے اِس ماں کے سپرد یہ اہم فریضہ کیا تھا ، اُسی نے اس کے دل کو ایسا حوصلہ بھی بخشا کہ وعدۂ الٰہی پر اُس کا ایمان ثابت رہے اور اُسے یہ یقین رہے کہ اُس کا بچہ خدا کے ہاتھ میں ہے آخر کار وہ پھر اُسی کے پاس آجائے گا اور پیغمبر بنے گا۔

" ربطنا " کا مادہ " ربط " ہے۔ اس کلمہ کے وضعی معنی ہیں " حیوانات کو کسی ایسی جگہ باندھنا جہاں وہ اطمینان سے اپنی جگہ محفوظ رہیں"۔ اِس قسم کی جگہ کو " رباط " کہتے ہیں۔ مجازاً حفظ و تقویت اور استحکام بخشنے کے معنی میں آتا ہے۔ اِس آیت میں جو

Marfat.com

"ربطنا علیٰ قلبها" کہا گیا ہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ ہم نے اُس کے دل کو قوی کر دیا تاکہ وہ خدا کی وحی پر ایمان لانے اور اس عظیم واقعے کا صدمہ برداشت کرے۔

٭ ٭ ٭

اس لُطفِ خداوندی کے طفیل ماں کے دل کا سکون لوٹ آیا مگر اُسے آرزو رہی کہ وہ اپنے فرزند کے حال سے باخبر رہے۔
اس لیے اُس نے موسیٰ کی بہن سے کہا کہ جا تو دیکھتی رہ کہ اُس پر کیا گزرتی ہے: (وقالت لاخته قصيه)۔
"قصيه" مادّہ "قص" سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی کیفیت کی جستجو۔ عرفِ عام میں جو لفظ "قصہ" ہے یہ نام اس وجہ سے ہوا کہ اُس میں بھی قسم قسم کے واقعات کی جستجو ہوتی ہے۔
موسیٰ کی بہن ماں کا حکم بجا لائی اور اتنے فاصلے سے جہاں سے سب کچھ نظر آتا تھا دیکھتی رہی۔ اُس نے دُور سے دیکھا کہ فرعون کے عُمّال اُس کے بھائی کے صندوق کو پانی میں سے نکال رہے ہیں اور موسیٰ کو صندوق میں سے نکال کر گود میں لے رہے ہیں۔
(فبصرت به عن جنب)۔
مگر وہ لوگ اس بہن کی اس کیفیت حال سے بے خبر تھے۔ (وهم لا يشعرون)۔
اس واقعے کے متعلق بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ فرعون کے مخصوص خدمت گار اس بچے کو لے کر محل سے باہر آئے تھے تاکہ اُس کے لیے کوئی دُودھ پلانے والی تلاش کریں۔ ٹھیک اُسی وقت موسیٰ کی بہن نے دُور سے اپنے بھائی کو دیکھ لیا تھا۔
مگر ــ پہلی توجیہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس توجیہ کی بنا پر جب موسیٰ کی ماں بچے کے صندوق کو دریائے نیل کے سپُرد کر کے گھر لوٹ آئی تو موسیٰ کی بہن دریا کے کنارے کھڑی دُور سے دیکھتی رہی کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے! اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عُمّالِ فرعون نے اُسے پانی میں سے نکال لیا ہے اور بچہ اُس عظیم خطرے سے جو اُسے درپیش تھا نجات پا گیا ہے۔
"هم لا يشعرون" کی اور بھی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ مرحوم علامہ طبرسی اس احتمال کو بعید نہیں سمجھتے کہ اس جگہ اور آیات ماقبل میں اس جملے کی جو تکرار فرعون کے متعلق ہوئی ہے۔ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب کہ وہ حالات سے اس حد تک لاعلم تھا تو پھر کس طرح خدائی کا دعویٰ کرتا تھا؟ وہ ارادۂ الٰہی اور اُس کی مشیت سے کس طرح نبرد آزما ہونا چاہتا تھا؟

٭ ٭ ٭

بہرحال ارادہ الٰہی یہ تھا کہ یہ طفل نوزاد جلد اپنی ماں کے پاس واپس جائے اور اُس کے دل کو قرار آئے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے:
"ہم نے تمام دُودھ پلانے والی عورتوں کو اُس پر حرام کر دیا تھا"۔ (وحرمنا عليه المراضع من قبل)[1]
یہ امرِ طبعی ہے کہ شیر خوار نوزاد چند گھنٹے گزرتے ہی بھوک سے رونے لگتا ہے اور بے تاب ہو جاتا ہے۔ اندریں حال لازم تھا کہ موسیٰ کو دُودھ پلانے کے لیے کسی عورت کی تلاش کی جاتی۔ خصوصاً جبکہ ملکۂ مصر اُس بچے سے نہایت دل بستگی رکھتی تھی اور اُسے اپنی جان کے برابر عزیز رکھتی تھی۔

---

[1] "مراضع" جمع ہے "مرضع" (بروزن مُخبِر) کی۔ اس کا معنی ہے "دُودھ پلانے والی عورت"۔ بعض کے نزدیک یہ "مرضع" (بروزن مکتب) کی جمع ہے بمعنی دُودھ پلانے کی جگہ یعنی پستانِ مادر۔ اس کلمے کے متعلق یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مصدر میمی ہے۔ بمعنی "رضاع" دودھ پلانا۔ مگر پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

Marfat.com

محل کے خدام حرکت میں آ گئے اور در بدر کسی دُودھ پلانے والی کو تلاش کرنے لگے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ کسی کا دُودھ پیتا ہی نہ تھا۔

ممکن ہے کہ وہ بچہ اُن عورتوں کی صُورت ہی سے ڈرتا ہو اور اُن کے دُودھ کا مزہ (جس سے وہ آشنا نہ تھا) اسے اس کا ذائقہ ناگوار اور تلخ محسوس ہوتا ہو۔ اُس بچے کا طور کچھ اس طرح کا تھا گویا کہ اُن (دُودھ پلانے والی) عورتوں کی گود سے اُچھل کے دُور جا گِرے دراصل یہ خدا کی طرف سے "تحریم تکوینی" تھی کہ اُس نے تمام عورتوں کو اُس پر حرام کر دیا تھا۔

بچہ لحظہ بہ لحظہ زیادہ بھوکا اور زیادہ بیتاب ہوتا جاتا تھا۔ بار بار رو رہا تھا اور اُس کی آواز سے فرعون کے محل میں شور ہو رہا تھا۔ اور ملکہ کا دل لرز رہا تھا۔

خدمت پر مامور لوگوں نے اپنی تلاش کو تیز تر کر دیا۔ ناگہاں قریب ہی اُنھیں ایک لڑکی مل جاتی ہے۔ وہ اُن سے یہ کہتی ہے: مَیں ایک ایسے خاندان کو جانتی ہوں جو اس بچے کی کفالت کر سکتا ہے۔ وہ لوگ اُس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔

کیا تم لوگ یہ پسند کروگے کہ مَیں تمہیں وہاں لے چلوں؟ (فقالت هل ادلّكم علیٰ اهل بيتٍ يكفلونه لكم وهم له ناصحون)۔

"مَیں بنی اسرائیل میں سے ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جس کی چھاتیوں میں دُودھ ہے اور اُس کا دل محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اُس کا ایک بچہ تھا وہ اُسے کھو چکی ہے۔ وہ ضرور اس بچے کو جو محل میں پیدا ہوا ہے، دُودھ پلانے پر آمادہ ہو جائے گی۔"

وہ تلاش کرنے والے خدام یہ سُن کر خوش ہو گئے اور موسیٰ کی ماں کو فرعون کے محل میں لے گئے۔ اُس بچے نے جُونہی اپنی ماں کی خوشبو سُونگھی اُس کا دُودھ پینے لگا۔ اور اپنی ماں کا رُوحانی رس چُوس کر اُس میں جان تازہ آگئی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کا نور چمکنے لگا۔ اُس وقت وہ خدام جو ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے تھے۔ بہت ہی زیادہ خوش و خرّم تھے۔ فرعون کی بیوی بھی اُس وقت اپنی خوشی کو نہ چھپا سکی۔ ممکن ہے اُس وقت لوگوں نے کہا ہو کہ تُو کہاں چلی گئی تھی۔ ہم تو تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے۔ تجھ پر اور تیرے شیر مشکل کُشا پر آفرین ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰؑ ماں کا دُودھ پینے لگے، فرعون کے وزیر ہامان نے کہا:۔ مجھے لگتا ہے کہ تُو ہی اِس کی ماں ہے۔ بچے نے اِن تمام عورتوں میں سے صرف تیرا ہی دُودھ کیوں قبول کر لیا؟

ماں نے کہا:۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ مَیں ایسی عورت ہوں جس کے دُودھ میں سے خوشبو آتی ہے۔ میرا دُودھ نہایت شیریں ہے۔ اب تک جو بچہ بھی مجھے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ فوراً ہی میرا دُودھ پینے لگتا ہے۔"

حاضرینِ دربار نے اِس قول کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور ہر ایک نے حضرت موسیٰؑ کی ماں کو گراں بہا ہدیے اور تحفے دیے[1]

ایک حدیث جو امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے اِس میں منقول ہے کہ:۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۴، صفحہ ۲۳۱۔

Marfat.com

"تین روز سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا کہ خدا نے بچے کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔"

بعض اہلِ دانش کا قول ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے لیئے یہ "تحریمِ تکوینی" (یعنی دوسری عورتوں کا حرام کردینا) اس سبب سے تھی کہ خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا فرستادہ پیغمبر ایسا دُودھ پیئے جو حرام سے آلودہ ہو اور ایسا مال کھا کے بنا ہو جو چوری، ناجائز ذرائع، رشوت اور حق الناس کو غصب کرکے حاصل کیا گیا ہو۔ خدا کی مشیت یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ اپنی صالحہ ماں کے پاک دُودھ سے غذا حاصل کریں۔ تاکہ وہ اہلِ دُنیا کے شر کے خلاف ڈٹ جائیں اور اہلِ شر و فساد سے نبرد آزمائی کرسکیں۔

❖ ❖ ❖

ہم نے اس طرح موسیٰ کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔ تاکہ اس کی آنکھیں روشن ہوجائیں اور اُس کے دل میں غم و اندوہ باقی نہ رہے اور وہ یہ جان لے کہ خدا کا وعدہ حق ہے۔ اگرچہ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے: (فرددناہ الی امہ کی تقر عینھا ولا تحزن ولتعلم ان وعداللہ حق ولکن اکثرھم لا یعلمون)[1]

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ :۔

کیا وابستگانِ فرعون نے موسیٰ کو کُلیتہً ماں کے سپرد کردیا تھا کہ وہ اُسے گھر لے جائے اور دُودھ پلایا کرے اور دورانِ رضاعت روزانہ یا کبھی کبھی بچے کو فرعون کے محل میں لایا کرے تاکہ ملکہ مصر اُسے دیکھ لیا کرے — یا — یہ کہ بچہ محل ہی میں رہتا تھا اور موسیٰ کی ماں معین اوقات میں آکر اُسے دُودھ پلا جاتی تھی ؟

مذکورہ بالا دونوں احتمالات کے لیے ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ لیکن احتمال اول زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ :۔

آیا — عرصۂ شیرخوارگی کے بعد حضرت موسیٰؑ فرعون کے محل میں چلے گئے یا اُن کا تعلق اپنی ماں اور خاندان کے ساتھ باقی رہا اور محل سے وہاں آتے جاتے رہے ؟

اِس مسئلے کے متعلق بعض صاحبان نے یہ کہا ہے کہ شیرخوارگی کے بعد آپ کی ماں نے اُنھیں فرعون اور اُس کی بیوی آسیہ کے سپرد کردیا تھا اور حضرت موسیٰؑ اُن دونوں کے پاس پرورش پاتے رہے۔

اِس ضمن میں راویوں نے فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کی طفلانہ (مگر بامعنیٰ) باتوں کا ذکر کیا ہے کہ اس مقام پر ہم ان کو بقدرِ طولِ کلام کے پیشِ نظر قلم انداز کرتے ہیں۔ لیکن فرعون کا یہ جُملہ جو اُس نے بعثتِ موسیٰؑ کے بعد کہا :

"الم نربك فينا وليدا ولبثت فينا من عمرك سنين" (شعراء-۱۸)

کیا ہم نے تجھے بچپن میں پرورش نہیں کیا اور کیا تو برسوں تک ہمارے درمیان نہیں رہا۔

یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے محل میں مدتوں رہے تھے۔

علی ابن ابراہیم کی تفسیر سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ تا زمانۂ بلوغ فرعون کے محل میں نہایت احترام کے ساتھ رہے۔ مگر اُن کی توحید آشکار باتیں فرعون کو سخت ناگوار ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ اُس نے اُنھیں قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ حضرت موسیٰؑ اس خطرے

[1] "تقر عینھا" کے لغوی مادہ کے متعلق اس کتاب کی پندرھویں جلد میں۔ سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۷۴ کے تحت ذکر ہوچکا ہے۔

Marfat.com

کو بھاگ گئے اور بھاگ کر شہر میں آگئے۔ یہاں وہ اِس واقعے سے دو چار ہوئے کہ دو آدمی لڑ رہے تھے جن میں سے ایک قبطی اور ایک سبطی تھا (اِس واقعے کی تفصیل آئندہ آتی ہے)۔[1]

۱۴۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ○

۱۵۔ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ○

۱۶۔ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

۱۷۔ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ○

ترجمہ

۱۴۔ اور جب وہ (موسٰی) بھرپور جوان اور طاقتور ہوگیا تو ہم نے اسے حکمت اور دانش عطا کی اور ہم نیکوکاروں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔

۱۵۔ اور وہ ایسے وقت جب اہلِ شہر غافل تھے شہر میں داخل ہوا تو ناگہاں اس نے دو آدمیوں کو دیکھا جو باہم لڑ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک اُس کے پیروکاروں میں سے تھا اور دوسرا اُس کے دشمنوں میں سے تھا اُن میں سے ایک نے جو اُس کا طرفدار تھا، دشمن کے مقابلے میں اس سے امداد طلب کی۔ موسٰی نے اُس کے سینے پر ایک مُکا مارا اور اُس کا کام تمام کر دیا (اور وہ زمین پر گرا اور مر گیا) موسٰی نے کہا کہ یہ ایک عمل شیطانی تھا۔ بیشک وہ دشمن اور صریح بہکانے والا ہے۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم طبق نور الثقلین، جلد ۴، صفحہ ۱۱۷۔

Marfat.com

۱۶۔ اُس نے کہا : اے میرے پروردگار ! میں نے اپنے اُوپر ظلم کیا تو مجھے بخش دے۔ پس خدا نے اُسے بخش دیا کہ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

۱۷۔ اُس نے عرض کی: اے پروردگار ! مَیں اُس نعمت کے شکرانے میں، جو تو نے مجھے عطا کی ہے، میں کبھی مجرموں کی مدد نہ کروں گا۔

تفسیر

مُوسیٰؑ مظلوموں کے مددگار کے طور پر :

اَب ہم حضرت موسیٰؑ کی بھرپور زندگی کے تیسرے دَور سے دوچار ہوتے ہیں ۔

اس دَور میں اُن کے وہ واقعات ہیں جو اُنھیں بدورانِ بلُوغ اور مصر سے مدین کو سفر کرنے سے پہلے پیش آئے اور یہ وہ اسباب ہیں جو ان کی ہجرت کا باعث ہوئے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ اِس سلسلے میں پہلی بات تو یہ فرماتا ہے : موسیٰ جب طاقتور اور کامل ہو گئے تو ہم نے انھیں حکمت اُ علم عطا کیا اور ہم نیکوکاروں کو اِس طرح جزا دیتے ہیں : (ولمّا بلغ اشدّہ واستوٰی اٰتیناہ حکمًا و علمًا وکذٰلک نجزی المحسنین) ۔

" اَشدّ " کا مادہ " شدّت " ہے ، بمعنی طاقتور ہونا ۔ " استوٰی " کا مادہ "استواء" ہے بمعنی کمالِ خلقت اور اس کا اعتدال ۔

ان دونوں الفاظ کے مفہوم میں کیا فرق ہے ؛ اس پر مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ " بلوغ اشدّ " وہ ہے کہ انسان قوائے جسمانی کے لحاظ سے سرحدِ کمال کو پہنچ جائے۔ غالباً اٹھارہ سال کی عمر میں ایسا ہوتا ہے۔

اور " استواء" زندگی میں استقرار اور اعتدال کو کہتے ہیں۔ یہ کیفیت جسمانی طاقت کے کمال کے بعد پیدا ہوتی ہے ۔

بعض دیگر مفسّرین " بلوغ اشد " کے معنی " کمال جسمانی " اور " استواء" کے معنیٰ " کمال عقلی وفکری" سمجھتے ہیں ۔

کتاب معانی الاخبار میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے کہ " اشد " اٹھارہ سال کی عمر ہے اور " استواء" عمر کا وہ حصہ ہے جب داڑھی مونچھ نمودار ہو جائے۔

ان تعبیراتِ بالا میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے اور ان دونوں کلمات کے لغوی معنیٰ پر توجہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے معنیٰ جسمانی ، فکری اور رُوحانی طاقتیں ہیں ۔

" حکم " اور علم " میں ممکن ہے کہ یہ فرق ہو کہ " حکم " سے مراد عقل و فہم اور صحیح فیصلہ کرنے کی استعداد ہے اور علم کے معنی ایسی آگاہی اور دانش ہے جس میں جہل کا شائبہ نہ ہو۔

Marfat.com

"کذٰلک نجزی المحسنین" کے الفاظ اس امر کے شاہد ہیں کہ حضرت موسیٰؑ میں اپنے تقویٰ اور طہارت قلب اور پاکیزہ اعمال کے سبب یہ استحقاق پیدا ہوگیا تھا کہ خدا انھیں بطور جزا علم و حکمت عطا فرمائے اور بدیہی ہے کہ اس علم و حکمت سے مراد وحی اور نبوت نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے بعد حضرت موسیٰؑ پر وحی نازل ہوئی اور نبوت ملی۔

بلکہ اس مقام پر علم و حکمت سے مراد وہی آگاہی، روشن بینی، صحیح قوتِ فیصلہ اور اسی قسم کے اوصاف ہیں جو خدا نے موسیٰؑ کو اُن کی پاک دامنی، نیکی اور صالح زندگی کے صلہ میں عطا کیے تھے۔ اس صورتِ حال سے اجمالاً یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ اگرچہ موسیٰؑ فرعون کے محل میں رہے مگر اُس ماحول کی فضا سے قطعی متاثر نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ اُن سے جتنا بھی ہوسکتا تھا وہ احیاء حق و عدالت میں سعی کرتے رہے۔ ہر چند کہ آپ کی مصروفیات کا حال تشریحاً ہمیں معلوم نہیں ہے۔

۞ ۞ ۞

بہرحال حضرت موسیٰؑ شہر میں اُس وقت داخل ہوئے جب تمام اہلِ شہر غافل تھے: (ودخل المدینة علیٰ حین غفلة من اهلها)۔

یہ واضح نہیں ہے کہ یہ کونسا شہر تھا۔ لیکن احتمال قوی یہ ہے کہ یہ مصر کا پایۂ تخت تھا۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اُس مخالفت کی وجہ سے جو اُن میں فرعون اور اُس کے وزراء میں ٹھنی اور بڑھتی جارہی تھی، مصر کے پایۂ تخت سے نکال دیا گیا تھا۔ مگر جب لوگ غفلت میں تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو موقع مل گیا اور وہ شہر میں آگئے۔

اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے محل سے نکل کر شہر میں آئے ہوں کیونکہ عام طور پر فرعونوں کے محلات شہر کے ایک کنارے پر ایسی جگہ بنائے جاتے تھے جہاں سے وہ شہر کی طرف آمدورفت کے راستوں کی نگرانی کرسکیں۔

"علیٰ حین غفلة من اهلها" سے مراد ایسا وقت ہے کہ شہر کے لوگ اپنے مشاغل معمول سے فارغ ہوچکے تھے اور کوئی بھی شہر کی حالت کی طرف متوجہ نہ تھا۔ مگر یہ کہ وہ وقت کونسا تھا؟ بعض کا خیال ہے کہ "ابتدائے شب" تھی، جب کہ لوگ اپنے کاروبار سے فارغ ہوجاتے ہیں، ایسے میں کچھ تو اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔ کچھ تفریح اور رات کو بیٹھ کے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت کو بعض اسلامی روایات میں "ساعتِ غفلت" کہا گیا ہے۔ چنانچہ جناب رسالت مآبؐ سے ایک حدیث منقول ہے[۱]

"تنفلوا فی ساعة الغفلة ولو برکعتین خفیفتین"

ساعتِ غفلت میں نماز نافلہ پڑھو خواہ وہ دو رکعت مختصر ہی کیوں نہ ہو۔

اِس حدیث میں جو "ساعتِ غفلت" کا کلمہ آیا ہے اُس کی یہ تعبیر کی گئی ہے:-

"ساعة الغفلة مابین المغرب والعشاء"

ساعت غفلت مغرب اور عشا کے درمیان کا وقت ہے[۱]

حقیقت میں وہ وقت غفلت کا ہوتا ہے۔ بہت سے گناہوں، بدچلنیوں اور اخلاقی انحرافات کا اسی وقت یعنی آغازِ شب ہی میں ارتکاب کیا جاتا ہے۔

---

[۱] وسائل الشیعہ، جلد پنجم ص۲۴۹ (باب ۲۰ از ابواب بقیۃ الصلوٰۃ المندوبہ)۔

Marfat.com

اُس وقت لوگ نہ تو اپنے کسب و کار میں مشغول ہوتے ہیں نہ بستر خواب و استراحت میں ہوتے ہیں بلکہ شہروں پر معمولاً ایک عام غفلت کی حالت چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور بداخلاقی کے مرکزوں میں اُسی وقت رونق ہوتی ہے۔

بعض اہلِ دانش کا خیال ہے کہ "ساعتِ غفلت" سے مراد وقت دوپہر ہے جبکہ نصف روز کام کرنے کے بعد چھٹی ہوتی ہے اور لوگ آرام کرتے ہیں۔ مگر اس موضوع میں پہلی رائے زیادہ درست اور پُرمعنیٰ معلوم ہوتی ہے۔

بہرکیف حضرت موسیٰؑ شہر میں آئے اور وہاں ایک ماجرے سے دوچار ہوئے دیکھا کہ دو آدمی آپس میں جھگڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ اُن میں سے ایک حضرت موسیٰؑ کا طرفدار اور اُن کا پیرو تھا اور دوسرا اُن کا دشمن تھا: (فوجد فیھا رجلین یقتتلان ھٰذا من شیعتہ وھٰذا من عدوہ)۔

کلمہ "شیعتہ" اس امر کا غماز ہے کہ جناب موسیٰؑ اور بنی اسرائیل میں اُسی زمانے سے مراسم ہوگئے تھے اور کچھ لوگ اُن کے پیرو بھی تھے۔ احتمال یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے مقلدین اور شیعوں کے گروہ کو فرعون کی جابرانہ حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے بطور ایک مرکزی طاقت کے تیار کر رہے تھے۔

جس وقت بنی اسرائیل کے اُس آدمی نے موسیٰؑ کو دیکھا تو اُن سے اپنے دشمن کے مقابلے میں امداد چاہی: (فاستغاثہ الذی من شیعتہ علی الذی من عدوہ)۔

حضرت موسیٰؑ اُس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوگئے تاکہ اُسے اس ظالم دشمن کے ہاتھ سے نجات دلائیں۔ بعض علما کا خیال ہے کہ وہ قبطی فرعون کا ایک باورچی تھا اور چاہتا تھا کہ اس بنی اسرائیل کو بیگار میں پکڑ کے اُس سے لکڑیاں اُٹھوائے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس فرعونی کے سینے پر ایک مُکا مارا وہ ایک ہی مکے میں مرگیا اور زمین پر گر پڑا: (فوکزہ موسیٰ فقضی علیہ)[1]

اِس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا اس فرعونی کو جان سے مار دینے کا ارادہ نہ تھا۔ آیات مابعد سے بھی یہ مطلب خوب واضح ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لیے نہ تھا کہ وہ لوگ مستحق قتل نہ تھے بلکہ اُنھیں اُن نتائج کا خیال تھا جو خود حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو پیش آسکتے تھے۔

لہٰذا حضرت موسیٰؑ نے فوراً کہا کہ یہ کام شیطان نے کرایا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا دشمن اور واضح گمراہ کرنے والا ہے: (قال ھٰذا من عمل الشیطان انہ عدو مضل مبین)۔

اِس واقعے کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ چاہتے تھے کہ بنی اسرائیلی کا گریبان اُس فرعونی کے ہاتھ سے چھڑا دیں۔ ہرچند کہ وابستگانِ فرعون اس سے زیادہ سخت سلوک کے مستحق تھے لیکن اُن حالات میں ایسا کام کر بیٹھنا قرینِ مصلحت نہ تھا اور جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے کہ حضرت موسیٰؑ اسی عمل کے نتیجے میں پھر مصر میں نہ ٹھہر سکے اور مدین چلے گئے

٭ ٭ ٭

پھر قرآن میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا: پروردگار: میں نے اپنے اُوپر ظلم کیا۔ تُو مجھے معاف کردے، اور خدا نے اُسے بخش دیا۔ کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے: (قال رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی فغفرلہ انہ ھو الغفور الرحیم)۔

---

[1] "وکز" کے معنی مُکا مارنے کے ہیں۔ اِس کلمے کے کچھ اور معنی بھی بتائے گئے ہیں جو درست نہیں معلوم ہوتے۔

Marfat.com

یقیناً حضرت موسیٰؑ اس معاملے میں کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ بلکہ حقیقت میں اُن سے ترکِ اُولیٰ سرزد ہوا۔ کیونکہ انہیں ایسی بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیئے تھی جس کے نتیجے میں وہ زحمت و تکلیف میں مبتلا ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے اسی ترکِ اُولیٰ کے لیے خدا سے طلب عفو کیا اور خدا نے بھی اُنھیں اپنے لطف و عنایت سے بہرہ مند کیا۔

* * *

حضرت موسیٰؑ نے کہا: خداوندا تیرے اس احسان کے شکرانے میں کہ تو نے میرے قصور کو معاف کر دیا اور دشمنوں کے پنجے میں گرفتار نہ کیا اور اُن تمام نعمتوں کے شکریے میں جو مجھے ابتدائے اب تک مرحمت کرتا رہا ہے، مَیں عہد کرتا ہوں کہ ہرگز مجرموں کی مدد نہ کروں گا اور ظالموں کا طرفدار نہ ہوں گا: (قال ربّ بما انعمت علیّ فلن اکون ظهیراً للمجرمین)۔ بلکہ ہمیشہ مظلومین اور ستم دیدہ لوگوں کا مددگار رہوں گا۔

اس جملے سے حضرت موسیٰؑ کا مقصود یہ تھا کہ: مَیں آئندہ ہرگز مجرم اور گنہگار وابستگانِ فرعون کا شریک کار نہ ہوں گا۔ بلکہ مَیں بنی اسرائیل کے ستم دیدہ لوگوں کا ہمدرد رہوں گا۔

بعض لوگوں نے آیت میں کلمہ "مجرمین" سے وہ اسرائیلی شخص مراد لیا ہے جو قبطی سے لڑ رہا تھا۔ یہ قیاس حقیقت سے بعید ہے۔

* * *

چند اہم نکات

۱۔ **حضرت موسیٰؑ کا یہ کام اور مقامِ عصمت**: مفسّرین نے، اُس قبطی اور بنی اسرائیل کی باہمی نزاع اور حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے مرد قبطی کے مارے جانے کے بارے میں بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔

درحقیقت یہ معاملہ کوئی اہم اور بحث طلب تھا ہی نہیں کیونکہ ستم پسند وابستگانِ فرعون نہایت بے رحم اور مُفسد تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچوں کے سر قلم کیے اور بنی اسرائیل پر کسی قسم کا ظلم کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس جہت سے یہ لوگ اس قابل نہ تھے کہ بنی اسرائیل کے لیے اُن کا قتل احترامِ انسانیت کے خلاف ہو۔

البتہ مفسّرین کے لیے جس چیز نے دشواریاں پیدا کی ہیں وہ اس واقعے کی وہ مختلف تعبیرات ہیں جو خود حضرت موسیٰؑ نے کی ہیں۔

چنانچہ وہ ایک جگہ تو یہ کہتے ہیں:

هٰذا من عمل الشّیطان

یہ شیطانی عمل ہے۔

اور دوسری جگہ یہ فرمایا:

ربّ انّی ظلمت نفسی فاغفرلی

خدایا میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تو مجھے معاف فرما دے۔

جنابِ موسیٰؑ کی یہ دونوں تعبیرات اس مسلّمہ حقیقت سے کیونکر مطابقت رکھتی ہیں کہ:-

Marfat.com

"عصمتِ انبیا کا مفہوم یہ ہے کہ انبیا ماقبل بعثت اور مابعد عطائے رسالت ہر دو حالات میں معصوم ہوتے ہیں۔"

لیکن — حضرت موسیٰؑ کے اس عمل کی جو توضیح ہم نے آیات فوق کی روشنی میں پیش کی ہے، اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ترکِ اُولیٰ سے زیادہ نہ تھا۔ اُنھوں نے اِس عمل سے اپنے آپ کو زحمت میں مبتلا کر لیا کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے ایک قبطی کا قتل ایسی بات نہ تھی کہ وابستگانِ فرعون اُسے آسانی سے برداشت کر لیتے۔

نیز، ہم جانتے ہیں کہ "ترکِ اُولیٰ" کے معنیٰ ایسا کام ہے جو بذاتِ خود حرام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ "عملِ احسن" ترک ہوگیا۔ بغیر اِس کے کہ کوئی عمل خلافِ حکمِ الٰہی سرزد ہوا ہو۔

اِس قسم کے واقعات کا دوسرے انبیاؑ کے احوالِ حیات میں بھی نشان ملتا ہے۔ اُن میں سے ایک حضرتِ آدمؑ بھی ہیں۔ جن کے متعلق سُورۂ اعراف آیت نمبر ١٩ کے تحت (جلد ٦ تفسیرِ ھذا میں) مفصلاً ذکر ہوا ہے۔

اِن آیات کی تفسیر میں "عیون الاخبار" میں جناب امام علی رضا علیہ السلام سے ایک تفسیر مروی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"ھٰذا من عمل الشیطان" سے مراد " اُن دونوں آدمیوں کی ایک دوسرے سے لڑائی ہے۔ (جو عملِ شیطانی شمار ہوتا ہے) نہ کہ عملِ مُوسیٰ اور اِس جملہ " رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی " سے مُراد یہ ہے کہ موسیٰ کہہ رہے ہیں کہ — خدایا جس مقام پر مجھے آنا نہیں چاہیئے تھا میں وہاں پہنچ گیا۔ مجھے اس شہر میں ہرگز داخل نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اور" فاغفرلی" سے مراد یہ ہے کہ :- " مجھے دشمنوں سے چھپا " تاکہ وہ مجھ پر غالب نہ آجائیں (کیونکہ کلمہ " غفران " چھپانے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے)۔[1]

٢۔ مُجرموں کی مدد کرنا بہت بڑا گناہ ہے :- اسلامی فقہ میں ارتکاب گناہ میں کسی کی اعانت کرنے اور ظالمین کی مدد کرنے کے بارے میں ایک مفصل باب ہے، جس میں احادیثِ کثیرہ کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ بدترین گناہوں میں سے ایک گناہ ظالموں، ستمگاروں اور مجرموں کی اعانت کرنا بھی ہے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اُس کا یہ عمل اس امر کا باعث بنتا ہے کہ اُس کا (مددگار کا) حشر اور عاقبت بھی اُن ہی ستمگاروں کے ساتھ ہوگی۔

یہ امر مسلّم ہے کہ ہر معاشرے میں ظالم، ستمگار اور فرعون جیسے کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ اگر اس معاشرے کے عوام اُن لوگوں کے کاموں کی تائید نہ کریں (یعنی خاموش نہ رہیں اور اظہارِ ناپسندیدگی کریں) تو پھر کوئی بھی فرعون نہ بن سکے۔

اِن ظالم فرعونوں کے مُوئیدین عام طور پر کمینے، مفلوک الحال یا ابن الوقت دنیا پرست لوگ ہوتے ہیں، جو اُن کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اُن کے دست و بازو یا کم از کم اُن کے لشکر اور جمعیت میں اضافے کا سبب بن جاتے ہیں تاکہ اُن ستم شعاروں کے لیے شیطانی قوت فراہم کریں۔

قرآن مجید میں اخلاق کے اِس بنیادی اصول کے متعلق بہ تکرار ھدایات موجود ہیں۔ چنانچہ سُورۂ مائدہ کی دوسری آیت میں مذکور ہے:

"و تعاونوا علی البرّ والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"

ایک دوسرے سے نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو مگر گناہ اور تعدی کے کاموں میں مدد نہ کرو۔

---

[1] عیون الاخبار، طبق نقل تفسیر نور الثقلین ج ۴ صفحہ ١١٩۔

Marfat.com

قرآن میں بصراحت مذکور ہے کہ ظالموں کے ساتھ " رکون " عذاب جہنم کا سبب ہے۔
" رکون " کے معنیٰ خواہ قلبی میلان ہوں یا کسی کے ساتھ اُس کے کام میں ظاہری شرکت، یا کسی کے فعل پر اظہار رضایت، دوستی وخیر خواہی یا اطاعت، مفسرین نے ان میں سے ہر معنی کی تفسیر کی ہے۔
اِس کلمہ کا ایک اور مفہوم بھی ہے جو ان معانی کا جامع ہے اور وہ بھروسہ، اعتماد اور وابستگی ہے۔ یہ مفہوم ہمارے مقصود کا زندہ گواہ ہے۔

امام زین العابدین علی ابن الحسین ؑ سے ایک حدیث منقول ہے :-
محمد بن مسلم زہری ایک عالم شخص تھا۔ وہ بنی اُمیہ کی حکومت بالخصوص ہشام بن عبدالملک کے ساتھ تعاون کیا کرتا تھا۔ امام علیہ السلام نے جب اُس کو ظالمین کی اعانت کرنے سے پرہیز کرنے کی ھدایت فرمائی تو اُسے متنبہ کرنے کے لیے یہ الفاظ فرماتے :

اولیس بدعائهم ایاك حین دعوك جعلوك قطباً ادار و ربك رحی مظالمهم، وجسراً یعبرون علیك الی بلا یاهم وسلماً الی ضلالتهم داعیاً الی غیهم، سالکاً سبیلهم، یدخلون بك الشك علی العلماء ویقتادون بك قلوب الجهال الیهم!...
فما اقل ما اعطوك فی قدر ما اخذوا منك! وما الیسر ما عمروا لك فی جنب ما خربوا علیك! فانظر لنفسك فانه لا ینظر لها غیرك وحاسبها حساب رجل مسئول!

کیا اُنھوں نے (بنی اُمیہ نے) تجھے اپنے گرد مجتمع ہونے کی دعوت نہیں دی؟ اور کیا تجھے اُنھوں نے وہ محور نہیں بنایا جس کے گرد اُن کے ظلم کی چکّی گھومتی ہے۔ اور کیا اُنھوں نے تجھے وہ پُل قرار نہیں دیا جس پر سے عبور کر کے وہ اپنی بلاؤں کی طرف جاتے ہیں۔
اور کیا اُنھوں نے تجھے اپنی ضلالت کے لیے سیڑھی نہیں بنایا۔ اور کیا اُنھوں نے تجھے اپنی جہالت اور گمراہی کی طرف داعی اور اپنی شرمناک راہ کا راہرو قرار نہیں دیا؟ وہ تیرے ذریعے سے علماء کو شک میں مبتلا کرتے ہیں اور جہلاء کے قلوب کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں۔ وہ جو کچھ تجھ سے لیتے ہیں اُس کے عوض تجھے کس قدر قلیل معاوضہ دیتے ہیں اور تیرے ذریعے وہ جتنا برباد کرتے ہیں اُس کے مقابلے میں کتنا کم آباد کرتے ہیں۔
بس تو اپنے نفس پر غور کر کیونکہ خود تجھ سے زیادہ، تیرا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔
اور ایک شخص مسئول کی طرح تو خود اپنے نفس کا حساب لے۔ [1]
حقیقت یہ ہے کہ امامؑ کی یہ معنیٰ آشکار اور دلنشین منطق ہر اُس عالم کو جو دربار رس اور وابستہ حکومت ہو اُس کے بارے میں ہے اور واضح کرتی ہے کہ اس کے نتائج کس قدر بُرے اور نحس ہوتے ہیں۔

[1] تحف العقول، صفحہ ٦٦

Marfat.com

ابن عباس کہتے ہیں : کہ یہ آیت " ربّ بما انعمت علیّ فلن اکون ظھیرا للمجرمین "
من جملہ ان آیات کے ہے جو یہ گواہی دیتی ہیں کہ مجرمین کی مدد کرنا جُرم وگناہ ہے اور مومنین کی اعانت کرنا فرمانِ الٰہی کی اطاعت ہے
کہتے ہیں کہ لوگوں نے کسی عالم سے کہا کہ :۔

" فلاں آدمی فلاں ظالم کا مُحرّر ہوگیا ہے اور صرف اُس کی آمدنی اور خرچ کا حساب لکھتا ہے ۔ اگر وہ اس کام کے معاوضے میں کچھ معاوضہ لے تو اُس کی گزر بسر ہو جاتی ہے گی ورنہ وہ خود اور اُس کے عیال فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائیں گے "

اُس عالم نے اس سوال کے جواب میں صرف ایک جملہ کہا :

کیا تم نے اُس مرد صالح (حضرت موسیٰؑ) کا قول نہیں سُنا ؟

ربّ بما انعمت علیّ فلن اکون ظھیرا للمجرمین

خداوندا! اِن نعمتوں کے شکرانے میں جو تُو نے مجھے بخشی ہیں، مَیں ہرگز مجرمین کی اعانت نہیں کروں گا [1]

٭ ٭ ٭

---

[1] ظالموں کی اعانت کے بارے میں ہم پہلے ہی دو تفصیلی احادیث ذکر کر چکے ہیں ۔ دیکھیے تفسیر نمونہ ج ۴ ، سورۂ مائدہ کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں اور ج ۹ سورہ ہُود کی آیت ۱۱۳ کی تفسیر کے ذیل میں ۔

Marfat.com

۱۸۔ فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ
یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ○

۱۹۔ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤی
اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖۗ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ
تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ
الْمُصْلِحِیْنَ ○

۲۰۔ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی ۫ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنَّ الْمَلَاَ
یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ○

۲۱۔ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○

۲۲۔ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیْۤ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ○

ترجمہ

۱۸۔ موسیٰ نے شہر میں بحالتِ خوف صبح کی جبکہ ہر لحظہ وہ کسی حادثے (اور کسی خبر) کے انتظار میں تھا۔ ناگہاں
اس نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے کل اس سے مدد مانگی تھی، آج پھر اسے پکار رہا ہے اور اس سے نصرت
طلب کر رہا ہے۔ موسیٰ نے اُس سے کہا کہ تو آشکارا طور پر گمراہ ہے۔

۱۹۔ پس جب اُس (موسیٰ) نے ارادہ کیا کہ اُس شخص کو جو اُن دونوں کا دشمن تھا پکڑے تو اُس نے کہا:
اے موسیٰ! کیا تو آج مجھے بھی اسی طرح قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا تھا۔
کیا تُو چاہتا ہے کہ تو زمین میں ظالم بن کر رہے اور کیا تو مصلحین میں سے نہیں ہونا چاہتا؟

۲۰۔ (اُس وقت) ایک شخص شہر کے دُور کے حصہ سے (فرعونیوں کے مرکز سے) تیزی سے آیا اور کہا کہ سردار تیرے
بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں۔ پس تو فوراً شہر سے نکل جا کہ مَیں تیرا خیر خواہ ہوں۔

۲۱۔ وہ شہر سے ڈرتے ہوئے نکلا اور ہر لحظہ کسی حادثے کا کھٹکا تھا۔

Marfat.com

(اُس نے خدا سے دُعا کی) اور کہا : اے میرے رب ! تُو مجھے ان ظالم لوگوں سے نجات دے۔
۲۲۔ اور جب اُس نے مدین کی طرف رُخ کیا تو کہا : مجھے اُمید ہے کہ میرا رب مجھے راہِ راست کی ہدایت کریگا۔

تفسیر

مُوسیٰؑ کی مخفیانہ مدین کی طرف روانگی :

ان آیات میں اس پُرحوادث سرگزشت کا چوتھا حصہ بیان کیا گیا ہے۔ فرعونیوں میں سے ایک آدمی کے قتل کی خبر شہر میں بڑی تیزی سے پھیل گئی۔ قرائن سے شاید لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ اُس کا قاتل ایک بنی اسرائیل ہے اور شاید اس سلسلے میں لوگ موسیٰؑ کا نام بھی لیتے تھے۔

البتہ یہ قتل کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اسے انقلاب کی ایک چنگاری یا اُس کا مقدمہ شمار کیا جاتا تھا۔ اور حکومت کی مشینری اسے ایک معمولی واقعہ سمجھ کر اُسے چھوڑنے والی نہ تھی کہ بنی اسرائیل کے غلام اپنے آقاؤں کی جان لینے کا ارادہ کرنے لگیں۔

لہٰذا ہم زیرِ بحث پہلی ہی آیت میں یہ پڑھتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد موسیٰؑ شہر میں ڈر رہے تھے اور ہر لحظہ اُنہیں کسی حادثے کا کھٹکا تھا اور وہ نئی خبروں کی جستجو میں تھے : (فاصبح فی المدینۃ خائفا یترقب)[1]

ناگہاں انہیں ایک معاملہ پیش آیا۔ آپ نے دیکھا کہ وہی بنی اسرائیلی جس نے گزشتہ روز اُن سے مدد طلب کی تھی اُنھیں پھر پکار رہا تھا اور مدد طلب کر رہا تھا (وہ ایک اور قبطی سے لڑ رہا تھا) : (فاذا الذی استنصرہ بالامس یستصرخہ)[2]

لیکن حضرت موسیٰؑ نے اُس سے کہا کہ تو آشکارا طور پر ایک جاہل اور گمراہ شخص ہے : (قال لہ موسیٰ انک لغوی مبین)

تو ہر روز کسی نہ کسی سے جھگڑ پڑتا ہے اور اپنے لیے مصیبت پیدا کر لیتا ہے اور ایسے کام شروع کر دیتا ہے، جن کا ابھی موقع ہی نہیں ہے۔ کل جو کچھ گزری ہے میں تو ابھی اُس کے عواقب کا انتظار کر رہا ہوں۔ اور تُو نے وہی کام ازسرِنو شروع کر دیا ہے۔

٭ ٭ ٭

بہرحال وہ ایک مظلوم تھا جو ایک ظالم کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ (خواہ ابتداءً اُس سے کچھ قصور ہوا ہو یا نہ ہوا ہو) اس لیے حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ اُس کی مدد کریں اور اُسے اُس قبطی کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیں۔ لیکن جیسے ہی حضرت موسیٰؑ نے یہ ارادہ کیا کہ اُس قبطی آدمی کو (جو اُن دونوں کا دشمن تھا) پکڑ کر اُس بنی اسرائیلی سے جُدا کریں، وہ قبطی چلایا، اُس نے کہا : اے موسیٰ! کیا تو مجھے بھی اُسی طرح قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا تھا : (فلما ان اراد ان یبطش

---

[1] "یترقب" کا مادہ "ترقب" ہے۔ اس کا معنی ہے "انتظار کرنا"۔ اس مقام پر موسیٰؑ اُس حادثے کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ شہر میں کیا خبر ہے۔ یہ جملہ بلحاظ اعراب ایک خبر کے بعد خبر ہے اگرچہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حال کے بعد حال ہے مگر یہ احتمال بہت بعید ہے۔

[2] "یستصرخ" کا مادہ "استصراخ" ہے جس کے معنی ہیں مدد کے لیے پکارنا۔ حقیقت میں اس کے معنی شور مچانے کے ہیں اور شور مچانا مدد مانگنے کے لیے لازم ہے۔

Marfat.com

بالذی ھو عدوٌ لھما قال یا موسیٰ اترید ان تقتلنی کما قتلت نفسًا بالامس)۔

تیری حرکات سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تُو زمین پر ایک ظالم بن کر رہے گا اور یہ نہیں چاہتا کہ مصلحین میں سے ہو :

(ان ترید الا ان تکون جبارًا فی الارض وما ترید ان تکون من المصلحین)[1]

اِس جُملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے محل اور اُس کے باہر ہر دو جگہ اپنے مصلحانہ خیالات کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِس موضوع پر اُن کے فرعون سے اختلافات بھی پیدا ہوگئے تھے۔ اسی لیے تو اُس قبطی آدمی نے یہ کہا :

یہ کیسی اصلاح طلبی ہے کہ تو ہر روز ایک آدمی کو قتل کرتا ہے ؟

حالانکہ اگر حضرت موسیٰؑ کا یہ ارادہ ہوتا کہ اُس ظالم کو بھی قتل کردیں تو یہ بھی راہِ اصلاح میں ایک قدم ہوتا۔

بہر کیف حضرت موسیٰؑ کو یہ احساس ہوا کہ گزشتہ روز کا واقعہ طشت از بام ہوگیا ہے۔ اور اِس خوف سے کہ اور زیادہ مشکلات پیدا نہ ہوں، اُنھوں نے اِس معاملے میں دخل نہ دیا۔

٭ ٭ ٭

اس واقعے کی فرعون اور اُس کے اہلِ دربار کو اطلاع پہنچ گئی۔ اُنھوں نے حضرت موسیٰؑ سے اِس عمل کے مکرر سرزد ہونے کو اپنی شانِ سلطنت کے لیے ایک تہدید سمجھا ــ وہ باہم مشورے کے لیے جمع ہوئے اور حضرت موسیٰؑ کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

اُس وقت ایک غیر متوقع واقعے نے حضرت موسیٰؑ کو موت سے نجات بخشی۔ ہوا یُوں کہ ایک آدمی شہر کے دُور دراز حصّے سے (جہاں فرعون اور اُس کے اہلِ خانہ رہتے تھے) تیزی کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا اور اُنھیں مطلع کیا کہ آپ کو قتل کرنے کا مشورہ ہو رہا ہے، آپ فوراً شہر سے نکل جائیں، میں آپ کا خیر خواہ ہوں: (وجآء رجلٌ من اقصا المدینۃ یسعٰی قال یا موسیٰ ان الملاَ یأتمرون بك لیقتلوك فاخرج انی لك من الناصحین)۔

یہ آدمی بظاہر وہی تھا جو بعد میں "مومن آلِ فرعون" کے نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کا نام حزقیل تھا۔ وہ فرعون کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھا اور اُن لوگوں سے اُس کے ایسے قریبی روابط تھے کہ ایسے مشوروں میں شریک ہوتا تھا۔

اُسے فرعون کے جرائم اور اُس کی کرتوتوں سے بڑا دُکھ ہوتا تھا اور اِس انتظار میں تھا کہ کوئی شخص اُس کے خلاف بغاوت کرے اور وہ اس کارِ خیر میں شریک ہو جائے۔

بظاہر وہ حضرت موسیٰؑ سے یہ آس لگائے ہوئے تھا اور اُن کی پیشانی میں من جانب اللہ ایک انقلابی ہستی کی علامات دیکھ رہا تھا اسی وجہ سے جیسے ہی اُسے یہ احساس ہوا کہ حضرت موسیٰؑ خطرے میں ہیں، نہایت سُرعت سے اُن کے پاس پہنچا اور اُنھیں خطرے سے بچا لیا۔

ہم بعد میں دیکھیں گے کہ وہ شخص صرف اسی واقعے میں نہیں، بلکہ دیگر خطرناک مواقع پر بھی حضرت موسیٰؑ کے لیے با اعتماد ہمدرد ثابت ہوا۔ فرعون کے محل میں وہ بنی اسرائیل کے لیے گویا ایک دیدۂ تیز بین تھا۔

---

[1] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اس اسرائیلی شخص کا جُملہ ہے کہ جس نے گمان کیا تھا موسیٰؑ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں تاہم آیت میں ایسے اشارے موجود ہیں جو اس مفہوم کی نفی کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اس خبر کو قطعی درست سمجھا اور اس ایماندار آدمی کی خیر خواہی کو بہ نگاہ قدر دیکھا اور اُس کی نصیحت کے مطابق شہر سے نکل گئے۔ اس وقت آپ خوف زدہ تھے اور ہر گھڑی انہیں کسی حادثے کا کھٹکا تھا: (فخرج منها خآئفا یترقب)۔

حضرت موسیٰؑ نے نہایت خضُوع قلب کے ساتھ متوجہ الی اللہ ہو کر اِس بلا کو ٹالنے کے لیے اُس کے لُطف وکرم کی درخواست کی اے میرے پروردگار! تو مجھے اس ظالم قوم سے رہائی بخش: (قال ربّ نجّنی من القوم الظالمین)۔

میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور بے رحم ہیں۔ میں تو مظلوموں کی مدافعت کر رہا تھا اور ظالموں سے میرا کچھ تعلق نہ تھا اور جس طرح سے میں نے اپنی توانائی کے مطابق مظلوموں سے ظالموں کے شر کو دُور کیا ہے تو بھی اے خدائے بزرگ! ظالموں کے شر کو مُجھ سے دُور رکھ۔

٭ ٭ ٭

حضرت موسیٰؑ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ شہر مدین کو چلے جائیں۔ یہ شہر شام کے جنوب اور حجاز کے شمال میں تھا اور قلمرو مصر اور فراعنہ کی حکومت میں شامل نہ تھا۔

لیکن وہ جوان جو محل کے اندر ناز و نعم میں پلا تھا۔ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہا تھا جیسا کہ سفر اُسے کبھی زندگی بھر پیش نہ آیا تھا۔ اُس کے پاس نہ زادِ راہ تھا، نہ توشۂ سفر، نہ کوئی سواری، نہ رفیقِ راہ اور نہ کوئی راستہ بتلانے والا ہر دم یہ خطرہ لاحق تھا کہ حکومت کے اہلکار مجھ تک پہنچ جائیں اور پکڑ کے قتل کر دیں اِس حالت میں ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا کیا حال ہوگا۔

لیکن ـــ حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ سختی اور شدت کے دِنوں کو پیچھے چھوڑ دیں اور قصرِ فرعون اُنھیں جس جال میں پھنسانا چاہتا تھا اُسے توڑ کر باہر نکل آئیں اور وہ کمزور اور ستم دیدہ لوگوں کے پاس رہیں۔ اُن کے درد و غم کا بہ شدت احساس کریں اور مستکبرین کے خلاف اُن کی منفعت کے لیے بحکم الٰہی قیام فرمائیں۔

اِس طویل، بے زاد و راحلہ اور بے رفیق و رہنما سفر میں ایک عظیم سرمایہ اُن کے پاس تھا اور وہ تھا ایمان اور توکل بر خدا۔

لٰہذا جب وہ مدین کی طرف چلے تو کہا: خدا سے اُمید ہے کہ وہ مجھے راہِ راست کی طرف ہدایت کرے گا: (ولما توجه تلقاء مدین قال عسٰی ربّی ان یهدینی سوآء السبیل)[1]۔

---

[1] "تلقاء" مصدر یا اسم مکان ہے اور اس جگہ سمت یا جانب کے معنی میں آیا ہے۔

Marfat.com

٢٣۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬
وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ
قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۖ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝
٢٤۔ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ
خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝
٢٥۔ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ
لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ
الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ

٢٣۔ اور جب موسٰی مدین میں پانی (کے کنویں) کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ لوگ اپنے چوپایوں کو پانی پلا رہے ہیں اور اُن کے ایک طرف دو عورتیں اپنی بکریوں کو لیے کھڑی ہیں اور (کنویں کے نزدیک نہیں آتیں) اُن سے موسٰیؑ نے پُوچھا تمہیں کیا مسئلہ درپیش ہے ؟ اُن دونوں نے کہا کہ ہم اُنھیں اُس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک تمام چرواہے یہاں سے نکل نہ جائیں اور ہمارا والد بہت ہی بوڑھا ہے۔

٢٤۔ پس موسٰی نے اُن (بکریوں) کو پانی پلایا پھر وہ سائے کی جگہ جا بیٹھا اور کہا : پروردگارا ! تُو مجھے جو بھی نعمت عطا کرے گا ، میں اُس کا حاجت مند ہوں۔

٢٥۔ (ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ) اُن میں سے ایک حیا اور شرم کے ساتھ چلتی ہوئی موسٰی کے پاس آئی۔ اور کہا میرے والد تجھے بُلاتے ہیں تاکہ تُو نے جو ہماری بکریوں کو پانی پلایا تھا اُس کی تجھے اُجرت دے —— پس موسٰی اُس کے (شعیب کے) پاس آئے ، اس سے سارا ماجرا بیان کیا تو شعیب نے کہا کہ ڈر نہیں تُو نے ظالموں سے نجات پالی ہے۔

Marfat.com

تفسیر

ایک نیک عمل نے موسیٰؑ پر بھلائیوں کے دروازے کھول دیئے :

اس مقام پر ہم اس سرگزشت کے پانچویں حصّے پر پہنچ گئے ہیں اور وہ موقع یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ شہر مدین میں پہنچ گئے ہیں ۔

یہ جوان پاکباز انسان کئی روز تک تنہا چلتا رہا ۔ یہ راستہ وہ تھا جو نہ کبھی اُس نے دیکھا تھا اسے طے کیا تھا ۔ بعض لوگوں کے قول کے مطابق حضرت موسیٰؑ مجبور تھے کہ پا برہنہ راستہ طے کریں ۔ بیان کیا گیا ہے کہ مسلسل آٹھ روز تک چلتے رہے ۔ یہاں تک کہ چلنے چلتے اُن کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ۔

جب بھوک لگتی تھی تو جنگل کی گھاس اور درختوں کے پتّے کھا لیتے تھے ۔ ان تمام مشکلات اور زحمات میں صرف ایک خیال سے اُن کے دل کو راحت رہتی تھی کہ اُنھیں فرعون کے پنجۂ ظلم سے رہائی مل گئی ہے ۔

رفتہ رفتہ اُنھیں اُفق میں شہر مدین کا منظر نظر آنے لگا ۔ اُن کے دل میں آسودگی کی ایک لہر اُٹھنے لگی ۔ وہ شہر کے قریب پہنچے ۔ اُنھوں نے لوگوں کا ایک انبوہ دیکھا ۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ لوگ چرواہے ہیں کہ جو کنویں کے پاس اپنی بھیڑوں کو پانی پلانے آئے ہیں ۔

جب حضرت موسیٰؑ کنویں کے قریب آئے تو اُنھوں نے وہاں بہت سے آدمیوں کو دیکھا جو کنویں سے پانی بھر کے اپنے چوپایوں کو پلا رہے تھے ۔ (ولمّا ورد ماءَ مدین وجد علیه اُمّةً من الناس یسقون) ۔

اُنھوں نے اُس کنویں کے پاس دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بھیڑوں کو لیے کھڑی تھیں ۔ مگر کنویں کے قریب نہیں آتی تھیں ۔

(ووجد من دونھم امرأتین تذودان)[1]

ان باعفت لڑکیوں کی حالت قابلِ رحم تھی جو ایک گوشے میں کھڑی تھیں اور کوئی آدمی بھی اُن سے انصاف نہیں کرتا تھا ۔ چرواہے صرف اپنی بھیڑوں کی فکر میں تھے اور کسی اور کو موقع نہیں دیتے تھے ۔ حضرت موسیٰؑ نے ان لڑکیوں کی یہ حالت دیکھی تو اُن کے نزدیک آئے اور پوچھا تم یہاں کیسے کھڑی ہو : (قال ما خطبکما)[2]

تم آگے کیوں نہیں بڑھتیں اور اپنی بھیڑوں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں ؟

حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ حق کشی ، ظلم و ستم ، بے عدالتی اور مظلوموں کے حقوق کی عدم پاسداری جو اُنھوں نے شہر مدین میں دیکھی ، قابلِ برداشت نہ تھی ۔

مظلوموں کو ظلم سے بچانا اُن کی فطرت تھی ۔ اِسی وجہ سے اُنھوں نے فرعون کے محل اور اس کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا تھا اور وطن سے بے وطن ہو گئے تھے ۔ وہ اپنی اِس روشِ حیات کو ترک نہیں کر سکتے تھے اور ظلم کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے ۔

لڑکیوں نے حضرت موسیٰؑ سے جواب میں کہا : ہم اُس وقت تک اپنی بھیڑوں کو پانی نہیں پلا سکتیں ، جب تک تمام چرواہے اپنے

---

[1] "تذودان" کا مادہ " زود " ہے ۔ اس کے معنی ہیں منع کرنا ، روکنا ، وہ لڑکیاں نگرانی کر رہی تھیں کہ اُن کی بھیڑیں بھاگ نہ جائیں یا دوسرے لوگوں کی بھیڑوں میں نہ مل جائیں ۔

[2] " خطب " بمعنی کام ۔ مقصد ۔

Marfat.com

حیوانات کو پانی پلا کر نکل نہ جائیں: (قالتا لا نسقی حتّٰی یصدر الرّعاء)[1]

اُن لڑکیوں نے اس بات کی وضاحت کے لیے کہ ان باعفت لڑکیوں کے باپ نے اُنھیں تنہا اس کام کے لیے کیوں بھیج دیا ہے، یہ بھی اضافہ کیا کہ ہمارا باپ نہایت ضعیف العمر ہے: (وابونا شیخ کبیر)۔

نہ تو اُس میں اتنی طاقت ہے کہ بھیڑوں کو پانی پلا سکے اور نہ ہمارا کوئی بھائی ہے جو یہ کام کرلے۔ اس خیال سے کہ کسی پر بار نہ ہوں ہم خود ہی یہ کام کرتی ہیں۔

٭ ٭ ٭

حضرت موسیٰ کو یہ باتیں سُن کر بہت کوفت ہوئی اور دل میں کہا کہ یہ کیسے بے انصاف لوگ ہیں کہ اُنھیں صرف اپنی فکر ہے اور کسی مظلوم کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔

وہ آگے آئے، بھاری ڈول اُٹھایا اور اُسے کنوئیں میں ڈالا۔ کہتے ہیں کہ وہ ڈول اتنا بڑا تھا کہ چند آدمی مل کر اُسے کھینچ سکتے تھے۔ لیکن حضرت موسیٰ نے اپنے قوی بازوؤں سے اُسے اکیلے ہی کھینچ لیا اور اُن دونوں عورتوں کی بھیڑوں کو پانی پلا دیا: (فسقٰی لھما)۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کنویں کے قریب آئے اور لوگوں کو ایک طرف کیا تو اُن سے کہا: "تم کیسے لوگ ہو کہ اپنے سوا کسی اور کی پرواہ ہی نہیں کرتے"!

یہ سُن کر لوگ ایک طرف ہٹ گئے اور ڈول حضرت موسیٰ کے حوالے کرکے بولے:

"لیجیے، بسم اللہ، اگر آپ پانی کھینچ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے حضرت موسیٰ کو تنہا چھوڑ دیا۔ لیکن حضرت موسیٰ اُس وقت اگرچہ تھکے ہوئے تھے اور اُنھیں بھوک لگ رہی تھی مگر قوتِ ایمانی اُن کی مددگار ہوئی، جس نے اُن کی جسمانی قوت میں اضافہ کر دیا اور کنویں سے ایک ہی ڈول کھینچ کر اُن دونوں عورتوں کی بھیڑوں کو پانی پلا دیا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ سائے میں آ بیٹھے۔ اور بارگاہ ایزدی میں عرض کرنے لگے: خداوندا! تُو مجھے جو بھی خیر اور نیکی بخشے، میں اس کا محتاج ہوں: (ثم تولّٰی الی الظل فقال ربّ انی لما انزلت الیّ من خیرٍ فقیر)۔

حضرت موسیٰ (اس وقت) تھکے ہوئے اور بھوکے تھے۔ اُس شہر میں اجنبی اور تنہا تھے اور اُن کے لیے کوئی سر چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی۔ مگر پھر بھی وہ بے قرار نہ تھے۔ آپ کا نفس ایسا مطمئن تھا کہ دعا کے وقت بھی یہ نہیں کہا کہ "خدایا تو میرے لیے ایسا یا ویسا کر" بلکہ یہ کہا کہ: "تو جو خیر بھی مجھے بخشے میں اس کا محتاج ہوں"۔

یعنی صرف اپنی احتیاج اور نیاز کو عرض کرتے ہیں اور باقی امور الطافِ خداوندی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

لیکن ـــ دیکھو کہ کارِ خیر کیا قدرت نمائی کرتا ہے اور اس میں کتنی عجیب برکات ہیں۔ صرف لوجہ اللہ ایک قدم اُٹھانے اور ایک ناآشنا مظلوم کی حمایت میں کنویں سے پانی کے ایک ڈول کھینچنے سے حضرت موسیٰ کی زندگی میں ایک نیا باب کھل گیا اور یہ عمل خیر ان کے لیے برکات مادی اور رُوحانی کی ایک دُنیا بطورِ تحفہ لایا۔ اور وہ ناپیدا نعمت (جس کے حصول کے لیے اُنھیں برسوں کوشش کرنا پڑتی) اللہ نے اُنھیں بخش دی

---

[1] "یصدر" مشتق ہے "صدر" سے اس کے معنی ہیں "خارج ہونا"۔ اور "رعاء" جمع "راعی" کی بمعنی چرواہا۔

Marfat.com

حضرت موسیٰؑ کے لیے اس خوش نصیبی کا دَور اُس وقت شروع ہوا جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ ان دونوں بہنوں میں سے ایک نہایت حیا سے قدم اُٹھاتی ہوئی آ رہی ہے۔ اُس کی وضع سے ظاہر تھا کہ اُسے ایک جوان سے باتیں کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ وہ لڑکی حضرت موسیٰؑ کے قریب آئی اور صرف ایک جملہ کہا: میرے والد صاحب آپ کو بُلاتے ہیں تاکہ آپ نے ہماری بکریوں کے لیے کنوئیں سے جو پانی کھینچا تھا، اُس کا معاوضہ دیں: (فجآءته احداهما تمشی علی استحیآءٍ قالت ان ابی یدعوک لیجزیک اجر ما سقیت لنا)۔

یہ سُن کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں اُمید کی بجلی چمکی۔ گویا اُنھیں یہ ادراک ہوا کہ اُن کے لیے ایک عظیم خوش نصیبی کے اسباب فراہم ہو رہے ہیں۔ وہ ایک بزرگ انسان سے ملیں گے۔ وہ ایک ایسا حق شناس انسان معلوم ہوتا ہے جو یہ بات پسند نہیں کرتا کہ انسان کی کسی زحمت کا یہاں تک کہ پانی کے ایک ڈول کھینچنے کا بھی معاوضہ نہ دے۔ یہ ضرور کوئی ملکوتی اور الٰہی انسان ہوگا۔ یا اللہ! یہ کیسا عجیب اور نادر موقع ہے!

بیشک وہ پیر مرد حضرت شعیبؑ پیغمبر تھے۔ اُنھوں نے برسوں تک اِس شہر کے لوگوں کو رجوع الی اللہ کی دعوت دی تھی۔ وہ حق پرستی اور حق شناسی کا نمونہ تھے۔

جب حضرت شعیبؑ نے یہ دیکھا کہ آج میری لڑکیاں ہر روز کے معمول سے قبل گھر آگئی ہیں تو اُنھوں نے لڑکیوں سے اس کا سبب پُوچھا۔ جب اُنھیں کُل واقعے کا علم ہوا تو اُنھوں نے تہیہ کر لیا کہ اُس اجنبی جوان کو اپنے دین کی تبلیغ کریں گے۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ اُس جگہ سے حضرت شعیبؑ کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔

بعض روایات کے مطابق وہ لڑکی رہنمائی کے لیے اُن کے آگے آگے چل رہی تھی اور حضرت موسیٰؑ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اُس وقت تیز ہوا سے اُس لڑکی کا لباس اُڑ رہا تھا اور ممکن تھا کہ ہوا کی تیزی لباس کو اُس کے جسم سے اُٹھا دے۔ حضرت موسیٰؑ کی پاکیزہ طبیعت اس منظر کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس لیے اُنھوں نے لڑکی سے کہا کہ میں آگے آگے چلتا ہوں۔ تم کسی دوراہے یا چندراہے پر مجھے راستہ بتا دینا۔[1]

چنانچہ حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کے گھر پہنچ گئے۔ ایسا گھر جس سے نُورِ نبوّت ساطع تھا اور اس کے ہر گوشے سے رُوحانیت نمایاں تھی۔ اُنھوں نے دیکھا کہ ایک پیر مرد، جس کے بال سفید ہیں ایک گوشے میں بیٹھا ہے۔ اُس نے حضرت موسیٰؑ کو خوش آمدید کہا۔ اور پوچھا:

"تم کون ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ اس شہر میں کیا کرتے ہو؟ اور آنے کا مقصد کیا ہے؟ تنہا کیوں ہو؟"

حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کو اپنی پُوری داستان سنائی۔

قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ جب موسیٰ حضرت شعیبؑ کے پاس پہنچے اور اُنھیں اپنی سرگزشت سُنائی تو حضرت شعیبؑ نے کہا مت ڈرو تمہیں ظالموں کے گروہ سے نجات مل گئی ہے: (فلما جآءه وقص علیه القصص قال لا تخف نجوت من القوم الظٰلمین)۔

ہماری سرزمین اُن کی حدودِ سلطنت سے باہر ہے۔ یہاں اُن کا کوئی اختیار نہیں چلتا۔ اپنے دل میں ذرہ بھر پریشانی کو جگہ نہ دینا۔ تم امن و امان سے پہنچ گئے ہو۔ مسافرت اور تنہائی کا بھی غم نہ کرو۔ یہ تمام مشکلات خدا کے کرم سے دُور ہو جائیں گی۔

حضرت موسیٰؑ فوراً سمجھ گئے کہ اُنھیں ایک عالی مرتبہ اُستاد مل گیا ہے، جس کے وجود سے رُوحانیت، تقویٰ، معرفت اور زلالِ عظیم کے چشمے

---

[1] ابوالفتوح رازی، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

پھوٹ رہے ہیں اور یہ اُستاد اُن کی تشنگی تحصیل علم و معرفت کو سیراب کر سکتا ہے۔

حضرت شعیبؑ نے بھی یہ سمجھ لیا کہ انھیں ایک لائق اور مستعد شاگرد مل گیا ہے، جسے وہ اپنے علم و دانش اور زندگی بھر کے تجربات سے فیض یاب کر سکتے ہیں۔

یہ مسلم ہے کہ ایک شاگرد کو جس قدر ایک بزرگ اور قابل اُستاد پا کر جتنی مسرت ہوتی ہے، اُستاد کو بھی ایک لائق شاگرد پا کر اتنی ہی خوشی ہوتی ہے۔

٭ ٭ ٭

چند اہم نکات

۱۔ **مدین کہاں تھا؟** "مدین" ایک شہر کا نام تھا جس میں حضرت شعیبؑ اور اُن کا قبیلہ رہتا تھا۔ یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق میں تھا (یعنی حجاز کے شمال اور شامات کے جنوب میں) وہاں کے باشندے حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے تھے۔ وہ مصر، لبنان اور فلسطین سے تجارت کرتے تھے۔ آج کل اس شہر کا نام معان ہے۔

بعض لوگ کلمہ "مدین" کا اطلاق اُس قوم پر کرتے ہیں جو خلیج عقبہ سے کوہ سینا تک سکونت پذیر تھی۔ توریت میں بھی اس قوم کو "مدیان" کہا گیا ہے۔

بعض اہل تحقیق نے اس شہر کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ایک بیٹا جس کا نام "مدین" تھا اس شہر میں رہتا تھا۔

اگر جغرافیائی نقشے کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا مصر سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے اس لیے حضرت موسیٰؑ چند روز میں وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔

ملک اُردن کے جغرافیائی نقشہ میں، جنوب غربی شہروں میں سے ایک شہر "معان" نام کا ملتا ہے، جس کا محل وقوع ہمارے مذکورہ بالا بیان کے مطابق ہے۔

٭ ٭ ٭

۲۔ **بہت سی سبق آموز باتیں:** حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے اس حصّے میں بکثرت سبق آموز باتیں ہیں:

(الف) پیغمبرانِ خدا ہمیشہ مظلوموں کے حامی رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اُس زمانے میں بھی جبکہ وہ مصر میں تھے اور اُس وقت بھی جبکہ وہ مدین میں آ گئے، غرض جہاں بھی وہ ظلم و ستم کا منظر دیکھتے تھے بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کا یہ عمل عین حق تھا کیونکہ بعثتِ انبیاء سے خدا کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔

(ب) بعض اوقات انسان کا معمولی سا عمل خیر کتنا پُر برکت ثابت ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے کنویں سے پانی کا صرف ایک ڈول کھینچا۔ اس عمل سے اُن کا مقصد رضائے الٰہی کے حصول کے علاوہ کچھ نہ تھا لیکن یہ چھوٹا سا کام کس قدر پُر برکت ثابت ہوا! کیونکہ یہی عمل خیر اس امر کا سبب ہوا کہ وہ پیغمبر خدا حضرت شعیبؑ کے مکان پر پہنچ گئے۔ انھیں احساس مسافرت سے نجات ملی اور ایک اطمینان بخش پناہ گاہ مل گئی۔ انھیں غذا، لباس اور ایک پاکدامن زوجہ بھی نصیب ہوئی۔ علاوہ بریں افضل ترین نعمت نصیب ہوئی کہ وہ دس سال کی مدت تک

Marfat.com

حضرت شعیبؑ جیسے پیرِ روشن ضمیر کے اِنسان ساز مکتبِ تربیت میں رہ کر مخلوق کی رہبری کے لیے تیار ہوگئے۔

(ج) مردانِ خدا کسی کی خدمت کو بھی بالخصوص مزدوروں کی خدمت کو بے اجر و بے معاوضہ نہیں رہنے دیتے۔ اسی وجہ سے جب حضرت شعیبؑ نے اس اجنبی جوان کے متعلق سُنا کہ اس نے میری بھیڑوں کو پانی پلایا ہے تو چین سے نہ بیٹھے۔ فوراً اپنی بیٹی کو اُس کی تلاش میں بھیجا تاکہ اُس کی مزدوری ادا کریں۔

(د) حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ وہ ہمیشہ یادِ خدا میں مشغول رہتے تھے اور ہر مشکل کے حل کے لیے اُسی سے دعا کرتے تھے۔

جس وقت ایک قبطی اُن کے ہاتھ سے مارا گیا اور ترکِ اُولیٰ سرزد ہوا تو اُنھوں نے خدا سے فوراً عفو اور مغفرت کی دُعا کی:

قال ربّ انّی ظلمت نفسی فاغفرلی

خدایا مَیں نے اپنے اُوپر ظلم کیا ہے تو مجھے معاف کردے۔

اور جس وقت وہ ملکِ مصر سے باہر آئے تو دُعا کی:

قال ربّ نجّنی من القوم الظالمین

خدایا تو مجھے اس ستمگار قوم سے نجات دے۔

اور جس وقت وہ شہر مدین کی طرف روانہ ہوئے تو متوجہ الی اللہ ہو کر کہا:

قال عسٰی ربّی ان یھدینی سوآء السّبیل

مجھے اُمید ہے کہ خدا مجھے راہِ راست کی ھدایت کرے گا۔

اور جس وقت حضرت شعیب کی بھیڑوں کو سیراب کیا اور سائے میں آرام کرنے لگے تو خدا سے عرض کیا:

فقال ربّ انّی لما انزلت الیّ من خیرٍ فقیر

اے پروردگار تو مجھے جو بھی نعمت عطا کرے گا میں اُس کا محتاج ہوں۔

خصوصاً یہ آخری دُعا جو اُنھوں نے زندگی کے بُحرانی ترین وقت میں مانگی، نہایت مؤدبانہ، پُراطمینان اور سکون آمیز تھی۔ اُنھوں نے یہ نہیں کہا کہ خدایا میری حاجات کو روا فرما۔ بلکہ صرف یہ کہا کہ ـــــ "میں تیرے احسان اور خیر کا محتاج ہوں"۔

(س) یہ خیال نہ کیا جائے کہ حضرت موسیٰؑ صرف سختی کے وقت ہی خدا کو یاد کرتے تھے بلکہ قصرِ فرعون میں بھی جبکہ اُن کا وقت ناز و نعم میں گزر رہا تھا وہ خدا کو نہ بھُولے۔ ہم روایات میں پڑھتے ہیں کہ ایک روز فرعون کے سامنے اُنھیں چھینک آگئی۔ تو اُنھوں نے فوراً "الحمد للّٰہ ربّ العالمین" کہا۔ فرعون یہ بات سُن کر ناراض ہوگیا اور اُن کے ایک تھپڑ مارا۔ حضرت موسیٰؑ نے بھی جواب میں اُس کی لمبی داڑھی پکڑ کے کھینچی۔ فرعون کو اس پر سخت غصہ آیا اور اُنھیں قتل کرنے کا ارادہ کرلیا مگر اُس کی بیوی نے اُنھیں یہ کہہ کر بچالیا کہ یہ ابھی بچّہ ہے اُسے ابھی کیا پتہ![1]

* * * *

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۱۷۔

Marfat.com

۲۶۔ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ؗ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝

۲۷۔ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

۲۸۔ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اُن دو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے ابا جان آپ اسے ملازم رکھ لیجیے۔ کیونکہ بہترین ملازم جو آپ رکھ سکیں اسے توانا اور امین ہونا چاہیے۔

۲۷۔ (شعیب نے موسیٰ سے) کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا تم سے نکاح کر دوں۔ اس شرط پر کہ تم آٹھ سال تک میری خدمت کرو اور اگر دس سال پورے کرو تو وہ تمہاری طرف سے احسان ہے۔ میں تم سے کوئی سخت کام لینا نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ مجھے صالحین میں سے پاؤ گے۔

۲۸۔ (موسیٰ نے) کہا (کوئی حرج نہیں۔ البتہ) میرے اور تمہارے درمیان یہ عہد ہے کہ میں ان مدتوں میں سے جونسی بھی میں تمام کروں، مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی (اور اس انتخاب مدت میں میں آزاد ہوں گا) اور ہم جو معاہدہ کر رہے ہیں، خدا اُس پر گواہ ہے۔

تفسیر

حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کے گھر میں :

اب حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے چھٹے دور کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ جناب شعیبؑ کے گھر آگئے۔ یہ ایک سادہ سا دیہاتی مکان تھا، مکان صاف ستھرا تھا اور رُوحانیت سے معمور تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ نے جناب شعیبؑ کو اپنی سرگزشت سُنائی تو اُن کی ایک لڑکی

Marfat.com

نے ایک مختصر مگر پُر معنی عبارت میں اپنے والد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ موسٰی کو بھیڑوں کی حفاظت کے لیے ملازم رکھ لیں۔ وہ الفاظ یہ تھے:

اے بابا! آپ اس جوان کو ملازم رکھ لیں۔ کیونکہ ایک بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھ سکتے ہیں، وہ ایسا ہونا چاہیئے جو قوی اور امین ہو اور اس نے اپنی طاقت اور نیک خصلت دونوں کا امتحان دے دیا ہے: (قالت احداھما یاابت استأجرہ ان خیر من استأجرت القوی الامین)۔

جس لڑکی نے ایک پیغمبر کے زیر سایہ تربیت پائی ہو اُسے ایسی ہی مؤدبانہ اور سوچی سمجھی بات کہنی چاہیئے نیز چاہیئے کہ مختصر الفاظ اور تھوڑی سی عبارت میں اپنا مطلب ادا کر دے۔

اس لڑکی کو کیسے معلوم تھا کہ یہ جوان طاقتور بھی ہے اور نیک خصلت بھی۔ کیونکہ اس نے پہلی بار کنویں پر ہی اُسے دیکھا تھا اور اُس کی گزشتہ زندگی کے حالات سے وہ بے خبر تھی؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اُس لڑکی نے اُس جوان کی قوت کو تو اُسی وقت سمجھ لیا تھا جب اُس نے ان مظلوم لڑکیوں کا حق دلانے کے لیے چرواہوں کو کنویں سے ایک طرف ہٹایا تھا۔ اور اُس بھاری ڈول کو اکیلے ہی کنویں سے کھینچ لیا تھا اور اُس کی امانت اور نیک چلنی اُس وقت معلوم ہو گئی تھی کہ حضرت شعیبؑ کے گھر کی راہ میں اُس نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک جوان لڑکی اُس کے آگے آگے چلے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ تیز ہوا سے اُس کا لباس جسم سے ہٹ جائے[1]۔

علاوہ بریں اُس نوجوان نے اپنی جو سرگزشت سنائی تھی اُس کے ضمن میں قبطیوں سے لڑائی کے ذکر میں اُس کی قوت کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اور اس کی امانت و دیانت کی یہ شہادت کافی تھی کہ اُس نے ظالموں کی ہم نوائی نہ کی اور اُن کی ستم رانی پر اظہار رضامندی نہ کیا۔

٭ ٭ ٭

حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی کی تجویز کو قبول کر لیا۔ اُنھوں نے موسٰیؑ کی طرف رُخ کر کے یوں کہا: میرا ارادہ ہے کہ اپنی ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا تیرے ساتھ نکاح کر دوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ تو آٹھ سال تک میری خدمت کرے: (قال انی ارید ان انکحک احدی ابنتی ھاتین علی ان تأجرنی ثمنی حجج)[2]۔

اس کے بعد یہ اضافہ کیا۔ "اگر تو آٹھ سال کی بجائے یہ خدمت دس سال کر دے تو یہ تیرا احسان ہوگا۔ مگر تجھ پر واجب نہیں ہے: (فان اتممت عشرًا فمن عندك)۔

بہرحال میں یہ نہیں چاہتا کہ تم سے کوئی مشکل کام لوں۔ ان شاء اللہ تم جلد دیکھو گے کہ میں صالحین میں سے ہوں، اپنے عہد و پیمان میں وفادار ہوں۔ تیرے ساتھ ہرگز سخت گیری نہ کروں گا اور تیرے ساتھ خیر اور نیکی کا سلوک کروں گا: (وما ارید ان اشق علیك ستجدنی ان شاء اللہ من الصالحین)۔

---

[1] علی بن ابراہیم کی تفسیر میں یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ جب حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی سے یہ سوال کیا کہ اس جوان کی قوت کا حال تو کنویں سے بڑا ڈول کھینچنے سے معلوم ہو گیا، تمہیں اُس کی امانت کا حال کیسے معلوم ہوا تو لڑکی نے جواب دیا کہ اُس نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ عورتوں کی کمر پر بھی نگاہ ڈالے۔ (تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۱۲۳)

[2] "حجج" جمع "حجۃ" کی جس کے معنی ہیں ایک سال" عربوں کا معمول یہ تھا کہ ہر سال کے بعد ایک حج کرتے تھے۔ یہ رسم حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلی آتی تھی۔

Marfat.com

حضرت شعیبؑ کی طرف سے اس تجویز کے ضمن میں، ازدواج، مہر اور اس کی جملہ خصوصیات کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن پر ان شاء اللہ نکات کے ضمن میں بحث ہوگی۔

❊ ❊ ❊

حضرت موسیٰؑ نے اس تجویز اور شرط سے موافقت کرتے ہوئے اور عقد کو قبول کرتے ہوئے کہا: "میرے اور آپ کے درمیان یہ عہد ہے": (قال ذٰلك بيني وبينك)۔

البتہ ان دو مدتوں میں سے (آٹھ سال یا دس سال) جس مدت تک بھی خدمت کروں، مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی اور میں اُس کے انتخاب میں آزاد ہوں، (ايما الاجلين قضيتُ فلا عدوان عليّ)۔

عہد کو پختہ اور خدا کے نام سے طلب مدد کے لیے یہ اضافہ کیا: جو کچھ ہم کہتے ہیں خدا اُس پر شاہد ہے: (والله علٰى ما نقول وكيل)۔

چند اہم نکات

۱۔ **ادارتِ کار کی درستی کے لیے دو بُنیادی شرائط**: آیاتِ مذکور بالا میں، حضرت موسیٰؑ کو ملازم رکھنے کے بارے میں، حضرت شعیبؑ کی دُختر کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوئے ہیں، اُن میں کسی کام کو ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنے کے لیے دو اہم ترین شرائط نہایت مختصر اور جامع صورت میں بیان ہوئی ہیں۔ اور وہ ہیں "**قدرت اور امانت**"۔

یہ امر بدیہی ہے کہ **قدرت** سے مراد صرف جسمانی قوت ہی نہیں ہے بلکہ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ انسان میں محولہ کام کو سرانجام دینے کی استعداد ہو۔ مثلاً ایک قوی اور امین طبیب وہ ہے جو اپنے کام سے آگاہ اور اس پر حاوی ہو۔

ایک قوی سربراہ ادارہ وہ ہے جو اپنے فرائض منصبی سے خوب واقف ہو، دفتری کام کے مقاصد سے باخبر ہو، ترتیب کار کا پروگرام بنانے میں ماہر ہو، اس میں بقدر کافی ایجاد و اختراع کی قابلیت ہو، کام کو منظم کرنے کی مہارت رکھتا ہو، اُس کے ذہن میں غایتِ کار واضح ہو اور اپنی تمام طاقتوں کو مقصد تک پہنچنے کے لیے استعمال میں لائے۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود وہ ہمدرد، خیرخواہ، امین اور اپنے کام میں دیانتدار بھی ہو۔

وہ لوگ جو کسی کو کوئی ذمہ داری سپرد کرتے وقت صرف اُس کی امانت اور درست کرداری پر قناعت کر لیتے ہیں وہ بھی اُسی طرح غلط فہمی میں ہیں جیسے کہ وہ لوگ جو کسی کی مہارتِ خصوصی دیکھ کر اُس پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔

خائن ماہرینِ خصوصی اور بددیانت واقفانِ کار ویسا ہی نقصان پہنچاتے ہیں جیسا کہ نااہل اور ناواقفانِ کار ایماندار لوگ۔

اگر ہم کسی ملک کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے انتظامی فرائض کو مذکورہ بالا گروہوں میں سے کسی ایک کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ سربراہ ادارہ خائن ہو اور صالح کردار کے لوگوں کو ذمہ داریوں سے محروم رکھا جائے۔ نتیجہ دونوں حالتوں میں ایک ہے۔

اسلامی مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ ہر کام اُس کے اہل اور امانت دار آدمی کے ہاتھ میں ہو تا کہ معاشرے کا نظام درست رہے۔ اگر ہم پوری تاریخ میں حکومتوں کے زوال کے اسباب پر غور کریں تو اُن کی بُنیادی علت یہی پائیں گے کہ کاروبارِ سلطنت مذکورہ بالا دو گروہوں میں سے

Marfat.com

کسی ایک کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اسلام میں اہلیت کار کی خصوصیات میں ہر جگہ "علم اور تقویٰ" کو ہم دوش لازم قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً مرجع تقلید کو مجتہد اور عادل ہونا چاہیئے۔ قاضی اور رہنمائے قوم کو مجتہد اور عادل ہونا چاہیئے (ان شرائط کے علاوہ کچھ اور بھی شرائط ہیں۔ مگر بنیادی شرائط یہی دونوں ہیں یعنی "عدالت و تقویٰ اور علم و آگہی")۔

۲۔ حضرت شعیبؑ کا حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح

۲۔ حضرت شعیبؑ کا حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح: مذکورہ بالا آیات کو پڑھ کر ذہن میں متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جن کے بے کم و کاست جوابات دیتے ہیں۔

ا۔ کیا فقہی اعتبار سے یہ درست ہے کہ وہ لڑکی جس کا کسی کے ساتھ نکاح کرنا ہے اُس کا ماقبل تعین نہ ہو۔ بلکہ صیغۂ عقد کے اجراء کے وقت کہا جائے کہ:۔

"میں ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا تیرے ساتھ نکاح کرتا ہوں"۔

جواب: یہ ہے کہ یہ واضح نہیں ہے کہ مذکورہ الفاظ اجرائے صیغہ کے وقت کہے گئے ہوں گے۔ بلکہ سیاقِ عبارت سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی گفتگو ہے، جسے اصطلاح میں "مقاولہ" کہتے ہیں تاکہ موسیٰؑ کی رضامندی کے بعد طرفین ایک دوسرے کو انتخاب کریں۔ پھر صیغۂ عقد جاری ہو جائے۔

ب۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ مہر کو غیر طے شدہ حالت میں یا کم اور زیادہ کے درمیان مشکوک حالت میں رکھا جائے۔

جواب: آیت کے لب و لہجہ سے یہ امر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے مہر آٹھ سال کی خدمت طے کی تھی۔ اُسے دس سال تک بڑھا دینا حضرت موسیٰؑ کی مرضی پر منحصر تھا۔

ج۔ کیا اصولاً کام اور خدمت کو مہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ نیز ایسی عورت سے ہم بستری کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ابھی اُس کا تمام مہر ادا کرنے کا وقت ہی نہیں آیا حتیٰ کہ شوہر کی اتنی بضاعت ہی نہیں ہے کہ کُل مہر یکمشت ادا کر دے۔

جواب: ایسے مہر کے عدمِ جواز پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ ہماری شریعت میں ہر وہ شئی جس کی کچھ قیمت ہو اُس پر مہر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ شوہر کے لیے یہ بھی لازم نہیں کہ وہ کُل مہر بیک وقت ادا کر دے۔ اتنا ہی کافی ہے کہ حق مہر ادا کرنے کا شوہر ذمہ دار ہو اور بیوی اس کی مالک ہو جائے۔ شوہر کی درستیٔ صحت اور اُس کا اپنی بیوی کی رفاقت میں رہنا بھی اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ وہ زندہ رہے گا اور اُس میں اتنی قدرت ہوگی کہ وہ حق مہر ادا کر سکے گا[۱]۔

د۔ یہ بات اصولاً کس طرح ممکن ہے کہ باپ کی خدمت بیٹی کا حق مہر قرار دیا جا سکے۔ کیا بیٹی بھی کوئی متاع ہے جسے حق خدمت کے عوض فروخت کر دیا جائے[۲]۔

---

[۱] جواب شریعت اسلامی کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شریعت ابراہیمی میں (جو حضرت موسیٰؑ سے قبل رائج تھی) حق مہر کی شرائط کچھ اور ہوں۔

[۲] مرحوم محقق حلّی شرائع الاسلام میں کہتے ہیں:۔ آزاد شخص کی منفعت پر عقد صحیح ہے مثلاً بطور مہر کوئی صنعت سکھا دے یا قرآن کی کوئی سورۃ پڑھا دے اور ہر حلال عمل پر اور شوہر کو معینہ مدت کے لیے اجیر بنانے پر۔ اور مرحوم فقیہ بزرگوار صاحب جواہر اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ علمائے مشہور اس رائے سے متفق ہیں۔

Marfat.com

جواب : اس میں شک نہیں کہ حضرت شعیبؑ نے اس مسئلے میں اپنی بیٹی کی رضامندی حاصل کرلی تھی اور وہ اس قسم کے عقد کو جاری کرنے کے لیے وکیل تھے۔

اس مسئلے کی ایک اور توجیہہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ذمّہ جو مہر تھا حقیقت میں اُس کی اصل مالک حضرت شعیبؑ کی لڑکی ہی تھی مگر چونکہ خاندانِ مشترکہ اور اُن کی زندگی نہایت خلوص اور محبت سے گزرتی تھی، آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا (جیسا کہ اب بھی قدیمی خاندانوں یا دیہات میں دیکھا جاتا ہے کہ گھر کے تمام افراد مل جُل کر رہتے ہیں) اس لیے وہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوسکتا تھا کہ حق مہر کون لے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مہر کی مالک صرف لڑکی ہی ہے نہ کہ باپ اور حضرت موسیٰؑ کی خدمت بھی لڑکی ہی کے لیے تھی۔

۵۔ حضرت شعیبؑ کی دختر کا مہر نسبتاً بہت زیادہ تھا۔ اگر آج کے حساب سے ایک مزدور کی مزدوری کا ایک ماہ اور پھر ایک سال میں حساب کریں اور پھر اس کو آٹھ سے ضرب دیں تو بہت ساری رقم بن جاتی ہے۔

جواب : اوّل تو یہ کہ یہ ازدواج کوئی معمولی رسم نہ تھی بلکہ موسیٰ کا حضرت شعیبؑ کے زیرِ تربیت رہنے کے لیے اسباب اوّلیہ میں سے تھا اور یہ ایک ذریعہ تھا جس سے موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کے دارالعلم میں رہ کر نصابِ تعلیم کو پُورا کریں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طویل مدّت میں موسیٰ نے پیرِ مدین سے کیا کچھ حاصل کیا۔

علاوہ بریں اگر حضرت موسیٰؑ اس مدّت میں حضرت شعیبؑ ہی کے لیے کام کرتے اور اس کے عوض میں حضرت شعیبؑ موسیٰؑ اور اُن کی زوجہ کے کفیل رہتے تو اُنھوں نے موسیٰ اور ان کی اہلیہ پر جو کچھ کیا اُسے کام کی مزدوری میں سے نفی کریں تو کچھ زیادہ رقم باقی نہ رہے گی اور پھر مہر بہت خفیف رہ جائے گا۔

❖ ❖ ❖

۳۔ **ایک مروجہ رسم کی نفی** : اس داستان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو ہمارے معاشرے میں باپ یا لڑکی کے وارثین کی طرف سے لڑکے کو پیام دینا عیب سمجھا جاتا ہے، درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شرع مانع نہیں ہے کہ لڑکی والے اگر کسی لڑکے کو لائق اور قابل سمجھتے ہیں تو اُسے پیغام دے دیں۔ جیسا کہ حضرت شعیبؑ نے کیا۔ نیز بزرگانِ اسلام کے حالاتِ زندگی میں بھی ایسی نظیریں ملتی ہیں۔

❖ ❖ ❖

حضرت شعیبؑ کی لڑکیوں کا نام "صفورہ" (یا صفورا) اور "لیا" بتایا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی شادی "صفورہ" سے ہوئی تھی۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۲۹۔ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ
امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ
تَصْطَلُوْنَ ۝

۳۰۔ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ
مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

۳۱۔ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ
یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ۝

۳۲۔ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ
اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ
وَمَلَاۡئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝

۳۳۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۝

۳۴۔ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ۫ اِنِّیْۤ
اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ۝

۳۵۔ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا
یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا
الْغٰلِبُوْنَ ۝

Marfat.com

ترجمہ

۲۹۔ جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور اپنے خاندان کے ساتھ (مدین سے مصر کی طرف) روانہ ہوا تو اس نے طور کی طرف سے آگ دیکھی۔ اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا۔ تم یہاں ٹھہرو، مَیں نے آگ دیکھی ہے شاید مَیں وہاں سے تمہارے لیے کچھ خبر لاؤں یا آگ کا کوئی انگارا لے آؤں تاکہ تم اُس سے گرم ہو جاؤ۔

۳۰۔ جب اُس کے پاس پہنچا تو ناگہاں میدان کے داہنے کنارے سے اُس بابرکت و بلند زمین میں ایک درخت میں سے آواز آئی۔ " اے موسیٰ! مَیں اللہ رب العالمین ہوں۔"

۳۱۔ تو اپنی لاٹھی کو ڈال دے۔ (جب موسیٰ نے عصا کو ڈال دیا تو) دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کر رہی ہے۔ موسیٰ کو خوف ہوا اور وہ رُخ موڑ کر چل پڑا اور پھر منہ پھیر کے بھی نہ دیکھا (آواز آئی) اے موسیٰ! واپس آ اور نہ ڈر تو امان میں ہے۔

۳۲۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال۔ تو جب تُو اسے نکالے گا، وہ بغیر کسی عیب کے سفید اور چمکدار ہوگا۔ اپنے ہاتھوں کو اپنے سینہ پر رکھ تاکہ خوف تجھ سے دُور ہو۔ اور خدا کی طرف سے یہ دو روشن دلیلیں فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے مقابلے کے لیے ہیں کیونکہ وہ سب فاسق ہیں۔

۳۳۔ موسیٰ نے عرض کیا مَیں نے اُن میں سے ایک فرد کو قتل کیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

۳۴۔ میرا بھائی ہارون اُس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے تو اُسے میرے ساتھ بھیج تاکہ وہ میری تصدیق کرے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔

۳۵۔ (خدا نے فرمایا) ہم تیرے بازوؤں کو تیرے بھائی کے وسیلے سے مضبوط کریں گے اور تمہیں غلبہ اور برتری عنایت کریں گے اور ہماری نشانیوں کی برکت سے وہ تم پر غالب نہ ہو سکیں گے۔ تم اور تمہاری پیروی کرنے والے غالب رہیں گے۔

تفسیر

وحی کی تابشِ اوّل :

اس مقام پر اس داستان کا ساتواں منظر ہمارے پیش نظر ہے۔

کوئی آدمی بھی حقیقتاً یہ نہیں جانتا کہ ان دس سال میں حضرت موسیٰؑ پر کیا گزری۔ لیکن بلاشک یہ دس سال حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ یہ سال دلچسپ، شیریں اور آرام بخش تھے نیز یہ دس سال ایک منصب عظیم کی ذمہ داری کے لیے تربیت اور تیاری کے تھے۔ درحقیقت اس کی ضرورت بھی تھی کہ موسیٰؑ دس سال کا عرصہ عالم مسافرت اور ایک بزرگ پیغمبر کی صحبت میں بسر کریں اور چرواہے کا کام

Marfat.com

کریں تاکہ اُن کے دل و دماغ سے محلات کی ناز پروردہ زندگی کا اثر بالکل محو ہو جائے۔ حضرت موسیٰؑ کو اتنا عرصہ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے ساتھ گزارنا ضروری تھا تاکہ اُن کی تکالیف اور مشکلات سے آگاہ ہو جائے اور ساکنان محلات کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔[۱]

ایک اور بات بھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اسرار آفرینش میں غور کرنے اور اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے بھی ایک طویل وقت کی ضرورت تھی اس مقصد کے لیے بیابانِ مدین اور خانۂ شعیبؑ سے بہتر اور کونسی جگہ ہو سکتی تھی۔

ایک اُولوالعزم پیغمبر کی بعثت کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ یہ مقام کسی کو نہایت آسانی سے نصیب ہو جائے۔ بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد تمام پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰؑ کی ذمہ داری ایک لحاظ سے سب سے زیادہ اہم تھی۔ اس لیے کہ :-

روئے زمین کے ظالم ترین لوگوں سے مقابلہ کرنا ، ایک کثیرالافراد قوم کی مدتِ اسیری کو ختم کرنا ، اور اُن کے اندر سے ایامِ اسیری میں پیدا ہو جانے والے نقائص کو محو کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

توریت اور اسی طرح اسلامی روایات میں مذکور ہے کہ حضرت شعیبؑ نے موسیٰؑ کی مخلصانہ خدمات کی قدرشناسی کے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ بھیڑوں کے جو بچے ایک خاص علامت کے ساتھ پیدا ہوں گے، وہ موسیٰؑ کو دے دیں گے ۔ اتفاقاً مدتِ موعود کے آخری سال میں جبکہ موسیٰؑ حضرت شعیبؑ سے رخصت ہو کر ملکِ مصر کو جانا چاہتے تھے تو تمام یا زیادہ تر بچے اُسی علامت کے پیدا ہوئے اور حضرت شعیبؑ نے بھی اُنھیں بڑی محبت سے موسیٰ کو دے دیا۔[۲]

یہ امر بدیہی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنی ساری زندگی چرواہے بنے رہنے پر قناعت نہیں کر سکتے تھے۔ ہر چند اُن کے لیے حضرت شعیبؑ کے پاس رہنا بہت ہی مُغتنم تھا مگر وہ اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ اپنی اُس قوم کی مدد کے لیے جائیں جو غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہے اور جہالت، نادانی اور بے خبری میں غرق ہے۔

حضرت موسیٰؑ اپنا یہ فرض بھی سمجھتے تھے کہ مصر میں جو ظلم کا بازار گرم ہے اُسے سرد کر دیں، طاغوتیوں کو ذلیل کریں اور توفیقِ الٰہی سے مظلوموں کو عزت بخشیں۔ اُن کے قلب میں یہی احساس تھا جو اُنھیں مصر جانے پر آمادہ کر رہا تھا۔

آخر کار اُنھوں نے اپنے اہلِ خانہ، سامان و اسباب اور اپنی بھیڑوں کو ساتھ لیا اور رختِ سفر باندھا اور روانہ ہو گئے ۔

متعدد آیاتِ قرآنی میں کلمہ " **اهل** " آیا ہے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اُن کی زوجہ کے علاوہ اُن کا لڑکا یا کوئی اور اولاد بھی تھی۔ اسلامی روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ توریت کے " سفر خروج " میں بھی ذکر مفصل موجود ہے۔ علاوہ ازیں اُس وقت اُن کی زوجہ اُمید سے تھی۔

جب حضرت موسیٰؑ مدین سے مصر کو جا رہے تھے تو راستہ بھول گئے ۔ یا غالباً شام کے ڈاکوؤں کے ہاتھ میں گرفتار ہو جانے کے خوف سے بوجہ احتیاط مروج راستے کو چھوڑ کے سفر کر رہے تھے۔

بہر کیف قرآن شریف میں یہ بیان اس طور سے ہے کہ : جب موسیٰ اپنی مدت کو ختم کر چکے اور اپنے خاندان کو ساتھ لے کر سفر پر روانہ

---

[۱] اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دس سال حضرت شعیبؑ کی خدمت کی۔ یہ ذکر کتاب وسائل الشیعہ، جلد ۱۵ ص۳۲ (کتاب النکاح ابواب المهور باب ۲۲ حدیث ۴) میں آیا ہے۔

[۲] اعلام قرآن ص۴۰۹ ۔

Marfat.com

ہو گئے تو اُنھیں طور کی جانب سے شعلۂ آتش نظر آیا۔ (فلما قضٰی موسی الاجل وسار باھلہ اٰنس من جانب الطور نارًا)۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہلِ خاندان سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو" مجھے آگ نظر آئی ہے۔ مَیں جاتا ہوں۔ شاید تمہارے لیے وہاں سے کوئی خبر لاؤں یا آگ کا ایک انگارا لے آؤں تاکہ تم اُس سے گرم ہو جاؤ: (قال لاھلہ امکثوا انی اٰنست نارًا لعلی اٰتیکم منھا بخبر او جذوۃ من النار لعلکم تصطلون)۔

"اٰنست" "ایناس" سے مشتق ہے جس کے معنیٰ مشاہدہ کرنے اور سکون و آرام سے دیکھنے کے ہیں۔

"جَذوۃ" "آگ کا ایک انگارا" بعض لوگوں نے اس کے معنیٰ "ایندھن کا بڑا ٹکڑا" لکھے ہیں۔ اور "اٰتیکم بخبر" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ راستہ بھول گئے تھے اور "لعلکم تصطلون" یہ اشارہ کر رہا ہے کہ سرد اور تکلیف دہ رات تھی۔

قرآن کی آیت میں حضرت موسیٰؑ کی زوجہ کی حالت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر تفاسیر اور روایات میں مذکور ہے کہ وہ اُمید سے تھیں اور انہیں دردِزہ ہو رہا تھا۔ اس لیے موسیٰ پریشان تھے۔

٭ ٭ ٭

حضرت موسیٰؑ جس وقت آگ کی تلاش میں نکلے تو اُنھوں نے دیکھا کہ:-

آگ تو ہے مگر معمول کی سی آگ نہیں ہے بلکہ حرارت اور سوزش سے خالی ہے۔ وہ نُور اور تابندگی کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی تھی۔

حضرت موسیٰؑ اس منظر سے نہایت حیران تھے کہ ناگہاں اُس پُر برکت سرزمین بلند میں وادی کے داہنی جانب سے ایک درخت میں سے آواز آئی: اے موسیٰ مَیں اللہ ربُّ العالمین ہوں (فلما اتاھا نودی من شاطیٔ الوادِ الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یا موسیٰ انی انا اللہ رب العالمین)۔

شاطئ : بمعنی ساحل۔

وادی : بمعنی درّہ یا پہاڑ میں وہ راستہ جہاں سے سیلاب گزرتا ہے۔

ایمن : جانب راست اور یہ "شاطی" کی صفت ہے۔

بُقعۃ : زمین کا وہ حصّہ جو اطراف کی زمین سے ممتاز ہو۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خدا کے اختیار میں ہے کہ جس چیز میں چاہے قوتِ کلام پیدا کر دے۔ یہاں اللہ نے درخت میں یہ استعداد پیدا کر دی۔ کیونکہ اللہ موسیٰؑ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ موسیٰؑ گوشت پوست کے انسان تھے، کان رکھتے تھے اور سُننے کے لیے انہیں امواجِ صوت کی ضرورت تھی۔ البتہ انبیاء پر اکثر یہ حالت بھی گزری ہے کہ وہ بطور الہام درونی پیغامِ الٰہی کو حاصل کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح کبھی اُنھیں خواب میں بھی ہدایت ہوتی رہی ہے۔ مگر کبھی وہ وحی کو بصورتِ صدا بھی سُنتے رہے ہیں۔ بہرکیف حضرت موسیٰؑ نے جو آواز سُنی اُس سے ہم ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ خدا جسم رکھتا ہے۔

بعض روایات میں مذکور ہے کہ موسیٰؑ جب آگ کے پاس گئے اور غور کیا تو دیکھا کہ درخت کی سبز شاخوں میں آگ چمک رہی ہے۔ اور لحظہ بہ لحظہ اُس کی تابش اور درخشندگی بڑھتی جاتی ہے۔ جو عصا اُن کے ہاتھ میں تھا اُس کے سہارے جھکے تاکہ اس میں سے تھوڑی سی آگ

Marfat.com

لے لیں۔ تو آگ موسیٰ کی طرف بڑھی۔ موسیٰ ڈرے اور پیچھے ہٹ گئے۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ کبھی موسیٰ آگ کی طرف بڑھتے تھے اور کبھی آگ اُن کی طرف۔ اسی کشمکش میں ناگہاں ایک صدا بلند ہوئی ___ اور اُنھیں وحی کی بشارت دی گئی۔

اس طرح ناقابلِ انکار قرائن سے حضرت موسیٰؑ کو یقین ہو گیا کہ یہ آواز خدا ہی کی ہے، کسی غیر کی نہیں ہے۔ لیکن اُس عظیم ذمہ داری کے اعتبار سے جو موسیٰؑ پر عائد کی گئی تھی لازم تھا کہ اُسی کے مطابق اُنھیں خدا کی طرف سے معجزات بھی عطا کیے جائیں۔ چنانچہ ان آیات میں دو اہم معجزات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اول یہ کہ موسیٰ سے کہا گیا کہ: "اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو"۔ چنانچہ موسیٰ نے عصا کو پھینک دیا۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ وہ عصا سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر موسیٰ ڈرے اور پیچھے ہٹ گئے۔ یہاں تک کہ مڑ کے بھی نہ دیکھا: (وان الق عصاك فلما رأها تهتز كانها جان ولى مدبرا ولم يعقب)۔

جس دن حضرت موسیٰؑ نے یہ عصا لیا تھا تاکہ تھکن کے وقت اُس کا سہارا لے لیا کریں اور بھیڑوں کے لیے اُس سے پتے جھاڑ لیا کریں اُنھیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ قدرتِ خدا سے اُس میں یہ خاصیت بھی چھپی ہوئی ہوگی اور یہ بھیڑوں کو چرانے کی لاٹھی ظالموں کے محل کو ہلا دے گی۔

موجوداتِ عالم کا یہی حال ہے کہ وہ بعض اوقات ہماری نظر میں بہت حقیر معلوم ہوتی ہیں مگر اُن میں بڑی بڑی استعداد چھپی ہوتی ہے جو کسی وقت خدا کے حکم سے ظاہر ہوتی ہے۔

اب موسیٰ نے دوبارہ آواز سنی جو اُن سے کہہ رہی تھی: واپس آ اور نہ ڈر تو امان میں ہے (یاموسیٰ اقبل ولا تخف انك من الامنين)

"جان" دراصل اُس شئے کو کہتے ہیں جو موجود تو ہو مگر نظر نہ آتی ہو۔ مجازاً "جان" اُن چھوٹے سانپوں کو کہتے ہیں جو گھاس کے ڈھیر یا زمین کے ڈانڈوں کے اندر سے گزرتے ہیں۔

البتہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں "ثعبان مبین" (واضح اژدھا) بھی کہا گیا ہے۔ (اعراف - ۱۰۷، شعرا - ۳۲)

ہم نے قبل ازیں کہا ہے کہ اُس سانپ کے لیے جو یہ دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ممکن ہے اُس کی دو مختلف حالتوں کے لیے ہوں کہ ابتدا میں وہ چھوٹا سا ہو اور پھر ایک بڑا اژدھا بن گیا ہو۔ اس مقام پر یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰؑ نے جب وادیٔ طور میں اُسے پہلی بار دیکھا تو چھوٹا سا سانپ تھا، رفتہ رفتہ وہ بڑا ہو گیا۔

بہر حال حضرت موسیٰؑ پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ درگاہ ربّ العزت میں مطلق امن و امان ہے اور کسی قسم کے خوف و خطر کا مقام نہیں ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو جو معجزات عطا کیے گئے اُن میں سے پہلا معجزہ خوف کی علامت پر مشتمل تھا۔ اُس کے بعد موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اب ایک دوسرا معجزہ حاصل کرو جو نور و اُمید کی علامت ہوگا۔ اور یہ دونوں معجزے گویا "انذار اور بشارت" تھے۔

موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو اور باہر نکالو۔ موسیٰ نے جب گریبان میں سے ہاتھ باہر نکالا تو وہ سفید تھا اور چمک رہا تھا اور اُس میں کوئی عیب اور نقص نہ تھا: (اُسلك يدك في جيبك تخرج بيضآء من غير سوٓء)۔

حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں یہ سفیدی اور چمک کسی بیماری (مثلاً برص یا کوئی اسی جیسی چیز) کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ یہ نورِ الٰہی تھا جو بالکل ایک نئی قسم کا تھا۔

Marfat.com

جب حضرت موسیٰؑ نے اُس سنسان کوہسار اور اُس تاریک رات میں یہ دو خارقِ عادت اور خلافِ معمول چیزیں دیکھیں تو اُن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ چنانچہ اس لیے کہ اُن کا اطمینانِ قلب واپس آجائے اُنھیں حکم دیا گیا کہ اپنے سینے پر اپنا ہاتھ پھیریں تاکہ دل کو راحت ہو جائے: (واضمم الیک جناحک من الرھب)۔

مذکورہ آیت کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد ہے کہ موسیٰ اپنے فرض کی ادائیگی اور پیامِ الٰہی کے پہنچانے میں ثابت قدم اور راسخ العزم رہیں اور کسی مقام اور دُنیا کی کسی طاقت سے خوف نہ کھائیں۔

بعض حضرات کا ذہن اِس طرف منتقل ہوا ہے کہ جس وقت عصا نے سانپ کی شکل اختیار کر لی تو موسیٰ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ اپنی مدافعت کریں لیکن خدا نے اُنھیں حکم دیا کہ اپنا ہاتھ روک لو اور نہ ڈرو، مدافعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ہاتھ کی بجائے یہاں جناح (بازو) کا استعمال نہایت فصیح ہے۔ غالباً اِس تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی حالت اُس پرندہ کی سی ہے کہ جب وہ کوئی خوفناک منظر دیکھتا ہے تو اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے لیکن جب وہ بحالتِ سکون میں ہوتا ہے تو اپنے پَر اور بازو سمیٹ لیتا ہے۔

اُس کے بعد موسیٰ نے پھر وہی صدا سُنی جو کہہ رہی تھی: خدا کی طرف سے تجھے یہ دو دلیلیں فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے مقابلے کے لیے دی جا رہی ہیں کیونکہ وہ سب لوگ فاسق تھے اور ہیں: (فذانک برھانان من ربک الی فرعون وملائہ انھم کانوا قوماً فاسقین)۔

یہ لوگ خدا کی اطاعت سے نکل گئے ہیں اور سرکشی کی انتہا تک جا پہنچے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ اُنھیں نصیحت کرو اور راہِ راست کی تبلیغ کرو اور اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں تو اُن سے جنگ کرو۔

٭ ٭ ٭

اِس موقع پر موسیٰؑ کو اپنی زندگی کا وہ اہم حادثہ یاد آگیا جو مصر میں پیش آیا تھا۔ یعنی ایک قبطی کو قتل کرنا۔ اور فرعون کی پولیس کا اُس قبطی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے پختہ ارادہ۔ اگرچہ موسیٰؑ ایک مظلوم کی حمایت میں اُس قبطی سے لڑے تھے مگر فرعون کی منطق میں یہ عُذر بے معنی تھا۔ وہ اب بھی تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اگر موسیٰؑ اُسے کہیں مل جائیں تو اُنھیں بے چون و چرا قتل کرا دے۔ اس لیے موسیٰ عرض کرتے ہیں: خدایا! میں نے تو اُن میں سے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ اُس کے انتقام میں مجھے قتل کر دیں گے اور میں اپنا فرض ادا نہ کرسکوں گا: (قال رب انی قتلت منھم نفساً فاخاف ان یقتلون)۔

(حضرت موسیٰؑ نے درگاہِ باری تعالیٰ میں عرض کی) علاوہ بریں میں تنہا ہوں اور میری زبان بھی فصیح نہیں ہے۔ تو میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ بھیج کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح زبان ہے تاکہ وہ میری مدد کرے اور تصدیق بھی۔ مجھے اِس بات کا خوف ہے کہ میں تنہا ہوں کا تو لوگ مجھے جھٹلائیں گے: (واخی ھارون ھو افصح منی لساناً فارسلہ معی رداً یصدقنی انی اخاف ان یکذبون)۔

"افصح" کا مادہ "فصیح" ہے۔ اِس کے لغوی معنی کسی چیز کے خالص ہونے کے ہیں۔ مراد ہے "سخنِ خالص" یعنی ہر قسم کے حشو و زواید سے خالی۔

Marfat.com

"ردء" بمعنی معین و یاور۔

بہرحال چونکہ یہ ماموریت بہت اہم اور عظیم تھی، اس لیے حضرت موسیٰؑ کی آرزو تھی کہ اُنھیں شکست ہرگز نہ ہو۔ اس لیے اُنھوں نے خدا سے یہ تقاضا کیا۔

٭ ٭ ٭

خدا نے بھی اُن کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اُنھیں اطمینان دلایا اور فرمایا: ہم تمہارے بازوؤں کو تمہارے بھائی کے وسیلہ سے محکم کریں گے: (قال سنشد عضدك باخيك)۔

اور تمہیں ہر مرحلے پر غلبہ اور برتری عطا کریں گے: (ونجعل لكما سلطانا)۔

قطعی مطمئن رہو! وہ لوگ ہرگز تم پر غالب نہ ہوں گے اور ان معجزوں کی برکت سے وہ نہ تو تم پر مسلط ہوں گے نہ تمہارے مقابلے میں فتح مند ہوں گے: (فلا يصلون اليكما باياتنا)۔

بلکہ تم اور تمہارے پیرو ہی غالب اور فیروز مند رہیں گے: (انتما ومن اتبعكما الغالبون)۔

یہ کیسی عظیم نوید اور کتنی بزرگ بشارت تھی۔ ایسی نوید و بشارت جس نے موسیٰ کے دل کو گرم، اُن کے ارادہ کو پختہ اور عزم کو محکم کر دیا۔ اس نوید کے روشن اثرات کو ہم اس داستان کے آئندہ بیان میں دیکھیں گے۔[1]

[1] اسی حوالے سے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۳، ۶ اور ۱۵ میں بالترتیب سورۂ طٰہٰ، اعراف اور شعراء کی تفسیر میں مزید مباحث بھی موجود ہیں۔

Marfat.com

۳۶۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِىْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○
۳۷۔ وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّىْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ
وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۶۔ جس وقت موسٰی ہمارے روشن معجزات لے کر اُن کے پاس آیا تو اُنھوں نے کہا: یہ تو جادو کے علاوہ کچھ نہیں ہے، جسے غلط طور پر خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے اور ہم نے اپنے گزشتہ بزرگوں میں کوئی ایسی بات نہیں سُنی۔

۳۷۔ موسٰی نے کہا: میرا خدا اُن لوگوں کو جو اُس کی طرف سے ہدایت لائے ہیں اور اُن لوگوں کو جن کے لیے آخر کار دنیا و آخرت کا گھر ہے، خوب جانتا ہے۔ یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔

تفسیر

مُوسٰی فرعون کے مقابلے میں:

اس مقام پر اس رُوداد کا آٹھواں حصہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسٰیؑ کو اُس مقدس مقام پر خدا کی طرف سے نبوّت اور رسالت کا فرمان مل گیا۔ وہ مصر میں آئے اور اپنے بھائی ھارونؑ کو مطلع کیا اور وہ رسالت جس کے لیے آپ مبعوث تھے، اُس کا پیغام اُسے پہنچایا۔ پھر یہ دونوں بھائی فرعون سے ملاقات کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ آخر بڑی مشکل سے اُس کے پاس پہنچ سکے۔ اس وقت فرعون کے وزراء اور مخصوص لوگ اُسے گھیرے ہوتے تھے۔ حضرت موسٰیؑ نے اُن سب کو خدا کا پیغام سنایا۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ پیغامِ حق سُن کر اُن کا ردِ عمل کیا ہوا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں خدا فرماتا ہے کہ جس وقت موسٰی ہمارے روشن معجزات لے کر اُن لوگوں کے پاس گئے تو اُنھوں نے کہا: "یہ تو جادو کے علاوہ کچھ نہیں ہے جسے غلط طور پر خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے"۔ (فلما جآءھم موسٰی باٰیاتنا بینات قالوا ما ھٰذا الا سحر مفتری)۔

ہم نے ایسی بات اپنے بزرگوں میں کبھی نہیں سُنی۔ (وما سمعنا بھٰذا فی اٰبائنا الاولین)۔

Marfat.com

اُنھوں نے حضرت موسیٰؑ کے روشن معجزات کے مقابلے میں وہی حربہ اختیار کیا جو پُوری تاریخ میں تمام ظالم و جابر اور گمراہ لوگ انبیاً کے معجزات کے مقابلے میں اختیار کرتے رہے تھے۔

اور وہ تھا جادوگری کا الزام کیونکہ معجزہ بھی خارق عادت ہوتا ہے اور جادو بھی لیکن یہ کہاں اور وہ کہاں! **جادُوگر** گمراہ اور دُنیا پرست لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کے عملیات کی بنیاد تحریف حقائق پر ہے۔ اس علامت سے اُن کی حقیقت کو خُوب پہچانا جا سکتا ہے جبکہ انبیاکے پیغام حق اور اس کی صداقت پر اُن کے معجزات گواہ ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ چونکہ ساحروں کا بھروسہ بشری طاقتوں پر ہوتا ہے اِس لیے ہمیشہ اُن کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔ لیکن انبیا کے پاس الٰہی طاقت ہوتی ہے لہٰذا اُن کے معجزات عظیم اور نامحدُود ہوتے ہیں۔

قرآن میں "**اٰیات بیّنات**" بطور جمع استعمال ہوا ہے۔ مراد اس سے وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئے تھے۔ بظاہر ذکر دو ہی معجزوں کا ہے۔ مگر ممکن ہے اُنھیں ان دو معجزوں کے علاوہ بھی معجزے دیئے گئے ہوں۔ یا یہ دو معجزے متعدد معجزوں سے مرکب ہوں۔

عصا کا اژدھے کی صُورت میں متشکل ہو جانا ایک عظیم معجزہ ہے اور پھر اُس کا پہلی حالت پر واپس آجانا ایک اور معجزہ ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کا چمک اُٹھنا ایک معجزہ ہے اور پھر اُس کا حالت اصلی اختیار کر لینا دوسرا معجزہ ہے۔

کلمہ "**مفتری**" کا مادہ "فریہ" ہے جس کے معنی تہمت اور دروغ کے ہیں۔ مصر کے لوگوں نے یہ کلمہ اس لیے استعمال کیا کہ وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ موسیٰؑ نے خدا کا نام لے کر جھُوٹ بولا ہے۔

اور اہلِ مصر کا یہ کہنا کہ " ہم نے ایسی بات اپنے باپ دادا سے کبھی نہیں سُنی"۔

اُس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ سے قبل اس ملک میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوّت اور اُن کے پیغام کی شہرت پہنچ چکی تھی یا ممکن ہے کہ اُنھوں نے یہ بات اس وجہ سے کہی ہو کہ ان واقعات کو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا اور وہ حق کو فراموش کر چکے تھے یا ہو سکتا ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اجداد کو ایسا پیغام دیا گیا تھا مگر اُنھوں نے قبول نہیں کیا۔

⁂

لیکن حضرت موسیٰ نے اُن کفار کے جواب میں تہدید آمیز لہجے میں کہا: میرا خدا اُن لوگوں کے حال سے، جو اُس کی طرف سے انسانوں کے لیے ہدایت لاتے ہیں، خوب آگاہ ہے اور اُس شخص کو بھی خُوب جانتا ہے جس کے لیے دارِ آخرت ہے: (وقال موسیٰ ربی اعلم بمن جآء بالھدٰی من عندہ ومن تکون لہٗ عاقبۃ الدار)۔

اِس قول سے حضرت موسیٰؑ کا مقصود یہ تھا کہ خدا میرے حال سے خُوب آگاہ ہے۔ ہر چند کہ تم مجھے دروغ گوئی سے متہم کرتے ہو۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ خدا ایک جھُوٹے شخص کو ایسے معجزات کیونکر عطا کر سکتا ہے کہ جو اُس کے بندوں کو گمراہ کرتا پھرے۔ خدا میرے دل کا حال خُوب جانتا ہے اور خدا نے مجھے یہ معجزات عطا کیے ہیں وہ میرے پیغام کی حقانیت پر دلیل وافی ہیں۔

علاوہ بریں " جھُوٹ کے پَیر نہیں ہوتے" جھُوٹے آدمی کا کام ایک قلیل مدت تک ہی چلتا ہے اور پھر اُس کا پردہ فاش ہو

Marfat.com

جاتا ہے۔ تم عنقریب دیکھ لوگے کہ ہم میں سے کون کامیاب ہوتا ہے اور شکست و رُسوائی کس کی قسمت میں ہے۔
مطمئن رہو اگر میں دروغ گو ہوں تو ظالم ہوں اور ظالموں کو کبھی فلاح نہیں ہوتی۔ (انه لا یفلح الظالمون)۔
اور اس آیت کا مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر ۶۹ کے مطابق ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے:

ولا یفلح الساحر حیث اتٰی

ساحر جہاں بھی جائے گا اسے فلاح نہ ہوگی۔

اس مقام پر یہ احتمال بھی ہے کہ آیت میں فرعون اور اس کے مفسد اور متکبر ساتھیوں کی نفسانی حالت کی طرف اشارہ ہو کہ تم لوگ میرے معجزات کو دیکھ کر دل میں تو مجھے برحق سمجھ گئے ہو مگر اپنی خباثتِ نفس کی وجہ سے میری مخالفت کرتے ہو۔ مگر اچھی طرح سمجھ لو کہ تم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے اور انجام کار میرے حق میں ہوگا نہ کہ تمہارے۔ "عاقبة الدار" سے مراد ممکن ہے کہ دُنیا کا انجام یا دارِ آخرت یا دونوں ہوں۔ البتہ تیسرے معنی زیادہ جامع اور زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اِس منطقی اور مُہذب جواب سے اُن کی اِس دُنیا اور آخرت دونوں میں رُوسیاہی کو اُن پر واضح کر دیا۔

Marfat.com

٣٨۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي
فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَىٰ
إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝

٣٩۔ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ
إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ۝

٤٠۔ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝

٤١۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا
يُنْصَرُونَ ۝

٤٢۔ وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوحِينَ ۝

ترجمہ

٣٨۔ فرعون نے کہا : اے (دربارنشیں) سردارو ! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی کو خدا نہیں جانتا (لیکن مزید تحقیق کے لیے) اے ھامان! تو میرے لیے مٹی پر آگ جلا (یعنی اینٹیں پکا) اور پھر میرے لیے ایک بلند بُرج تعمیر کرتا کہ مجھے موسیٰ کے خدا کا پتہ چلے۔ اگرچہ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

٣٩۔ وہ (فرعون) اور اُس کے لشکر زمین میں ناحق مغرور ہو رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

٤٠۔ پس ہم نے اسے اور اس کی افواج کو پکڑ لیا اور اُنھیں غرقِ دریا کر دیا۔ دیکھو! کہ ظالموں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

٤١۔ اور ہم نے اُن کو ایسے پیشوا قرار دیا جو (جہنم کی) آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور قیامت کے دن اُن کی مدد نہ کی جائے گی۔

٤٢۔ اور ہم نے اِس دُنیا میں اُن کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے روز وہ بدحالوں میں سے ہوں گے۔

Marfat.com

تفسیر

ظالموں کا انجام :

اس مقام پر ہم اس تاریخ کے نویں سبق آموز حصّے کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو میدانِ مقابلہ سے ہٹانے کے لیے ایک برج بنانے کا منصوبہ بنایا۔

ہم جانتے ہیں کہ منجھے ہوئے سیاستدانوں کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ اُن کی میلانِ طبع کے خلاف پیش آجاتا ہے تو وہ عوام کی توجہ اُس سے منحرف کرنے کے لیے فوراً کوئی نئی چال چلتے ہیں۔ تاکہ عوام کی توجہ اُن ہی کی طرف رہے۔

یوں لگتا ہے کہ فرعون نے نہایت بلند برج بنانے کا حکم حضرت موسیٰؑ کے جادوگروں سے مقابلے کے بعد دیا ہوگا۔ کیونکہ قرآن مجید میں سُورہ مومن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منصوبہ اُس وقت بنایا گیا تھا جب کہ فرعون کے اہل کار موسیٰؑ کو قتل کرنے کی تجویز کر رہے تھے اور مومن آلِ فرعون اُنھیں بچانے کی تدابیر کر رہا تھا۔ نیز یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساحروں سے پہلے اس تجویز کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ حضرت موسیٰؑ کی صداقت کی تحقیق اور اُنھیں جادوگروں سے شکست دلانے میں مشغول تھے۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے ساحروں سے مقابلے کا حال سورہ طٰہٰ، اعراف، یونس اور شعراء میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس مقام پر اُس تفصیل سے قطع نظر کرکے ہم صرف تعمیر برج کے واقعے کا ذکر کرتے ہیں جو صرف اس سورۃ اور سورۃ مومن میں بیان ہوا ہے۔

جادوگروں پر حضرت موسیٰؑ کی فتح کا حال تمام مملکتِ مصر میں مشہور ہو گیا تھا۔ جادوگروں کے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے سے خطرہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اور حکومت فرعون کی پوزیشن سخت خطرے سے دوچار ہوگئی تھی۔ ملک کے عوام جنہیں غلام بنا رکھا تھا، اُن کے بیدار ہونے کا احتمال ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس نازک وقت میں لازمی تھا کہ ہر قیمت پر عوام کی توجہ اس مسئلے سے ہٹائی جائے۔ اور اُن کے ذہن کو کسی اور طرف مشغول کرنے، اُنھیں اصل مسئلے سے غافل کرنے اور بے وقوف بنانے کے لیے کوئی تدبیر کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کی طرف سے اُن کے لیے عطا و بخشش کا سلسلہ بھی جاری ہو۔

فرعون نے اس معاملے میں اپنے اہل دربار سے مشورہ کیا۔ وہ اُس نتیجے پر پہنچا جس کا ذکر زیر بحث پہلی آیت میں آیا ہے:

فرعون نے کہا: اے میرے امراء و وزراء! مجھے تمہارے لیے اپنے سوا کسی خدا کا علم نہیں۔ (وقال فرعون یاایھا الملأ ما علمت لکم من الٰہ غیری)۔

مسلمہ طور پر زمین کا خدا میں ہوں۔ رہا آسمان کا خدا اُس کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ لیکن میں احتیاط سے گریز نہیں کرتا اور آسمانی خدا کے متعلق تحقیق کرتا ہوں اس کے بعد اس نے ہامان کی طرف رُخ کیا اور کہا: اے ہامان! تُو آگ جلا کر اینٹیں پکا! (فاوقدلی یا ھامان علی الطین)۔

اس کے بعد تُو میرے لیے ایک بہت بلند برج بنا تاکہ میں اُس پر چڑھوں اور موسیٰ کے خدا کو تلاش کروں، ہرچند کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ سچا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹوں میں سے ہے: (فاجعل لی صرحا لعلی اطلع الی الٰہ موسیٰ وانی لاظنہ

Marfat.com

من الکاذبین)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرعون نے " اینٹ " کا لفظ کیوں استعمال نہیں کیا اور صرف یہ کہا کر " مٹی پر آگ جلا " ؟

اس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُس زمانے میں ابھی پختہ اینٹیں بنانے کا رواج نہ تھا۔ اینٹ فرعون کے دور میں ایجاد ہوئی۔ مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ طرزِ بیان بھی متکبرانہ ہے جیسا کہ جابر بادشاہوں کا طرزِ گفتگو ہوتا ہے۔

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ کلمہ " آجر " (یعنی اینٹ) کوئی فصیح لفظ نہیں ہے کہ قرآن میں استعمال ہوتا اُس کی بجائے " طین " (مٹی) استعمال کیا گیا ہے۔

اس مسئلے میں مفسرین کے ایک گروہ نے (مثلاً فخر رازی اور آلوسی نے) یہ سوال بھی اُٹھایا ہے کہ آیا! فرعون نے اپنا مجوزہ بلند مینار تعمیر کرایا تھا یا نہیں ؟

ان مفسرین کا ذہن اس طرف اس لیے منتقل ہوا کہ مینار کی تعمیر کا کام کسی طرح بھی عاقلانہ نہ تھا۔ کیا اُس عہد کے لوگ کبھی بلند پہاڑوں پر نہیں چڑھے تھے ؟ اور انھوں نے آسمان کے منظر کو ویسا ہی نہیں دیکھا تھا جیسا کہ وہ زمین سے نظر آتا ہے ؟ کیا انسان کا بنایا ہوا مینار پہاڑ سے زیادہ اُونچا ہو سکتا ہے ؟ کیا کوئی احمق بھی یہ یقین کر سکتا ہے کہ ایسے مینار پر چڑھ کر آسمان کو چھوا جا سکتا ہے ؟ لیکن ـــــ وہ مفسرین جنھوں نے یہ اشکالات پیدا کیے ہیں اُن کی توجہ ان نکات کی طرف نہیں گئی کہ **اول** تو ملکِ مصر کوہستانی نہیں ہے۔ **دوم** یہ کہ انھوں نے اُس عہد کے لوگوں کی سادہ لوحی کو فراموش کر دیا کہ اُن سیدھے سادے لوگوں کو ایسے ہی مسائل سے غافل کیا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خود ہمارے زمانے میں جسے عصرِ علم و دانش کہا جاتا ہے، لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لیے کیسے کیسے مکر و فریب اور حیلہ سازیاں کی جاتی ہیں۔

بہرکیف ـــــ بعض تواریخ کے بیان کے مطابق، ھامان نے حکم دیا کہ ایسا محل اور بُرج بنانے کے لیے زمین کا ایک وسیع قطعہ انتخاب کریں اور اس کی تعمیر کے لیے پچاس ہزار معمار اور مزدور روانہ کر دے اور اس عمارت کے واسطے مٹیریل فراہم کرنے کے لیے ہزاروں آدمی مقرر کیے گئے۔ اُس نے خزانہ کا منہ کھول دیا اور اس مقصد کے لیے کثیر رقم خرچ کی۔ یہاں تک کہ تمام ملکِ مصر میں اس عظیم بُرج کی تعمیر کی شہرت ہو گئی۔

یہ عمارت جس قدر بھی بلند سے بلند تر ہوتی جاتی تھی۔ لوگ اتنے ہی زیادہ اُسے دیکھنے آتے تھے اور منتظر تھے کہ دیکھیے فرعون یہ عمارت بنا کر کیا کرتا ہے ؟

یہ عمارت اتنی بلند ہو گئی کہ اُس سے دُور دُور تک اطراف و جوانب کا میدان نظر آنے لگا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ معماروں نے اُس کی مارپیچ سیڑھیاں ایسی بنائی تھیں کہ آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر اُس پر چڑھ سکتا تھا۔[1]

جب وہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور اُسے مزید بلند کرنے کا کوئی امکان نہ رہا تو ایک روز فرعون پوری شان و شوکت سے وہاں آیا اور بذاتِ خود برج پر چڑھ گیا۔ جب وہ بُرج کی چوٹی پر پہنچا اور آسمان کی طرف نظر اُٹھائی تو اُسے آسمان ویسا ہی نظر آیا جیسا کہ وہ زمین سے دیکھا

[1] یہ مؤرخین کا طبع زاد افسانہ ہے۔ موجودہ قاہرہ کے جنوب میں فرعون کے دارالسلطنت کے کھنڈرات موجود ہیں۔ وہاں اس قسم کی عمارت کا کوئی نشان نہیں ہے۔

Marfat.com

کرتا تھا۔ اُس منظر میں ذرا بھی تغیر و تبدیلی نہ تھی۔

مشہور یہ ہے کہ اُس نے مینار پر چڑھ کے کمان میں تیر جوڑا اور آسمان کی طرف پھینکا یا تو وہ تیر کسی پرندے کے لگا یا پہلے سے کوئی سازش کی گئی تھی کہ تیر خون آلود واپس آیا۔ تب فرعون وہاں سے نیچے اُتر آیا اور لوگوں سے کہا: جاؤ، مطمئن رہو اور کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ میں نے موسیٰ کے خدا کو مار ڈالا ہے۔[1]

یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ سادہ لوحوں اور اندھی تقلید کرنے والوں کے ایک گروہ نے اور اُن لوگوں نے جن کی آنکھیں اور کان حکومتِ وقت کے پروپیگنڈے سے بند ہو گئے تھے، فرعون کے اس قول کا یقین کر لیا ہو گا اور ہر جگہ اس خبر کو عام کیا ہو گا اور مصر کی رعایا کو غافل رکھنے کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا ہو گا۔

مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمارت دیر تک قائم نہیں رہی (اور اُسے رہنا بھی نہ چاہیئے تھا) تباہ ہو گئی۔ بہت سے لوگ اُس کے نیچے دب کے مر گئے۔ اِس سلسلے میں اہلِ قلم نے اور بھی طرح طرح کی داستانیں لکھی ہیں لیکن اُن کی صحت کی تحقیق نہ ہو سکی اس لیے انھیں قلم زد کر دیا گیا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ فرعون نے یہ جُملہ کہہ کر:

ماعلمت لکم من الٰہٍ غیری

مجھے تمہارے لیے اپنے سوا کسی خدا کا علم نہیں۔

بڑی شیطنت کا ثبوت دیا تھا جملے سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی اُلوہیت کو تو مسلّم سمجھتا تھا اور قابلِ بحث صرف یہ پہلو چھوڑ دیا کہ اُس کے علاوہ کوئی اور خدا بھی ہے یا نہیں؟

اور چونکہ خدائے برحق کے عدمِ وجود کے لیے اُس کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اس لیے یہاں ایک مغالطہ پیدا کرتا ہے اور اپنے علاوہ کسی اور دوسرے خدا کا عدم وجود ثابت کرنے کے لیے ایک بلند برج بنانے کا حکم دے کر لوگوں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹانا چاہتا ہے۔

یہ سب باتیں اس حقیقت کی علامت ہیں کہ وہ معاملے کو خوب سمجھتا تھا مگر مصر کے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اور اپنی پوزیشن بچانے کے لیے بہانوں سے کھیل رہا تھا۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد قرآن مجید میں فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے تکبّر اور اُن کے مبداء و معاد سے انکار کا ذکر ہے۔ کیونکہ اُن کے تمام گناہوں کا سرچشمہ ان ہی دو حقائق کا انکار تھا۔ چنانچہ قرآن شریف میں یہ ذکر اس طرح ہے: فرعون اور اُس کے فوجیوں نے ناحق زمین پر تکبّر کیا اور خدا کا (جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے) انکار کیا۔ انھوں نے یہ گمان کیا کہ قیامت آنے والی نہیں ہے اور وہ ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے: (واستکبر ہو وجنودہٗ فی الارض بغیر الحق وظنوا انھم الینا لا یرجعون)۔

ایسا انسان ضعیف البنیان جو کسی وقت اپنے اُوپر سے مچھر بھی نہیں اُڑا سکتا اور کبھی ایک جراثیم (جو صرف خوردبین ہی سے نظر آتا ہے) قوی ترین انسان کو تہہ خاک پہنچا دیتا ہے، کیونکر اپنی ذات پر غرور کر سکتا ہے اور کس طرح اُلوہیت کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

[1] اقتباس از تفسیر ابوالفتوح رازی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں، جلد ۸، صفحہ ۴۹۲۔

Marfat.com

مشہور حدیث قدسی میں خدا فرماتا ہے :

الکبریاء ردائی، والعظمة ازاری، فمن نازعنی واحداً منهما القیته فی النار

بزرگی میری ردا ہے اور عظمت میرا لباس ہے جو میری قامت کبریائی پر سلا ہوا ہے جو شخص ان دو چیزوں میں مجھ سے منازعت کرے گا، میں اُسے دوزخ میں ڈال دوں گا۔ ؎

ظاہر ہے کہ خدا کو تو ان توصیفات کی ضرورت نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان کی سرکشی اور عصیان کوشی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اپنی حقیقت کو بھُول جاتا ہے اور اُس کا سر کبر و غرور سے بھر جاتا ہے۔

٭ ٭ ٭

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کبر و غرور کا انجام کیا ہوا۔ قرآن میں یوں فرمایا گیا ہے کہ : ہم نے اُسے اور اُس کے فوجیوں کو پکڑا اور دریا میں ڈبو دیا : (فاخذناه وجنوده فنبذناهم فی الیم) ۔

البتہ وہ دریا جو اُن کی حیات کا باعث تھا (یعنی اہل مصر کی معاش کا مدار جس کے پانی اور اس کے سیلاب پر تھا) ہم نے اسی کو اُن کی موت کا سبب بنا دیا۔ اور دریائے نیل کو جو اُن کی قدرت اور عظمت کا باعث تھا، ہم نے اُسے اُن کا قبرستان بنا دیا۔

اِس آیت میں کلمہ " نبذناهم " استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ " نبذ " ہے (بروزن " نبض ") اس کے معنی ہیں " بے قدر اور بیکار چیزوں کو دُور پھینک دینا "۔ یہاں قرآن کی بلاغت جاذب توجہ ہے کہ ہم نے ان بے قدر اور بیکار چیزوں (فرعون اور اُس کے ساتھیوں) کو دُور پھینک دیا اور زمین کو اُن کے ناپاک وجود سے پاک کر دیا۔

آیت کے آخر میں رُوئے سُخن پیغمبر اسلامؐ کی طرف ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے دیکھو ظالموں کا انجام کیسا تھا ؟ (فانظر کیف کان عاقبة الظالمین) ۔

آیت میں کلمہ " انظر " چشم ظاہر کے لیے نہیں بلکہ چشم باطن کے لیے ہے اور کلمہ " ظالمین " صرف زمانۂ ماضی کے سرکشوں کے لیے نہیں بلکہ اِس زمانے کے ستمگروں کا انجام بھی یہی ہے۔

آیت نمبر ۴۱ میں فرمایا گیا ہے : ہم نے اُن کو ایسا پیشوا بنایا ہے جو آتش دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور قیامت کے روز کوئی بھی اُن کا مددگار نہ ہوگا : (وجعلناهم ائمة یدعون الی النار ویوم القیامة لا ینصرون) ۔

مفسرین کو اِس آیت کی تفسیر میں یہ مشکل پیش آئی ہے کہ خدا کا کام تو خیر کی طرف دعوت دینا ہے اور ایسے امام مقرر کرنا ہے جو پیشوایانِ حق ہوں۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا ایسے پیشوایانِ باطل مقرر کرے جو اُس کی مخلوق کو آگ کی طرف دعوت دیں۔

لیکن ــــ غور کیا جائے تو یہ مشکل لاینحل نہیں ہے۔ کیونکہ " ائمۂ نار " دوزخیوں کے پیشوا ہیں۔ جس وقت ضالین کے گروہ دوزخ کی طرف حرکت کریں گے تو وہ اُن کے آگے آگے ہوں گے۔ نیز جس طرح وہ دنیا میں " آئمہ ضلال " تھے۔ آخرت میں بھی دوزخیوں کے پیشوا ہوں گے کیونکہ وہ جہان اِس جہان کی ایک وسیع تر تجسیم ہے۔

دوم یہ کہ " آئمہ ضلال " خدا نہیں بناتا بلکہ یہ خود انہی کا نتیجۂ اعمال ہوگا۔ یہ مسلّم ہے کہ ہر علت کا معلول اور ہر سبب کا مسبّب فرمانِ الٰہی

؎ تفسیر رُوح المعانی، تفسیر کبیر از فخر رازی، تفسیر المیزان نیز دیگر تفاسیر۔ اس آیت کے متعلق۔

Marfat.com

سے ظہور میں آتا ہے۔ چونکہ اُنھوں نے وہ راہِ عمل اختیار کی جو امامت ضالین پر منتہی ہوتی تھی لہٰذا نتیجتاً وہ داعی الی النار ٹھہرے اور اُن کی یہ وضع بروز قیامت ہوگی۔

٭ ٭ ٭

پھر تاکید مزید کے لیے قرآن میں دُنیا اور آخرت میں اُن کے چہرے کی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے: اس دنیا میں ہم نے اُن کے نصیب میں لعنت کی ہے اور بروز قیامت اُن کے چہرے مکروہ وسیاہ ہوں گے: (واتبعناھم فی ھٰذہ الدنیا لعنۃ ویوم القیامۃ ھم من المقبوحین)[1]

"لعنت خدا" کا مطلب "رحمت الٰہی" سے محروم ہونا ہے اور لعنتِ فرشتگان و مومنین سے مراد نفرین ہے جو صبح و شام اُن پر نازل ہوتی ہے۔ ظالمین و مستکبرین کبھی تو عام لعنت کے حقدار ٹھہرتے ہیں اور کبھی اُن پر خصوصیت سے لعنت و نفرین ہوتی ہے۔ کیونکہ جو آدمی بھی تاریخ میں ان کے حالات پڑھتا ہے ان پر لعنت و نفرین بھیجتا ہے۔

بہر حال دُنیا کے یہ بدسیرت اُس جہان میں بدصُورت ہوں گے۔ کیونکہ وہ دن "یوم البروز" ہوگا اور اُس روز ہر شخص کے حال سے پردہ اُٹھ جانے گا۔

چند اہم نکات

ائمۂ نور اور ائمۂ نار: قرآن شریف میں دو قسم کے اماموں کا ذکر ہے۔ ایک امام تو پیشوائے متقین ہے جو راہِ راست اور دینِ حق کی طرف ھدایت کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ انبیاء کی آیت ۷۳ میں پیغمبروں کے ایک گروہ کے متعلق ہم یوں پڑھتے ہیں:

وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا واوحینا الیھم فعل الخیرات و
اقام الصلٰوۃ وایتاء الزکٰوۃ وکانوا لنا عابدین

ہم نے اُن کو پیشوا بنایا تھا کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ھدایت کرتے تھے۔ ہم نے اُن کو وحی کی کہ وہ نیک کام کریں، نماز پڑھیں اور زکٰوۃ ادا کریں اور وہ صرف ہمارے ہی عبادت گزار تھے۔

یہ ایسے امام تھے جن کے فرائضِ عمل بالکل واضح تھے۔ اُن کے فرائضِ عمل کی فہرست توحید خالص، خیر اور نیکی کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور حق و عدالت پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ امامانِ نور تھے کہ اُن کا سلسلہ انبیاء اور اوصیا سے گزرتا ہوا جناب خاتم المرسلین تک آتا ہے۔

دوسری قسم کے امام رہبرانِ ضلال و گمراہی ہیں اور آیاتِ زیرِ بحث کی رُو سے وہ "آئمۂ نار" ہیں۔

پیشواؤں کے دو گروہوں کی خصوصیات جیسی کہ امام جعفر صادق ؑ سے منقول ہے یہ ہیں:

---

[1] "مقبوح" کا مادہ "قبح" ہے جس کے معنی ہیں "زشتی" اور یہ کہ بعض مفسرین نے جو "مقبوح" کے معنی "دھتکارا ہوا"، "رسوا یا مغضوب یا اور اسی طرح کے لکھے ہیں، یہ سب تفاسیر مجازی ہیں جسے لزومی معنی کہتے ہیں۔ وگرنہ "مقبوح" کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں۔

Marfat.com

"اُن میں سے گروہ اول خدا کے فرمان کو مخلوق کی رائے اور اپنے ارادے پر مقدم رکھتے ہیں اور اُسی کے حکم کو برترین فرمان سمجھتے ہیں"۔

لیکن گروہ دوم اپنی رائے کو خدا کے حکم پر مقدم سمجھتے ہیں اور اپنے حکم کو خدا کے فرمان پر ترجیح دیتے ہیں [1]

اہل نظر کے لیے ان دونوں قسم کے اماموں میں امتیاز کرنا اس معیار کی روشنی میں آسان ہو جائے گا جو امام صادقؑ نے بیان فرمایا ہے :

بروز قیامت جب اعمال حسن و قبیح کے مطابق مخلوق کی صف بندی ہوگی تو ہر گروہ اپنے اپنے امام کے پیچھے چلے گا۔ ناری گروہ کسی ناری امام کو تلاش کرلے گا اور نُوری گروہ امامِ ہدایت کے پیچھے ہو گا۔

چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے :

يوم ندعوا كل أناس بامامهم

وہ ایسا دن ہوگا کہ ہم ہر گروہ کو اُس کے امام کے ساتھ بلائیں گے ۔ (بنی اسرائیل - ۷۱)

ہم نے بارہا اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ میدانِ قیامت اس تنگ دُنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور عظیم ہوگا۔ اس جہانِ فانی میں جن لوگوں نے جس امام کی بھی پیروی کی ہے اور اُس کے معتقد رہے ہیں، روزِ محشر بھی وہ اُسی کے ساتھ ہوں گے ۔

بشر بن غالب یوں بیان کرتا ہے کہ میں نے ابوعبداللہ امام حسین علیہ السلام سے يوم ندعوا كل أناس بامامهم کی تفسیر پوچھی۔ تو امامؑ نے فرمایا :

"امام دعا الى هدى فاجابوه اليه، وامام دعا الى ضلالة فاجابوه اليها، هؤلاء في الجنة وهؤلاء في النار وهو قوله عزّوجل" فريق في الجنّة و فريق في السعير"

ایک امام تو وہ ہے جو ھدایت کی طرف بُلاتا ہے اور ایک گروہ اُس کی دعوت کو قبول کرلیتا ہے ۔ اور ایک امام وہ ہے جو گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے اور ایک گروہ اُس کی بھی پیروی کرنے لگتا ہے ۔ پہلا گروہ اہل جنّت میں سے ہے اور دوسرا دوزخی ہے اور خدا کے اس فرمان کا کہ ایک فریق جنّت میں ہوگا ، اور ایک دوزخ میں' یہی مطلب ہے ۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ وہ فرعون جو حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے پیرووں کے آگے آگے چل رہا تھا ، یہاں تک کہ اُس نے اُن سب کو دریائے نیل کی موجوں میں غرق کر دیا ، بروز قیامت بھی وہ اُس گمراہ گروہ کے آگے آگے ہوگا اور اُنھیں دریائے آتش میں ڈبو دے گا ۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے :

يقدم قومه يوم القيامة فاوردهم النار

---

[1] تفسیر صافی ذیل آیات زیر بحث ۔

Marfat.com

بروزِ قیامت وہ اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا۔ یہاں تک کہ وہ انھیں آگ میں داخل
کر دے گا۔ (ھود۔ ۹۸)

ہم اس بحث کو سوائے کائنات امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ایک قول پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے منافقین کے ایک گروہ کے متعلق فرمایا:

ثمّ بقوا بعدہ، فتقربوا الی ائمۃ الضلالۃ، والدعاۃ الی النار بالزور والبهتان، فولوهم الاعمال وجعلوهم حكاما على رقاب الناس

یہ گروہ منافقین رسول اللہؐ کی وفات کے بعد بھی باقی رہا۔ اور انھوں نے آئمہ ضلال کی قربت اختیار کر لی اور اُن لوگوں کی پیروی کی جو دروغ اور بہتان کے ساتھ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔ ان آئمہ ضلال نے اُن کے وجود سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ انہیں عہدے اور منصب عطا کیے ___ اور اُنھیں حکام بنا کر مخلوق کی گردنوں پر سوار کر دیا۔

Marfat.com

٤٣۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ
الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ ○

٤٤۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ
مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ○

٤٥۔ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ
ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا
مُرْسِلِيْنَ ○

٤٦۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ
رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○

ترجمہ

٤٣۔ پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسٰی کو کتاب دی۔ ایسی کتاب جو لوگوں کے لیے بصیرت آفریں تھی اور ہدایت و رحمت کا باعث تھی تاکہ وہ غور وفکر کریں۔

٤٤۔ اور جب ہم نے موسٰی کی طرف فرمانِ نبوت بھیجا تو اُس وقت تو مغربی گوشے میں موجود نہ تھا اور نہ تو اُس واقعے کے دیکھنے والوں میں سے تھا۔

٤٥۔ لیکن ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف قومیں پیدا کیں اور اُن پر طولانی زمانے گزر گئے (اور انبیاء کے آثار ان کے دلوں سے محو ہو گئے لہذا تجھے تیری آسمانی کتاب کے ساتھ بھیجا) اور تو اہلِ مدین میں سے نہ تھا کہ اُن (مشرکینِ مکہ) کو اس بارے میں ہماری آیات پڑھ کر سناتا۔ مگر یہ کہ ہم نے تجھے بھیجا (اور تجھے یہ خبریں دیں)۔

٤٦۔ اور تو اُس وقت طور کے پہلو میں نہ تھا۔ جب ہم نے موسٰی کو آواز دی لیکن یہ تیرے رب کی رحمت تھی

Marfat.com

(کہ تجھے یہ اطلاعات دیں) تاکہ تو انھیں سنا کر اپنی اس قوم کو ڈرائے جن کے پاس اس سے قبل کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر

یہ غیبی خبریں اللہ نے دی ہیں:

سورۂ قصص میں جتنی آیات بھی حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت سے متعلق ہیں، ہم اس مقام پر اس کے دسویں حصے سے متعارف ہوتے ہیں۔

اس حصے میں حضرت موسیٰؑ پر توراۃ کے نزول اور احکام عشرہ عطا کرنے کا ذکر ہے یعنی جب نفی طاغوت کا زمانہ ختم ہو گیا (یعنی جب موسیٰ اپنی قوم کو بت پرستوں کے نرغے سے نکال لائے) تو وہ عہد شروع ہوا جب اُن کی دینی نقطۂ نگاہ سے تربیت، اصلاح اور غیر خدا کے انکار کے بعد اللہ کی وحدانیت کا اقرار سکھانا تھا۔

چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: ہم نے پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب دی جو لوگوں کے لیے بصیرت آفریں اور ہدایت و رحمت کا سبب ہے تاکہ وہ غور و فکر کریں: (ولقد اٰتینا موسی الکتاب من بعد ما اھلکنا القرون الاولیٰ بصائر للناس وھدی و رحمۃ لعلھم یتذکرون)۔

آیت زیر نظر میں " قرونِ اولیٰ " (یعنی اعصار گزشتہ کی وہ اقوام جو ہلاک ہو گئیں) سے کونسی قومیں مراد ہیں؟ بعض مفسرین اس سے قوم نوح ۔ عاد و ثمود اور اُن جیسی ہی کافر قومیں مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ مرور زمانہ سے گزشتہ انبیا کے آثار زمین سے محو ہو گئے تھے اور اب لازم تھا کہ نوعِ انسانی کی تربیت کے لیے ایک نئی کتاب نازل کی جائے۔

بعض کے نزدیک اس سے قوم فرعون کی ہلاکت مراد ہے جو گزشتہ اقوام کی باقیات میں سے تھی کیونکہ خدا نے اُس قوم کی ہلاکت کے بعد ہی موسیٰ پر توریت نازل کی۔

لیکن یہ امر تسلیم کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ " قرون الاولیٰ " سے اِس قسم کی جملہ اقوام مراد ہوں۔

" بصائر " جمع " بصیرت " کی ہے۔ جس کے معنی " بینائی " کے ہیں۔ مگر اس مقام پر خدا کی وہ نشانیاں اور دلائل مراد ہیں جو مومنین کے قلب کو منور کرنے کا سبب ہوں اور ہدایت و رحمت بھی اس بصیرت کے لوازم میں سے ہے۔ نیز دلوں کی بیداری اور قدرت الٰہی میں غور و فکر اس کا نتیجہ ہے۔ [1]

❊ ❊ ❊

اس کے بعد یہ ذکر ہے کہ ہم نے جو کچھ موسیٰ اور فرعون کی داستان اس کی جزئیات کے ساتھ بیان کی وہ قرآن کی صداقت پر دلیل ہے۔ کیونکہ تم اُس موقع پر موجود نہ تھے اور تم نے یہ واقعات اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے تھے۔ یہ ہمارا لطف و کرم ہے کہ ہم نے مخلوق کی ہدایت کے لیے تم پر یہ آیات نازل کیں۔

---

[1] بصائر جمع بصیرت و ابصار جمع بصر۔

Marfat.com

پھر فرماتا ہے کہ :۔ جب ہم نے موسیٰ کو فرمانِ نبوت دیا تو تم کوہ طور کے گوشے میں موجود نہ تھے اور نہ اس واقعے کے شاہدین میں سے تھے ؛ (وماکنت بجانب الغربیّ اذ قضینا الی موسی الامر وما کنت من الشاھدین ۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ مدین سے بہ سُوئے مصر سفر کرتے ہوئے (کہ وہ راستہ سرزمین سینا سے گزرتا تھا، ٹھیک مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کر رہے تھے ۔

اس کے برعکس جب بنی اسرائیل مصر سے شام کی طرف آنے اور وادیٔ سینا سے گزرے تو انھوں نے مغرب سے مشرق کی طرف سفر کیا۔

لہٰذا بعض مفسرین نے سُورہ شعرا کی آیت ساٹھ " فاتبعوھو مشرقین " (جو کہ فرعون اور اُس کی افواج کے بنی اسرائیل کا تعاقب کرنے کے بارے میں ہے) کا یہی مطلب سمجھا ہے ۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد قرآن میں فرمایا گیا ہے : ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام کو پیدا کیا مگر جب ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا تو انبیا کی ہدایت اور ان کی تعلیم کا اثر اُن کے قلوب سے محو ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے تمہیں رسول بنایا اور قرآن عطا کیا اور گزشتہ قوموں کے حالات بیان کیے تاکہ وہ انسانوں کے لیے نصیحت کا باعث ہوں : (ولکنّا انشأنا قروناً فتطاول علیھم العمر ۔

اور تم ہرگز اہل مدین کے درمیان نہ رہتے تھے (کہ تمہیں اُن کی زندگی کے حالات معلوم ہوتے ، اور وہ حالات تم انہیں اہل مکہ کو سناتے : (وماکنت ثاویاً فی اھل مدین تتلوا علیھم اٰیاتنا)[1]

لیکن ہم نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا اور ہزارہا سال ماقبل کے تاریخی حالات کا علم تمہیں بخشا تاکہ تم اس مخلوق کی ھدایت کرو : (ولکنّا کنّا مرسلین)[2]

٭ ٭ ٭

اسی مفہوم کی تاکید کے لیے اس عبارت کا اضافہ کیا گیا کہ : جب ہم نے موسیٰ کو ندا دی اور اُس کے نام فرمانِ نبوت صادر کیا : (وماکنت بجانب الطُّور اذ نادینا)[3]

مگر ہم نے تمہیں جن حالات سے مطلع کیا ہے وہ اس رحمت کا تقاضا ہے کہ تم اُن کے وسیلے سے اُس قوم کو ڈراؤ جن کے پاس قبل ازیں کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا ، شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں : (ولکن رحمۃ من ربك لتنذر قوماً ما اتاھم من نذیرٍ من قبلك لعلھم یتذکرون) ۔

---

[3] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں ندا سے مراد وہ ندا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ستر افراد کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے اور اُنھیں خدا کی آواز سنائی دی تھی ۔ لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے کیونکہ ان آیات میں اشارہ ہے اُن مطالب کی طرف جو ماقبل آیات میں آچکے ہیں اور رسول اکرمؐ نے وہ حالات لوگوں کو بتائے جبکہ وہ اُن حالات کے شاہد و ناظر نہ تھے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ آیات ماقبل میں حضرت موسیٰؑ کا مدین سے مصر کی طرف سفر کرنے اور وادیٔ طور میں پہلی دفعہ کلام خدا کو سُننے کا ذکر ہے ۔

[1] " ثاوی " کا مادہ " ثوی " ہے ۔ جس کے معنی ہیں " مستقل طور پر قیام کرنا " اسی وجہ سے جائے قرار کو " مثوی " کہتے ہیں ۔

[2] حضرت موسیٰؑ اور جناب ختمی مرتبت رسالت مآبؐ کے درمیان تقریباً دو ہزار سال کا فاصلہ ہے ۔

Marfat.com

حاصل کلام یہ ہے کہ خدا جناب رسالت مآب کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ: وہ بیدار کن اور ہوش آور واقعات جو ماضی بعید کی قوموں پر گزر چکے ہیں اور تم نے انھیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ ہم نے تمہیں اُن سے آگاہ کیا ہے تاکہ تم انھیں اس گمراہ قوم کو سناؤ کہ ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کریں۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں یہ کس طرح کہا گیا ہے کہ:-

اس قوم (زمانۂ رسول کے عربوں) کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔

جبکہ یہ بھی مسلّم ہے کہ رُوئے زمین کبھی حجتِ الٰہی سے خالی نہیں رہتی۔ اور اُس قوم (عرب) میں بھی پیمبران صاحب کتاب کے اوصیا موجود رہے ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ:-

اُس قوم گمراہ کے پاس ایک صاحب کتاب پیغمبر اور ڈرانے والے کو بھیجنے کی غایت واضح ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ اور پیمبر اسلامؐ کے ظہور کے درمیان کئی سو سال گزر چکے تھے۔ اس دوران میں کوئی اُولوالعزم پیغمبر نہیں آیا تھا اور یہ مفسد اور ملحد عرب اسی بہانے سے راہِ خدا سے منحرف ہو گئے تھے۔

امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں:

ان الله بعث محمداً ولیس احدٌ من العرب یقرء کتاباً ولا یدعی نبوة فساق الناس حتی بوأهم محلتهم و بلغهم منجاتهم

جس وقت خدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا (اُس وقت یہ حال تھا کہ) کوئی عرب بھی آسمانی کتاب نہیں پڑھتا تھا اور وہاں کوئی بھی مدعیٔ نبوت نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے اُنھیں وہ مقام عطا کیا جو اُن کے لائق تھا اور اُنھیں نجات کی منزل پر پہنچا دیا۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۳۳)

Marfat.com

۴۷۔ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا
لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

۴۸۔ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى اَوَلَمْ
يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۣ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ○

۴۹۔ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۵۰۔ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ط وَمَنْ
اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

ترجمہ

۴۷۔ اگر کسی پیغمبر کے بھیجنے سے پہلے ہم اُن کے اعمال پر انہیں سزا دیتے تو وہ کہتے : پروردگارا ! تُو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور مومنین میں سے ہوتے ۔

۴۸۔ مگر جب ہماری طرف سے اُن کے پاس حق آیا تو انھوں نے کہا کہ اس پیغمبر کو ایسی چیز کیوں نہیں دی گئی تھی کیا بہانہ سازوں نے ان کی طرح اُن آیات کا انکار نہیں کیا تھا جو اس سے قبل موسیٰ کو دی گئی تھیں ۔ انھوں نے کہا تھا کہ یہ دونوں (موسیٰ اور ہارون) جادوگر ہیں اور انھوں نے باہم سازش کرلی ہے (تاکہ ہمیں گمراہ کریں) اور اُنھوں نے کہا کہ ہم ان سب باتوں کے منکر ہیں ۔

۴۹۔ کہہ دے کہ اگر تم سچے ہو (کہ تورات اور قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہیں) تو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخش کتاب لے آؤ تاکہ میں اس کی پیروی کروں ۔

۵۰۔ پس یہ لوگ اگر تیری تجویز قبول نہ کریں تو جان لے کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اُس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا کہ جو اپنی خواہشات کی پیروی کرے اور اللہ کی ہدایت کو قبول نہ کرے ۔ یقیناً خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۔

Marfat.com

تفسیر

گریز از حق کے لیے نو بہ نو بہانے :

گزشتہ آیات میں پیغمبر کے بھیجنے کا مقصد ڈرانا اور خوف دلانا بیان ہوا تھا۔ زیرِ نظر آیات میں سے پہلی میں خدا کے اُس لطف و کرم کا ذکر ہے جو کسی قوم کی طرف رسول بھیجنے کی صورت میں ظہور میں آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : پیغمبر کو مبعوث کرنے سے پہلے ہم انہیں ان کے اعمال پر سزا دیتے تو وہ کہتے کہ خدایا تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور مومنین میں سے ہو جاتے۔ اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو ان کے اعمال اور کفر کی وجہ سے کسی پیغمبر کے بھیجنے کی ضرورت بھی نہ تھی : (ولو لا ان تصیبھم مصیبۃ بما قدمت ایدیھم فیقولوا ربنا لولا[1] ارسلت الینا رسولاً فنتبع اٰیاتك ونكون من المؤمنین)

اس آیت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ راہِ حق روشن ہے اور ہر عقل شرک اور بُت پرستی کے باطل ہونے کا حکم لگاتی ہے اور ان کے بہت سے اعمال مثلاً ظلم اور ناانصافیاں ایسے ہیں جنہیں عقل قابلِ نفرت سمجھتی ہے۔ اور وہ ایسے قبیح ہیں کہ بدُون ارسال پیغمبر ہی مستحق سزا ہیں۔

لیکن اس کے باوجود کہ ان کی بداعمالیوں کے بارے میں حکم عقل واضح اور روشن ہے، خدا اُن کے ہر عُذر کی نفی اور اتمام حُجت کے لیے، اُن کی طرف پیغمبروں کو آسمانی کتابیں اور معجزات کے ساتھ بھیجتا ہے تاکہ اُن میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہماری بدبختی تو کسی رہنما کے نہ ہونے سے تھی اگر ہمارے لیے خدا کی طرف سے کوئی رہبر ہوتا تو ہم نجات یافتہ اور راہِ ہدایت پر ہوتے۔

بہرحال یہ آیت، اُن آیات میں سے ہے جو "پیغمبروں کو بھیجنے کی صُورت میں" خدا کے لطف کے ضروری ہونے کو بیان کرتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ خدا کسی قوم کو اُس کی طرف پیغمبر بھیجنے سے پہلے اُس کے گناہوں کی سزا نہیں دیتا۔ جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ایک مو پینسٹھ میں مذکور ہے :

رسلاً مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل وکان اللہ عزیزاً حکیماً

ہم نے وہ پیغمبر بھیجے جو بشارت دینے اور ڈرانے والے تھے تاکہ ان پیغمبروں کے بعد لوگوں کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ توانا اور حکیم ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ "لولای اول" کا جواب محذوف ہے۔ اس شرط کی جزا "لما ارسلنا رسولاً" یا "لما وجب ارسال الرسل" ہونی چاہیئے۔ دوسری تعبیر صحیح تر اور قریب ترین حقیقت ہے۔ بہرحال یہ کلام اُن احکام سے مربوط ہے جن کا عقل مستقلاً ادراک کرتی ہے۔ ورنہ خدا کی طرف سے بعثت انبیا اور دلائل سے بھی لازم ہے۔ ہر چند کہ پیغمبروں کی آمد کے فوائد میں سے ایک "احکام عقلیہ" کی تاکید بھی ہے مثلاً بطلانِ شرک، ظلم کی قباحت اور شر و فساد کے مضرات۔

Marfat.com

اس کے بعد قرآن میں اُن کا فر اقوام کی بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ " ہماری طرف سے پیغمبر بھیجے جانے کے بعد بھی انھوں نے بہانہ سازی کو نہ چھوڑا۔ اور اپنی قدیم منحرف راہوں پر چلتے رہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے : جس وقت اُن کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو انھوں نے کہا کہ اس پیغمبر کو ویسے ہی معجزات کیوں نہیں دیئے گئے جیسے کہ موسیٰ کو دیئے گئے تھے : (فلما جاء ہم الحق من عندنا قالوا لولا اوتی مثل ما اوتی موسیٰ)۔

اُس کے ہاتھ میں عصائے موسیٰ کیوں نہیں ہے ؟ وہ ید بیضا کیوں نہیں رکھتا ؟ اُس کے لیے دریا کیوں نہیں پھٹ جاتا ؟ اس کے دشمن غرق کیوں نہیں ہو جاتے ؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا ؟ ویسا کیوں نہیں ہوتا ؟ یہ ہیں اعتراضات اُن کفار کے۔

قرآن مجید میں ان بہانہ تراشیوں کا اس طرح جواب دیا گیا ہے۔

کیا گزشتہ بہانہ جو لوگوں نے اُن معجزات کا جو موسیٰ کو دیئے گئے تھے اسی طرح انکار نہیں کیا تھا ! (اولم یکفروا بما اوتی موسیٰ من قبل)۔

کیا اُس عہد کے کفار نے یہ نہیں کہا تھا کہ : یہ دونوں (موسیٰ و ہارون) ساحر ہیں۔ ان دونوں نے باہم شراکت کر لی ہے (تاکہ ہم کو گمراہ کریں) ہم ان دونوں کا انکار کرتے ہیں : (قالوا سحران تظاهرا وقالوا انا بکل کافرون

اس مقام پر کلمہ " سحران " استعمال ہوا ہے۔ حسب قاعدہ ساحران ہونا چاہیئے تھا۔ کلمۂ سحران شدت تاکید کے لیے ہے کیونکہ عربوں کی یہ فطرت تھی کہ جب وہ کوئی بات زور دے کر کہنا چاہتے تھے تو وہ صفت کو عین ذات قرار دے دیتے تھے۔ مثلاً عادل شخص کو " عین عدالت " ، ظالم کو " عین ظلم " ۔ ساحر کو " عین سحر " وغیرہ۔

اس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ " کلمہ " سحران " سے مراد حضرت موسیٰ کے دو بڑے معجزے " عصا اور ید بیضا " ہوں

اگر اس مقام پر تردیداً یہ کہا جانے کہ کفار مصر کے انکار کا کفار مکہ کے انکار سے کیا ربط ہے ؟ تو اس کا جواب واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل کفر کی بہانہ جوئی کوئی تازہ بات نہیں ہے۔ تمام اہل کفر کا مزاج یکساں ہوتا ہے اور اُن کے اعتراضات بھی ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور اُن کے کافرانہ منصوبے بھی یکساں ہوتے ہیں۔

آیت مافوق کی جو تفسیر ہم نے بیان کی وہ تو شبہ سے پاک ہے۔ مگر کچھ مفسرین نے اس آیت کی کسی اور طرح سے بھی تعبیر کی ہے۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ " سحران تظاهرا " سے مراد دو پیغمبر حضرت موسیٰؑ اور جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کیونکہ مشرکین عرب یہ کہتے تھے کہ یہ دونوں ساحر تھے اور ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں۔

ان مفسرین نے اپنے قول کی تائید میں ایک تاریخی واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ :-

اہل مکہ نے چند لوگوں کو علمائے یہود کے پاس ایسے وقت بھیجا کہ وہ اُن کی عید کا دن تھا۔ اُن لوگوں نے علمائے یہود سے سوال کیا کہ کیا واقعاً محمد پیغمبر ہیں۔

اُن علماء نے جواب دیا کہ ہم نے توریت میں اُن کا نام اُن کی صفات کے ساتھ پڑھا ہے۔

ان نمایندوں نے واپس آ کر مشرکین مکہ کو تمام واقعہ کہہ سنایا۔ اُس وقت کفار مکہ نے " سحران تظاهرا ..... وانا بکل کافرون " کہا (یہ دونوں ساحر تھے اور ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں)[1] لیکن دو نکتوں پر غور کرنے سے یہ تفسیر حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی ، جلد ۲۰ ، صفحہ ۸۱۔

Marfat.com

اوّل یہ کہ :-

روایات اور تاریخ سے یہ بات بہت کم ہے کہ مشرکین عرب نے حضرت موسیٰؑ پر ساحری کا اتہام لگایا ہو اور شاید یہیں اس قسم کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ :-

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے درمیان قریباً دو ہزار سال کا فاصلہ ہے ۔ یہ ادّعا کرے کہ یہ دونوں جادوگر تھے اور انہوں نے ایک دوسرے سے سازش کر رکھی تھی۔ نیز کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی جادوگر ہزاروں سال قبل یہ جان لے کہ آیندہ کیسا آدمی پیدا ہوگا اور وہ کیا دعویٰ کرے گا۔

❖ ❖ ❖

بہ حال مُفسد طبع مشرکین مکّہ کو اس امر پر اصرار تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے پاس حضرت موسیٰؑ جیسے معجزات کیوں نہیں ہیں۔ نیز نہ تو وہ اُس شہادت اور اُن علامات کی طرف اعتنا کرتے تھے جو توریت میں پیغمبر اکرمؐ کے متعلق موجود تھیں اور نہ وہ قرآن اور اُس کی پُرعظمت آیات ہی پر ایمان لاتے تھے۔ لہٰذا قرآن میں جناب رسالتمآب سے یہ کہا گیا ہے (اے پیغمبر) ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچ مچ یہ اعتقاد رکھتے ہو کہ یہ دونوں کتابیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں تو اس کتاب سے زیادہ نورانی اور ہدایت بخش کوئی اور کتاب خدا کی طرف سے لے آؤ تاکہ میں اس کی پیروی کروں :(قل فأتوا بکتاب من عند الله هو اهدٰی منهما اتبعه ان کنتم صادقین)۔

لیکن ـــــ وہ کفار کہ حق طلب نہ تھے بلکہ صرف بہانہ جُو تھے۔ اس لیے وہ کسی اور عجیب کتاب ھدایت کے طلب گار اور پیغمبر کے دارائے معجزات ہونے پر مُصر تھے اور اس حقیقت سے غافل تھے کہ قرآن سے بڑا معجزہ اور اس سے بہتر کتاب ہدایت اور کونسی ہو سکتی تھی۔ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قرآن کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا تو یہی اُن کی حقانیت رسالت کے لیے کافی تھا۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے ۔ (اے پیغمبر) اگر یہ کفار تمہارے پیغام کو قبول نہیں کرتے تو جان لو کہ اپنی ہوس کی پیروی کرتے ہیں :(فان لم یستجیبوا لك فاعلم انما یتبعون اهواء هم)۔

کیونکہ جو انسان ہوا پرست نہیں ہوتا وہ ایسی منطقی پیشکش کے سامنے سر جُھکا دیتا ہے لیکن وہ کسی طرح بھی راہِ راست پر نہیں آتے اور پیغمبر کے ہر پیغام کو کسی نہ کسی بہانے سے رُد کر دیتے ہیں ۔

کیا ـــ کوئی شخص اُس سے بھی زیادہ گمراہ تر مل سکتا ہے جو اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کر کے کسی بھی ہدایت الٰہی کو قبول نہیں کرتا۔ (و من اضلّ ممّن اتبع هوٰىه بغیر هدًی من الله)۔

یہ مُسلّم ہے کہ خدا ظالمین کے گروہ کی ہدایت نہیں کرتا:(ان الله لا یهدی القوم الظالمین)۔

اگرچہ وہ لوگ گمراہ تھے لیکن اگر اپنی گمراہی کو محسوس کر کے حق طلب ہوتے تو لطف الٰہی بہ مقتضائے ۔ والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا[1] ـــ ـــ ـــ ـــ

[1] جو لوگ ہماری طرف کوشش کرتے ہیں ہم انہیں ہدایت سے راستوں کی راہنمائی کرتے ہیں ۔

Marfat.com

ان کے شامل حال ہوتا، مگر وہ ستمگر ہیں۔ وہ اپنی ذات پر بھی ظلم کرتے ہیں اور اُس معاشرے پر بھی جس میں وہ رہتے ہیں۔ اُن کا مقصدِ حیات فساد اور عناد کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حالت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ راہِ ہدایت کے لیے اُن کی مدد کرے۔

٭ ٭ ٭

خواہشات پرستی گمراہی کا سبب ہے:

مذکورہ بالا آیات میں ان دونوں باتوں (یعنی خواہش پرستی اور گمراہی) کا رابطہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اُن لوگوں کو گمراہ ترین کہا گیا ہے جنہوں نے اپنی ہوائے نفس کو اپنا رہبر بنا لیا ہے اور ہدایتِ الٰہی کو ہرگز قبول نہیں کرتے ـــ اور

ہوائے نفس "عقل کی آنکھوں پر ضخیم پردہ ہے۔"

"ہوائے نفس" کسی موضوع سے ایسا دل بستہ کر دیتی ہے کہ انسان میں ادراکِ حقیقت کی قابلیت ہی نہیں رہتی کیونکہ ادراکِ حقیقت کے لیے واقعات کو بطور امرِ مطلق کے تسلیم کرنا اور ہر قسم کے پیشگی فیصلے اور رجحانِ طبع کو ترک کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ہر موجود جو عینیتِ خارجی رکھتا ہے، خواہ وہ تلخ ہو یا شیریں، ہمارے میلانِ طبع کے موافق ہو یا مخالف، ہمارے ذاتی مفاد سے ہم آہنگ ہو یا نہ ہو، اسے بلا قید و شرط تسلیم کر لینا ہی ادراکِ حقیقت کہلاتا ہے۔ مگر یہ مجرد اصول انسان کی ہوائے نفس سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اس موضوع پر ہم نے سورۃ فرقان کی آیت نمبر ۴۳ کے ذیل میں جلد ۱۵ میں مفصل بحث کی ہے۔

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ متعدد روایات میں آیت فوق کی تفسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ گمراہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے فرستادۂ خدا رہبر اور امام کو قبول نہیں کیا اور صرف اپنی رائے پر جمے ہوئے ہیں۔[1]

یہ روایات حضرت امام باقرؑ، امام جعفر صادقؑ اور دیگر آئمۂ ہدیٰؑ سے نقل ہوئی ہیں۔ اپنے مصداق کے لحاظ سے قطعی روشن اور بہ مرتبہ حق الیقین ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان ہر وقت ہدایتِ الٰہی کا نیازمند ہے اور یہ ہدایت کبھی تو آسمانی کتاب میں جلوہ گر ہوتی ہے، کبھی وجودِ پیغمبر اور اُس کی سُنّت میں، کبھی اُس کے معصوم اوصیا میں اور کبھی عقل و خرد کے استدلال میں۔

بہرکیف انوارِ ہدایت سے بہرہ مند ہونے کے لیے، لازم ہے کہ انسان اوامرِ الٰہی پر بے چون و چرا عامل ہو اور کسی امر میں بھی اپنی ہوائے نفس کو دخل نہ دے۔

٭ ٭ ٭

---

[1] یہ روایات اصول کافی اور بصائر الدرجات میں (بمطابق نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۳۲) مذکور ہے۔

Marfat.com

۵۱۔ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

۵۲۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝

۵۳۔ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا
مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝

۵۴۔ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

۵۵۔ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ
اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝

ترجمہ

۵۱۔ ہم اُن لوگوں کے پاس پے در پے قرآن کی آیات بھیجتے رہے کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

۵۲۔ وہ لوگ جنہیں ہم نے قبل ازیں کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔

۵۳۔ اور جس وقت اُن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یقیناً یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے اور ہم پہلے ہی سے مسلمان تھے۔

۵۴۔ ان لوگوں کو دوگنا بدلہ دیا جائے گا کیونکہ وہ صبر کرتے رہے ہیں اور وہ بھلائی کے ساتھ بُرائیوں کو دُور کرتے رہے ہیں۔ اور ہم نے اُنھیں جو رزق دیا ہے اُس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

۵۵۔ اور جب وہ لغو اور بے ہودہ باتیں سُنتے ہیں تو اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال مبارک ہوں۔ تم پر ہمارا (دُور کا) سلام ہے، ہم جاہلوں کے خواستگار نہیں ہیں۔

Marfat.com

شانِ نزول

آیاتِ فوق کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین اور راویانِ حدیث نے گوناں گوں روایات نقل کی ہیں۔ ان تمام روایات میں قدرِ مشترک ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ آیاتِ قرآن اور پیغمبرِ اسلامؐ کی رسالت پر علمائے یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت کا ایمان لانا۔

چنانچہ —— سعید ابنِ جُبیر نے روایت کی ہے کہ یہ آیات اُن ستر عیسائی علما کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہیں نجاشی نے حبشہ سے تحقیقِ حال کے لیے مکہ بھیجا تھا۔ جب جناب رسالتمآبؐ نے اُن کے سامنے سورہ یٰسٓ پڑھی تو اُن پر رقت طاری ہوگئی اور وہ رونے لگے اور اُنھوں نے اسلام قبول کرلیا[1]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیات نجران کے عیسائیوں کی ایک جماعت کے متعلق نازل ہوئی تھیں، جو آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے تھے جب اُنھوں نے قرآن کی آیات سُنیں تو ایمان لے آئے[2]

بعض لوگ اِن آیات کو "نجاشی" اور اُس کے اہلِ دربار کے متعلق سمجھتے ہیں[3]

بعض لوگوں نے اِن کی شانِ نزول حضرت سلمان فارسیؓ اور علمائے یہود کی ایک جماعت (مثلاً عبداللہ بن سلام، تمیم الداری اور جارود عبدی وغیرہ) کے متعلق سمجھا ہے[4]

بعض راوی اِن آیات کا مشارٌ الیہ چالیس روشن ضمیر عیسائی علما کو بتاتے ہیں کہ جن میں سے بتیس تو جناب جعفر ابن ابوطالب کے ساتھ حبشہ سے مدینہ آئے تھے اور آٹھ شام سے آئے تھے جن میں سے مشہور بحیرا راہب شامی بھی تھا[5]

البتہ اِن میں سے پہلی تین قسم کی روایات ان آیات کے مکہ میں نازل ہونے سے مناسبت رکھتی ہیں اور اُن لوگوں کے قول کی تائید کرتی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کُلی سورہ مکی ہے۔ لیکن چوتھی اور پانچویں قسم کی روایات اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ چند آیات مدینہ میں نازل ہوئی تھیں اور یہ روایات اُن لوگوں کے قول پر گواہی ہیں جو ان آیات کو مدنی سمجھتے ہیں۔

بہرکیف —— جو بھی ہو —— یہ آیات اِس امر پر شاہد ناطق ہیں کہ اہلِ کتاب کے علماء میں سے ایک جماعت نے آیاتِ قرآن سُن کر اسلام قبول کرلیا تھا کیونکہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ رسول اللہؐ ایسی حالت میں کہ اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی اُن پر ایمان نہ لایا ہوتا، ایسی بات کہہ دیں کیونکہ اگر یہ آیات مطابقِ واقعہ نہ ہوتیں تو مشرک فوراً آپ کی تکذیب کرتے اور شور مچانے لگتے۔

تفسیر

حق طلب اہلِ کتاب:

گزشتہ آیات میں اُن بہانوں کا ذکر تھا جو مُشرک لوگ حقائقِ قرآن کو تسلیم نہ کرنے کے لیے تراشا کرتے تھے اور ان آیات میں جو

---

[1]، [2]، [3] تفسیر فی ظلال القرآن، جلد ۶، صفحہ ۲۵۷، ۲۵۸۔

[4]، [5] مجمع البیان، جلد ۷، صفحہ ۲۵۸۔

Marfat.com

زیر بحث میں اُن آمادہ دلوں کا ذکر ہے جنہوں نے کلام الہٰی کو سُن کر حق کو قبول کیا، پھر اُس سے وفادار رہے اور دل وجان سے اُس کی اطاعت کی۔ جب کہ جہلا کے تاریک دل حق سے ذرہ بھر بھی متاثر نہ ہوئے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: ہم نے آیات قرآن کو پے در پے اُن کے پاس بھیجا کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔ (ولقد وصلنا لهم القول لعلهم يتذكرون)[1]

یہ آیات بارش کے قطروں کی طرح مسلسل اُن پر نازل ہوئیں۔ ان آیات کی شکلیں نوع بہ نوع تھیں اور ان کی کیفیات مختلف تھیں۔ اُن میں کبھی حُسنِ عمل کی جزا کا وعدہ تھا اور کبھی عملِ سُوء کے نتیجے میں دوزخ کی وعید تھی۔ کبھی اُن میں نصیحت و پند تھی اور کبھی خوف دلایا گیا تھا کبھی تو اُن میں عقلی استدلال تھا اور کبھی گزشتہ قوموں کی عبرت انگیز اور ثمر بخش تاریخ بیان کی گئی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ آیات ہر حیثیت سے بہت کامل اور نہایت ہم آہنگ تھیں۔ جس دل میں قبولِ حق کی ذرہ بھر بھی استعداد ہو وہ انھیں خود بخود جذب کر لیتا ہے لیکن کور دل لوگوں نے اُنھیں قبول نہیں کیا۔

٭ ٭ ٭

لیکن وہ لوگ جنہیں قبل ازیں ہم نے آسمانی کتاب دی تھی (یہود و نصاریٰ) وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ (الذين اٰتيناهم الكتاب من قبله هم به يؤمنون)۔

کیونکہ وہ قرآن کو اُن علامات کے مطابق پاتے ہیں جو وہ اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

اس مقام پر جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ یہ ایمان لانے والے، اہلِ کتاب، کچھ افراد تھے لیکن آیت فوق میں صرف "اہلِ کتاب" کہا گیا ہے، جو کلمہ عمومی ہے۔ اس میں کوئی قید اور تخصیص نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ جو لوگ ایمان لائے صرف وہی اہلِ کتاب تھے اور باقی کچھ نہیں تھے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جس وقت اُن کے سامنے یہ آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے، یہ یقیناً حق ہیں اور ہمارے خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں: (واذا يتلى عليهم قالوا اٰمنا به انه الحق من ربنا)۔

البتہ اُن کے لیے ان آیات کی تلاوت ہی کافی تھی تاکہ وہ "آمنا" کہیں اور تصدیق کریں۔ اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے۔ ہم نے پیغامِ الہٰی کو آج ہی قبول نہیں کیا، بلکہ ہم تو پہلے ہی سے مسلمان تھے: (انا كنا من قبله مسلمين)۔

ہم نے اس پیغمبر کے آمد کی علامات اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھی ہیں۔ ہمیں اُن علامات کے مطابق آنے والے سے دلبستگی تھی اور بے چینی سے ہم اُس کا انتظار کر رہے تھے اور جب ہم نے اپنے اُس ہادی کو پا لیا جس کا انتظار تھا تو فوراً دل و جان کے ساتھ اُس پر ایمان لے آئے۔

٭ ٭ ٭

---

[1] "وصلنا" کا مادہ "وصل" ہے۔ جس کے معنی ارتباط دینے اور متصل کرنے کے ہیں مگر جب یہ مادہ باب تفعیل میں جاتا ہے تو اس میں کثرت اور تاکید کے معنی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

اِس کے بعد قرآن میں اِس تقلید شکن اور حق طلب گروہ کی جزا کے بارے میں فرمایا گیا ہے : یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے صبر و شکیبائی کی وجہ سے دوگنا اجر پائیں گے : (اُولئك یؤتون اجرھم مرتین بما صبروا) ۔

اُنھیں ایک دفعہ تو اِس نیکی کا اجر ملے گا کہ وہ اپنی آسمانی کتاب پر ایمان لائے اور اُس کے احکام کے پابند اور وفادار رہے اور دُوسرا اجر اس بات کا ملے گا کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ پر ایمان لائے اور اُنھوں نے اقرار کیا کہ یہ وہی پیغمبر موعود ہیں کہ جن کے آنے کی سابق کتابوں میں خبر دی گئی تھی ۔

اِس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ انھیں دوگنا اجر ملنے کا سبب یہ ہے کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ پر اُن کے ظہور سے پہلے بھی ایمان رکھتے تھے اور ظہور کے بعد بھی اُنھوں نے اپنے ایمان کا اعلان کیا ۔ گزشتہ آیات سے یہ معنٰی سمجھ میں آتا ہے اِن اہلِ ایمان نے ہر دو مرحلوں میں اپنے اثباتِ ایمان کے لیے نہایت صبر و استقامت کا ثبوت دیا ۔ نہ تو یہود و نصاریٰ کے منحرف الایمان لوگ اُن کے عمل کو پسند کرتے تھے اور نہ وہ معاشرہ جو اپنے آباؤ اجداد کے عقائد کا مقلد تھا اُنھیں سابق دین سے دستبرداری کی اجازت دیتا تھا ۔ تاہم ــــ وہ ثابت قدم رہے اور اُنھوں نے عارضی منافع اور ہوائے نفس کو ٹھکرا دیا اور ۔ خدا کی طرف سے دوگنا اجر کے مستحق ٹھہرے ۔

اِس کے بعد قرآن میں اُن کے ایک سلسلۂ اعمال کی طرف اشارہ ہے ۔ اُن کے یہ اعمال ایک دوسرے سے زیادہ قدر و منزلت رکھتے ہیں اور وہ ہیں حسنات کے ذریعے سے سیئات کو دُور کرنا ، خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سے انفاق کرنا اور جُہلا کے ساتھ بزرگانہ برتاؤ کرنا ۔ اِن تین صفات کے ساتھ صبر و شکیبائی کا اضافہ کیا جائے تو چار ممتاز صفات ہو جاتی ہیں ۔

سب سے پہلے یہ ذکر ہے کہ :۔ یہ لوگ بدیوں کو نیکیوں کے ذریعے دُور کرتے ہیں : (و یدرءون بالحسنة السیئة) ۔

یہ لوگ بُری باتوں کو اپنی نیک گفتاری سے ، مُنکر کو امر بالمعروف سے ، جاہلوں کے جہل کو اپنے حلم سے ، عداوت اور کینہ توزی کو محبت سے ، قطع محبت کو اپنی دوستی اور صلہ رحمی سے دُور کرتے ہیں ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو بجائے اس کے کہ بدی کا بدلہ بدی سے دیں ، بدی کو نیکی کے ذریعے دفع کرتے ہیں ۔

بُرائیوں کے ساتھ مقابلے ، بالخصوص آمادہ ہٹ دھرم افراد کے مقابلے میں مذکورہ روش نہایت مؤثر ہے اور قرآن میں بار بار اس روش کا ذکر کیا گیا ہے ۔

ہم نے اس موضوع کو جلد دہم میں سورہ رعد کی آیت ۲۲ اور سورہ مومنون کی آیت ۹۶ کے ذیل میں تفصیلاً تحریر کیا ہے ۔

اِن مومنین کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ : ہم نے اُنھیں جو رزق دیا ہے وہ اس میں سے انفاق کرتے ہیں : (و مما رزقناھم ینفقون) ۔

یہ مومنین اپنے مال اور ثروت ہی میں سے ہی انفاق نہیں کرتے بلکہ اپنے علم و دانش ، اپنی فکری اور جسمانی طاقت اپنی معاشرتی حیثیت بھی (کہ یہ سب خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں) مستحقین اور نیازمندوں کے لیے کام میں لاتے ہیں ۔

٭ ٭ ٭

نیز اُن مومنین کا ایک اور امتیازِ عملی یہ ہے کہ جس وقت وہ کوئی لغو اور بیہودہ بات سنتے ہیں تو اُس سے مُنہ پھیر لیتے ہیں :

Marfat.com

(واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه)۔ اور ہرگز لغویات کے جواب میں لغویات نہیں کہتے اور جہل کا جواب جہل سے نہیں دیتے بلکہ بیہودہ بکنے والوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ: (وقالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم)۔ نہ تو تمہیں ہمارے جرم اعمال کی سزا ملے گی اور نہ ہمیں تمہارے جرم اعمال کی مگر تم جلد ہی جان لوگے ہم میں سے ہر ایک کے عمل کا انجام کیا ہوا ہے۔

اُس کے بعد اس مطلب کا اضافہ ہے کہ وہ مومنین اُن جُہلا سے (جو یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اذیت ناک باتوں سے باایمان اور نیکوکار افراد کو غصہ دلائیں اور اُن کی دل آزاری کریں) رخصت ہوجاتے ہیں اور اُن سے یہ کہتے ہیں" تمہیں ہمارا سلام ہو۔ ہم جاہلوں کے طالب نہیں ہیں: (سلام علیکم لانبتغی الجاهلین)۔

ہم نہ تو بدگو ہیں اور نہ جاہل اور فسادی' اور نہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔ ہم تو روشن ضمیر اہل دانش اور علمائے عامل اور سچے مومنین کے خواہاں ہیں۔

اس عنوان سے وہ لوگ بجائے اس کے کہ اپنی توانائیوں کو جاہلوں، کوردلوں اور بے خبر بیہودہ بکنے والوں کے مقابلہ میں ضائع اور برباد کریں، بڑی متانت سے اُن سے کنارہ کش ہوکر اپنے بنیادی مقاصد کے پُورا کرنے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔

قابل توجہ یہ امر ہے کہ جب اس قسم کے افراد سے اُن کا سامنا ہوتا ہے تو اُنھیں سلام تحیت نہیں کرتے بلکہ اُن کا سلام سلام رخصت ہوتا ہے۔

* * *

قلوب باایمان:

مذکورہ بالا آیات میں اُن قلوب کی نہایت حسین اور جاذب تصویر کھینچی گئی ہے جن میں ایمان کا بیج ہے اور وہ اُس کی پرورش کرتے ہیں وہ اُن بے شخصیت افراد کے زُمرے میں سے نہیں ہیں جو جہل، تعصب، بدزبانی، بیہودہ گوئی اور بخل و کینہ توزی کا مخزن ہیں۔

یہ لوگ ایسے بزرگوار اور پاک زبان ہیں کہ اُنھوں نے سب سے پہلے کورانہ تقلید کی زنجیروں کو توڑ دیا ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے توحید کی منادی کو بہ توجہ تمام سُنا اور جب اُنھیں دلائل حق کی صداقت کا یقین ہوگیا تو اُنھوں نے حق کو قبول کرلیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگوں کو تقلید شکنی اور اپنے منحرف الحق معاشرے سے جُدا ہونے کا گراں تاوان ادا کرنا پڑتا ہے اور بہت سی تکالیف اور محرومیاں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ مگر اُن میں اس قدر صبر و شکیبائی کا جوہر ہوتا ہے کہ وہ پیش نظر عظیم مقصد کے لیے ان تمام مشکلات کو برداشت کرلیتے ہیں۔

یہ لوگ نہ تو کینہ توز ہوتے ہیں کہ ہر بدی کا بدتر جواب دیں اور نہ بخیل و خسیس ہوتے ہیں کہ عطیات الٰہی کو صرف اپنے لیے مخصوص کرلیں۔

وہ لوگ ایسے بزرگوار ہیں جو مذکورہ بالا نقائص کے علاوہ دروغ، نامناسب مشاغل، لڑائی جھگڑوں، بیہودہ بحثوں، بے معنی باتوں، رکیک حرکتوں اور ان جیسی جُملہ ناشائستہ باتوں سے مُحترز رہتے ہیں۔ وہ پاک زبان اور پاکیزہ قلب رکھتے ہیں۔ وہ اپنی فعال اور کارساز توانائیوں

Marfat.com

کو جہلا سے جھگڑا کرکے تباہ نہیں کرتے ۔ حتیٰ کہ بہت سے موقعوں پر سکوت کو (جو کہ ایسے احمقوں اور بے خرد لوگوں کے لیے بہترین جواب ہے) گویائی پر ترجیح دیتے ہیں ۔ وہ لوگ اپنے اعمال اور فرائض کی فکر میں رہتے ہیں اور اُن پیاسوں کی طرح جو چشمۂ آب کی طرف جاتے ہیں وہ لوگ بھی علم و دانش کے پیاسے ہیں اور علما اور دانشمندوں کی صحبت میں حاضر ہونے کے خواہشمند رہتے ہیں ۔

ہاں ـــــ یہی وہ بزرگوار لوگ ہیں جن میں اتنی سعادت موجود ہے کہ ایمان کے پیغام کو دل سے قبول کرتے ہیں اور پیشگاہ خداوندی سے اپنے اعمال خیر کا ایک گنا نہیں بلکہ دو گنا اجر پاتے ہیں ۔

یہ لوگ حضرت سلمان فارسی ، نجاشی یا بحیرا جیسے متلاشی حق یا اُن ہی جیسے اور اُن ہی کے ہم پایہ ہوتے ہیں کہ جب انھیں ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں تو وہ منزل ایمان پر پہنچنے کے لیے اُن کا مقابلہ کرتے ہیں ۔

اس ضمن میں حضرت امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث جاذب توجہ ہے ۔ آپؑ نے فرمایا :

نحن صبراء و شیعتنا اصبر منا و ذٰلک انا صبرنا علیٰ ما نعلم و صبروا علیٰ ما لا یعلمون .

ہم صابر ہیں اور ہمارے شیعہ ہم سے زیادہ صابر ہیں کیونکہ ہم تو اسرار اُمور سے آگاہ ہیں پھر صبر کرتے ہیں (اور طبعاً یہ کام آسان تر ہے) مگر وہ اسرار اُمور کو جانے بغیر صبر و شکیبائی کو نہیں چھوڑتے ۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ دو جانباز آدمی میدان جہاد میں قدم رکھتے ہیں ۔ اُن میں سے ایک انجام کار سے باخبر ہے اور جانتا ہے کہ اس جہاد کا نتیجہ فتح ہو گا ۔ لیکن دوسرا شخص باخبر نہیں ہے اور محض خوشنودی خدا کے لیے میدان میں آیا ہے ۔ اس حالت میں کیا دوسرے کا صبر پہلے شخص کے صبر سے اولیٰ نہیں ہے ؟

یا بالفرض ـــــ اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ متذکرہ دونوں افراد شہید ہو جائیں گے ۔ مگر اُن میں سے ایک یہ جانتا ہے کہ شہادت میں کون کونسے اسرار نہاں ہیں اور اس شہادت کے مستقبل کے آئندہ زمانے پر کیا اثرات مترتب ہوں گے اور یہ شہادت آئندہ نسلوں کے لیے ایک نمونہ بن جائے گی ۔ لیکن دوسرا شخص اسرار آئندہ سے مطلق بے خبر ہے ۔ اس لیے دوسرا شخص جب جنگی مصائب پر صبر کرتا ہے تو یہ صبر بلند تر ہے ۔

ایک اور حدیث میں (جو کہ علی بن ابراہیم کی تفسیر میں درج ہے) منقول ہے کہ آیت فوق میں "لغو" سے مراد : کذب ، لہو اور غنا ہے ۔ اس سے پرہیز کرنے والے آئمہؑ ہیں ۔

یہ واضح ہے کہ گزشتہ دونوں احادیث میں بیان مصداق کے لحاظ سے کوئی ابہام نہیں ہے ۔ ورنہ "لغو" کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں حدیث دوم کی مراد کے علاوہ اور چیزیں بھی شامل ہیں اور تمام راست کردار مومنین "لغو" سے اعراض کرتے ہیں لیکن اس خصوص میں آئمہؑ کا مقام افضل ترین ہے ۔

Marfat.com

۵۶۔ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝

۵۷۔ وَقَالُوا إِنْ نَتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا ۚ أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِزْقًا مِنْ لَدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ

۵۶۔ جسے تو نہیں چاہتا ہدایت نہیں پا سکتا بلکہ خدا ہی جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور خدا ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

۵۷۔ اور اُنھوں نے کہا کہ اگر ہم تیرے ساتھ ہدایت کو قبول کرلیں تو ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔ کیا ہم نے اُنھیں ایسی جگہ نہیں دی جو حرم امن ہے اور (ہر شہر و دیار کے) ثمرات اُس کی طرف لائے جاتے ہیں کہ جو ہماری طرف سے رزق ہے۔ مگر اُن میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

ہدایت صرف خُدا کے ہاتھ میں ہے:

اگرچہ مفسرین نے زیرِ نظر پہلی آیت کی شانِ نزول میں بہت بحث کی ہیں۔ لیکن اُنھوں نے جن روایات کو بنیادِ بحث بنایا ہے وہ بے اعتبار و بے وقعت ہیں۔ اور خاص مقاصد کے لیے اُنھیں وضع کیا گیا ہے۔ لہٰذا —— ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اِس آیت کی تفسیر خود قرآن مجید ہی سے اخذ کی جائے۔ اس کے بعد اُن مشکوک اور جعلی روایات کی تحقیق کی جائے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ گزشتہ آیات میں دو گروہوں کا ذکر تھا۔ ایک گروہ تو ہٹ دھرم کفارِ مکہ کا تھا۔ جناب رسولِ خدا نے ہر چند اُنھیں ہدایت دینے کی کوشش کی، مگر اُن کے دلوں میں نُورِ ایماں کا نفوذ نہ ہوا۔ ان کے برعکس مکہ سے دُور دراز فاصلے پر رہنے والا ایک گروہ اہلِ کتاب کا تھا، جنھوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور راہِ اسلام میں فرطِ جذبات کے ساتھ استقلال و ایثار کا ثبوت دیا۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے خود پرست جاہلوں اور قریبی عزیزوں کی مخالفت کی بھی پرواہ نہ کی اور اُن سے خوفزدہ نہ ہوئے۔ اِن امور پر توجہ کرنے کے بعد زیرِ نظر پہلی آیت سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اے پیغمبر تم جسے چاہتے ہو اُسے ہدایت نہیں کرسکتے بلکہ خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے

Marfat.com

اور وہ ہدایت پانے والوں کو خُوب جانتا ہے: (انك لاتهدی من احببت ولٰکن الله یهدی من یشآءُ وهو اعلم بالمهتدین)۔

وہی جانتا ہے کہ کون لوگ اس لائق ہیں کہ ایمان قبول کریں۔ وہی جانتا ہے کہ کونسے دل طلبِ حق میں بے چین ہیں۔ وہی جانتا ہے کہ کن سروں میں عشقِ الٰہی کا سودا سمایا ہوا ہے۔ ہاں ۔ وہ ان شائستہ افراد کو خوب پہچانتا ہے۔ وہ اُنھیں توفیق عنایت کرتا ہے اور اپنے لطف کو اُن کا رفیقِ راہ بناتا ہے تاکہ وہ ایمان کی راہ اختیار کریں۔

لیکن —— وہ زشت سیرت تاریک دل جو دشمنِ حق ہیں اور اپنے تمام وسائل سے فرستادگانِ خدا کے خلاف جنگ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی روشِ زندگی کے لحاظ سے اِس قدر آلودہ اور شرمناک ہیں کہ کسی طرح بھی اُن کا ظرف نورِ ایمان کو قبول نہیں کرسکتا خدا ہرگز ایسے لوگوں کی راہ میں چراغِ توفیق نہیں جلاتا۔

بنا بریں —— اس مقام پر "ھدایت" سے مراد "ارائہ طریق" نہیں ہے۔ کیونکہ راہِ راست کی ھدایت تو پیغمبر کا فرض ہے کہ وہ بغیر استثنا ہر ایک کی رہبری کرتا ہے۔ بلکہ یہاں ھدایت سے "ایصال بہ مطلوب" اور منزلِ مقصود تک پہنچانا مراد ہے اور یہ صرف خدا کا کام ہے کہ دلوں میں ایمان کا بیج بوئے اور خدا کا یہ کرم بھی عام نہیں ہے۔ بلکہ وہ اہل دلوں پر نظر ڈالتا ہے اور پھر اُنھیں یہ نورِ ایمانی عطا کرتا ہے۔

بہرحال یہ آیت ایک طرح سے پیغمبر کی دلجوئی کے لیے ہے تاکہ وہ اس واقعیت کی طرف متوجہ ہوں کہ نہ تو مکہ کے بت پرستوں کے گروہ کا شرک پر اصرار بے وجہ ہے اور نہ مردم حبشہ یا نجران اور حضرت سلمان اور بحیرا جیسے لوگوں کا ایمان لانا ہی بے دلیل ہے۔

پیغمبر کو چاہیئے کہ گروہ اوّل کے ایمان نہ لانے سے ہرگز ملول خاطر نہ ہوں کیونکہ یہ نورِ الٰہی صرف دلہائے آمادہ کو تلاش کرلیتا ہے تو وہاں داخل ہوتا ہے اور سکونت پذیر ہوجاتا ہے۔ اس مضمون کی مثالیں آیاتِ قرآنی میں بہت ہیں۔

چنانچہ ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۲ میں پڑھتے ہیں:

لیس علیك هداهم ولٰکن الله یهدی من یشآءُ

تم اُن کی ہدایت کے ذمّہ دار نہیں ہو بلکہ خدا جسے چاہتا ہے اُسے ہدایت کرتا ہے۔

اور سورۃ نحل کی آیت ۳۷ میں فرمایا گیا ہے:

ان تحرص علی هدٰهم فان الله لایهدی من یضلّ

اس گروہ کی ہدایت پر تیرا اصرار مؤثر نہیں ہے کیونکہ خدا نے جسے گمراہ کردیا ہے۔ اسے ہدایت نہیں کرتا۔

اور سورۂ یونس کی آیت ۴۳ میں مذکور ہے:

افانت تهدی العمی ولو کانوا لایبصرون

تم اندھوں کو ھدایت کرنا چاہتے ہو۔ ہرچند کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے اور کسی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کرتے۔

Marfat.com

بالآخر سورہ ابراہیم کی چوتھی آیت میں ایک قانون کُلّی طور فرمایا گیا ہے :

فیضل اللہ من یشآء ویھدی من یشآء وھوالعزیز الحکیم ۰

خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

اس آیت کا آخری جملہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان دونوں گروہوں کے بارے میں خدا کی مشیت کورانہ نہیں ہے بلکہ بر بنائے معیار حکمت اور افراد کی اہلیت ، تلاش حق کے لیے ان کی جستجو اور ان کے ظروف اور قابلیتوں کے مطابق ہے ۔ وہ صرف اسی لحاظ سے کسی جماعت کو توفیق ہدایت عطا کرتا ہے اور کسی گروہ سے اُسے سلب کر لیتا ہے۔

٭ ٭ ٭

آیات زیر بحث میں سے دوسری میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو دل میں تو اسلام کی حقانیت کے معترف تھے لیکن اپنے ذاتی مفادات کے خیال سے ایمان نہیں لاتے تھے ۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : اُنھوں نے کہا کہ اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کو قبول کرلیں ، اور اُس کی پیروی کریں ہمیں زمین سے اُچک لیں گے : (وقالوا ان نتبع الھدٰی معك نتخطف من ارضنا)[1]

تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ بات حارث بن نوفل نے کہی تھی ۔ وہ حضرت پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا :

"ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ حق ہے لیکن جو چیز ہمارے لیے آپ پر ایمان لانے اور قبول حق سے مانع ہے وہ یہ ہے کہ عرب ہم پر یلغار کردیں گے اور ہمیں ہماری زمینوں سے اُٹھالے جائیں گے اور ہم میں اُن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے "[2]

یہ بات صرف وہی آدمی کہہ سکتا ہے جو خدا کی قدرت کو ناچیز سمجھتا ہے اور تھوڑے سے جاہل عربوں کی قوت کو بہت عظیم ۔ یہ بات صرف وہی کہہ سکتا ہے جو خدا کی عنایات اور اُس کی حمایت کے رموز سے آشنا نہیں ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ اپنے محبوں کی کس طرح مدد کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کو کس طرح برباد کردیتا ہے ۔ لہٰذا قرآن ایسے لوگوں کے جواب میں فرماتا ہے :

کیا ہم نے انھیں ایسی جگہ نہیں دی جو جائے امن ہے ۔ اور شہر و دیار کے ثمرات اُن کی طرف لائے جاتے ہیں : (اولم نمکن لھم حرما اٰمنا یجبٰی الیہ ثمرات کل شیء)[3] اور یہ رزق ہماری طرف سے ہے : (رزقا من لدنا)۔ مگر اُن میں سے اکثر یہ نہیں جانتے : (ولٰکن اکثرھم لا یعلمون)۔

وہ خدا جس نے شورہ زار ، سنگلاخ اور بے آب و گیاہ زمین کو حرم امن قرار دے کر اور مخلوق کے دلوں کو اُس کی طرف ایسا متوجہ کرکے

---

[1] " آیت فوق میں " معك " " نتبع " سے متعلق ہے اور اس امر کا احتمال بھی ہے کہ اس کا تعلق " ھدٰی " سے ہو۔ اس طرح معنیٰ میں خفیف سا فرق ہو جائے گا۔

[2] " مجمع البیان " زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

[3] " یجبٰی " کا مادہ " جبایۃ " ہے ۔ اس کے معنی ہیں " جمع کرنا " لہٰذا اُس حوض کو جس میں پانی جمع کرتے ہیں " جابیۃ " کہتے ہیں ۔ ضمناً اوپر کی آیت میں " نمکن " " نجعل " کے معنیٰ میں ہے اور " حرما " مفعول ہے ۔ ورنہ " نمکن " اپنے اصلی معنی میں ہو کر " تمکین دینا " میں " فی " کے صلہ سے متعدی ہوتا ہے ۔

Marfat.com

دنیا کے مختلف مقامات سے بہترین پیداوار اُس کی طرف لاتے ہیں، اپنی قدرت کو خوب ظاہر کردیا ہے۔

وہ خدا جس نے ایسی قدرت نمائی کی ہے اور ایسی سرزمین کو ایسی امنیت اور ایسی نعمتیں بخشی ہیں کہ تم اپنی آنکھوں سے اُن کے آثار دیکھتے ہو اور سالہا سال سے اُن نعمات سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں، کیا وہ اس امر پر قادر نہیں ہے کہ تھوڑے سے بت پرست عرب اگر تم پر حملہ آور ہوں تو وہ اُن سے تمہاری حفاظت نہ کرسکے؟

تم کو حالتِ کفر میں خدا کی دو بڑی نعمتیں ــــــ امینت اور نعماتِ زندگی، نصیب ہوتی رہی ہیں۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بعد اسلام خدا تمہیں اُن نعمتوں سے محروم کردے۔ دل قوی رکھو، ایمان لاؤ اور مزاج میں استقلال پیدا کرو کہ خدائے کعبہ و مکہ تمہارے ساتھ ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حرم مکہ مسلمانوں کے لیے تو اس قدر جائے امن و امان نہ تھا۔ کیا مسلمانوں کی ایک تعداد پر وہاں ظلم و تعدی نہیں کی گئی؟ کیا اہل مکہ نے رسول اللہؐ کو پتھر نہیں مارے؟ کیا بعض مسلمانوں کو مکہ میں قتل نہیں کیا گیا؟ کیا آخر کار حضرت جعفر طیار کے ساتھ کچھ لوگوں نے اور پھر باقی افراد نے حضرت پیغمبرؐ کے ساتھ اس خیال سے کہ وہ وہاں اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے تھے ہجرت نہیں کی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود مکہ میں دوسرے مقامات سے زیادہ امن تھا اور عرب اُس مقام کو محترم اور پاک سمجھتے تھے اور جن گناہوں کے وہ دوسرے مقامات پر مرتکب ہوتے تھے، وہاں اُن کے ارتکاب کی جرأت کم کرتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ عین بے امنی کے زمانے میں بھی بڑی حد تک پُرامن تھا۔ خاص طور پر شہر مکہ میں اُس کے اطراف و جوانب کے علاقوں کی نسبت زیادہ امن رہتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آغازِ اسلام میں ایک قلیل مدت تک یہ سرزمین امن الٰہی مسلمانوں کے لیے ناآسودگی اور بے امنی کا مقام ثابت ہوئی۔ مگر زیادہ عرصہ نہ گذرا کہ یہ مقام پائدار امن کا مرکز اور جملہ اقسام کی عظیم نعمات کا مرکز بن گیا بنابریں مسلمانوں کے لیے ان جلد گزر جانے والی مشکلات کا، عظیم نعمتوں کے حصول کے لیے برداشت کرنا کچھ سخت کام نہ تھا۔

بہرحال ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کے نقصان کے خوف سے حارث بن نوفل کی طرح ہدایت اور ایمان سے دست کش ہوجاتے ہیں۔ جبکہ خدا پر ایمان لانا اور اُس کے احکامات پر عمل کرنا صرف اُن کے دُنیاوی مفادات ہی کو خطرات سے محفوظ نہیں کردیتا بلکہ اُن کے مشروع مادی منافع اور اُن کے لیے امن و سلامتی کا معاشرہ پیدا کرنے کے لیے بھی غیر معمولی طور پر مفید ہے۔

آج کی دُنیا میں جسے متمدن کہا جاتا ہے، جو قتل و غارت، خوں ریزی اور تباہ کاری ہم دیکھتے ہیں وہ اِس امر کی زندہ گواہ ہے کہ لوگ ایمان اور ھدایت سے دُور ہوگئے ہیں۔

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ خدا نے اس مقام پر پہلے نعمتِ امن کا ذکر کیا ہے اور اُس کے بعد ہر سمت سے مکہ کی طرف ضروریاتِ انسانی کے آنے کا ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ترتیب اس امر کی نشاندہی کرتی ہو کہ جب تک کسی ملک یا شہر میں امن و امان کا دَور دَورہ نہ ہو، اُس وقت تک وہاں کی اقتصادی حالت درست نہیں ہوسکتی۔ ہم نے اس مطلب کو جلد ۱۰ میں سورۂ ابراہیم

Marfat.com

کی آیۃ ۳۵ کے تحت مفصل بیان کیا ہے۔

علاوہ بریں آیۃ میں "یجبی" فعل مضارع کی صورت میں استعمال ہوا ہے، جو حال اور مستقبل کی حالت استمراری پر دلیل ہے چنانچہ ہم چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس سرزمین کی جانب ہر طرف سے خدا کی نعمتیں کھنچی چلی جا رہی ہیں۔ جو لوگ خانۂ خدا کی زیارت کے لیے جاتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ یہ خشک و سوزاں اور بے آب و گیاہ زمین انواع و اقسام کی بہترین نعمتوں سے پُر ہے۔ شاید دُنیا کے کسی حصّے میں بھی نعمتوں کا اتنا وفور نہ ہوگا۔

٭ ٭ ٭

حضرت ابُوطالبؑ کا ایمان اور معاندین کا منشور:

اُن حضرات کو جو اہلِ مطالعہ ہیں، یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ راویانِ احادیث کی ایک جماعت کو اس امر پر کیوں اصرار تھا کہ جنابِ رسالتمآب کے چچا کو بے ایمان اور مشرک ثابت کریں جبکہ ان کے متعلق دُنیا کے تمام مسلمان باتفاق اس امر کے قائل ہیں کہ اُنھوں نے اپنی حیات میں پیمبر اسلامؐ کی حمایت میں انتہا درجہ فداکاری، قربانی اور ایثار سے کام لیا۔ ان لوگوں کا اصرار ہے کہ اُن کی وفات بحالتِ کفر ہوئی۔

آخر دوسرے لوگوں کے متعلق، جن کا اسلام میں کوئی کردار نہیں ہے، یہ اصرار کیوں نہیں ہے؟ غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ مسئلہ کوئی معمولی اور سرسری نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تاریخی اور روایاتی بحثوں کے پیچھے حضرت علیؑ کے رقیبوں کی طرف سے ایک خطرناک سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اس امر پر نظر کرنے سے کسی مزید دقتِ نظر کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ ان معاندین کا اس امر پر زور تھا کہ علیؑ سے ہر فضیلت چھین لیں۔ حتیٰ کہ اُن کے باایثار اور فداکار باپ کو مُشرک ثابت کریں اور انھیں بحالتِ عدم ایمان دُنیا سے رُخصت کریں۔

یقیناً بنی اُمیہ اور اُن کے ہوا خواہ اپنے عہد میں برسرِ اقتدار آنے سے پہلے بھی، اس فتنہ پردازی میں مشغول رہتے تھے اور کوشش میں لگے رہتے تھے کہ جہاں سے بھی ممکن ہو اس مقصد کے لیے شواہد جمع کریں خواہ وہ کیسے ہی کمزور اور بے بُنیاد ہوں۔

ہم اس کثیف اور گندی سیاست کی مخالفانہ امواج سے جو اپنی جگہ پر غور و فکر کی مستحق ہے، سے قطعِ نظر کرتے ہوئے ــــ جہاں تک موضوعِ کتاب اجازت دیتا ہے۔ اس موضوع کا تاریخی اور تفسیری حیثیت سے حقیقت طلبانہ مطالعہ کرتے ہیں، تاکہ قارئین پر یہ روشن ہو جائے کہ اس ہنگامۂ اختلاف کی پُشت پر کوئی معتبر سند موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف حقیقت ہونے پر زندہ شواہد موجود ہیں۔

۱۔ آیۃ زیرِ بحث یعنی (انك لا تهدی من احببت ......) کا کسی طرح بھی جناب ابوطالب سے کوئی ربط نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے ماقبل کی آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ آیات مشرکینِ مکّہ کے خلاف اہلِ کتاب میں سے مومنین کی ایک

Marfat.com

جماعت کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔

جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ فخر رازی جس نے اس آیۃ کو (اجماعِ مسلمین کا نام لے کر) حضرت ابوطالب کی جانب منسوب کیا ہے، خود ہی اعتراف کرتا ہے کہ آیۃ اپنے ظاہری معنیٰ کے لحاظ سے کسی طرح بھی ابوطالب کے کفر پر دلالت نہیں کرتی۔[1]

اس تصریح کے بعد بھی بعض لوگوں کا یہ اصرار کیوں ہے کہ اس آیۃ کو حضرت ابوطالب کے شرک سے مربوط کر دیں۔ واقعاً یہ بات بہت حیران کن ہے۔

۲۔ اس موضوع پر جو سب سے بڑی دلیل قائم کی گئی ہے وہ "ادعائے اجماعِ مسلمین" ہے کہ جناب ابوطالبؑ دُنیا سے شرک رُخصت ہوئے۔

جبکہ اس اجماع کا ذکر محض جھوٹ ہے۔ جیسا کہ اہلِ سُنّت کے مشہور مفسّر آلوسی نے اپنی تفسیر رُوح المعانی میں تصریح کی ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں ہے اور آیۃ فوق کے متعلق اجماعِ مُسلمین یا مفسّرین کی یہ روایت کہ یہ حضرت ابوطالبؑ کے متعلق نازل ہوئی تھی، درست نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ علمائے شیعہ اور ان کے بہت سے مفسّرین حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے معتقد ہیں اور اس موضوع پر اُنھوں نے اہلبیت علیہم السّلام کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ علاوہ بریں حضرت ابوطالبؑ کے اپنے اکثر قصائد اُن کے ایمان کی شہادت دیتے ہیں۔[2]

۳۔ تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "اجماعِ مسلمین" کے ادعا کا سرچشمہ اخبارِ احاد ہیں جن کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور ان روایات کی سند میں جن افراد کے نام آتے ہیں وہ مشکوک یا کذاب ہیں۔

ان روایات میں سے ایک ابن مردویہ نے اپنی ہی سند کے ساتھ ابن عباس سے نقل کی ہے:

> آیۃ "انک لا تھدی من احببت" ابوطالب کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ پیغمبرِ اسلام نے اُن سے اسلام قبول کرنے کے لیے بہت اصرار کیا مگر اُنھوں نے قبول نہ کیا۔[3]

حالانکہ اس روایت کی سند میں "ابوسھل سری" کا نام بھی ہے اور بزرگانِ علمِ رجال کی تصریح کے مطابق وہ حدیث چوروں، جھوٹوں اور روایتیں گھڑنے والوں میں سے تھا۔ "عبدالقدوس ابن سعید دمشقی" کا نام بھی اس حدیث کی سند میں آتا ہے حالانکہ وہ بھی کذابین میں سے تھا۔

بظاہر اس حدیث سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ابن عباس نے اسے کسی واسطے کے بغیر بیان کیا ہے اور وہ خود اُن حالات کے شاہد و ناظر تھے۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ ابن عباس ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ بنابریں حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے وقت وہ شیر خوار ہوں گے۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ حدیثیں گھڑنے والے اپنے فن میں بھی ماہر نہیں تھے۔

اس سلسلے میں ایک حدیث ابوہریرہ سے بھی نقل کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

---

[1] تفسیر کبیر از فخر رازی، ج ۲۵ ص۳۔

[2] رُوح المعانی، ج ۲۰، ص۸۴۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] دُرالمنثور، ج ۵، ص۱۳۳۔

Marfat.com

جس وقت ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو رسول اللہؐ نے اُن سے فرمایا کہ :

اے چچا ! کہیئے : " لا الٰہ الا اللہ " تاکہ میں بروز قیامت آپ کے متعلق مُوحّد ہونے کی گواہی دوں ۔

تو ابوطالب نے جواب دیا :

" اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ قریش مجھے یہ طعنہ دیں گے کہ اُس نے موت کے وقت خوف کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا تو میں ضرور توحید کی شہادت دیتا اور تجھے مسرور کر دیتا ۔"

اُس وقت آیہ " انک لا تھدی من احببت " نازل ہوئی ۔

اس حدیث کا ظاہری لب و لہجہ یا انداز بیان اس امر کا مظہر ہے کہ ابوہریرہ نے اس وقوعہ کو بچشم خود دیکھا تھا ۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ابوہریرہ نے ہجرت سے سات سال بعد (یعنی فتح خیبر کے سال میں) اسلام قبول کیا تھا ۔ تو پھر بھلا وہ حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے وقت کیسے موجود ہو گئے جو ماقبل ہجرت واقع ہوئی تھی ۔

بنابریں اس روایت سے بھی غیر ماہرانہ جعل سازی نمایاں ہے ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ " ابن عباس اور ابوہریرہ " خود اس واقعے کے شاہد نہ تھے اور اُنھوں نے یہ داستان کسی دوسرے شخص سے سُنی تھی تو ہم سوال کرتے ہیں کہ " کس سے " ؟

جس آدمی نے یہ روایت ان دونوں آدمیوں سے بیان کی وہ ناشناس اور مجہول ہے ۔ ایسی حدیث کو مُرسل کہتے ہیں اور اور سب جانتے ہیں کہ مرسل حدیث معتبر نہیں ہوتی ۔

جائے افسوس ہے کہ مفسرین اور راویان اخبار کی ایک جماعت نے بغیر تحقیق و غور و فکر اس قسم کی احادیث کو ایک دوسرے سے لے کر اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے ۔ اور آہستہ آہستہ اپنے لیے توجیہہ اجماع بھی فراہم کر لی ہے لیکن ظاہر ہے کہ کہاں کا اجماع ؛ اور کیسی حدیث معتبر ؟

۴ ۔ ان تمام امور سے قطع نظر کر کے ان جعلی احادیث کا متن ہی غماز ہے کہ حضرت ابوطالبؑ پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لائے تھے ۔ ہر چند کہ اُنھوں نے مصالح کے تحت اعلانیہ اقرار نہیں کیا تھا ۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور زبان تو محض ایک ذریعۂ اظہار ہے ۔

بعض احادیث اسلامی میں حضرت ابوطالبؑ کی کیفیت کو اصحاب کہف سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ لوگ دل میں ایمان پنہاں رکھتے تھے مگر بعض وجوہ کی بناء پر اُس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے ۔

۵ ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے اہم مسئلے میں صرف یک طرفہ روایات پر قناعت کر لی جائے اور ابوہریرہ اور ابن عباس سے جو روایات منقول ہیں صرف اُنھیں پر اکتفا کر لیا جائے ؟

اس مسئلہ میں آئمہ اہل بیتؑ اور علمائے شیعہ کے اجماع کو قابل توجہ کیوں نہیں سمجھا جاتا ؛ حالانکہ یہ لوگ خاندان پیمبرؐ کے حالات

---

۱ تفسیر صافی اور تفسیر برہان ، زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

سے زیادہ واقف ہیں ۔

حضرت ابوطالبؑ کے بہت سے اشعار ہمارے پاس ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر اُن کے ایمان کا آئینہ ہیں ۔ بہت سے بزرگوں اور علمائے اِن اشعار کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ۔ ہم نے آں جناب کی سُخن گوئی کے چند نمونے تفسیر نمونہ کی جلد پنجم میں (سورۂ انعام کی آیۃ ۲۶) کے ذیل میں اہلِ سُنّت کے معروف منابع سے نقل کر دیئے ہیں ۔

۶ ۔ اِن تمام امور سے قطع نظر کر کے حضرت ابُوطالبؑ کی تاریخ زندگی ، جنابِ رسالت مآبؐ کے لیے اُن کی عظیم قربانیاں اور رسول اللہؐ اور مسلمانوں کی اُن سے شدید محبت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے ۔

ہم یہاں تک دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ کی موت کے سال کا نام مسلمانوں نے " عام الحزن " رکھا ۔ یہ سب باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ کو اسلام سے عشق تھا ۔ اور وہ جو پیغمبر اسلامؐ کی اس قدر مدافعت کرتے تھے وہ محض رشتہ داری کی وجہ سے نہ تھی ۔ بلکہ اس دفاع میں آپ کی حیثیت ایک مومنِ مخلص ، ایک جاں نثار اور ایسے فداکار کی تھی جو اپنے رہبر اور پیشوا کا تحفظ کر رہا ہو ۔

اِن واضح حقائق کے باوجود کس قدر غفلت ، بے خبری ، ناشکرگزاری اور ظلم ہے کہ بعض لوگوں کا یہ اصرار ہے کہ ایک مومن اور مُوحّدِ مخلص کو مشرک قرار دے کر دُنیا سے رُخصت کریں ۔

Marfat.com

۵۸۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ
تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ○
۵۹۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ○
۶۰۔ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ
خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۵۸۔ اور ہم نے بہت سی ایسی بستیوں کو ہلاک کر دیا کہ جو زیادہ نعمتوں پر مغرور ہو گئی تھیں ۔ یہ ہیں اُن کے گھر (کہ جو ویران ہو چکے ہیں) کہ جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی رہا ہے اور ہم ہی اُن کے وارث ہوئے۔

۵۹۔ اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اُن کے مرکز میں کوئی پیغمبر نہ بھیجے کہ جو اُن کو ہماری آیات پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو ہرگز ہلاک نہیں کرتے مگر یہ کہ اُن کے باشندے ظالم ہوں۔

۶۰۔ اور جو چیز تمہیں دی گئی ہے وہ متاعِ حیاتِ دُنیا اور اُس کی زینت ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

تفسیر

دُنیا کی دلچسپیاں تمہیں فریب نہ دیں :

گزشتہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ بعض کفارِ مکّہ کو اسلام قبول کرنے میں یہ عذر تھا کہ اگر ہم ایمان لے آئیں گے تو عرب ہم پر حملہ کر دیں گے اور ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال دیں گے اور ہماری زندگیوں میں خلل ڈال دیں گے۔

گزشتہ آیات میں اس عذر کا ناطق جواب دیا گیا ہے۔

زیرِ بحث آیات میں اُس عذر کے دو جواب اور بھی دیئے گئے ہیں۔

خدا پہلے یہ فرماتا ہے ، بالفرض یہ کہ تم ایمان کو قبول نہیں کرتے اور بحالتِ کفر و شرک مادّی حیثیت سے خوشحال زندگی بسر

Marfat.com

کرتے ہو لیکن یہ نہ بھولو کہ ہم نے بہت سی آبادیوں کو جو اپنی خوشحال اور پُر نعمات زندگیوں پر مغرور تھیں نابود کر دیا: (وكم اهلكنا من قرية بطرت معيشتها)۔ البتہ غرورِ نعمت نے اُنھیں سرکشی پر آمادہ کیا اور یہ سرکشی ظلم اور ناانصافی کا سرچشمہ بن گئی اور ظلم نے اُن کی اصل حیات کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

یہ ہیں وہ بستیاں اور اُن لوگوں کے مکانات کہ اُن کی تباہی کے بعد کوئی کم ہی اُن میں بسا (فتلك مساكنهم لم تسكن من بعدهم الا قليلا)۔

اُن کی بستیاں اور مکانات اُسی طرح خالی، خاموش، ویران اور مکینوں کے بغیر پڑے رہے۔ اگر کچھ لوگ وہاں آکر رہے بھی تو نہایت قلیل مدت کے لیے اور ہم ہی اُن کے وارث ہوئے: (وكنا نحن الوارثين)۔

اے مشرکین مکہ! کیا تم بھی یہ چاہتے ہو کہ بحالتِ کفر اُسی خوشحال زندگی تک پہنچ جاؤ جس کا انجام ہم نے تمہیں بتا دیا — بھلا ایسی زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے۔

"بطرت" کا مادہ "بَطَر" (بروزن بَشَر) اس کے معنیٰ اُس سرکشی اور غرور کے ہیں جو دولت کی زیادتی کی وجہ سے ہو۔

آیتہ میں جو کلمہ "تلك" استعمال ہوا ہے، یہ اسمِ اشارہ بعید ہے اور اُن چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو قابلِ مشاہدہ ہیں ممکن ہے کہ اس کلمہ سے اشارہ عاد، ثمود یا قومِ لوط کی سرزمین کی طرف ہو۔ یہ مقامات اہلِ مکہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔ یہ مقامات یا تو احقاف کے علاقہ میں تھے (جو یمن اور شام کے درمیان ہے) یا وادیٔ قریٰ میں تھے یا سدوم کے علاقے میں۔

الغرض یہ تمام مقامات اعرابِ مکہ کے اُن تجارتی قافلوں کی راہ میں واقع تھے جو شام کا سفر کرتے تھے اور اہلِ عرب ان ویران بستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ اُن کی تباہی کے بعد وہاں کبھی کوئی آباد نہیں ہوا۔

آیتہ نمبر اٹھاون میں جو "الا قليلا" بصورتِ استثنیٰ آیا ہے، اس کے لیے تین احتمال ہو سکتے ہیں

اوّل یہ کہ ساکنین کو مستثنیٰ کیا گیا ہو۔

دوسرے مساکن کو اور

تیسرے سکونت کو۔

پہلی صورت میں اُس کا یہ مفہوم ہے کہ اُن مقامات کی تباہی کے بعد تھوڑے سے لوگ وہاں آباد ہوئے۔

دوسری صورت میں یہ معنیٰ ہیں کہ اُن مقامات کے صرف چند گھر آباد ہوئے اور

تیسری صورت میں یہ مطلب ہے کہ ویرانی کے بعد وہاں قلیل مدت تک سکونت رہی ہے۔ کیونکہ جس آدمی نے ان منحوس اور بلاخیز بستیوں میں سکونت اختیار کی وہ بہت جلد فنا ہو گیا۔

البتہ مذکورہ بالا تینوں تعبیرات کے اختیار کرنے سے منشائے الٰہی کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ ہر چند کہ پہلے معنیٰ زیادہ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

Marfat.com

بعض حضرات نے " الا قلیلا " کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ اشارہ ہے اس جانب کہ اس راہ سے آنے جانے والے مسافر تھوڑی دیر کے لیے یہاں ٹھہر جاتے تھے۔ اور بعض لوگوں نے " قلیل" سے اُلّو اور حیوانات وحشی مُراد لی ہے۔ ان تمام آرا اور تعبیرات میں قدرِ مُسلّم یہ ہے کہ یہ گناہ و شرک سے آلودہ بستیاں ایسی ویران ہوئیں کہ پھر وہاں کوئی نہ بسا۔

" کنا نحن الوارثین " کا مطلب یہ ہے کہ وہ بستیاں مکینوں سے خالی رہیں۔ نیز یہ کہ " ہر چیز کا حقیقی مالک خدا ہی ہے" اگر وہ عارضی اور وقتی طور پر بعض انسانوں کو بعض چیزوں کا مالک بنا دیتا ہے تو زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ یہ ملکیت زائل ہو جاتی ہے اور مالکِ حقیقی ہی اُس کا وارث ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد کی آیت درحقیقت ایک سوال مقدر کا جواب ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر اصول یہ ہے کہ خدا سرکشوں کو نابود کر دیتا ہے تو پھر اُس نے مکّہ اور حجاز کے مشرکوں کو عذاب دے کر نابود کیوں نہیں کیا۔ جنہوں نے اپنی سرکشی کو آخری حد تک پہنچا دیا تھا اور کوئی ایسی جہالت اور گناہ نہ تھا جس کے وہ مرتکب نہ ہوئے ہوں ؟

اس کے جواب میں قرآن میں ارشاد ہے کہ تیرا پروردگار ہرگز کسی شہر یا آبادی کو ہلاک نہیں کرتا۔ جب تک اُن کے مرکزی مقام پر کوئی نبی نہ بھیج دے جو اُنھیں ہماری آیات پڑھ کر سنائے: (وماکان ربک مهلك القری حتی یبعث فی امها رسولاً یتلوا علیهم ایاتنا)۔

رُوحِ مفہوم یہ ہے کہ ہم جب تک اتمامِ حجت نہیں کر لیتے اور اُس قوم کی طرف صریح احکام کے ساتھ پیغمبروں کو نہیں بھیج دیتے اُس وقت تک اُن کو سرکشی کی سزا نہیں دیتے۔

اتمامِ حجت کے بعد ہم اُن کے اعمال کی نگرانی کرتے رہتے ہیں اگر اُن سے ظلم و ستم سرزد ہوتا ہے اور وہ مستوجبِ عذاب ہوتے ہیں تو ہم اُن کو سزا دیتے ہیں اور ہم ہرگز آبادیوں کو نیست و نابود نہیں کرتے مگر اس حالت میں کہ اُن کے ساکنین ظالم اور ستمگر ہوں: (وماکنا مهلکی القری الا واهلها ظالمون)۔

" ماکان " یا " ماکنا " تخصیصی الفاظ اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ دائمی اور جاودانی سُنّتِ الٰہی تھی اور ہے کہ وہ کافی اتمامِ حجت کے بغیر کسی قوم کو سزا نہیں دیتا۔ نیز یہ جُملہ کہ " حتی یبعث فی امها رسولاً " (جب تک ان شہروں کے مرکز میں اپنا رسول مبعوث نہ کر دے) اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لازم نہیں ہے کہ خدا ہر شہر اور ہر گاؤں میں اپنا پیغمبر بھیجے۔ صرف ایک ایسے مقام پر جہاں اُس قوم کے دانشمند اور اہلِ فکر لوگ رہتے ہوں اور جہاں سے ہر طرف اطلاعات پہنچ سکتی ہوں، پیغمبر کا مبعوث ہونا کافی ہے۔

کیونکہ اُس علاقے کے تمام لوگ ضروریاتِ زندگی کے لیے ہمیشہ وہاں آتے جاتے ہیں۔ اور وہاں جو بھی واقعہ ہو اس کی خبر بسُرعت تمام علاقے میں اور دُور و نزدیک کے مقامات میں پھیل جاتی ہے جیسے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی مکّہ میں بعثت کی خبر بہت کم مدّت میں تمام جزیرۂ عرب میں پھیل گئی تھی۔ بلکہ اُس سے بھی دُور تک پہنچ گئی تھی ــــ چونکہ مکّہ عرب کا مرکزی مقام تھا (جسے اُم القریٰ کہتے تھے) یہ مقام حجاز کا مرکزِ رُوحانی بھی تھا اور تجارتی مرکز بھی۔ یہاں تک کہ بعثتِ رسولؐ کی خبر اُس زمانے کے تمام متمدن مقامات تک پہنچ گئی تھی۔

Marfat.com

اس آیۃ میں ایک کلی اور عمومی حکم بیان کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے جو اس آیۃ کا مشارٌ الیہ مکہ کو سمجھا ہے یہ بالکل بے دلیل بات ہے اور " فی اُمّھا " کہنا بھی ایک عام تعبیر ہے کیونکہ کلمہ " اُم " کے معنی ماں اور مرکز اصلی کے ہیں۔ یہ کلمہ صرف مکہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔[۲]

٭ ٭ ٭

زیرنظر آیات میں سے تیسری آیۃ اُن بہانہ ساز کفار کی باتوں کا جواب ہے جو یہ کہتے تھے کہ اگر ہم ایمان لے آئے تو عرب ہم پر یورش کر دیں گے اور ہماری زندگیوں کو تباہ کر دیں گے۔

اُن کے اس حیلہ کا رَدّ قرآن میں یہ ہے : تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ حیات دنیا کی بے قدر وقیمت متاع اور صرف اُس کی زینت ہے : (وما اوتیتم من شیء فمتاع الحیٰوۃ الدنیا وزینتھا)۔

مگر جو کچھ خدا کے پاس ہے (یعنی دُوسری دُنیا کی بے پایاں نعمتیں اور رُوحانی برکات) وہ بہتر اور پائیدار ہے: (وماعند اللہ خیرٌ وابقیٰ)۔ کیونکہ دنیا کی تمام مادی نعمتوں کے ساتھ بہت سے ناگوار واقعات اور طرح طرح کی مشکلات لگی ہوتی ہیں اور دنیا کی کوئی نعمت بھی ضرر اور خطر سے خالی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جو نعمتیں خدا کے پاس ہیں اُن کی یہ حیثیت ہے کہ وہ دائمی اور جاوداں ہیں اور اس دنیا کی راحتیں اور آسائشیں زود گزر ہیں تو بھلا ان دونوں کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے ؟

ان حقائق کو پیش نظر رکھ کے ایک عاقل انسان تھوڑا سا بھی مقابلہ کر کے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اُن نعمتوں کو اس دنیا کی لذات پر قربان نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لیے آیۃ کے اخیر میں یہ الفاظ ہیں ــــــ (افلا تعقلون) کیا تم غور وفکر نہیں کرتے ؟

فخر رازی نے ایک فقیہ کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر کوئی یہ وصیت کرے کہ اُس کا ایک تہائی مال عاقل ترین لوگوں کو دے دیا جائے تو میرا فتویٰ یہ ہے کہ یہ تہائی مال ان لوگوں کو دیں جو اللہ کے احکامات کی اطاعت کرتے ہیں کیونکہ عاقل ترین انسان وہ ہے کہ زود گزر قلیل متاع کو چھوڑ دے اور پائیدار اور مستقل سرمایۂ فراواں کو لے لے اور یہ اصول صرف اُن لوگوں پر صادق آتا ہے جو فرمانِ الٰہی کے مطیع ہیں ۔

اس کے بعد فخر رازی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اُنہوں نے یہ فقہی حکم اس زیر بحث آیت سے اخذ کیا ہے۔[۲]

---

[۱] یہ بات کہ آیا اس آیت میں مستقلات عقلیہ بھی شامل ہیں یا نہیں۔ ہم نے اس بحث کو جلد ۱۲ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۵ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

[۲] تفسیر کبیر فخر رازی ، ج ۲۵ ، ص ۶

Marfat.com

۶۱۔ اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰهُ وَعۡدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيۡهِ كَمَنۡ مَّتَّعۡنٰهُ مَتَاعَ
الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ثُمَّ هُوَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ۝
۶۲۔ وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ فَيَقُوۡلُ اَيۡنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ۝
۶۳۔ قَالَ الَّذِيۡنَ حَقَّ عَلَيۡهِمُ الۡقَوۡلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ اَغۡوَيۡنَا ۚ
اَغۡوَيۡنٰهُمۡ كَمَا غَوَيۡنَا ۚ تَبَرَّاۡنَاۤ اِلَيۡكَ مَا كَانُوۡۤا اِيَّانَا
يَعۡبُدُوۡنَ ۝
۶۴۔ وَقِيۡلَ ادۡعُوۡا شُرَكَآءَكُمۡ فَدَعَوۡهُمۡ فَلَمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَهُمۡ
وَرَاَوُا الۡعَذَابَ ۚ لَوۡ اَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَهۡتَدُوۡنَ ۝

ترجمہ

۶۱۔ وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اُسے حاصل کرلے۔ کیا وہ اُس شخص جیسا ہے جسے ہم نے حیاتِ دُنیا کی متاع دی ہے اور پھر وہ قیامت کے روز (برائے حساب و جزا) پیش کیا جائے گا۔

۶۲۔ اور وہ دن، جس روز خدا انہیں ندا دے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک سمجھتے تھے۔

۶۳۔ اور وہ لوگ جن کے لیے فرمانِ عذاب ثابت ہو چکا ہوگا، کہیں گے: "اے ہمارے رب! یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے گمراہ کیا تھا۔ جس طرح ہم گمراہ ہوئے تھے اسی طرح ہم نے انہیں گمراہ کیا۔ اب ہم اُن سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت ہماری نہیں (بلکہ اپنی ہوائے نفس کی) پرستش کرتے تھے۔

۶۴۔ اور اُن سے کہا جائے گا کہ اُنھیں بلاؤ جنہیں خدا کا شریک قرار دیتے تھے۔ تو وہ اُنھیں پکاریں گے مگر وہ انھیں جواب نہ دیں گے اور جب وہ عذاب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

Marfat.com

تفسیر

وہ لوگ صرف اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے :

آیات محرّرہ بالا سے قبل کی آیات میں اُن لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے دُنیا کی نعمتوں کے لالچ میں کفر کو ایمان پر اور شرک کو توحید پر ترجیح دی ـــــ اور زیرِ نظر آیات میں اُس گروہ کی حالت اور راست باز مومنین کی کیفیت میں فرق بیان کیا گیا ہے ۔

سب سے پہلے ، خدا ، ایک موازنے کے ذریعے جو بصورت استفہام کیا گیا ہے ۔ تمام لوگوں کے وجدان سے انصاف طلب ہو کر کہتا ہے : "وہ آدمی جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے اور وہ یقیناً اُس موعود کو پالے گا ۔ کیا اُس کے مساوی ہے کہ جسے ہم نے صرف متاعِ دُنیا کا حصہ دیا ہے اور قیامت کے دن وہ حساب اور جزائے اعمال کے لیے ہمارے سامنے پیش ہو گا :"

(افمن وعدناه وعدا حسنا فهو لاقيه كمن متعناه متاع الحيوة الدنيا ثم هو يوم القيامة من المحضرين)۔

بدون شک ہر وہ شخص جس کا ضمیر بیدار ہے ، وہ خدا کے نیک وعدوں اور اُس کی عظیم جاودانی برکات کو اس دنیا کی فانی نعمات اور زود گذر لذّات پر (جن کا انجام جاودانی درد والم ہے) ترجیح دیتا ہے ۔

جملہ " فهو لاقيه " تاکیدی ہے ۔ یعنی اللہ کے وعدہ میں ہرگز تخلف نہیں ہوتا ۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ وعدہ سے تخلف یا تو بوجہ جہل ہوتا ہے یا بوجہ عجز ۔ اور اللہ کی ذات ان میں سے ہر ایک سے پاک ہے ۔

" هو يوم القيامة من المحضرين " کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے محضرِ الٰہی میں حاضر ہوں گے ۔ بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ آتشِ دوزخ میں حاضر ہوں گے ۔ مگر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے ؛ بہر حال آیت کے تیور بتاتے ہیں کہ ان گناہ آلودہ لوگوں کو بالجبر اور اُن کی رغبت کے خلاف کھینچ کر خدا کے حضور لایا جائے گا ۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کہ حساب اور سزا کا خوف اُن کے پُورے وجود پر چھایا ہوا ہو گا ۔

کلمہ " حیاتُ الدنیا " جو قرآن مجید کی مختلف سُورتوں میں بارہا آیا ہے ۔ اس سے اشارہ حیاتِ آخرت اور زندگی جاودانی و زوال ناپذیر کے مقابلے میں اس دُنیاوی زندگی کی پستی کی طرف ہے ۔

کیونکہ کلمہ " دُنیا " مادۂ " دنو " سے مشتق ہے ۔ اس کے وضعی معنیٰ ہیں زمان یا مکان میں یا منزل یا مقام سے نزدیک ہونا ، کبھی کلمہ دُنیا اور ادنیٰ اُن چھوٹی موجودات کے لیے (جو انسان کے اختیار میں ہوں) عظیم موجودات کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اور کبھی بلند اور عالی موضوعات کے مقابلے میں پست موضوعات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کلمہ کا اطلاق دُور کے مقابلے میں نزدیک پر ہوتا ہے ۔

چونکہ اس جہان کی زندگی جہانِ دیگر کے مقابلے میں خفیف اور بے قدر اور نزدیک ہے ۔ اس لیے ، اس کو حیاتِ دُنیا کہنا نہایت ہی مناسب ہے ۔

Marfat.com

اس کلام کے بعد قرآن شریف میں منظر کشی کی گئی ہے کہ روزِ حشر کفار کا کیا حال ہو گا۔ یہ ایسا منظر ہے کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسان کانپنے لگتا ہے۔

چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: ذرا اُس دن کا تصور کرو کہ خدا اُن مشرکین کو آواز دے گا اور کہے گا جنہیں تم نے میرا شریک قرار دیا تھا وہ کہاں ہیں؟ (ویوم ینادیھم فیقول این شرکاءی الذین کنتم تزعمون)۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال ملامت اور سرزنش کے لیے ہے۔ کیونکہ روزِ محشر تمام پردے اور حجابات اُٹھ جائیں گے۔ اُس دن نہ تو شرک کا کوئی مفہوم باقی رہے گا اور نہ مشرک اپنے عقیدے پر باقی رہیں گے۔

اس لیے یہ سوال مشرکین کے لیے ایک قسم کی سرزنش اور اُن کے کیفرِ کردار کو یاد دلانے کے لیے ہے اور ایک طرح کی توبیخ و سزا ہے۔

لیکن قبل ازیں کہ وہ مشرکین جواب دیں، اُن کے معبود گویا ہوتے ہیں اور وہ اپنے پرستاروں سے متنفر اور بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اُن مشرکین کے معبود کبھی تو پتھر یا لکڑی کے بُت تھے۔ کبھی مقدس ہستیاں تھیں جیسے فرشتے، عیسیٰ اور کبھی جنات اور شیاطین تھے۔

آیۃ میں جن شرکاءِ الٰہی کا ذکر ہے اُن میں سے اس مقام پر تیسرے نمبر کی جماعت (جنات و شیاطین) گویا ہوتے ہیں ہم اُن کی گفتگو آیۃ مابعد میں اس طرح پڑھتے ہیں: معبودوں کا ایک گروہ، جن کے لیے فرمان عذاب مسلم ہو چکا ہے یوں کہتا ہے: اے ہمارے پروردگار ہم نے ان پرستاروں کو گمراہ کیا۔ صحیح ہے کہ ہم نے اُنھیں گمراہ کیا۔ اسی طرح کہ جیسے کہ ہم خود گمراہ تھے۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی، ہم اُن سے بیزار ہیں۔ وہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ درحقیقت وہ اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے: (قال الذین حق علیھم القول ربنا ھؤلاء الذین اغوینا اغوینٰھم کما غوینا تبرأنا الیك ماکانوا ایانا یعبدون)۔

اس بنا پر آیۃ فوق سورۂ یونس کی اٹھائیسویں آیۃ کی طرح ہے۔ جس میں یہ قول ہے:

وقال شرکاؤھم ماکنتم ایانا تعبدون

یہ باطل معبود بروز قیامت اپنے عبادت کرنے والوں کی طرف رُخ کر کے کہیں گے تم ہماری پرستش نہیں کرتے تھے۔

اس طرح یہ گمراہ کرنے والے معبود، مثلاً: فرعون، نمرود اور جن و شیاطین اس قسم کے پرستاروں سے اپنی بیزاری اور نفرت[1] کا اظہار

---

[1] مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے متعلق یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ جواب دینے والے مشرکین کے سردار ہیں اور کفر و شرک کے مقتدین مراد ہیں۔ (یعنی فقط پرستاروں کا ایک گروہ) یہ لوگ اپنے معبودوں کے متعلق خدا کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنے پیروؤں کا ذکر کریں گے اور اپنی مدافعت کرتے ہوئے عرض کریں گے۔ خدایا ہم از خود گمراہ تھے کہ ہم نے شرک کی راہ اختیار کی۔ اور اس گروہ نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی اور ہم نے اُنھیں گمراہ کیا۔ لیکن درحقیقت وہ ہماری اطاعت نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ تو اپنی ہوائے نفس کی اطاعت کرتے تھے۔
مگر جو تفسیر ہم نے متن کتاب میں بیان کی وہ صحت سے زیادہ قریب ہے۔

Marfat.com

کریں گے اور اپنی مدافعت کریں گے۔ یہاں تک کہ اپنے اوپر اُن کی گمراہی کا الزام بھی نہ لیں گے اور کہیں گے کہ "انھوں نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی تھی" لیکن یہ بدیہی امر ہے کہ نہ تو یہ انکار کچھ کارگر ہوگا اور نہ اُن کی اپنے پرستاروں سے بیزاری اور اظہار برات بلکہ وہ معبود اپنے عبادت کرنے والوں کے گناہ میں برابر کے شریک اور حصہ دار ہوں گے۔

اس مقام پر قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ اُس روز (بروزِ حشر) ان گمراہ اور گنہگار لوگوں میں سے ہر شخص ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار کرے گا اور ہر شخص کی یہی کوشش ہوگی کہ اپنا گناہ دوسرے کے سر تھوپ دے۔

ہم دنیا میں چھوٹے پیمانے پر اس قسم کے واقعات کی نظیر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ باہم مل کر کسی خلاف اخلاق یا خلافِ قانون فعل کے مرتکب ہوتے ہیں اور جب وہ گرفتار ہو کر عدالت میں پیش ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار خیال کرتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالنے لگتا ہے ـــــ دنیا اور آخرت میں گمراہ اور غلط عمل کے مرتکب لوگوں کا انجام یہی ہے۔

جس طرح سے سورہ ابراہیم کی آیت نمبر بائیس میں مذکور ہے کہ:

وماکان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا
تلوموني ولوموا انفسکم

میرا تو تمہارے اوپر کچھ زور نہ چلتا تھا۔ میں نے تو تمہیں صرف دعوت دی تھی۔
(یعنی امرِ الٰہی کی مخالف راہ کی طرف بلایا تھا) تم نے بڑے اشتیاق سے اُسے قبول کر لیا۔
اب تم مجھے نہیں بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

مشرکین کے بارے میں سورۂ "صافات" کی تیسویں آیت میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگیں گے اور ہر ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرائے گا۔ مگر گمراہ کرنے والے جواب میں واضح طور پر کہیں گے:

وماکان لنا علیکم من سلطان بل کنتم قوما طاغین

* * *

بہرحال جب اُن سے اُن کے معبودوں کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ جواب دینے سے عاجز رہ جائیں گے۔ تب اُن سے کہا جائے گا کہ تم اپنے معبودوں کو جنہیں تم خدا کا شریک قرار دیتے تھے بلاؤ تاکہ وہ اس وقت تمہاری مدد کریں:
(وقیل ادعوا شرکائکم)۔

وہ مشرکین یہ جاننے کے باوجود کہ وہ معبود اس وقت ذرہ بھر بھی کام نہیں آسکتے۔ انتہائی پریشانی کی وجہ سے یا ہر طرف سے مایوس ہو کر یا فرمانِ الٰہی کی اطاعت کی وجہ سے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اس طرح مشرکوں اور اُن کے معبودوں کو سب کے سامنے رسوا کرے وہ اپنے معبودوں کی طرف دستِ تقاضا دراز کریں گے اور اُنھیں اپنی مدد کے لیے بلائیں گے: (فدعوھم)۔
لیکن وہ جھوٹے معبود، اُنھیں کچھ جواب نہیں دیں گے اور اُن کی صدائے امداد پر لبیک نہیں کہیں گے: (فلم یستجیبوا لھم)۔
وہ (مشرکین) اُس وقت عذابِ الٰہی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے: (ورأوا العذاب)۔ اور یہ آرزو کریں گے کہ

Marfat.com

کاش ہم زندہ ہوتے اور ہدایت یافتہ ہوتے (لوانھم کانوا یھتدون)[۲]

کیونکہ اس میدان قیامت میں وہ جو بھی تدبیر کریں گے ناکامی اور رسوائی کے سوا اُس کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ کیونکہ صرف ایمان و عمل ہی وسیلہ نجات ہے جس سے وہ لوگ محروم ہوں گے۔

---

۱ " شرکائکم " کی تعبیر اس لیے ہے کہ وہ مشرکین خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے تھے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ شریک تم نے بنائے ہیں۔ اس کا جواب بھی تم ہی دو۔

۲ "لوانھم کانوا یھتدون " کے متعلق بلندپایہ مفسرین نے بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔ اکثریت نے کلمہ "لو" کو حرف شرط سمجھا ہے۔ اس کے بعد اس کی جزا کے متعلق بحث کی ہے۔ بعض نے اس شرط کی جزا اس جملے کو سمجھا ہے جو "رأوا العذاب" سے مستنبط ہوتا ہے۔ اور اس جملہ مقدر کی یہ تاویل کی ہے:

اور بعض لوگوں نے جملہ مقدر کو اس طرح سمجھا ہے: لوانھم کانوا یھتدون لرأوا العذاب فی الدنیا بعین الیقین

بعض مفسرین نے دوسری جزاؤں کو مقدر سمجھا ہے۔ بعض مفسرین معتقد ہیں کہ اصلاً جواب شرط محذوف ہی نہیں ہے۔ انھوں نے جملہ " راوا العذاب " کو جواب شرط قرار دیا ہے۔ اس قول کی بنا پر جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر وہ بروز قیامت چشم بینا رکھتے اور ہدایت یافتہ ہوتے تو عذاب کو دیکھتے مگر وہ چشم بینا نہیں رکھتے۔

مگر ان تمام معانی کے ماوراء ایک معنیٰ اور بھی ہے جسے بالائی سطور میں ہم نے ترجیح دی ہے اور وہ یہ ہے کہ "لو" تمنا کے لیے ہے۔ ادبی کتابوں میں بالخصوص " مغنی اللبیب " میں اس کی شرح دیکھی جاسکتی ہے۔

Marfat.com

۶۵۔ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ○

۶۶۔ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ○

۶۷۔ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ○

۶۸۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○

۶۹۔ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ○

۷۰۔ وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

ترجمہ

۶۵۔ اس دن کا سوچو کہ جب خدا انہیں پکارے گا اور کہے گا : تم نے مُرسلین کو کیا جواب دیا تھا؟

۶۶۔ اس دن تمام خبریں اُن پر پوشیدہ رہیں گی (یہاں تک کہ وُہ) ایک دوسرے سے سوال (بھی) نہیں کر سکیں گے۔

۶۷۔ لیکن جو شخص توبہ کرے ، ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے تو اُمید ہے کہ وہ فلاح یافتگان میں سے ہو جائے گا۔

۶۸۔ اور تیرا رب جسے چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے۔ (اس کے سامنے) ان کا کوئی اختیار نہیں۔ اللہ اُن شرکوں سے منزہ و برتر ہے جن کے اُس کے لیے وہ قائل ہیں ۔

۶۹۔ تیرا رب سب جانتا ہے کہ جو کچھ ان کے سینے میں چھپائے رکھتے ہیں اور جس کا اظہار

Marfat.com

کر دیتے ہیں ۔

۷۰ ۔ وُہ اللہ ہے کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور حمد و ستائش اُسی کے لیے ہے ۔ اِس جہان میں اور دُوسرے جہان میں حاکمیت (بھی) اسی کے لیے ہے اور تم سب اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے ۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں مُشرکین کا ذکر تھا ۔ اُن آیات میں اُن سوالات کے بارے میں گفتگو تھی جو اُن سے کیے گئے تھے ۔ زیرِ نظر آیات اُسی گفتگو کا تتمہ ہیں ۔

پہلے اُن کے معبودوں کے بارے میں سوال تھا ۔ اس کے بعد مرسلین کے ساتھ اُن کے سلوک سے متعلق ہے ۔

ارشاد ہوا ہے : اُس دن کا سوچ جس دن اللہ اُنہیں پکارے گا اور کہے گا ، تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا : (و یوم ینادیہم فیقول ماذا اجبتم المرسلین) ۔

پہلے سوال کی طرح یقیناً اس سوال کا بھی اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نے اُن کی دعوت کو قبول کیا تھا تو یہ جھوٹ ہے اد اُس میدان میں جھوٹ نہیں چل سکتا ۔ اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نے اُن کی تکذیب کی تھی ، اُن پر تہمتیں د نہیں ، اُنہیں جادوگر کا نام دیا تھا ، اُنہیں دیوانہ کہا تھا ، اُن کے خلاف مسلح جنگ کی تھی اور انہیں اور اُن کے پیروکاروں ل کیا تھا ۔ تو یہ بھی اُن کی بدبختی اور رُسوائی کا باعث ہے ۔

وہاں تو یہ عالم اللہ کے عظیم نبیوں سے جب سوال ہو گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا تو وہ کہیں گے :

تیرے علم کے سامنے تو ہمارا علم کچھ بھی نہیں تُو تو علام الغیوب ہے ۔ (مائدہ ۔ ۱۰۹)

ایسے عالم میں یہ کوردل مُشرک کیا جواب دے سکتے ہیں ؛

اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے : " اُس وقت تمام خبریں اُن سے پردۂ اخفا میں ہوں گی " اور جواب دینے کے لیے کچھ بھی اُن کے پاس نہ ہو گا ۔ (فعمیت علیھم الانباء یومئذ) ۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے بھی کچھ پُوچھ نہ سکیں گے " اور نہ کسی کا کچھ جواب سُن پائیں گے ۔ (فھم لا یتساءلون) ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں " عمی " یعنی اندھے پن کی نسبت خبروں کی طرف دی گئی ہے نہ کہ خود اُن کی طرف ۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ " وہ اندھے ہو جائیں گے " بلکہ کہتا ہے : " خبریں ایسی اندھی ہوں گی کہ اُنہیں

Marfat.com

تلاش نہ کر پائیں گی کیونکہ بسا ایسا ہوتا ہے کہ انسان خود کسی چیز سے باخبر نہیں ہوتا لیکن ایک منہ سے دوسرے کی طرف گردش کرتی ہوئی خبر اُس تک پہنچ جاتی ہے۔ معاشرے میں بہت سی خبریں یونہی پھیلتی ہیں لیکن اُس جہان میں نہ تو یہ لوگ آگاہی رکھتے ہوں گے اور نہ ہی خبر پھیلنے کی صلاحیت۔

اس طرح تمام خبریں اُن سے پوشیدہ رہیں گی۔ جب اُن سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اُن مرسلین کو کیا جواب دیا تھا تو اُن سے کوئی جواب نہ بن پائے گا اور وہ سراپا سکوت بن جائیں گے۔

قرآن کی روش یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کافروں اور گنہگاروں پر لوٹ آنے کے راستے کھلے رکھتا ہے تاکہ وہ گناہ کے کسی بھی مرحلے سے راہ حق کی طرف پلٹنا چاہیں تو اُن کے لیے گنجائش موجود ہو۔ اسی لیے اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے۔ البتہ جو شخص توبہ کرلے، ایمان لے آئے اور عملِ صالح بجالائے اُمید ہے کہ فلاح یافتگان میں سے ہوجائے۔ (فاما من تاب وامن وعمل صالحا فعسٰی ان یکون من المفلحین)۔

لہٰذا تمہارے لیے راہِ نجات ان تین اقدامات میں ہے :

۱۔ خدا کی طرف بازگشت

۲۔ ایمان

۳۔ عملِ صالح

اس کے بعد یقیناً فلاح و نجات ہے۔

"عسٰی" (اُمید ہے) ــــ اگرچہ جو شخص ایمان و عملِ صالح کا حامل ہو اس کے لیے فلاح یقینی ہے لیکن یہاں ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے ہو کہ فلاح اس حالت کے تسلسل سے مشروط ہے اور چونکہ ضروری نہیں کہ ہر توبہ کرنے والا اپنی اس حالت پر باقی رہے اس لیے یہاں یہ لفظ لایا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جب "عسٰی" کی تعبیر کسی ذاتِ کریم سے صادر ہو تو اس میں قطعی اور یقینی ہونے کا مفہوم پنہاں ہوتا ہے جب کہ اللہ تو اکرم الاکرمین ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت درحقیقت نفیِ شرک اور مشرکین کے بطلان کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : تیرا رب جس چیز کو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے۔ (وربك یخلق ما یشاء و یختار)۔

تخلیق اُس کے ہاتھ میں ہے اور تدبیر و اختیار اور انتخاب بھی اسی کے ارادے پر منحصر ہے " وہ اس کے مقابلے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے "۔ (ما کان لهم الخیرة)[1]

خلق کرنے کا اختیار اُسے حاصل ہے، اختیارِ شفاعت کا حامل وہ ہے اور انبیاء و مرسلین بھیجنے کا اختیار اُسی

---

[1] "ما کان لهم الخیرة" میں "ما" نافیہ ہے۔ البتہ بعض نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ یہاں یہ "ما" موصولہ ہے اور یختار کے محذوف مفعول پر معطوف ہے لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے۔

Marfat.com

کے پاس ہے ــــ خلاصہ یہ کہ تمام چیزوں کا اختیار اس کی ذاتِ پاک کے ارادے سے وابستہ ہے کیونکہ بُتوں سے تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا جب کہ فرشتے اور انبیاءؑ بھی اس کی اجازت ہی سے کچھ کرسکتے ہیں ۔

بہرحال یہاں اختیار کا اطلاق اس کی عمومیت کی دلیل ہے یعنی اللہ امورِ تکوینی میں بھی صاحب اختیار ہے اور امورِ تشریعی میں بھی ــــ دونوں کا سرچشمہ اس کا مقامِ خالقیت ہے ۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر وہ کیونکر راہِ شرک پر چلتے ہیں اور غیر خدا کی طرف کس طرح جاتے ہیں ۔

اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : اللہ ان شرکاء سے منزہ و برتر ہے جن کے وہ قائل ہوتے ہیں ۔ (سبحان اللہ وتعالیٰ عما یشرکون) ۔

اہل بیت علیہم السلام کے حوالوں سے پہنچنے والی روایات میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں مذکور اختیار، انتخاب اور چناؤ خدا کی طرف سے امام معصومؑ کے انتخاب کی طرف اشارہ ہے ۔ نیز " ماکان لھم الخیرۃ " (لوگوں کو اس سلسلے میں کوئی اختیار نہیں) سے بھی یہی مفہوم مُراد لیا گیا ہے ۔ ان روایات میں دراصل ایک واضح مصداق بیان کیا گیا ہے کیونکہ دین کی حفاظت کا مسئلہ خدا ہی سے مربوط ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس مقصد کے لیے خدا کے علاوہ کوئی اور معصوم رہبر کا انتخاب کرسکے [1]

❊ ❊ ❊

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے وسیع علم کے بارے میں بات کی گئی ہے ۔ گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کے وسیع اختیار کا ذکر ہوا تھا ، زیرِ نظر آیت اس کے لیے تاکید یا دلیل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : تیرا پروردگار اُسے بھی جانتا ہے کہ جو وہ اپنے سینے میں چھپائے رکھتے ہیں اور اُسے بھی جسے آشکار کرتے ہیں ۔ (وربك يعلم ما تكن صدورهم وما يعلنون) ۔

یہ ہر چیز پر اس کے احاطے اور اختیار کی دلیل ہے نیز ضمنی طور پر مشرکین کے لیے تہدید ہے کہ وہ یہ گمان نہ کریں کہ اللہ ان کی نیتوں اور سازشوں سے آگاہ نہیں ہے ۔

❊ ❊ ❊

زیرِ بحث آخری آیت درحقیقت گزشتہ آیات کے لیے نفیِ شرک کے بارے میں اخذِ نتیجہ اور توضیح کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کا بیان ہے جو سب اُس کی خالقیت اور اختیار کی فرع ہیں ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : وُہ خدا ہے کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں (وھو اللہ لا الٰہ الا ھو) ۔

کیسے ممکن ہے کہ اُس کے علاوہ کوئی معبود ہو جب کہ خالق صرف وہ ہے اور تمام اختیارات اسی کے دستِ قدرت میں ہیں لہٰذا جو لوگ شفاعت وغیرہ کے عُذر سے بُتوں کے دامن سے متمسک ہیں وہ سخت اشتباہ میں مبتلا ہیں ۔

دُوسری صفت یہ کہ تمام نعمتیں ، چاہے اس جہان کی ہوں چاہے اُس جہان کی سب اسی کی طرف سے ہیں اور یہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین ، ج ۴ ص ۱۳۶ بحوالہ اصولِ کافی اور تفسیر علی بن ابراہیم ۔

Marfat.com

اس کی خالقیت مطلقہ کا لازمہ ہے۔ اس لیے قرآن مزید کہتا ہے: ہر حمد و ستائش بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے چاہے اس جہان میں ہو چاہے اُس جہان میں۔ (له الحمد فی الاولیٰ والاٰخرة)۔

تیسری صفت یہ ہے کہ دونوں جہانوں میں وہی حاکم ہے۔ (وله الحکم)۔

بدیہی ہے کہ جب خالق و مختار وہ ہے تو تکوینی و تشریعی حاکمیت بھی اسی کے اختیار میں ہوگی۔

چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "تم سب کی بازگشت (حساب و اجر کے لیے) اسی کی طرف ہوگی۔ (والیه ترجعون)۔

وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، وہ تمہارے اعمال سے آگاہ بھی ہے اور وہی یوم الجزاء کا حاکم ہے لہذا تمہارا حساب کتاب اور تمہاری جزاء و سزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔

❊ ❊ ❊

Marfat.com

۷۱۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝

۷۲۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ
فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

۷۳۔ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ
وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

۷۴۔ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ
تَزْعُمُوْنَ ۝

۷۵۔ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ ع

ترجمہ

۷۱۔ کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روزِ قیامت تک تمہارے لیے رات ہی کو باقی رکھنا چاہے تو
کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے روشنی لا سکے ؟ کیا تم سنتے نہیں ہو ؟

Marfat.com

۷۲۔ کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روزِ قیامت تک دن ہی کو باقی رکھنا چاہے تو کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے رات لاسکے تاکہ تم اس میں سکون پا سکو ؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو ؟

۷۳۔ یہ امر اس کی رحمت میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے ہیں تاکہ اس میں سکون پاؤ اور فضلِ الٰہی سے فائدہ اُٹھاؤ۔ شاید تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

۷۴۔ اس دن کا سوچو جس میں انہیں پکارے گا اور کہے گا : کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے ؟

۷۵۔ (اس روز) ہم ہر اُمت میں سے گواہ منتخب کریں گے اور (گمراہ مشرکین سے) کہیں گے اپنی دلیل پیش کرو۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ حق اللہ کے لیے ہے اور جو کچھ بھی وہ افترا پردازی کرتے تھے وہ سب ان (کی نگاہ) سے گم ہو جائے گا۔

تفسیر

رات اور دن کا وجود عظیم نعمت ہے :

زیر بحث آیات نعماتِ الٰہی کے ایک عظیم حصے کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ یہ نعمات توحید اور نفی شرک پر بھی دلالت کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے زیر بحث آیات گزشتہ آیات کی بحث کو ہی مکمل کرتی ہیں۔ ان آیات میں مذکور نعمات اُن نعماتِ الٰہی کا ایک نمونہ بھی ہیں جن کی وجہ سے خدا لائق حمد و ستائش ہے، وہی حمد و ستائش جس کا ذکر گزشتہ آیات میں آیا ہے نیز یہ نعمات نظامِ آفرینش اور اس جہان کی تدبیر میں خدا کے مختار ہونے پر بھی شاہد ہیں۔

پہلے دن کی عظیم نعمت یعنی روشنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہی روشنی کہ جو ہر جنبش و حرکت کا سرچشمہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روزِ قیامت تک دن رات کو طویل کر دیتا تو کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے روشنی لے آتا ؟ کیا سنتے نہیں ہو ؟ (قل ارءیتم ان جعل اللہ علیکم اللیل سرمدًا الٰی یوم القیامة من الٰہ غیر اللہ یاتیکم بضیاء افلا تسمعون)[1]

(حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

Marfat.com

یہاں لفظ "ضیاء" (روشنی) استعمال کیا گیا ہے کیونکہ دن کا اصلی اور بنیادی مقصد روشنی ہی ہے۔ وہی روشنی کہ جس سے تمام موجودات زندہ کی حیات وابستہ ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو نہ درخت اُگتے۔ نہ پھول کھلتے، نہ پرندے پرواز کرتے۔ نہ انسانوں کی حیات ہوتی اور نہ بارش کا کوئی قطرہ برستا۔

"سرمد" دائم اور ہمیشگی کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے "سرد" کے مادہ سے سمجھا ہے اور اس کا معنی "پے درپے" کیا ہے۔ اس کی میم کو اُنھوں نے زائد قرار دیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ مادہ خود دائم اور ہمیشگی کے معنی میں ہے۔[۱]

اگلی آیت "تاریکی" کی نعمت کا ذکر کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دو: مجھے بتاؤ اگر خدا روزِ قیامت تک دن کو طویل کر دیتا تو اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے رات لے آتا تاکہ تم اس میں آرام کر پاتے؟ کیا دیکھتے نہیں ہو؟ (قل ارءیتم ان جعل اللّٰہ علیکم النہار سرمدًا الی یوم القیامۃ من الٰہ غیر اللّٰہ یأتیکم بلیل تسکنون فیہ افلا تبصرون)۔

❊ ❊ ❊

تیسری آیت جو درحقیقت گزشتہ دو آیتوں کا نتیجہ ہے اس میں فرمایا گیا ہے: یہ امر رحمتِ الٰہی میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے ہیں تاکہ تم آرام بھی کر سکو اور دوسری طرف اپنی زندگی کی خاطر فضلِ خدا سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر سکو اور شاید تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ (ومن رحمتہ جعل لکم اللیل والنہار لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون)۔

جی ہاں، رحمتِ الٰہی کی وسعت کا تقاضا ہے کہ وہ تمہیں زندگی کے تمام وسائل مہیا کرے۔ ایک طرف تو تمہیں کام کاج اور جنبش و حرکت کی ضرورت ہے کہ جو دن کی روشنی کے بغیر ممکن نہیں اور دوسری طرف تمہیں راحت و آرام کی ضرورت ہے کہ جو شب کی تاریکی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

دورِ حاضر میں سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ روشنی کی موجودگی میں انسانی جسم کی تمام مشینریاں حرکت میں رہتی ہیں۔ خون کی گردش، سانس لینے کی مشینری، حرکتِ قلب وغیرہ۔ اگر روشنی ضرورت سے زیادہ پڑے یا ایک خاص مقدار سے بڑھ جائے تو خلیے (CELLS) تھک جاتے ہیں اور نشاط و اطمینان کی جگہ فسردگی سی چھا جاتی ہے۔ اس کے برعکس رات کی تاریکی میں بدن کی مشینریاں ایک گہرے آرام و سکون میں ڈوب جاتی ہیں۔ ایسے میں قویٰ ایک نشاطِ تازہ حاصل کرتے ہیں۔[۲]

(گزشتہ صفحے کا حاشیہ)

حاشیہ صفحہ نمبر ۱ "ارءیتم" کا عام طور پر "اخبرونی" (مجھے بتاؤ) معنی کیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کبھی یہ لفظ "ہل علمتم" (کیا تم جانتے ہو) کے معنی میں بھی آتا ہے۔

[۱] یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اربابِ لغت نے تصریح کی ہے کہ "سرمدی" ایسے موجود کو کہا جاتا ہے کہ جس کا نہ آغاز ہو اور نہ انجام جب کہ "ازلی" اُسے کہتے ہیں جس کا آغاز نہ ہو اور "ابدی" اُسے کہتے ہیں جس کا انجام نہ ہو۔

[۲] تفسیر نمونہ کی آٹھویں اور بارہویں جلد میں اس مسئلے کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

Marfat.com

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ قرآن جس وقت دائمی رات کا ذکر کرتا ہے تو آیت کے آخر میں فرماتا ہے :

" کیا سُنتے نہیں ہو ؟ "

اور جس وقت دائمی دن کے بارے میں بات کرتا ہے تو فرماتا ہے :

" کیا دیکھتے نہیں ہو ؟ "

تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے اس بناء پر ہو کہ رات سے مناسبت رکھنے والی حسّ قوت شنوائی ہے جب کہ دن کے ساتھ مناسبت رکھنے والی حسّ بینائی ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے اپنی تعبیرات میں کس حد تک باریک بینی سے کام لیا ہے ۔

یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ اس سلسلۂ کلام کے آخر میں " شکر " کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ۔ نور و ظلمت کا ایسا جچا تُلا نظام عطا ہونے پر شکر ـــــ ایسا شکر جو بہر صورت انسان کو معرفتِ منعم پر آمادہ کرتا ہے اور ایسا شکر جو افزائش ایمان کا باعث بنتا ہے ۔

توحید اور نفی شرک کے بارے میں کچھ دلائل ذکر کرنے کے بعد قرآن پھر اسی سوال کی طرف لوٹتا ہے جو گزشتہ آیات میں زیر بحث تھا ۔ فرماتا ہے : اس دن کا سوچو کہ جب خدا انہیں پکارے گا اور کہے گا :

کہاں ہیں وہ جو بزعم خود تم نے شریک قرار دے رکھے تھے ! (ویوم ینادیھم فیقول این شرکاءی الذین کنتم تزعمون) ۔

یہ آیت بعینہٖ اسی سُورہ کی آیت ٦٢ ہے ۔ ہو سکتا ہے یہ تکرار اس بناء پر ہو کہ روزِ قیامت پہلے مرحلے میں اُن سے ایک انفرادی سوال ہوگا تاکہ اُن کا ضمیر بیدار ہو جائے اور وہ شرمندہ ہوں ۔ جب کہ دُوسرے مرحلے میں سب لوگوں اور گواہوں کی موجودگی میں سوال کیا جائے گا تاکہ وہ شرمسار ہوں اور دوسری آیت میں اسی مرحلے کی مناسبت سے سوال آیا ہے لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : اس روز ہم ہر اُمّت میں سے گواہ چُنیں گے ۔ (ونزعنا من کل امة شھیدًا) [1]

اس کے بعد " بے خبر اور گمراہ مشرکین سے ہم کہیں گے کہ اپنے شرک پر کوئی دلیل پیش کرو ۔ " (فقلنا ھاتوا برھانکم) ۔

یہ وہ منزل ہے جہاں تمام مسائل روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائیں گے ۔ " اور وہ جان لیں گے کہ حق خدا کے لیے ہے " (فعلموا انّ الحق للّٰہ) ۔

اور جو کچھ وہ افتراء باندھتے تھے سب اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور گُم ہو جائے گا ۔ (وضل عنھم ما کانوا یفترون) ۔

ہر اُمّت میں سے گواہ سے کیا مُراد ہے ؟ اس سلسلے میں اگر قرآن کی دیگر آیات کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی اُمّت پر گواہ ہوگا جب کہ پیغمبر اسلامؐ خاتم انبیاء ہیں ۔ آپؐ تمام انبیاؑ اور تمام اُمّتوں پر گواہ ہیں ۔

[1] نزع کے مادہ سے نزعنا کی تعبیر کسی چیز کو اس کی جگہ سے جذب کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں ہر گروہ سے ایک گواہ لایا جانا مُراد ہے ۔

Marfat.com

چنانچہ سورہ نساء کی آیت ۴۱ میں فرمایا گیا ہے :

فکیف اذا جئنا من کل اُمۃ بشھید و جئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شھیدًا

اس دن اُن کی کیا حالت ہو گی کہ جب ہم ہر اُمت کے اعمال کا گواہ طلب کریں گے اور تجھے اُن پر گواہ قرار دیں گے۔

اس طرح گویا انبیاء کے حضور ایک مجلس منعقد ہو گی اور ان کور دل ہٹ دھرم مُشرکوں سے اس مجلس میں باز پُرس ہو گی۔ اس موقع پر انہیں احساس ہو گا کہ شرک کی مصیبت کتنی بڑی ہے۔ اب وہ پروردگار کی حقانیت اور بُتوں کی لغویت واضح طور پر دیکھیں گے۔

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ قرآن یہاں پر کہہ رہا ہے :

ضل عنھم ما کانوا یفترون

یعنی بُتوں کے بارے میں اُن کے بے بُنیاد تصورات و خیالات سب ان کی نظروں سے غائب ہو جائیں گے کیونکہ میدان قیامت مقام حق ہے۔ وہاں باطل کے لیے کوئی گنجائش نہیں لہٰذا باطل غائب اور محو ہو جائے گا۔ اِس دُنیا میں اگر باطل حق کا لباس پہن لیتا ہے اور چند دن فریب کاری میں مشغول رہتا ہے تو وہاں فریب کے پردے سب ہٹ جائیں گے اور حق کے علاوہ کچھ باقی نہ رہے گا۔

ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام " ونزعنا من کل اُمۃ شھیدًا " کی تفسیر کرتے ہُوئے فرماتے ہیں :

ومن ھٰذہ الامۃ امامھا

اس اُمت سے بھی اس کے امام کو چُنا جائے گا۔[1]

یہ بات اِس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ ہر زمانے میں اُمت کے لیے ایک معصوم شاہد ضروری ہے اور مندرجہ بالا حدیث اس کے ایک مصداق کی طرف اشارہ ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱۶، ص۷۲۔

Marfat.com

۷۶۔ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ
مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۗ اِذْ
قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝
۷۷۔ وَابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ
مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ
فِى الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝
۷۸۔ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ
قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۶۔ قارون قومِ موسیٰ میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا۔ ہم نے اسے اسقدر خزانے دیے تھے کہ ان کے صندوق ایک طاقتور گروہ کے لیے بھی اُٹھانا مشکل تھے۔ وُہ وقت یاد کرو جب اس کی قوم نے اس سے کہا: یہ سب متکبّرانہ خوشی نہ کرو کیونکہ غرور آمیز خوشی کرنے والوں کو خُدا دوست نہیں رکھتا۔

۷۷۔ اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس کے ذریعے آخرت کا گھر تلاش کر اور دُنیا سے اپنے

Marfat.com

حصّے کو فراموش نہ کر اور جیسے خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی ہے تُو بھی نیکی کر اور زمین پر ہرگز فساد و گناہ نہ کر کہ خدا مفسدین کو پسند نہیں کرتا۔

۷۸۔ (قارون) کہنے لگا: یہ دولت مَیں نے اپنے علم کی وجہ سے حاصل کی ہے۔ کیا اُسے معلوم نہ تھا کہ خُدا نے اس سے پہلے کچھ ایسی بھی قوموں کو ہلاک کر دیا جو اس سے زیادہ طاقتور اور زیادہ مالدار تھیں (اور جس وقت عذاب الٰہی آپہنچتا ہے تو) پھر مجرموں سے ان کے گناہوں کا نہیں پوچھا جاتا (اور ان کے لیے عُذر خواہی کا موقع باقی نہیں رہتا)۔

تفسیر

بنی اسرائیل کے خُود پرست سرمایہ دار:

حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کی عجیب و غریب سرگزشت اور فرعون کے خلاف اُن کے جہاد کے بارے میں کچھ تفصیلات اسی سُورت کی گزشتہ آیات میں بیان کی گئی ہیں اور اس سلسلے میں کہنے کی باتیں کہی جا چکی ہیں۔ مذکورہ گفتگو بہت ہدایت بخش تھی۔

اس سورہ کی کچھ آیات بنی اسرائیل کے ایک اور مسئلے اور اُلجھن سے متعلق ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اُن میں ایک سرکش سرمایہ دار تھا۔ اُس کا نام قارون تھا۔ قارون غرور و سرکشی میں مست کر دینے والی دولت کا مظہر تھا۔

اصولی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں تین متجاوز طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد کیا۔ ایک فرعون تھا جو حکومت و اقتدار کا مظہر تھا، دوسرا قارون تھا جو ثروت و دولت کا مظہر تھا اور تیسرا سامری تھا کہ جو مکر و فریب کا مظہر تھا۔ اگرچہ حضرت موسیٰؑ کا سب سے بڑا معرکہ حکومت کے خلاف تھا لیکن دوسرے معرکے بھی اہم تھے اور وہ بھی عظیم تربیتی نکات کے حامل ہیں۔

مشہور ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قریبی رشتہ دار تھا۔ (چچا تھا یا چچازاد تھا اور یا خالہ زاد)۔ اس نے تورات کا خُوب مطالعہ کیا تھا۔ پہلے وہ مومنین کی صف میں تھا لیکن دولت کا گھمنڈ اُسے کفر کی آغوش میں لے گیا اور اُسے زمین میں غرق کر دیا۔ اس غرور نے اسے پیغمبرِ خدا کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور اس کی موت سب کے لیے باعثِ عبرت بن گئی۔ اس واقعے کی تفصیل ہم زیرِ بحث آیات میں پڑھیں گے۔

Marfat.com

ارشاد ہوتا ہے : قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا (انّ قارون کان من قوم موسیٰ فبغٰی علیھم)۔

اس ظلم کا سبب یہ تھا کہ اُس نے بہت سی دولت کما لی تھی اور چونکہ اس کا ظرف کم تھا اور ایمان مضبوط نہ تھا اس لیے فراواں دولت نے اسے بہکا دیا اور اسے انحراف و استکبار کی طرف لے گئی۔

قرآن کہتا ہے : ہم نے اسے مال و دولت کے اتنے خزانے دیے کہ انہیں اُٹھانا ایک طاقتور گروہ کے لیے بھی مشکل تھا۔ (واٰتیناہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوٓء بالعصبۃ اولی القوۃ)۔

"مفاتح" "مفتح" (بروزن "مکتب") کی جمع ہے۔ اس کا معنیٰ ہے ایسی جگہ جس میں کوئی چیز ذخیرہ کرتے ہیں مثلاً صندوق کہ جس میں اموال و اشیاء محفوظ رکھتے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ قارون کے پاس اس قدر سونا چاندی اور قیمتی اموال تھے کہ ان کے صندوقوں کو طاقتور لوگوں کا ایک گروہ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتا تھا۔

توجہ رہے کہ "عصبہ" اس گروہ کو کہتے ہیں کہ جس نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوں، جس کے افراد بہت طاقتور ہوں اور اعصاب کی طرح ایک دوسرے کو پکڑے ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قارون کے جواہرات اور گراں قیمت اموال کا حجم کس قدر زیادہ تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ "عصبہ" دس سے لے کر چالیس افراد تک کے گروہ کو کہتے ہیں۔

لفظ "تنوء" "نوء" کے مادے سے زحمت و مشقت سے اُٹھنے کے معنی میں ہے اور بہت وزنی اموال کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے کہ جب انسان اسے اُٹھاتا ہے تو بوجھ کے باعث ایک طرف سے دُوسری طرف کو جُھک جاتا ہے۔

"مفاتح" کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اسے مفسرین اور علماء لغت کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے جب کہ بعض دوسرے علماء نے "مفاتح" کو "مفتح" (بروزن "منبر") کی جمع قرار دیا ہے جس کا معنیٰ ہے چابی۔ یہ مفسرین کہتے ہیں کہ قارون کے خزانوں کی چابیاں اتنی تھیں کہ کئی طاقتور افراد بڑی مشکل سے انہیں اُٹھا پاتے تھے۔

جن لوگوں نے یہ دوسرا معنیٰ اپنایا ہے وہ خود اپنے اس معنیٰ کی توجیہ میں مشکل سے دوچار ہوگئے ہیں کہ خزانے کی چابیوں کے لیے ایسا کیونکر ممکن ہے۔ بہرحال پہلی تفسیر زیادہ واضح اور زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ اس سے قطع نظر کہ اہل لغت نے "مفتح" کے بھی کئی معانی بیان کیے ہیں ان میں سے ایک معنیٰ "خزانہ" ہی ہے یعنی مال جمع کرنے کی جگہ لیکن پہلا معنیٰ حقیقت سے نزدیک تر اور ہر قسم کے مبالغے سے پاک ہے۔ البتہ "مفاتیح" "مفتاح" کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے چابی۔ ان الفاظ سے اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے [1]

---

[1] بعض مفسرین نے یہاں چابی کیلئے بھی ایک مجازی معنی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ مُراد یہ ہے کہ ان تمام اموال کی چابی سنبھالنا اور ان کی حفاظت کرنا طاقتور لوگوں کے لیے بھی مشکل تھا لیکن یہ تفسیر بھی بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ (اس لفظ کے لغوی مفہوم کو تفصیل سے جاننے کے لیے "لسان العرب" کی طرف رجوع فرمائیں)۔

Marfat.com

آیئے اس بحث سے آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ بنی اسرائیل نے قارون سے کیا کہا :

قرآن کہتا ہے : اس وقت کو یاد کرو جب اس کی قوم نے اس سے کہا : تم میں ایسی خوشی نہیں ہونی چاہیئے جس میں تکبر اور غفلت ہو کیونکہ خدا غرور میں ڈوبے ہوئے خوشحال افراد کو پسند نہیں کرتا۔(اذ قال لہ قومہ لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین)[1]

اس کے بعد چار اور قیمتی ، سرنوشت ساز اور تربیتی نصیحتیں کرتے ہیں۔ اس طرح کل پانچ ہوگئیں۔

پہلے کہتے ہیں : اللہ نے جو کچھ تجھے دیا ہے اُس سے دارِ آخرت حاصل کر۔ (وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض کج فہم افراد کے خیال کے برخلاف مال و دولت کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کس راستے پر صرف ہو رہا ہے۔ اگر اس کے ذریعے دارِ آخرت کو تلاش کیا جائے تو پھر اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ غرور ، غفلت ، ظلم ، تجاوز اور ہوس پرستی کا ذریعہ بن جائے تو پھر اس سے بدتر بھی کوئی چیز نہیں۔

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام نے یہی منطق دُنیا کے بارے میں اپنے ایک مشہور جملے میں بیان فرمائی ہے :

من ابصر بھا بصرتہ و من ابصر الیھا اعمتہ ۔

اگر کوئی دُنیا کو ایک ذریعہ جانتے ہوئے اس کی طرف دیکھے تو یہ اُس کی آنکھ کو بینا کر دیتی ہے مگر جو اسے مقصد قرار دیتے ہوئے اس کی جانب دیکھے تو یہ اسے نابینا کر دیتی ہے۔[2]

قارون اپنی بے پناہ دولت کی بناء پر بہت سے اجتماعی امورِ خیر انجام دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے غرور و تکبر نے اسے حقائق دیکھنے کی اجازت نہ دی۔

اُنہوں نے مزید کہا : دُنیا سے اپنے حصّے کو نہ بھول جا۔(ولا تنس نصیبک من الدنیا)۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کا اس دُنیا میں ایک محدود حصّہ ہے یعنی وہ مال جو اس کے بدن ، لباس اور مکان کے لیے درکار ہوتا ہے اور ان پر صرف ہوتا ہے اس کی مقدار معین ہے اور ایک خاص مقدار سے زیادہ اس کے لیے قابلِ جذب ہی نہیں ہوتا۔ انسان کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔

ایک انسان کتنی غذا کھا سکتا ہے ، کتنا لباس پہن سکتا ہے اور اسے کتنے مکانوں اور سواریوں کی ضرورت ہوتی ہے ؟ مرتے وقت انسان کتنے کفن ساتھ لے جا سکتا ہے ؟ لہٰذا باقی وہ چاہے نہ چاہے دوسروں کا حصّہ ہے۔ اور انسان اس کا امانت دار ہے۔ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے کیا خوب بیان فرمایا ہے :

یا ابن آدم ما کسبت فوق قوتک فانت فیہ خازن لغیرک

اے فرزندِ آدم : جو کچھ تو اپنی خوراک کی مقدار سے زیادہ حاصل کرتا ہے اس کے

---

[1] "فرحین" "فرح" کی جمع ہے اس کا معنی ہے وہ شخص کہ جو کچھ چیز پالینے کی وجہ سے مغرور ہو گیا ہو اور خوشی سے پھولا نہ سماتا ہو۔

[2] نہج البلاغہ ، خطبہ ۸۲ ۔

Marfat.com

بارے میں تو دوسروں کا خزانہ دار ہے۔[1]

اسلامی روایات اور کلماتِ مفسرین میں اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ملتی ہے اور ہو سکتا ہے یہ بھی اس کا ایک معنیٰ ہو کیونکہ ایک لفظ ایک سے زیادہ معانی میں استعمال ہو سکتا ہے۔

وہ تفسیر یہ ہے کہ ــــ معانی الاخبار میں ہے کہ "ولا تنس نصیبک من الدنیا" کی تفسیر میں حضرتِ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا تنس صحتك وقدرتك وفراغك وشبابك ونشاطك ان تطلب بها الأخرة

تندرستی، قوت، فراغت، جوانی اور خوشی کو فراموش نہ کر اور ان (پانچ عظیم نعمتوں) کے ذریعے اپنی آخرت طلب کر۔[2]

اس تفسیر کے مطابق قرآن حکیم کا مذکورہ بالا جملہ تمام انسانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ میسّر صلاحیتوں اور مواقع کو ضائع نہ کر دیں کیونکہ مہلت کے لمحے بادلوں کی طرح جلد گزر جاتے ہیں۔[3]

تیسری نصیحت یہ ہے: جیسے خدا نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی نیکی کر۔ (واحسن کما احسن الله اليك)۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ اللہ کے احسان پر نظر لگائے ہوئے ہے اور اس کی بارگاہ سے ہر خیر کا تقاضا کر رہا ہے اور اسی سے ہر قسم کی توقع باندھے ہوئے ہے تو اس طرح سے وہ کیونکر کسی کے صریح تقاضے کو یا زبانِ حال کے تقاضے کو نظرانداز کر سکتا ہے اور اس سے کیسے بے اعتنائی برت سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جیسے خدا نے تجھ پر عنایت کی ہے تو بھی دوسروں سے نیکی کر۔ سورۂ نور کی آیت ۲۲ میں عفو و درگزر کے بارے میں ایسی ہی بات کہی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وليعفوا وليصفحوا الا تحبون ان يغفر الله لكم

مومنین کو چاہیئے کہ عفو و درگزر سے کام لیں۔ کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ اللہ تمہیں بخش دے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات خدا انسان کو عظیم نعمتیں دیتا ہے جب کہ اسے اپنی ذاتی زندگی میں ان سب کی احتیاج نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی کو خدا ایسی عقل دیتا ہے کہ جو نہ صرف ایک فرد کا نظام چلانے کے لیے کافی ہوتی ہے بلکہ ایک ملک کو کنٹرول کر سکتی ہے۔ کسی کو وہ ایسا علم دیتا ہے جو ایک انسان ہی کے لیے نہیں بلکہ ایک معاشرے کے لیے کارمند ہو سکتا ہے۔ کسی کو وہ ایسا مال دیتا ہے کہ جو بڑے بڑے اجتماعی پروگراموں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس قسم کی نعماتِ الٰہی کا مفہوم یہ ہے کہ یہ سب کی سب تیری ایک ذات سے متعلق نہیں ہیں بلکہ انہیں دوسروں کی طرف منتقل کرنے کے لیے تو امانت دار اور وکیل ہے۔ اللہ نے تجھے یہ نعمت اس لیے دی ہے تاکہ تیرے ہاتھ سے اپنے بندوں کا نظام چلائے۔

---

[1] نہج البلاغہ، کلماتِ قصار ۱۹۲
[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۴ ص ۱۳۹، بحوالہ معانی الاخبار۔

Marfat.com

آخر میں چوتھی نصیحت یہ ہے : کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مادی وسائل تجھے دھوکہ دیں اور تُو انہیں گناہ اور دعوتِ گناہ میں صَرف کر دے " زمین میں ہرگز گناہ و فساد نہ کر کیونکہ اللہ مفسدین کو پسند نہیں کرتا " (ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین) ۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات دولت مند اور سرمایہ دار ہوسِ زر یا بڑا بننے کے جنون میں خرابی کرتے ہیں اور معاشرے کو محرومیت اور فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیتے ہیں ۔ ہر چیز اپنے لیے ہی منحصر کر لیتے ہیں ، لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنے کے درپے ہوتے ہیں اور جو کوئی اعتراض کرے اسے ختم کر دیتے ہیں اور اسے ختم نہ کر سکیں تو تہمتیں لگا کر غیر مؤثر اور معاشرے سے ایک طرف کر دیتے ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ معاشرے کو خرابی و تباہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان ناصحین نے پہلے قارون کا غرور ختم کرنے کی کوشش کی ۔ پھر اسے خبردار کیا کہ دنیا وسیلہ ہے مقصد نہیں تیسرے مرحلے میں اسے متنبہ کیا کہ جو کچھ تیرے پاس ہے اُس میں سے تُو اپنے لیے تھوڑا سا خرچ کر سکتا ہے ۔ پھر اسے یہ حقیقت یاد دلائی کہ خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی ہے تجھے بھی نیکی کرنی چاہیئے ورنہ وہ اپنی نعمتیں تجھ سے چھین لے گا اور پانچویں مرحلے میں اسے زمین میں خرابی برپا کرنے سے ڈرایا اور یہ آخری بات پہلی چار باتوں کا حاصل ہے ۔

صحیح طور پر معلوم نہیں کہ نصیحت کرنے والے یہ افراد کون تھے ۔ البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ وہ اہل علم ، پرہیزگار ، زیرک بابصیرت اور جرأت مند افراد تھے ۔ بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ وہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے ۔ لیکن یہ بات بہت بعید ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے :

اذ قال لہ قومہ

قارون کی قوم نے اس سے کہا ۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس سرکش و ستمگر بنی اسرائیل نے ان ہمدرد واعظین کو کیا جواب دیا ۔

قارون تو اپنی اس بے حساب دولت کے نشے میں چُور تھا اُس نے اُسی غرور سے کہا : مَیں نے تو یہ سب دولت اپنے علم و دانش کے بل بوتے پر حاصل کی ہے : (قال انما اوتیتہ علی علم عندی) ۔ تمہیں اس سے کیا کہ میں اپنی دولت کیسے خرچ کرتا ہوں ۔ جو مَیں نے کمایا اسے خود کمایا ہے تو پھر صَرف کرنے میں بھی مجھے تمہاری راہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں ۔ علاوہ ازیں یقیناً خدا مجھے اس دولت کے لائق سمجھتا تھا تبھی تو اس نے مجھے عطا کی ہے اور اسے صَرف کرنے کی راہ بھی اُس نے مجھے بتائی ہے ۔ مَیں دوسروں سے بہتر جانتا ہوں ۔ تمہیں اس میں دخیل ہونے کی ضرورت نہیں ۔ ان سب باتوں سے قطع نظر زحمت مَیں نے کی ہے ۔ تکلیف مَیں نے اُٹھائی ہے ، خونِ جگر پیا ہے تب کہیں یہ دولت جمع کی ہے ، دوسروں کے پاس بھی ایسی لیاقت و توانائی ہوتی تو وہ زحمت و کوشش کیوں نہ کرتے ۔ مَیں نے کوئی ان کا راستہ تو نہیں روک رکھا اور اگر ان میں اس کی لیاقت نہیں ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ بھوکے رہیں اور مر جائیں [1]

یہی وہ بوسیدہ اور گھٹیا منطق ہے کہ جو عام طور پر بے ایمان سرمایہ دار نصیحت کرنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔

---

[1] " اوتیتہ علی علم عندی " : اس جملے میں مذکورہ بالا ایک یا تینوں معانی ہو سکتے ہیں ۔

Marfat.com

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے اس باب کو اجمالاً بیان کیا ہے کہ قارون کس علم کے بل پر دولت جمع کرتا تھا۔
کیا وہ علمِ کیمیا تھا، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے یا پھر تجارت، زراعت اور صنعت کا علم تھا یا پھر کیا وہ انتظامی صلاحیت اور علم کا حامل تھا یا یہ سب امور تھے۔ بعید نہیں کہ آیت کا مفہوم وسیع ہو اور یہ ان سب امور کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ (قطع نظر اس کے کہ اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ علم کیمیا کے ذریعے تانبے وغیرہ کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے)

اس موقع پر قرآن قارون اور اس جیسے دیگر افراد کو ایک تیکھا جواب دیتا ہے: کیا اُسے معلوم نہ تھا کہ خدا نے اس سے پہلے کئی ایسی قوموں کو ہلاک کر دیا کہ جو اس سے زیادہ طاقتور تھیں، علم میں بڑھ کر تھیں اور سرمایہ بھی ان کے پاس زیادہ تھا۔
(اولم یعلم ان اللّٰہ قد اھلک من قبلہ من القرون من ھو اشد منہ قوۃ و اکثر جمعاً)۔

تو کہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے علم کی بدولت ہے لیکن تو بھول گیا ہے کہ تجھ سے زیادہ علم والے اور زیادہ طاقتور افراد بھی تھے۔ کیا وہ عذابِ الٰہی سے بچ سکے ہیں؟

بنی اسرائیل کے اہلِ دانش نے قارون سے کہا تھا:
ما اٰتاک اللّٰہ ...
اللہ نے جو کچھ تجھے عطا کیا ہے۔
لیکن اُس بے اَدب گستاخ نے کہا:
میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے علم کی بدولت ہے۔
اللہ تعالیٰ اپنے ارادے اور مشیّت کا ذکر کر کے اس کی حیثیت و طاقت کے چھوٹے پن کو ظاہر کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں ایک مختصر اور معنی خیز جملے کے ذریعے ایک اور تنبیہ کرتا ہے: "عذابِ الٰہی کے نزول کے وقت مجرموں سے ان کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا" اس وقت سوال و جواب کی گنجائش ہرگز نہ ہوگی، اس وقت تو قاطع، دردناک، تکلیف دہ اور ناگہانی عذاب ہوگا۔ (ولا یسئل عن ذنوبھم المجرمون)۔

یعنی — آج تو بنی اسرائیل کے آگاہ افراد اور اہلِ دانش قارون کو نصیحت کر رہے ہیں، اسے غور و فکر کی دعوت دے رہے ہیں اور اس کے پاس جواب دینے کی گنجائش ہے لیکن جب اتمامِ حُجت ہو چکا اور عذابِ الٰہی آ گیا تو پھر غور و فکر کرنے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے اور غرور و تکبّر کے اظہار کی گنجائش نہ ہوگی۔ پھر عذابِ الٰہی آکر رہے گا اور پھر تباہی ناگزیر ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ مجرمین سے سوال نہ ہوگا، اس سے کونسا سوال مراد ہے؛ دُنیا کا یا آخرت کا؟

بعض مفسرین نے پہلا سوال مراد لیا ہے اور بعض نے دوسرا لیکن کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں جگہ پر سوال مراد ہو یعنی سزائے استحصال کے موقع پر دُنیا میں اُن سے سوال نہ ہوگا تاکہ وہ رُوگردانی اور عُذر تراشی کریں اور وہ اپنے آپ کو بے گناہ ظاہر کریں اور قیامت میں بھی اُن سے سوال نہ ہوگا کیونکہ وہاں سوال کے بغیر ہی سب کچھ واضح ہوگا اور قرآن کے بقول مجرموں کی

Marfat.com

حالت پر خود اُن کے چہرے گواہ ہوں گے :

یعرف المجرمون بسیماھم

یعنی۔ مجرم تو اپنی کیفیت ہی سے پہچانے جائیں گے۔ (رحمٰن - ۴۱)

اس طرح زیرِ بحث آیت سُورہ رحمٰن کی آیت ۳۹ سے ہم آہنگ ہے جس میں فرمایا گیا ہے :

فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جانّ

اس دن کسی بھی انسان یا جن سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔

اس مقام پر ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ سورہ حجر کی آیت ۹۲ میں تو ہے :

فو ربک لنسئلنھم اجمعین

تیرے رب کی قسم ہم اُن سب سے سوال کریں گے۔

یہ آیت زیرِ بحث آیت سے کیسے ہم آہنگ ہے ؟

اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جا سکتا ہے :

پہلا یہ کہ قیامت کے مختلف مرحلے ہوں گے بعض مراحل پر سوال ہوگا اور بعض پر سب چیزیں واضح ہو چکنے کی وجہ سے سوال کی ضرورت نہ رہے گی۔

دُوسرا یہ کہ سوال دو قسم کا ہے :

۱۔ سوالِ تحقیق اور

۲۔ سوالِ سرزنش

قیامت کے روز سوالِ تحقیق کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ ہر چیز آشکار ہوگی اور بیان کی احتیاج نہ ہوگی لیکن سرزنش آمیز سوال وہاں ہوگا اور یہ خود مجرموں کے لیے ایک طرح کی نفسیاتی سزا ہوگی۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے ایک باپ اپنے ناخلف بیٹے سے پُوچھتا ہے کہ کیا مَیں نے تیری اتنی خدمت نہ کی تھی۔ کیا ان خدمات کا صلہ یہ خیانت اور سرکشی تھا (جب کہ حقیقت سے باپ اور بیٹا دونوں آگاہ ہوتے ہیں اور باپ کا مقصد بیٹے کو سرزنش کرنا ہوتا ہے)۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۷۹۔ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ
الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝

۸۰۔ وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ
عَمِلَ صَالِحًاۚ وَلَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝

۸۱۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ یَّنْصُرُوْنَهٗ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ ۝

۸۲۔ وَاَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ
یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُۚ لَوْلَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ
عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَاؕ وَیْكَاَنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۹۔ (ایک روز) قارون بڑی سج دھج اور ٹھاٹھ کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ وہ لوگ جو دُنیاوی زندگی کے طالب تھے کہنے لگے: جیسا مال و متاع قارون کو ملا ہے، کاش ہمارے پاس بھی ہوتا یقیناً اُس کے پاس تو (دولت کا) بہت بڑا حصہ ہے۔

۸۰۔ اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ کہنے لگے کہ تم پر افسوس ہے۔ ثوابِ الٰہی بہتر ہے، اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے اور عملِ صالح انجام دیتے ہیں۔ لیکن اُسے صابروں کے سوا کوئی نہیں پا سکتا۔

۸۱۔ آخر کار ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ اور عذابِ الٰہی کے مقابلے میں کوئی جماعت اُس کی مدد نہ کر سکی اور وہ خود بھی اپنی مدد نہ کر سکا۔

Marfat.com

۸۲۔ اور وہ لوگ جو کل اُس کی مقام و منزلت کی تمنا کرتے تھے (جب انہوں نے یہ منظر دیکھا تو) کہنے لگے:
وائے ہو ہم پر، یہ تو اللہ ہی ہے کہ جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اُس پر رزق کو فراخ کر دیتا ہے،
اور جس پر چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ اے افسوس!
کافروں پر کہ وہ ہرگز نجات نہیں پا سکتے۔

تفسیر

نمائش ثروت کا جنون:

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مغرور دولت مند لوگ طرح طرح کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک نمائش ثروت کا جنون ہے۔ انھیں اِس عمل سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اپنی دولت کا لوگوں پر اظہار کریں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی گراں قیمت سواری پر سوار ہو کے نکلیں اور برہنہ پا لوگوں کے درمیان سے گزریں۔ اُن کے منہ پر گرد و غبار ڈالتے جائیں اور اُن کی تحقیر کرتے جائیں۔ انھیں اس عمل سے تسکین ہوتی ہے۔

لیکن دولت کی یہی نمائش اُن کے لیے بلائے جان بن جاتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں اُن کے خلاف کینہ پرورش پانے لگتا ہے اور جذبات نفرت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی شرمناک اور مکروہ عمل اُن کی زندگی کو ختم کر دیتا ہے یا اُن کی دولت کو برباد کر دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس جنون آمیز عمل کا نتیجہ کسی قسم کی تحریک ہو۔ مثلاً لالچی افراد میں مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس میں اضافہ ہو۔ اور سرکش لوگوں میں فرمانبرداری کے جذبات پیدا ہوں۔ مگر اہل ثروت' نمائش دولت کے عمل کو اِس تصور کے بغیر انجام دیتے ہیں۔ درحقیقت اُن کا عمل بھی ایک قسم کی ہوس ہوتا ہے۔ اس میں کسی سوجھ بوجھ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

بہرحال قارون بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بلکہ جنون نمائش ثروت کا ایک واضح نمونہ تھا۔ قرآن میں زیر بحث آیات میں ایک جملے کے اندر قارون کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ قارون پوری زیب و زینت سے اپنی قوم کے سامنے نکلا:
(فخرج علی قومه فی زینته)

کلمہ "فی زینته" اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اُس نے اپنی پوری قوت اور توانائی اِس کام پر صرف کر دی تھی کہ وہ اپنی تمام دولت و آرائش کی لوگوں کے سامنے نمائش کرے اور یہ بات محتاج ذکر نہیں کہ اتنی دولت کا مالک شخص جب نمود حشمت کا ارادہ کرے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔

کتب تواریخ میں اس واقعے کے متعلق بہت سے افسانے اور داستانیں ذکر ہوئی ہیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ قارون چار ہزار خادموں کی قطار کے ساتھ بنی اسرائیل کے درمیان سے گزرا۔ جبکہ یہ چار ہزار خادم گراں قیمت گھوڑوں پر سرخ پوشاکیں پہنے ہوئے

Marfat.com

سوار تھے۔ اُس کے ساتھ خوش گل کنیزیں بھی تھیں جو سفید خچروں پر سوار تھیں جن پر سُنہری زین کسے ہوئے تھے۔ اُن کی پوشاکیں سُرخ اور سب طلا کار تھیں۔

بعض لوگوں نے اُس کے خادموں کی تعداد ستر ہزار لکھی ہے اور اسی طرح کی اور باتیں بھی لکھی ہیں۔

لیکن اگر ہم ان تمام بیانات کو مبالغہ آمیز بھی سمجھ لیں پھر بھی ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ نمائش دولت کے لیے اُس کے پاس بہت ساز و سامان تھا۔

جیسا کہ دُنیا کا معمول ہے قارون کی جاہ و حشمت کو دیکھ کر لوگوں کے دو گروہ ہو گئے۔ دُنیا پرست اکثریت نے جب اس خیرہ کن منظر کو دیکھا تو اُن کے دل میں تمنائیں مچلنے لگیں۔ اُنھوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگے کہ کاش وہ بھی قارون جیسی دولت کے مالک ہوتے۔ خواہ ایک دن، ایک ساعت یا ایک لمحے ہی کے لیے یہ شکوہ نصیب ہوتا۔ آہ ! اُس کی کیسی شیریں، جذاب، نشاط انگیز اور لذت بخش زندگی ہے !

چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے : جو لوگ دُنیاوی زندگی کے طلب گار تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی اتنی دولت ہوتی جتنی قارون کے پاس ہے : (قال الذین یریدون الحیٰوۃ الدنیا یالیت لنا مثل ما اوتی قارون)۔

حقیقت میں اُس کے پاس تو دولت کا فراواں حصہ ہے : (انه لذو حظ عظیم)۔ آفرین ہے قارون پر اور اُس کی بے پناہ دولت پر، واہ اُس کا کیا جاہ و جلال ہے۔ اور کتنے خادم اور نوکر چاکر ہیں۔ تاریخ میں اُس جیسا کوئی شخص نہیں ہے۔ یہ عظمت اُسے خدا نے عنایت کی ہے۔ غرض لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔

درحقیقت اِس واقعے میں امتحان کی ایک بہت بڑی بھٹی جل رہی تھی۔ اُس بھٹی کے بیچ میں قارون تھا، تاکہ وہ اپنی سرکشی اور غرور کا امتحان دے۔ دوسری طرف بنی اسرائیل کے دُنیا پرست لوگ اُس بھٹی کے گرداگرد مقیم تھے۔

لیکن قارون کے لیے ایک دردناک عذاب تھا۔ ایسا عذاب جو ایسی نمائش کے بعد ہوتا ہے۔ یہ عذاب اوجِ عظمت سے قعرِ زمین میں لے جاتا ہے۔

❖ ❖ ❖

لیکن اِس دُنیا طلب بڑے گروہ کے مقابلے میں ایک اقلیت اہلِ علم صاحبانِ فکر، پرہیزگار اور باایمان لوگوں کی بھی وہاں موجود تھی جن کا اُفقِ فکر ان مسائل سے برتر اور بالاتر تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے نزدیک احترامِ شخصیت کا پیمانہ زر اور زور نہ تھا۔ ان کے نزدیک انسان کی قدر کا معیار اُس کے مادی وسائل نہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ دولت و ثروت کی عارضی اور مضحکہ انگیز نمود و نمائش پر تمسخر آمیز طور پر مُسکرا دیتے تھے، اور اسے ایک بے مغز اور غیر حقیقی شے سمجھتے تھے۔

چنانچہ قرآن میں مذکور ہے کہ :۔ وہ لوگ جنہیں علم و معرفت عطا ہوئی تھی، اُنھوں نے کہا تم پر افسوس ہے ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں اور عملِ صالح کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ثواب اور جزا بہتر ہے : (وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب الله خیر لمن اٰمن وعمل صالحًا)۔

اِن الفاظ پر اُنھوں نے یہ اضافہ کیا کہ یہ ثوابِ الٰہی صرف اُن لوگوں کا نصیب ہے جو صابرین ہیں : (ولا یلقّاها الا الصّابرون)۔

Marfat.com

اس ثواب الٰہی کے مستحق وہ لوگ ہیں جو دُنیا کی زینتوں اور اُس کے ہیجان انگیز فرّ و شکوہ کے مقابلے میں مستقیم المزاج رہتے ہیں۔ جو نعمات دُنیا کی محرومیّت کو مردانہ وار استقلال سے برداشت کرتے ہیں۔ جو ناکس لوگوں کے سامنے کبھی سر نہیں جُھکاتے اور جو دُنیا میں مال و دولت اور خوف و مصیبت کی آزمائش کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔

مُسلماً — اِس مقام پر " الّذین اُوتوا العلم " سے مُراد بنی اسرائیل کے اہل علم مومنین ہیں۔ اُن میں یوشع جیسے بزرگ افراد بھی تھے۔

اِس مقام پر قابلِ غور امر یہ ہے کہ " الّذین یریدون الحیٰوۃ الدّنیا " (یہ جُملہ گروہ اول کے متعلق آیا ہے) کے مقابلہ میں " الّذین یریدون الحیٰوۃ الاٰخرۃ " نہیں کہا گیا۔ بلکہ صفت علم کی تخصیص کی گئی ہے۔ کیونکہ علم ہی وہ اصل ہے جس سے ایمان واستقامت، حصولِ ثوابِ الٰہی اور دارِ آخرت میں اجر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

" الّذین اوتوا العلم " میں ایک ایسا ابہام بھی ہے کہ یہ قارون کے اس فخر کا جواب ناطق ہے کہ وہ اپنے آپ کو عالم سمجھتا تھا۔ قرآن کا جواب یہ ہے کہ : حقیقی عالم یہ لوگ ہیں کہ جن کا اُفقِ فکر اِس حد تک بلند ہے نہ کہ تو خیرہ سر اور مغرور۔

اِس جواب میں ہمارے لیے یہ درس بھی ہے کہ علم و دانش ہی جُملہ خیرات و برکات کی بُنیاد ہے۔

❊ ❊ ❊

قارون نے سرکشی اور خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ لیا تھا۔ مگر تواریخ اور روایات میں اُس کے متعلق کچھ اور ہی واقعہ بیان ہوا ہے جو قارون کی انتہائی بے شرمی کی علامت ہے۔ اور وہ ماجرا یہ ہے کہ :-

ایک روز حضرت موسیٰؑ نے قارون سے کہا کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ تیرے مال میں سے زکوٰۃ لوں جو محتاجوں کا حق ہے۔ جب قارون زکوٰۃ کی ادائیگی کے اصول سے مطلع ہوا اور اُس نے حساب لگایا کہ اُسے کتنی کثیر رقم دینا پڑے گی تو اس نے انکار کر دیا اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ وہ بنی اسرائیل کے دولت مندوں کی ایک جماعت کے سامنے کھڑا ہوا اور کہا :

> " اے لوگو! موسیٰ چاہتا ہے کہ وہ تمہاری دولت خود ہضم کر لے۔ اُس نے تمہیں نماز کا حکم دیا تم نے قبول کیا۔ اُس کے دوسرے احکامات بھی تم نے مان لیے۔ کیا تم یہ بات بھی برداشت کر لوگے کہ اپنی دولت اُسے دے دو!؟"

اُن سب نے کہا کہ نہیں۔ مگر اُس سے کس طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟

اُس وقت قارون کے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا۔ اُس نے کہا کہ میں نے ایک بہت اچھی تدبیر سوچی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے خلاف ایک منافی عصمت سازش کرنی چاہیئے۔ ہمیں چاہیئے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک فاحشہ عورت کو تلاش کر کے موسیٰ کے پاس بھیج دیں، تاکہ وہ اُس پر شرمناک تہمت لگا دے۔ بنی اسرائیل نے اِس تجویز کو پسند کیا۔ انھوں نے ایک بدکار عورت کو تلاش کیا اور اُس سے کہا کہ :

> " تُو جو کچھ مانگے گی تجھے دیں گے بشرطیکہ تو یہ گواہی دے کہ موسیٰ کا تجھ سے نامشروع تعلق تھا۔"

Marfat.com

اُس عورت نے بھی اِس تجویز کو منظور کر لیا۔ ایک طرف تو یہ سازش ہوئی۔ دوسری طرف قارون حضرت موسیٰ کے پاس گیا اور اُن سے کہا کہ :۔

"بہتر ہے کہ آپ بنی اسرائیل کو جمع کریں اور اُنھیں الٰہی احکامات سنائیں"

حضرت موسیٰؑ نے یہ پیش کش منظور کر لی اور بنی اسرائیل کو جمع کیا۔

جب لوگ جمع ہوگئے تو اُنھوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ : "آپ ہمیں خدا کے احکام سنائیں"۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ "بجز اُس کے کسی کی پرستش نہ کرو" صلہ رحم بجا لاؤ، ایسا کرو اور ویسا کرو۔ زنا کار آدمی کے لیے خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر وہ زنائے محصنہ کرتا ہے تو اُسے سنگسار کیا جائے۔

جب حضرت موسیٰؑ نے یہ الفاظ کہے تو بنی اسرائیل کے دولت مند سازشی لوگوں نے کہا : "خواہ وہ مجرم تو خود ہی ہو"۔

حضرت موسیٰ نے جواب دیا "ہاں ٹھیک ہے خواہ میں خود ہی ہوں"۔

اُس مقام پر اُن بے شرموں نے، بے ادبی اور گستاخی کی حد کر دی اور کہا کہ :

"ہم جانتے ہیں کہ تو خود اس فعل کا مرتکب ہوا ہے۔ اور فلاں بدکارہ عورت سے تیرا تعلق رہا ہے"۔

پھر اُنھوں نے اُس عورت کو بُلایا اور اُس سے کہا کہ تو شہادت دے۔ حضرت موسیٰ نے اُس عورت کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ "میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تو اصل حال بیان کر"۔

جب اُس بدکارہ عورت نے یہ بات سُنی تو کانپ گئی۔ اُس کی حالت بدل گئی اور اُس نے کہا :

"جب آپ مجھ سے سچ بات پُوچھتے ہیں تو میں حقیقت حال بیان کرتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اِن لوگوں نے مجھے اِس بات پر آمادہ کیا تھا کہ میں آپ کو متہم کروں۔ اِس کے بدلے میں اُنھوں نے مجھے ایک کثیر رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ باعفت ہیں اور اللہ کے رسول ہیں"۔

ایک دُوسری روایت میں مذکور ہے کہ اُس عورت نے یہ بھی کہا کہ :۔

لعنت ہو مجھ پر، میں نے اپنی زندگی میں بہت گناہ کیے ہیں مگر کسی پیغمبر پر تہمت نہ لگائی تھی۔

اس کے بعد اُس نے دولت کے دو تھیلے جو اُن سازشیوں نے اُسے دیے تھے نکال کر سامنے رکھ دیے اور مذکورہ باتیں کیں۔

حضرت موسیٰؑ سجدے میں گر گئے اور رونے لگے۔ اِس موقع پر بدبیرت، سازشی قارون پر عذاب نازل ہوا۔ اِسی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ خدا نے قارون کے غرقِ زمین کرنے کا حضرت موسیٰؑ کو اختیار دیا تھا۔ [۱]

---

[۱] بطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۶ صفحہ ۸۴ بحوالہ درالمنثور اسی طرح تفسیر رُوح المعانی۔ نیز دیگر مفسرین نے بھی کچھ فرق کے ساتھ اسی آیت کے ذیل میں یہ روایت ...

Marfat.com

اس مقام پر قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ : ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں غرق کر دیا: (فخسفنا بہٖ وبدارہ الارض) ۔

یہ درست ہے کہ جب منکرین کا طغیان اور سرکشی اور اُن کی جانب سے تہی دست مومنین کی تحقیر و تذلیل ، اور پیمبرِ الٰہی کے خلاف سازش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اُس وقت دستِ قدرتِ الٰہی دراز ہوتا ہے اور ان متکبر گستاخوں کی زندگیوں کو ختم کر دیتا ہے اور انھیں ایسی سزا دیتا ہے کہ اُن کی اُفتاد سب لوگوں کے لیے سبب عبرت بن جاتی ہے ۔

کلمہ "خسف " اس مقام پر زمین میں گڑ جانے اور زمین میں پوشیدہ ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ انسان کی پوری تاریخ میں ایسے واقعات بارہا پیش آئے ہیں کہ سخت زلزلہ آیا اور زمین شگافتہ ہو گئی اور اُس نے شہر یا آبادیوں کو نگل لیا ۔ مگر اس مقام پر جس حادثہ خسف کا ذکر ہے ، یہ مختلف نوعیت کا ہے ۔ اس میں فقط قارون اور اُس کے خزانے ہی لقمۂ زمین ہوئے ۔ کیا عجب واقعات ہیں کہ فرعون تو دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہو جاتا ہے اور قارون شکم زمین میں سما جاتا ہے ۔ اس مقام پر دیدنی یہ امر ہے کہ پانی جو مایۂ حیات ہے ، وہ فرعون اور اُس کے ہمکاروں کو نابود کرنے پر مامور ہوتا ہے ۔ اور زمین جو انسان کے لیے جائے راحت ہے وہ قارون اور اُس کے ساتھیوں کے لیے گورستان بن جاتی ہے ۔

یہ مُسلّم ہے کہ قارون اپنے گھر میں تنہا نہ تھا ۔ وہ اور اُس کے اہل خاندان ، اُس کے ہم خیال ، اور اُس کے ظالم اور ستمگر دوست سب کے سب شکم زمین میں سما گئے ۔ لیکن اُس وقت اُس کی مدد کے لیے کوئی جماعت نہ تھی جو اُسے عذاب الٰہی سے بچا سکتی اور وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا : (فما کان لہ من فئۃ ینصرونہٗ من دون اللہ وما کان من المنتصرین) ۔ نہ تو اُس کے دستر خوان کے مُفت خور ، نہ اُس کے دلی دوست ، نہ اس کا مال و دولت ، اِن میں سے کوئی شے بھی اُسے عذاب الٰہی سے نہ بچا سکی اور وہ سب کے سب قعرِ زمین میں سما گئے ۔

❖ ❖ ❖

آیات زیرِ نظر میں سے آخری آیت میں اُن لوگوں کے بدل جانے کا ذکر ہے جو گزشتہ روز قارون کے جاہ و جلال اور کرّ و فر کو دیکھ کر وجد اور رشک کر رہے تھے اور یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہمیشہ کے لیے یا تھوڑی دیر کے لیے ہی یہ شان ہمیں بھی نصیب ہوتی ۔

یہ آیت عجیب سبق آموز ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے ۔ جو لوگ کہ گزشتہ روز یہ آرزو کر رہے تھے کہ " کاش ہم اُس کی (قارون کی) جگہ ہوتے جب اُنھوں نے اُسے (قارون) اور اُس کی دولت کو زمین میں دھنستے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہمارے خیالات پر افسوس ہے (حق یہ ہے کہ) خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے ۔ کلید رزق صرف اُسی کے ہاتھ میں ہے ": (واصبح الذین تمنوا مکانہ بالامس یقولون ویکأن اللہ یبسط الرزق لمن یشآء من عبادہٖ و یقدر) ۔

(اُنھوں نے کہا) آج یہ بات ہم پر ثابت ہو گئی کہ جس آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی دین ہے ۔ اُس کی عطا کا انحصار اس امر پر نہیں کہ وہ کسی سے راضی اور خوش ہے ۔ اور نہ کسی کی محرومی اس وجہ سے ہے کہ وہ

Marfat.com

شخص اللہ کی جناب میں بے قدر ہے۔ اللہ افراد اور اقوام کو دولت دے کر اُن کا امتحان لیتا ہے اور اُن کی سیرت اور فطرت کو آشکار کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ (رشک کرنے والے) سوچنے لگے کہ اگر گزشتہ روز خدا اُن کی دُعا کو قبول کر لیتا اور اُنھیں بھی قارون جیسا ہی بنا دیتا تو اُن کا کیسا عبرت ناک انجام ہوتا۔ لہذا اُنھوں نے خدا کی اِس نعمت کا شکر ادا کیا اور کہا کہ اگر خدا ہم پر احسان کرتا تو وہ ہمیں بھی زمین میں غرق کر دیتا: (لولا ان من اللہ علینا لخسف بنا)۔

اور — گویا کہ کافر ہرگز نجات نہیں پائیں گے: (ویکأنہ لا یفلح الکافرون)۔

اب ہم حقیقت کی نظر سے غرور و غفلت اور کفر و ہوس دُنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں نیز ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ نمائشی زندگیاں جن کا منظر نہایت دل فریب ہوتا ہے ان کی حقیقت کتنی خوفناک ہے۔

اس ماجرے کے انجام سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آخر کار مغرور کافر اور بے ایمان قارون دُنیا سے رُخصت ہوا۔ ہر چند کہ اُس کا شمار بنی اسرائیل کے دانشمندوں اور تورات کے تلاوت کرنے والوں میں ہوتا تھا۔ نیز وہ حضرت موسیٰ کا رشتہ دار بھی تھا۔

❖ ❖ ❖

چند اہم نکات

۱۔ **ماضی اور حال کے قارون:** داستانِ قارون، (جسے ایک مغرور دولت مند کا مثالی نمونہ کہنا چاہیئے) جسے قرآن کی سات آیات میں بہت ہی جاذب توجہ طور پر بیان کیا گیا ہے، وہ انسانی زندگی کے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے۔

یہ داستان اِس حقیقت کو روشنی میں لاتی ہے کہ دولت کا غرور اور نشہ بعض اوقات انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ مثلاً اپنی دولت کی نمائش کا جنون، دوسروں کے سامنے اپنی برتری کا اظہار، یا تہی دست لوگوں کی تحقیر کر کے محظوظ ہونے کا جنون وغیرہ۔

یہی غرورِ ثروت اور سیم و زر کی بے کراں حرص کبھی انسان کو بدترین اور مکروہ ترین گناہوں پر آمادہ کر دیتی ہے۔ مثلاً وہ پیمبرِ خدا کے مقابلے پر اُتر آئے اور حقیقت و حقانیت کے خلاف جنگ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ پاک ترین افراد پر نہایت بے شرمانہ تہمتیں لگانے لگے اور اپنی دولت خرچ کر کے اِس مقصد کے لیے بدکار عورتوں کی امداد حاصل کرنے لگے۔ دولت کا غرور اور نشہ انسان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ ناصحین کی نصیحت پر کان دھرے اور خیر خواہوں کے مشورے پر عمل کرے۔

(جو اُنھوں نے بندگانِ خدا کے حقوق غصب کر کے حاصل کی ہے) ان کی عقل و دانائی کی دلیل ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو دانا اور سب کو نادان سمجھتے ہیں۔

یہ بے خبر ثروت مند مغرور اپنے آپ کو سب سے زیادہ عالم اور دانا اور سب کو نادان سمجھتے ہیں، اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کی دولت یہاں تک کہ اُن کی جرأت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ خدا کے مقابلہ میں بھی اپنی ہستی سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے آپ کو اُس کی ذات سے مستغنی سمجھ کر کہنے لگتے ہیں کہ:

"ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ہماری جدت، تیزیٔ طبع، تخلیقی استعداد اور علم و دانش کا نتیجہ ہے"۔

Marfat.com

ہم نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے تباہ کار متکبرین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اگر قارون مع اپنے عیال و دولت کے قعرِ زمین میں پیوست ہو کر نابود ہو گیا تو دوسرے لوگ، دوسرے طریقوں سے نابود ہو جائیں گے اور زمین اُن کی دولت کو کسی اور شکل سے نگل لے گی۔

بعض لوگ اپنی کثیر دولت سے محلات بناتے اور باغ لگاتے ہیں اور ایسی جائیدادیں خریدتے ہیں کہ اُن سے فائدہ اُٹھانا اُن کے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی دولت سے بنجر اور ویران زمینیں اس خیال سے خرید لیتے ہیں کہ ان کے پلاٹ بنا کر فروخت کریں گے۔ اور اس طرح سے بہت سی دولت کما لیں گے۔ اس طرح زمین ان کی دولت کو نگل لیتی ہے۔

اس قسم کے سبک سر دولت مندوں کے سامنے جب اپنی کثیر دولت کو خرچ کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو پھر اُنھیں ایسے شوق ہو جاتے ہیں جن کی اقدار محض وہمی ہوتی ہیں مثلاً وہ آثارِ قدیمہ سے برآمد شدہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور کوزے، بیرنگ تختیاں، سالہا سال پرانی ٹکٹوں یا نوٹوں کو گراں بہا قدیم یادگاریں سمجھ کر خرید لیتے ہیں اور اُنھیں احتیاط سے اپنے محلات میں سجاتے ہیں۔ اگر ان چیزوں کی حقیقت پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ کوڑی پر پھینکنے کے لائق ہیں۔

ان اہل ثروت نے یہ بازیب و زینت روشِ حیات اس حالت میں اختیار کی ہے کہ اُن کے شہر و دیار یہاں تک کہ اُن کے ہمسائے اور زیرِ دیوار نادار اور مفلوک الحال لوگ رہتے ہیں۔ جو رات کو بھوکے سوتے ہیں۔ مگر ان دولت مندوں کا ضمیر ایسا مُردہ ہو گیا ہے کہ انھیں ان غربا کی تکلیف کا قطعی احساس نہیں ہوتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دولت مندوں کے پالتو حیوانات نہایت آرام دہ زندگی گزارتے ہیں۔ اُن کے لیے تربیت دینے والے اُستاد مقرر کیے جاتے ہیں۔ بوقت بیماری اُن کے لیے طبیب کو بُلایا جاتا ہے۔ جبکہ اُن اہل دولت کے قرب و جوار میں مظلوم انسان انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ وہ بستر بیماری میں نالہ و فریاد کر رہے ہوتے ہیں، مگر انھیں طبی امداد میسّر ہوتی ہے نہ دوا کا ایک قطرہ۔

سطور بالا میں جو حالات ہم نے کسی معاشرے کے مخصوص افراد کے لکھے ہیں وہ کبھی ایک قوم یا ملک پر بھی صادق آتے ہیں یعنی دُنیا کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں کوئی ایک ملک قارون ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں امریکہ قارون ہو گیا ہے۔

اہلِ امریکہ تیسری دُنیا کے غریب، تہی دست اور پسماندہ عوام کا استحصال کر کے نہایت باشکوہ و جلال زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جو فالتو غذا کوڑیوں پر پھینک دیتے ہیں۔ اگر اُسے جمع کر کے صحیح مصرف میں لایا جائے تو دنیا کے لاکھوں بھوکے انسانوں کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

جب ہم لفظ "غریب ملک" استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ ممالک من جانب اللہ مفلس و بے نوا ہیں بلکہ ان ملکوں کو مغرب کی طاقتور قوموں نے غارت کر کے فقیر بنا دیا ہے۔ ان میں سے بعض ملکوں میں زیرِ زمین گراں بہا معدنیات اور ذخائر ہیں۔ لیکن مغرب کے غارتگر اُنھیں لوٹ کے جاتے ہیں اور اُن ملکوں کے باشندوں کو کنگال کر دیتے ہیں۔ مغرب کی یہ قارون قومیں درحقیقت خون آشام جونکیں ہیں جنھوں نے تیسری دنیا کے مستضعفین کی ویران شدہ جھونپڑیوں کے کھنڈرات پر اپنے

Marfat.com

محلات تعمیر کیے ہیں۔

اس لیے ـــــ جب تک دُنیا کی مستضعف اقوام متحد و متفق ہو کر ان قارونوں کو قعرِ زمین میں نہ بھیج دیں گی دنیا کے حالات ایسے ہی رہیں گے۔

فی الحال تو کیفیت یہ ہے کہ غارتگر اہل مغرب شراب پی کر عالم مستی میں قہقہے لگاتے ہیں اور مفلوک الحال اقوام سر جھکائے روتی ہیں۔

۲۔ **قارون یہ دولت کہاں سے لایا تھا؟** یہ امر توجہ طلب ہے۔ سورۂ مومن کی آیات ۲۳ اور ۲۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی رسالت کا آغاز ہی تین شخصوں کے ساتھ تنازعے سے شروع ہوا تھا۔ وہ تھے فرعون اُس کا وزیر ہامان اور مغرور ثروت مند قارون۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

ولقد ارسلنا موسٰی بایاتنا و سلطان مبین الی فرعون و ھامان وقارون فقالوا ساحر کذاب۔

ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات، دلائل اور روشن معجزات دے کر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا۔ مگر اُن سب نے کہا کہ یہ تو بڑا جھوٹا جادوگر ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قارون بھی فرعون کے رُفقاء میں سے تھا اور اُن ہی کا ہم عقیدہ تھا۔ ہم تاریخ میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ وہ ایک طرف تو بنی اسرائیل میں فرعون کا نمائندہ تھا اور اُس کا دوسرا مقام یہ تھا کہ فرعون کا خزانہ دار تھا۔[1]

قارون کی ان حیثیات کے پیشِ نظر اُس کا کردار قطعی روشن ہو جاتا ہے۔ کہ فرعون نے اس منصوبے کے تحت کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر میں اسیر رکھے اور اُن کے سرمائے اور دولت کو لُوٹتا رہے۔ اُن ہی میں سے ایک منافق، حیلہ باز اور بے رحم انسان کو منتخب کر لیا تھا اور اسے بنی اسرائیل پر مسلط کر کے مختارِ کُل بنا دیا تھا۔ تاکہ وہ اپنی لیتی پر مبنی بر ظلم عہدے سے فائدہ اُٹھا کر اُن کا خوب استحصال کرے اور اُنھیں تباہ کر دے۔ اور اپنے شیوۂ جَور سے خُوب دولت بھی کما لے۔

قرائن بتاتے ہیں کہ فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے نابود ہو جانے کے بعد اُن کی دولت اور خزانوں کی بہت بڑی مقدار قارون کے پاس رہ گئی تھی۔ اُس وقت تک حضرت موسیٰؑ میں اتنی قوت پیدا نہ ہوئی تھی کہ قارون سے اُس فرعونی دولت کو جو اُس کے پاس تھی مُستضعفین کی امداد کے لیے لے لیں۔

بہر کیف قارون نے خواہ اُس دولت کو فرعون کی حیات میں پیدا کیا تھا، یا فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد اُس کے خزانوں کو لُوٹ کر۔ یا بقول بعض بذریعہ علم کیمیا یا بذریعہ تجارت یا زیر اقتدار پسے ہوئے لوگوں کا استحصال کر کے، جو کچھ بھی ہو۔

جب حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اُس کے ساتھیوں پر فتح حاصل ہوگئی تو قارون نے معاً اپنی پالیسی بدل لی اور بہت بڑھ چڑھ کر (جیسا کہ گروہ منافقین کا طریقہ ہوتا ہے) اپنے آپ کو توریت کی تلاوت کرنے والا اور اُس کا عالم ظاہر کیا۔ حالانکہ اس قسم کے لوگوں کے قلب میں نُورِ ایمان کی ایک کرن بھی داخل نہیں ہوتی۔[2]

آخر کار جب حضرت موسیٰؑ نے طے کر لیا کہ وہ اُس سے زکوٰۃ لیں گے تو اُس کے چہرے سے نقاب اُلٹ گئی اور اس کے

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲۵، صفحہ ۱۳ و تفسیر مجمع البیان، جلد ۷، صفحہ ۲۶۱ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان، جلد ۸ صفحہ ۵۲۰، سورۂ مومن کی آیت ۲۴ کے ذیل میں۔

Marfat.com

پُرفریب زرق و برق کے نیچے سے اُس کا بُرا اور منحوس چہرہ ظاہر ہوگیا ـــــ اور پھر ہم نے دیکھا کہ اُس منافق انسان کا کیا انجام ہوا۔

۲۔ **دولت کے بارے میں اسلام کا مؤقف :** ہم نے جو کچھ سطورِ بالا میں بیان کیا ہے اُس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ مال و دولت کے معاملے میں اسلام کا رویہ منفی ہے اور وہ ثروت مندی کا مخالف ہے۔ یہ بھی تصور نہیں کرنا چاہیئے کہ اسلام غربت و افلاس کو پسند کرتا ہے اور لوگوں کو مسکنت اور بے نوائی کی طرف دعوت دیتا ہے اور اُس حالت کو رُوحانی کمالات کے حصول کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

بلکہ ـــــ اس کے بالعکس اسلام مال و دولت کو ایک مؤثر اور کارساز وسیلہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۰ میں "مال" کو خیر کہا گیا ہے۔ نیز ـــــ امام باقرؑ سے ایک حدیث منقول ہے :

نعم العون الدنيا على طلب الأخرة

آخرت تک پہنچنے کے لیے دُنیا اچھا وسیلہ ہے۔ [1]

بلکہ ـــــ زیرِ بحث آیات جن میں مغرور اور صاحب ثروت قارون کی شدید ترین مذمّت کی گئی ہے، اُن سے بھی یہ حقیقت مترشح ہے کہ اسلام اُس دولت کو پسند کرتا ہے جس کے وسیلے سے " دارِ آخرت " کی جستجو اور اگلے جہان کی نعمات کو طلب کیا جائے۔

جیسا کہ بنی اسرائیل کے اہلِ دانش نے قارون سے کہا : " وابتغ فيما اتاك الله الدار الأخرة "۔ اسلام اُس دولت کو پسند کرتا ہے جس میں " احسن كما احسن الله اليك " کے تقاضے کے مطابق تمام بنی نوع انسان کے ساتھ بھلائی اور احسان ہو۔

اسلام اس دولت کا مدّاح ہے جس کا مالک " لا تنس نصيبك من الدنيا " کی تعلیم پر عامل ہو (یعنی دولت مند ہونے کے باوجود یہ خیال رکھتا ہو کہ دولت دُنیا میں میرا محدود حصّہ ہے)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام اُس دولت کا خواہاں ہے جو" زمین پر باعثِ فساد، انسانی اقدار کو فراموش کر دینے والی، ارتکاز و تکاثر کی جنون آمیز مسابقت میں گرفتار کر دینے والی ۔ انسان میں جذبہ برتریٔ ذات پیدا کرنے والی، دوسروں کو بنظرِ تحقیر دیکھنے والی اور یہاں تک کہ پیغمبروں کے مدِ مقابل آنے والی نہ ہو۔ ان اخلاقِ رزیلہ کی بجائے وہ دولت ایسی ہو جس سے جُملہ بنی نوع کو فائدہ پہنچے ، بین الناس اقتصادی نشیب و فراز کے خلا کو پُر کر دے ، بے چارے غم رسیدہ لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھے اور مستضعفین کے احتیاجات اور مشکلات کا حل بن جائے۔ اگر کوئی شخص ایسی دولت کا مالک ہے جس کے مصرف ایسے مقدس مقاصد ہیں تو اس شخص کو دُنیادار اور دولت پرست نہیں کہہ سکتے۔ ایسے شخص کا تعلق نعماتِ آخرت سے ہے۔ چنانچہ ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ : امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ :

" ہم دُنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور اُس سے دلبستگی رکھتے ہیں ۔ ہم اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم دُنیا پرست نہ ہو جائیں "۔

---

[1] وسائل الشیعہ ، جلد ۱۲ ص ۱۷ (ابواب مقدمات تجارت سے باب ۱۶ ، حدیث ۵)

Marfat.com

امامؑ (جو کہ اُس شخص کی نیکی اور تقویٰ کو جانتے تھے) نے اُس سے سوال کیا ۔
تو دُنیا کی دولت کو کس کام میں خرچ کرنا چاہتا ہے ؟
اُس شخص نے جواباً عرض کیا :
مَیں اُس سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی معاش فراہم کرتا ہوں ۔ اپنے اعزا کی مدد کرتا ہوں ، راہِ خدا میں انفاق کرتا ہوں اور حج و عمرہ بجا لاتا ہوں ۔
یہ سُن کر امامؑ نے جواب دیا :

"لیس ھٰذا طلب الدنیا ھٰذا طلب الاٰخرۃ "

یہ دُنیا طلبی نہیں ہے ، طلب آخرت ہے ۔[1]

اِس استشہاد کی بناء پر دو قسم کے لوگوں کے عقائد کا بطلان ثابت ہوتا ہے :

اوّل : تو وہ مُسلمان نما تعلیماتِ اسلام سے بے خبر لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام سرمایہ داری کا حامی ہے ۔

دُوسرے : وہ اہلِ غرض دُشمنانِ اسلام جو تعلیماتِ اسلام کو مسخ کرکے اُسے معاندِ ثروت اور حامیِ افلاس و تہی دستی قرار دیتے ہیں ــــ مگر اُن پر یہ حقیقت منکشف ہونی چاہیئے کہ :

ایک مفلس و نادار قوم کبھی آزاد اور با عزّت زندگی بسر نہیں کر سکتی ۔

قومی افلاس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ پسماندہ قوم کسی قوی قوم کے زیر اثر آکر اس سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہے ۔ مفلسی دُنیا و آخرت دونوں جگہ رُوسیاہی کا باعث ہے ۔

مفلسی انسان کو گناہ اور مکروہات کی طرف دعوت دیتی ہے ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک قول اِس معنٰی کا مصداق ہے :

"غنی یحجزک عن الظلم خیر من فقر یحملک علی الاثم "

وہ دولت مندی جو تجھے دوسروں کے سلب حقوق سے باز رکھے اُس فقر سے بہتر ہے جو تجھے گناہ پر آمادہ کرے ۔

اِس لیے تمام مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی تمام کوشش اس امر پر صَرف کریں کہ وہ مالی حیثیت سے غنی اور بے نیاز ہو جائیں ، خود کفیل ہوں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں ۔ وہ اپنے شرف ، عزّت اور استقلال کو ، بوجہ فقر و افلاس دوسری قوموں کی وابستگی پر قربان نہ کریں اور یہ جان لیں کہ اسلام کے نزدیک صراطِ مستقیم یہی ہے ۔

⁂

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صہ ۱۹ (حدیث ۳ از باب ۷ از ابواب مقدمات التجارۃ) ۔

Marfat.com

۸۳۔ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○

۸۴۔ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۸۳۔ ہم نے دارِ آخرت کو صرف اُن لوگوں کے لیے بنایا ہے جو دُنیا میں اپنی بڑائی اور (حصولِ اقتدار) کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ فساد کا ارادہ کرتے ہیں۔ اور انجام نیک تو پرہیزگار لوگوں کے لیے ہی ہے۔

۸۴۔ جو شخص نیک کام کرتا ہے اس کے لیے اس کا بہتر صلہ موجود ہے اور جو لوگ کہ بُرے کام کرتے ہیں، اُن کا بدلہ بھی اُن کے اعمال کے مطابق ہی دیا جائے گا۔

تفسیر

فساد فی الارض اور ہوسِ اقتدار کا نتیجہ :

گزشتہ آیات میں ایک گنہگار و متکبر ثروت مند (یعنی قارون) کے عبرت انگیز واقعہ کے ذکر کے بعد اب زیرِ بحث آیات میں سے پہلی آیت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، درحقیقت وہ اُس ماجرے کا ایک کلی نتیجہ ہے۔ چنانچہ ربُّ العزت فرماتا ہے:
ہم سرائے آخرت صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص کرتے ہیں جو دُنیا میں ہوسِ اقتدار نہیں رکھتے اور نہ فساد کرتے ہیں:
(تلك الدار الاٰخرة نجعلها للذين لايريدون علوًا فی الارض ولا فسادًا)۔

صرف یہی نہیں کہ وہ بڑا بننے کے خواہشمند اور مفسد نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کا ارادہ بھی نہیں کرتے۔ اُن کا دل اِن آلائشوں سے پاک اور اُن کی رُوح اِس قسم کی آلودگیوں سے منزّہ ہے۔

Marfat.com

انسان کے لیے جو چیزیں نعماتِ آخرت سے محرومی کا سبب بنتی ہیں وہ درحقیقت یہی دو ہیں :

اوّل : بڑا بننے کی طلب ۔

دوم : "فساد فی الارض"۔ تمام گناہ ان ہی دو چیزوں میں جمع ہیں۔ کیونکہ خدا نے جن منکرات سے نہی کی ہے ، وہ انسان کیلیے تحصیل شرف و کمالِ اخلاق میں مانع اور اُس کی منشائے تخلیق کے خلاف ہیں ۔

حتیٰ کہ ہوسِ اقتدار بجائے خُود اُن چیزوں میں سے ہے جنہیں " فساد فی الارض " کہتے ہیں ۔ اسی لیے اس کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے اُس کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے ۔

ہم نے ' قارون ' کے تفصیلی حالات اور اُس کی سرنوشت میں دیکھا ہے کہ جو بات اُس کی بدبختی . ہلاکت اور نیستی کا باعث بنی وہ اُس کا تکبّر اور برتری کی ہوس تھی ۔

اسلامی روایات میں اس مسئلے پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے :

ان لرجل لیعجبه ان یکون شراك نعله اجود من شراك نعل صاحبه فیدخل تحتها .

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اس بات سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اُس کی جوتی کے بند اس کے دوست کے بند سے بہتر ہوں ۔ تو وہ شخص محض اس جذبۂ برتری سے اس آیت کے مفہوم میں داخل ہو جاتا ہے [1]

قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ مفسّرِ تفسیر کشاف اِس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد ایک اِفادہ کا اضافہ کرتا ہے :-

بعض اہلِ طمع آیۂ زیرِ بحث میں جذبۂ کبر ذات اور برتری کو بہ مقتضائے آیہ (قصص ۴) ان فرعون علا فی الارض " محض فرعون ہی سے منسوب کرتے ہیں ۔ اور بہ مقتضائے آیہ (قصص ۷۷) " ولا تبغ الفساد فی الارض " فساد کو قارون سے مخصوص کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو آدمی فرعون اور قارون کی مانند نہ ہو ، بہشت اور دائمی گھر اُس کی ملکیت ہے ۔ اس طرح وہ لوگ صرف تنہا فرعون و قارون اور اُن جیسے افراد کو بہشت سے خارج کرتے ہیں ۔ اور باقی نعماتِ آخرت کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں ۔ ان حضرات نے اس آیہ کے اخیر میں : " والعاقبة للمتقین " پر اس طرح پر غور نہیں کیا جس طرح اُس پر امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ نے غور فرمایا تھا ۔[2]

اس مقام پر " مفسّرِ تفسیر کشاف " کے قول پر ہم اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ ان اہلِ طمع حضرات نے فرعون اور قارون کی حقیقت

---

[1] تفسیر " جوامع الجامع " زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔

[2] تفسیر فخر رازی : زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

کو بھی نہیں پہچانا۔ کیونکہ فرعون نے اپنے آپ کو برتر و عالی سمجھا اور وہ مُفسد بھی تھا :

انّہٗ کان من المفسدین" (قصص ۴)

قارون نے بھی اُس کی مانند زمین میں فساد کیا اور جذبۂ برتری بھی رکھتا تھا۔ بہ مقتضائے آیۃ :

"فخرج علیٰ قومه فی زینته" (قصص ۷۹)

ایک روایت میں جناب امیرالمومنین علی علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے کہ خلافتِ ظاہری کے زمانے میں آپ بذاتِ خود بازاروں میں تشریف لاتے تھے۔ جو لوگ راستہ بھول گئے ہوتے اُن کی رہنمائی کرتے تھے، ضعیف لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ آپ سوداگروں اور کاسبین کے قریب سے گزرتے تھے اور اُنھیں یہ سُناتے جاتے تھے :-

تلك الدار الاٰخرة نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا

اس کے بعد آپ یہ فرماتے تھے :

نزلت هذه الاٰیة فی اهل العدل والتواضع من الولاة واهل القدرة من الناس

یہ آیۃ عادل و متواضع سربراہانِ مملکت اور حکام نیز قوم کے صاحبانِ قدرت و اختیار افراد کے متعلق نازل ہوئی ہے۔[۱]

کاسبین اور سوداگروں کو اس تنبیہہ سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ جس طرح میں نے حکومت کو اپنے لیے سبب برتری نہیں سمجھا، تمہیں بھی چاہیئے کہ اپنی فراوانیٔ دولت کو دوسروں پر تحکّم کا سبب نہ بناؤ۔ کیونکہ انجام نیک صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جن میں احساسِ برتری نہیں اور نہ وہ زمین پر فساد کرتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن میں اس آیت کے آخر میں مذکور ہے "والعاقبةُ للمتقین" عاقبت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

"عاقبت" ایک وسیع المفہوم کلمہ ہے۔ جس میں اِس جہان کی پیروزی اور نیک انجام اور دارِ آخرت میں بہشت اور اُس کی نعمتیں، سب کچھ شامل ہے۔

چنانچہ ہم نے دیکھا کہ قارون اور فرعون کا کیا انجام ہوا۔ باوجودیکہ وہ بے مثال طاقت رکھتے تھے۔ مگر، چونکہ اُن میں تقویٰ نہ تھا۔ لہٰذا وہ دردناک عذاب میں مُبتلا ہوئے۔

اَب ہم اِس آیۃ کے متعلق اپنے بیان کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کر کے ختم کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جس وقت امامؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا :

ذهبت واللّٰه الامانی عند هٰذه الاٰیة

اس آیۃ نے دُنیا میں میری تمام آرزوؤں کو ختم کر دیا ہے اور پیروزیٔ آخرت بھی مشکل ہے۔[۲]

---

[۱] اس روایت کو "زاذان" نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے متعلق نقل کیا ہے۔ تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[۲] تفسیر علی بن ابراہیم زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

اس حقیقت کے بیان کے بعد کہ سرائے آخرت اور اُس کی نعمات دُوسروں پر تسلط جمانے والوں اور مستکبرین کے لیے نہیں ہیں بلکہ متواضع اور حق طلب پرہیزگاروں کے لیے ہیں، زیرِنظر آیات میں سے دُوسری آیتہ میں ایک قانون کلّی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں پاداش اعمال اور کیفرِ کردار کے متعلق خدا کے عدل اور تفضّل کا ذکر ہے۔ یعنی جو آدمی نیک کام کرے گا اُس کا بہتر بدلہ پائے گا: (من جآء بالحسنة فله خير منها)۔

جزائے خیر کا موقع خدا کا مقام تفضّل ہے۔ ذات الٰہی دُنیا کے تنگ چشم لوگوں کی طرح نہیں ہے کہ جب وہ کسی کے عمل کا صلہ دینے لگتے ہیں تو اُن کے نزدیک عدالت کا یہی مفہوم ہے کہ وہ صلہ ٹھیک اُس کام کے مطابق ہو۔ مگر ذاتِ الٰہی کا مقام اس سے ارفع ہے۔ وہ کبھی بمقابلۂ عمل اپنے لُطفِ بیکراں سے دس گُنا، کبھی سوگنا اور کبھی ہزار گنا صلہ دیتا ہے۔ کم ازکم دس گنا تو ضرور ہی دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم سورۂ انعام کی آیتہ ۱۶۰ میں پڑھتے ہیں:

"من جآء بالحسنة فله عشر امثالها"

مگر — اُس صلہ کی حد آخر کو خدا خُود ہی جانتا ہے۔ جس کا ذکر سورہ بقرہ کی آیتہ ۲۶۱ میں راہِ خدا میں انفاق کے صلہ میں ضمناً آیا ہے۔

البتہ — اس اجر و صلہ کو کئی گنا کر دینا بے حساب نہیں ہے۔ اس کا انحصار پاکیٔ عمل، اخلاص، حُسن نیّت اور صفائے قلب کے معیار پر ہے۔

نیکوکاروں کے متعلق خدا کے اس فضل و لُطف کا ذکر بدکاروں کے اعمال کی سزا کے بعد آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:
جو لوگ گناہ کرتے ہیں اُنہیں اُن کے اعمال کے مطابق ہی سزا دی جائے گی: (ومن جآء بالسيئة فلا يجزى الذين عملوا السيئات الا ما كانوا يعملون)۔

یہ اُس پروردگار کا مقامِ عدل ہے کہ گنہگار اپنے عمل سے ایک ذرّہ بھی زیادہ سزا نہیں پائیں گے۔ اس مقام پر یہ جُملہ جاذبِ توجہ ہے کہ:

اُن کے اعمال ہی خود اُن کا صلہ ہیں۔

یعنی اُن کے اعمال کے آثار، (عالمِ ہستی میں بقائے موجودات کے قانون کے مطابق) اُن کے نفوس اور عالمِ خارجی میں باقی رہ جاتے ہیں اور بروزِ قیامت، جس روز ہر راز پنہاں آشکار ہو جائے گا، یہ اعمالِ سیئہ مجسّم ہو کر گنہگاروں کے ساتھ ہونگے اور اُن کے لیے آزار و اذیّت کا موجب ہوں گے۔

اس مقام پر تین سوال پیدا ہوتے ہیں، جن کا جواب دینا ضروری ہے:

۱۔ اس آیتہ میں کلمہ "سیئۃ" کی دو مرتبہ تکرار کیوں ہوئی ہے؟

ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اس امر کا بیان حتمی مقصود ہو کہ "سیئات" میں ہر گنہگار کو صرف اُسی عملِ بد کی سزا ملے گی جو اُس نے انجام دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر: خود کردہ را علاجے نیست

Marfat.com

۲۔ کیا آیۃ فوق میں کلمہ "حسنہ" میں ایمان اور توحید بھی شامل ہیں ؟

اگر یہ درست ہے تو پھر اس جملہ کے کیا معنی ہیں ؟ جو کہا گیا ہے :

" ہم اُس سے بہتر کو ، اُس کی جزا قرار دیں گے "

کیا اس سے بہتر بھی کوئی شئے ہوگی جو اُس کی جزا ہو جائے گی ؟

ہم اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ بدون تردید کلمہ "حسنہ" کے معنی بہت وسیع ہیں ۔ اس میں انسان کے معتقدات، گفتار و کردار سب کچھ شامل ہے۔ لیکن " پروردگار کی رضا و خوشنودی "توحید کے صرف اعتقاد سے بہتر ہے اور یہی نیکو کاروں کی جزا ہے۔ جیسا کہ ہم سورۃ توبہ کی آیۃ ۷۲ میں پڑھتے ہیں :

ورضوان من اللہ اکبر

خدا کی خوشنودی ہر جزا سے بہتر ہے۔

۳۔ آیۃ فوق میں کلمہ "حسنہ" مفرد کیوں استعمال ہوا ہے اور کلمہ " سیئات" جمع کیوں استعمال ہوا ہے ؟

اس سلسلے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بہ لحاظ شمار گنہگاروں کی تعداد زیادہ ہے اور نیکو کاروں کی کم ہے ۔

اس مقام پر یہ امکان بھی ہے کہ جملہ حسنات " حقیقتِ توحید" میں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ کہ اگر "حسنات" کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی بنیاد عقیدۂ توحید ہی ہے جبکہ سیئات کی بُنیاد شرک ہے اور شرک میں بخلاف " توحید" پراگندگی اور کثرت پائی جاتی ہے۔

٭ ٭ ٭

Marfat.com

۸۵۔ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ
مَنۡ جَآءَ بِالۡہُدٰی وَ مَنۡ ہُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۸۵﴾

۸۶۔ وَ مَا کُنۡتَ تَرۡجُوۡۤا اَنۡ یُّلۡقٰۤی اِلَیۡکَ الۡکِتٰبُ اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ فَلَا
تَکُوۡنَنَّ ظَہِیۡرًا لِّلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۫۸۶﴾

۸۷۔ وَ لَا یَصُدُّنَّکَ عَنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ بَعۡدَ اِذۡ اُنۡزِلَتۡ اِلَیۡکَ وَ ادۡعُ اِلٰی رَبِّکَ
وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿ۚ۸۷﴾

۸۸۔ وَ لَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۟ کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ ؕ
لَہُ الۡحُکۡمُ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿٪۸۸﴾

ترجمہ

۸۵۔ وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہی تجھے تیرے انجام تک پہنچا دے گا۔ کہہ دے کہ میرا رب اُسے بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت لے کر آیا اور اُسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے۔

۸۶۔ اور تجھے یہ توقع نہ تھی کہ یہ کتاب تجھ پر نازل کی جائے گی۔ مگر یہ محض تیرے ربّ کی رحمت سے تجھ پر نازل ہوئی ہے۔ پس ہرگز کافروں کا مددگار نہ ہونا۔

۸۷۔ اور بعد از نزول وہ تجھے آیاتِ خدا کی تبلیغ سے روک نہ دیں۔ اُنھیں خدا کی طرف دعوت دے اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔

۸۸۔ اور خُدا کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو کیونکہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُس کی ذات کے سوا ہر شے فانی ہے۔ حُکم اُسی کا ہے اور سب کچھ اُسی کی طرف لَوٹ جائے گا۔

Marfat.com

شانِ نزول :

کچھ مفسرین نے زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت کی شانِ نزول ابن عباس سے نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے :-

جس وقت جناب رسول اللہ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ کی طرف جا رہے تھے ، تو جب آپ مقامِ جحفہ پر پہنچے کہ جس کا فاصلہ مکہ سے کچھ زیادہ نہیں ہے تو آپ کو اپنا وطن یاد آیا یعنی شہرِ مکہ ، کہ جو خدا کا حرم ہے۔ اور وہاں خانہ کعبہ بھی ہے جس سے آنحضرتؐ کا ناقابلِ انقطاع قلبی اور رُوحانی تعلق تھا۔

اس یادِ وطن سے احساسِ غم آپ کے چہرے پر نمایاں ہوا۔ اُس مقام پر جبرئیل نازل ہوئے اور پُوچھا : کیا واقعاً آپ کو اپنے شہر اور جائے پیدائش کا بہت اشتیاق ہے ؟ آنحضرتؐ نے فرمایا : " ہاں ضرور ہے "۔ تب جبرئیل نے عرض کیا کہ خدا نے آپ کو یہ پیغام بھیجا ہے :

ان الذی فرض علیك القرآن لرآدك الی معاد

جس ذات نے اس قرآن کو تجھ پر فرض کیا ہے وہ تجھے تیرے وطن میں بھی پہنچا دے گا۔[1]

ہم جانتے ہیں کہ آخر کار یہ عظیم وعدہ پُورا ہوا۔ پیغمبر اسلام ایک طاقتور فوج اور بڑی عظمت کے ساتھ مکہ کو فاتحانہ لوٹے اور حرم خدا جنگ اور خون ریزی کے بغیر آپ کے قبضے میں آگیا۔

تاریخ کے اس عظیم انقلاب کے پیش نظر زیرِ نظر آیت قرآن کی اعجاز آمیز پیش گوئیوں میں سے ہے کہ اس کے ذریعے آنحضرتؐ کو حتمی طور پر کسی شرط کے بغیر ایسی خبر دی گئی ، جو قلیل مدت کے بعد درست ثابت ہوئی۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

حرمِ امنِ خدا کی طرف بازگشت کا وعدہ :

یہ سُورہ قصص کی آخری آیات ہیں۔ ان میں پیغمبر اسلامؐ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ موسیٰ بن عمران کی زندگی کے بعض گوشوں اور فرعون اور اُس کے رفقاء سے جنگ کے حالات بیان کرنے کے بعد ان میں پیغمبر اسلامؐ کو بشارت دی گئی ہے نیز انھیں نہایت مستحکم دستور العمل دیے گئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا — ان آیات میں سے پہلی آیت (جیسا کہ مشہور ہے) مقامِ جحفہ پر اُس وقت نازل ہوئی ، جب آنحضرتؐ مدینے کی طرف سفر کر رہے تھے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر -

Marfat.com

اُن کا ارادہ تھا کہ یثرب جائیں اور اس بستی کو " مدینۃ الرسول" بنا دیں۔ اُس مقام پر اسلامی حکومت کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھیں۔ تاکہ پیام اسلام میں جو انقلابی صلاحیتیں ہیں، انہیں عمل میں لائیں اور اُس مقام کو وسیع حکومت الٰہی اور اس کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے مرکز قرار دیں۔

اس عظیم منصوبے کے باوجود آپ کو مکّہ سے جو دل بستگی تھی وہ رنج و غم کا باعث بنی رہتی تھی اور آپ کو اس حرم امن الٰہی سے دُوری سخت ناگوار تھی۔

ان حالات میں آپ کے قلب مُطہر پر فُروحی کی تابش ہوتی ہے اور آپ کو وطن مالوف کی طرف بازگشت کی بشارت دی جاتی ہے بایں الفاظ" کہ: وہی ذات جس نے تم پر قرآن کو فرض کیا، وہ تمہیں تمہارے وطن و مَولِد کو واپس کردے گی۔ (ان الذی فرض علیك القراٰن لرآدك الٰی معاد)۔

تم رنجیدہ خاطر نہ ہو — وہی خدا جس نے عالم طفولیت میں موسٰی کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔ وہی خدا جس نے مصر سے دس سال کی جلاوطنی کے بعد اُسے، اُس کے وطن کو واپس کر دیا تاکہ وہ چراغ توحید روشن کرے اور مستضعفین کی حکومت قائم کرے۔ اور منکرین خدا فرعونیوں کی طاقت کو برباد کردے۔ وہی تم کو بھی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ مکّہ کو لوٹا دے گا۔ اور تمہارے ہاتھ سے اُس مقدس سرزمین میں چراغ توحید روشن کرائے گا۔

وہی خدا جس نے تم پر قرآن نازل کیا، اس کی تبلیغ فرض کی اور تم پر اُس کے احکام کو واجب کیا۔ اُس زمین و آسمان کے مالک قادرِ مطلق خدا کے لیے یہ امور آسان ہیں۔

اس کے بعد اس مطلب کا اضافہ ہے کہ: ان سرپھرے اور متکبّر مخالفین سے کہہ دو کہ میرا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُس کی طرف سے کون ہدایت لایا ہے اور کون شخص کھُلی گمراہی میں ہے: (قل ربّی اعلم من جآء بالھدٰی ومن ھو فی ضلالٍ مبین)۔ مقصد یہ ہے کہ راہِ ہدایت روشن ہے اور مشرکین کی گمراہی آشکار ہے۔ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں عبث ہے۔ خدا اُن کے افعال سے خُوب آگاہ ہے اور حق طلب قلوب بھی حقیقت کو خوب جانتے ہیں۔

اس آیت کی واضح تفسیر یہی ہے جو ہم نے سطور بالا میں بیان کی ہے لیکن بہت سے مفسّرین نے کلمہ " معاد " کے متعلق دوسرے احتمالات کی طرف بھی رجُوع کیا ہے۔ اُن کے خیالات یہ ہیں کہ :-

" معاد " سے مراد حیات بعد از موت ہے، یا سرزمین محشر، یا خُود موت، یا مقام شفاعت کُبریٰ، یا بہشت یا بیت المقدس (جہاں سے آنحضرتؐ معراج پر گئے تھے) نیز اسی طرح کے بہت سے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ لیکن آیت کے کُلّیۃً مطالعے اور سرگزشت موسٰی و بنی اسرائیل پر غور کرنے کے بعد، اور مذکورہ شانِ نزول کے علم کے بعد یہ تمام معانی حقیقت سے بعید نظر آتے ہیں۔ اس لیے کلمہ " معاد " کی تفسیر (بمعنی مقام بازگشت) سرزمین مکّہ ہی درست ہے۔

علاوہ بریں، یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اگر کلمہ " معاد " کے معنی روزِ قیامت لیے جائیں تو وہ روز صرف پیمبرؐ ہی سے تو مخصوص نہیں ہے جب کہ آیت کا رُوئے سخن صرف جناب پیغمبرؐ کی طرف ہے۔ نیز یہ کہ ماقبل آیت (۸۴) میں روزِ قیامت اعمال کی جزا و سزا کا بیان ہے اور یہ اُس کے بعد ہے، اس لیے بھی کلمہ معاد کا وہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس

Marfat.com

مطلب کا قوی امکان ہے۔ کیونکہ آیت ماقبل (۸۴) میں سرائے آخرت میں جزائے اعمال کا ذکر ہے۔ تو سیاق معانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس آیت میں اس دنیا کی کامرانیوں کا ذکر ہو۔

⁂

آیت مابعد (۸۶) میں پیمبر اکرمؐ کو خدا کی طرف سے ایک عظیم ترین نعمت کے عطا ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

"تمہیں ہرگز اُمید نہ تھی کہ یہ عظیم آسمانی کتاب تمہیں القا کی جائے گی لیکن یہ تمہارے رب کی رحمت کا تقاضا تھا"۔

(وماکنت ترجوا ان یلقی الیک الکتاب الا رحمة من ربک)[1]

اُس وقت بہت سے لوگوں نے نئے دین کی آمد کی خوش خبری سُن رکھی تھی۔ نیز، شاید اہل کتاب میں سے کچھ لوگ اس عنایت الٰہی کے منتظر تھے کہ وحی اُن پر نازل ہوگی اور خدا اُنھیں یہ ذمہ داری سپرد کر دے گا لیکن اے پیغمبر تمہیں اس کا گمان بھی نہ تھا۔ مگر خدا نے تمہیں اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھا کہ یہ دین تمہارے ذریعے سے دنیا میں پھیلے۔ بعض بزرگ مفسرین نے اس آیت کو اُن آیات سے مربوط سمجھا ہے جن میں پیمبر اسلام سے داستانِ موسیٰ کے بارے میں خطاب کیا گیا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:

وماکنت بجانب الغربی اذ قضینا الی موسی الامر ..... (قصص۔ ۴۴)

وماکنت ثاویا فی اہل مدین ..... (قصص۔ ۴۵)

وماکنت بجانب الطور اذ نادینا ولکن رحمة من ربک ..... (قصص۔ ۴۶)

اے رسول تم ہرگز وادئ طور میں موجود نہ تھے، جہاں ہم نے موسیٰ پر وحی نازل کی تھی ....

تم نے اہل مدین میں زندگی نہیں گزاری ....

اور جب ہم نے طور پر موسیٰ کو وحی کی تھی تم اُس وقت بھی موجود نہ تھے۔ مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے کہ اُس نے تمہیں ان حالات کی خبر دی۔

اس تفسیر کے مطابق "کتاب" سے مراد سرگزشت انبیائے ماسبق ہے۔

مگر اس تفسیر اور تفسیر ماسبق میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ اسے اُس تفسیر کا ایک حصہ ہی سمجھنا چاہیئے۔

اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ:

اب اس عظیم نعمت کا شکریہ یہ ہے کہ کافروں کی ہرگز مدد نہ کرنا: (فلا تکونن ظهیرا للکافرین)۔

یہ حکم اُس مطلب سے ہم آہنگ ہے جسے ہم آیات ماسبق میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق پڑھ آئے ہیں کہ موسیٰ نے کہا:

---

[1] بعض مفسرین نے اس مقام پر کلمہ "الا" کو استثنیٰ کے معنی میں سمجھا ہے۔ اس بنا پر وہ مستثنیٰ منہ کے حذف اور مقدر ہونے کے قائل ہوتے ہیں۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ "الا" اس مقام پر "لکن" کے معنی میں ہے اور ان معنی میں استدراک کا پہلو نکلتا ہے اور یہ معنی سیاق کے قریب تر ہیں۔

Marfat.com

"پروردگارا ! اُن نعمات کی وجہ سے جو تُو نے مجھے دی ہیں۔
مَیں ہرگز مجرمین کا مددگار نہ بنوں گا۔
ظالموں کی مدد کرنے کے بارے میں، ہم نے سورۂ قصص کی آیت ۱۷ کے تحت مفصل بحث کی ہے۔

٭ ٭ ٭

اِس سُورہ کے آخر میں مختلف استدلالات اور تعبیرات کے ساتھ توحید کو واضح کیا گیا ہے۔ وہ توحید جو جُملہ دینی مسائل کی اصل بُنیاد ہے۔ وہ توحید جو اصل بھی ہے اور فرع بھی، جو کُل بھی ہے اور جُز بھی۔

اِن دو آیات میں پیغمبرِ اکرمؐ کو چار احکامات دیئے گئے ہیں اور خدا کی چار صفات بیان کی گئی ہیں۔ نیز اس سُورۃ میں جتنے بھی موضوعات پر بحث ہوئی ہے، یہ آیات اُن سب کا تکملہ ہیں:

سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کفار تجھ پر نازل شُدہ آیات سے تجھے باز رکھیں:
(ولا یصدنك عن اٰیات اللّٰه بعد اذ انزلت الیك)۔

اِس آیت میں اگرچہ حرفِ نہی کا مرجع کفار ہیں۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ پیمبرؐ اُن کی سازشوں اور خلل اندازیوں سے متنبہ رہیں۔ جیسے کہ ہم کسی سے کہتے ہیں کہ: کوئی آدمی تمہیں بہکانے نہ پائے۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اُن کے دھوکے میں نہ آجانا۔

اِس کے بعد جناب پیغمبرؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب کہ تم پر آیاتِ الٰہی نازل ہو گئی ہیں تو اُن احکامات پر باستقلال قائم رہو اور کسی قسم کے تردّد اور شک کو دل میں نہ آنے دو۔ امر اللہ کی تبلیغ میں جو رکاوٹیں بھی پیش آئیں اُنھیں راستے سے ہٹا دو اور محکم قدموں کے ساتھ مقصد کی طرف بڑھو کیونکہ خدا تمہارے ساتھ ہے اور تمہارا مددگار ہے۔

مُفسّرِ معروف ابنِ عباس کے قول کے مطابق، اِس آیت کی مخاطب تو ذاتِ پیغمبرؐ ہے لیکن مراد ہیں عام لوگ جیسے کہ ایک عربی ضرب المثل ہے۔ "ایاك اعنی واسمعی یاجارہ" میری مراد تُو ہے مگر اے ہمسائے تو بھی سُن لے۔

۱یہ حُکم جو نفی کا پہلو رکھتا ہے، اس کے بعد اثباتی انداز سے حکم دیا ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دے (وادع الی ربك)۔

وہ خدا جو تیرا مالک ہے، تو جس کے اختیار میں ہے، وہی تیرا مربّی اور تیری پرورش کرنے والا بھی ہے۔ اس حکم کے بعد کہ پیغمبرؐ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیں، ہر قسم کے شرک اور بُت پرستی کی ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ قطعاً مشرکین میں سے نہ ہونا: (ولا تکونن من المشرکین)۔

یعنی راہِ توحید قطعی آشکارا اور نورانی ہے اور اُس پر چلنے والے ہی راہِ مستقیم پر ہیں۔

٭ ٭ ٭

بالآخر چوتھا حکم ہر قسم کے شرک کی نفی پر ایک تاکیدِ مکرر ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی بھی دوسرے معبود کو مت پُکار: (ولا تدع مع اللّٰه الٰھا اٰخر)۔

الغرض یہ پے در پے احکام جن میں سے ہر ایک دوسرے حکم کا مُوکد ہے۔ اسلامی پروگرام میں عقیدۂ توحید کی اہمیت کو روشن کرتے ہیں کیونکہ جب تک عقیدۂ توحید پوری طرح دلنشین نہ ہو، تمام عقائد و اعمال برباد ہیں۔

Marfat.com

قرآن میں ان چار احکامات کے ذکر کے بعد خدا کی چار صفات کا ذکر ہے کہ وہ لوازم عقیدۂ توحید میں سے ہیں :

۱۔ اوّل : یہ کہا گیا کہ " اُس کے سوا کوئی معبود نہیں :(لا الٰه الّا هو) ۔

۲۔ اُس ذاتِ پاک کے علاوہ ہر چیز فانی اور نابود ہونے والی ہے :(كلّ شئٍ هالك الّا وجهه) ۔

۳۔ دُنیائے تکوین و تشریع میں حکم اور حاکمیت اُسی کی ذات سے مخصوص ہے : (له الحكم) ۔

۴۔ آخرالامر ہم سب کی بازگشت اُسی کی طرف ہے : (واليه ترجعون) ۔

اس امر کا امکانِ عقلی موجود ہے کہ آخری تین صفات اثباتِ توحید اور ہر قسم کی اُس بُت پرستی کو ترک کرنے کی دلیل ہو جس کا ذکر صفتِ اوّل میں کیا گیا ہے ۔

کیونکہ ـــــ ہم سب فانی ہیں اور بقا صرف اُسی کی ذات کے لیے ہے ۔

کیونکہ ـــــ نظامِ ہستی کی تدبیر اور کائنات کی حاکمیت صرف اُسی کے لیے ہے ۔

کیونکہ ـــــ قیامت میں ہم سب کی بازگشت اُسی کی طرف ہوگی ۔ اُس کے مقابلے میں معبودانِ مجازی کی بھلا کیا حقیقت ہے اور سوائے اُس کے اور کونسی چیز قابلِ پرستش ہے ؟

" كل شئٍ هالك الّا وجهه " کی تفسیر میں بڑے بڑے مفسّرین نے گوناں گوں خیالات کا اظہار کیا ہے ۔

ان آرائے مختلف کا محور دو کلمات " وجه اور هالك " ہیں ۔ کیونکہ لغوی اعتبار سے کلمہ " وجه " انسان کے جسم کے اُس حصّہ کے لیے بولا جاتا ہے جسے چہرہ کہتے ہیں یعنی انسانی صُورت ۔ لیکن جس وقت یہ کلمہ خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اُس سے مُراد اُس کی ذات ہوتی ہے ۔

کلمہ " هالك " کا مادّہ " ہلاک " ہے ۔ جس کے معنیٰ موت اور نابودی کے ہیں ۔ اِن معانی کے پیشِ نظر اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ذاتِ الٰہی کے سوا موجودات میں سے ہر شے فنا ہو جائے گی ۔ یہ " فنا " کائنات کے اختتام پر منحصر نہیں ہے بلکہ بحالتِ موجودہ بھی اُس کے مقابلے میں ہر شے فانی اور معدوم ہے ۔ کیونکہ جُملہ ممکنات اپنے وجُود کے لیے اُسی کی محتاج ہیں ۔ اور لحظہ بہ لحظہ اُسی سے فیضِ وجُود حاصل کرتی رہتی ہیں ۔ اُن کا قیام بذاتِ خود نہیں ہے ، بلکہ یہ ارادۂ الٰہی ہے ۔

ع اگر نازی کند یکدم فرو ریزند قالبہا

اگر مشیتِ ایزدی مائل بہ فنائے ممکنات ہو تو وہ ایک لمحے میں فنا ہو جائیں ۔

علاوہ بریں ـــــ کائنات میں تمام موجودات ہر وقت متغیر ہو رہی ہیں اور اُن کی کیفیت بدلتی رہتی ہے ۔ یہاں تک کہ ایٹمی نظریے کے مطابق (یعنی حرکت جوہری) ہر شے کی ماہیت تغیر اور حرکت ہی ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ تغیر اور حرکت سے مراد ہے کہ ہر شے ہر لمحہ فنا اور وجود تازہ کے مرحلے سے گزرتی رہتی ہے ۔ یعنی موجوداتِ جہاں ہر لحظہ مرتے اور زندہ ہوتے رہتے ہیں ۔

بنابریں جملہ موجودات اپنی کیفیّت حالیہ میں بھی " هالك " اور فانی ہیں ۔ صرف ذاتِ الٰہی وہ ہے جس میں تغیّر و فنا کو دخل نہیں ہے اور اس کی ذاتِ مقدس استقلالِ محض ہے ۔

ہم جانتے ہیں کہ جب اس دُنیا کا وقت آخر آئے گا تو ہر موجودِ ممکن پر فنا اور نیستی کا تسلط ہوگا ۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے :

Marfat.com

كلّ من عليها فان ويبقىٰ وجه ربّك ذوالجلال والاكرام

زمین پر رہنے والا ہر وجود فنا ہو جائے گا صرف خدا کی ذات ذوالجلال ہی باقی رہ جائے گی۔ (رحمٰن - ۲۶ ، ۲۷)

صرف اہلِ زمین ہی نہیں بلکہ اہلِ آسمان بھی فنا ہو جائیں گے :

ونفخ فی الصّور فصعق من فی السّمٰوات ومن فی الارض

اور جس وقت صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کہ جو آسمان میں اور جو زمین میں ہیں مر جائیں گے۔ (زمر - ۶۸)

یہ تفسیر اس آیت اور دیگر آیات کے ظاہری معنیٰ سے ہم آہنگ ہے لیکن بعض مفسّرین نے اس آیت کی اور تفاسیر بھی لکھی ہیں۔ اُن میں سے بعض یہ ہیں :

کسی نے کہا ہے کہ " وجہ " سے مُراد عملِ صالح ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ :

انسان کے تمام اعمال " اُس عمل کے سوا جو لوجہ اللہ کیا گیا ہو " ضائع ہو جائیں گے۔

بعض دیگر حضرات نے کہا ہے کہ " وجہ " سے مُراد اشیا کا اللہ سے منسوب پہلو ہے۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمام اشیا بذاتہ تو معدوم ہیں، سوائے پروردگار کی طرف ان کے انتساب کا پہلو۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ " وجہ " بہ معنیٰ دین ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بروز قیامت جملہ شریعتیں باطل اور فنا ہو جائیں گی بجز اللہ کے دین کے اور آیت میں کلمہ " لہ الحکم " کے معنیٰ حاکمیت تشریعی سمجھے ہیں اور اسے اس مفہوم کے لیے کلمہ تاکید شمار کیا ہے۔ اسی طرح جملہ " والیہ ترجعون " سے اخذ شریعت میں خدا کی طرف رجوع کرنا مُراد لیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ یہ جملہ ان معنیٰ پر ایک مکرّر تاکید ہے۔[1]

ہم نے اس آیت کی تفسیر میں، سطورِ مافوق میں جو کچھ کہا تھا، یہ تفاسیر جن کا ہم نے بعد میں ذکر کیا اُس کے منافی نہیں ہیں کیونکہ جب ہمیں یہ علم ہو گیا کہ اِس عالم میں جو چیز باقی رہ جائے گی وہ صرف ذاتِ الٰہی ہوگی۔ تو اِس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے جو شے کسی طرح بھی اُس کی ذات سے متعلق ہے وہ بھی کیفیتِ بقا و ابدیت اختیار کر لے گی۔

رہبرانِ الٰہی بذاتِ خدا مربوط ہیں اس لیے وہ بھی جاودانی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شے بھی جو ذاتِ الٰہی سے تعلق اور ربط رکھتی ہے وہ فنا اور ہلاکت سے محفوظ رہے گی۔ (یہ مقام غور و فکر ہے)

❖ ❖ ❖

---

[1] تفسیر نورالثقلین، میں اس آیت کے ذیل میں متعدد روایات کا ذکر ہے۔ ان میں سے بعض میں " وجہ " سے مُراد دینِ خدا ہے اور بعض میں مُراد رہبرانِ الٰہی اور بعض میں وہ چیزیں جو خدا سے منسوب ہیں۔

Marfat.com

چند نکات

۱. تمام اشیا کس طرح فنا ہوں گی ؟ آیات فوق کے ذیل میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر دنیا کے آخر میں سب چیزیں فنا ہو جائیں گی تو اس مٹی کو بھی فنا ہو جانا چاہیئے جو انسان کے جسم کی بن گئی ہے جب کہ قرآن میں بطور مکرر یہ صراحت موجود ہے کہ ہم جسم کی ان ہڈیوں کو جمع کرکے ان سے دوبارہ انسان پیدا کریں گے۔ یا — بروز قیامت انسان اپنی قبروں سے نکلیں گے۔

نیز جیسا کہ آیات قرآنی کے ظاہری معنیٰ سے مترشح ہوتا ہے، بہشت اور دوزخ بھی پیدا کیے جا چکے ہیں جیسا کہ کلمات " أعدّت للمتقين " یا ان ہی جیسے اور کلمات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ " بہشت پرہیز گاروں کے لیے ہے " چنانچہ قرآن میں دو مقامات پر یعنی سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۳ اور سورۂ حدید کی آیت ۲۱ میں یہ بیان ہے۔ اور دو مقامات پر دوزخ کا ذکر " أعدّت للكافرين " کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ وہ ہیں سورہ بقرہ آیت ۲۴ اور سورۂ آل عمران آیت ۱۳۱۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر بہشت و دوزخ مخلوقات میں سے ہیں تو کیا وہ بھی بروزِ قیامت فنا اور نابود ہو جائیں گی ؟ قطع نظر ان امور کے ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ انسانوں کے لیے ایک حیاتِ برزخی بھی ہے۔ جیسا کہ " ارواح " کے ذکر کے وقت ہم نے اُسے آیاتِ قرآنی سے ثابت کیا ہے، تو کیا وہ ساکنانِ برزخ بھی فنا ہو جائیں گے ؟

ذیل کی توضیحات سے ان تمام سوالات کے جوابات واضح ہو جائیں گے :

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کلمات " ہلاک ' نابودی اور فنا " سے کسی نظم و ترتیب کا زیر و زبر ہو جانا مراد ہوتا ہے نہ کہ اُس شے کے موادِ اصلی کا فنا ہو جانا۔ مثلاً۔ اگر ایک عمارت زلزلہ کی وجہ سے مسمار ہو جائے تو اُس کیفیت پر ہم کلمات " فنا و ہلاک " کا اطلاق کرتے ہیں۔ حالانکہ اُس عمارت کا اصلی مواد موجود ہوتا ہے۔ اُس مواد کی صرف نظم و ترتیب درہم برہم ہو گئی ہوتی ہے۔

نیز یہ کہ دُنیا کے آخر وقت میں — خورشید بے نور، چاند تاریک اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اور زمین پر ہر زندہ موجود کو موت آجائے گی۔ ایک پہلو سے ان اشیا کے لیے ہلاکت کا مفہوم یہ ہے :

دُوسرے پہلو سے ہلاکت اور فنا کا اطلاق دُنیا اور اُس کے مافیہا پر ہے۔

لیکن بہشت اور دوزخ (خواہ ہم اُنھیں اسی دُنیا میں سمجھیں، خواہ اس دنیا سے باہر) اس دُنیا کا جُز نہیں ہیں کہ انھیں فنا اور نابودی کے حکم میں شامل کیا جا سکے۔ ان چیزوں کا تعلق آخرت اور دوسری دُنیا سے ہے نہ کہ اس دُنیا سے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا کہ موجوداتِ امکانی کے لیے ہلاکت اور فنا کا انحصار صرف دنیا کے خاتمے پر ہی نہیں ہے بلکہ یہ موجودات بحالت موجودہ بھی فانی ہیں۔ کیونکہ اول تو ان کا وجود قائم بالذات نہیں ہے بلکہ اپنے وجود کے لیے دوسرے کی محتاج ہیں۔ دوسرے یہ کہ جملہ کائنات ہمہ وقت حالت تغیر اور حرکت میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حرکت کے معنیٰ ہیں فنائے تدریجی۔ جس کے مطابق ہر وقت وجود عدم کی دونوں کیفیات موجود رہتی ہیں۔ ان توضیحات سے محولا بالا سوالات کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

۲۔ "ولاتدع مع اللہ الٰہا اٰخر" کی غلط تفسیر : وہابی لوگ جن کا اس عقیدے پر اصرار ہے کہ "توسّل اور شفاعت" کا مسئلہ حقیقت توحید سے ہم آہنگ نہیں ہے، کبھی تو وہ آیت مافوق سے اور کبھی اسی کے مشابہ دوسری آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ :

> قرآن میں صریحاً غیر خدا کی عبادت و پرستش ، یا کسی غیر کا نام خدا کے نام کے ساتھ لینے سے نہی کی گئی ہے : فلاتدعوا مع اللہ احداً۔ (سورہ جن - ۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ ہم کسی کو ہرگز نہ پکاریں۔ ایسی آیات کا مفہوم وہی ہے جو کلمہ "مع اللہ" سے سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص خدا کے اختیار اور اُس کی صفت خلاّقی میں کسی اور کو دخیل سمجھے اور مستقل طور پر یہ سمجھے کہ کوئی دوسری ذات بھی خدا کے کاموں کو انجام دے سکتی ہے، تو وہ مشرک ہے۔

لیکن ــــ اگر ہم تمام اختیارات کو خدا سے مخصوص سمجھیں اور کسی کو بھی اس کی قدرت میں شریک یا مؤثر خیال نہ کریں ــــ مگر یہ عقیدہ رکھیں کہ اولیاء اللہ اُس کے اذن اور فرمان سے شفاعت کرتے ہیں اور اس نیت سے ہم اُن سے متوسل ہوں کہ وہ خدا کے حضور میں ہماری شفاعت کریں گے تو یہ عین توحید ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف قرآن میں مکرّر اشارہ ہوا ہے۔

آیا ــــ جب برادرانِ یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ " یا ابانا استغفرلنا "

اے باپ تو ہمارے لیے خدا سے مغفرت طلب کر (سورہ یوسف ۹۷) تو کیا یہ شرک تھا ؟!

یا ــــ جس مقام پر قرآن شریف میں یہ ذکر آتا ہے :

> ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوك فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما
>
> جس وقت اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں ، اگر وہ تیرے پاس آتے ہیں اور خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور رسول بھی اُن کے لیے مغفرت طلب کرے تو وہ خدا کو توّاب اور رحیم پائیں گے۔ (سورہ نساء - ۶۴)

تو کیا یہ کفر کی طرف دعوت ہے ؟

شفاعت اور توسّل کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے[۱]

⁂

---

[۱] اس مسئلے کی زیادہ توضیح کے لیے جلد چہارم میں سورہ مائدہ کی آیت ۳۵ کے ذیل میں اور جلد اوّل میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۸ کے ذیل میں رجوع کریں۔

Marfat.com

پروردگارا! ـ تو ہمارے دلوں کو توحید اور معرفت کے نُور سے منوّر کرتا کہ ہم تیرے سوا کسی کو نہ دیکھیں، تیرے سوا کسی کی جستجو نہ کریں اور تیرے سوا کسی کی آرزو نہ کریں۔

خداوندا ـــ تو اپنی ذاتِ پاک سے ہمارے ارتباط کو روز بروز محکم کرتا جا۔ تاکہ اس طریقے سے ہماری رُوح پر تیری ذات کی بقائے جاودانی کا پرتو پڑے۔

بارالٰہا ـــ تو ہمارے دلوں سے دنیا کی محبت، بڑائی کی خواہش اور فساد فی الارض کو دُور رکھ اور تُو ہمیں ان پرہیزگاروں کی صف میں جگہ دے جن کے لیے "عاقبت نیک" ہے (والعاقبة للمتقین)۔

سُورۂ "قصص" کی تفسیر ختم ہوئی۔

اکیس ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۰۳ء بہ مطابق ۱۲ تیر ماہ ۱۳۶۲ ہجری شمسی

Marfat.com

سُورَہ عَنکبُوت

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی
- اس میں ٦٩ آیات ہیں

Marfat.com

سورۂ عنکبوت کے مضامین

محققین کی ایک جماعت میں مشہور ہے کہ یہ کُل سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ اس نہج سے اُس کے مضامین مکی سورتوں کے مضامین سے ہم آہنگ ہیں۔ اس سورۃ میں مبدأ و معاد کا ذکر ہے، گزشتہ اولوالعزم انبیاء کے قیام اور مشرکوں اور بت پرستوں جابروں اور ستمگروں سے اُن کی جنگ اور پھر فتح کا بیان ہے اور پھر نتیجۃً ظالم گروہ کی تباہی اور بربادی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

علاوہ بریں اس سورہ میں یہ مضمون بھی ہے کہ انبیاء نے کس طرح منحرفین کو حق کی طرف دعوت دی اور انھیں اس راہ میں کیسی کیسی آزمائشوں سے سابقہ پڑا۔ نیز یہ کہ کفار کس طرح مختلف بہانوں سے قبول حق سے اعراض کرتے رہے۔

مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی گیارہ آیات باقی سورہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ گیارہ آیات مدینے میں نازل ہوئی تھیں۔

ان مفسرین کے اس عقیدے کا محرک شاید وہ بعض شانہائے نزول ہیں، جن کا ہم بعد میں ذکر کریں گے اور جہاد کی وہ بحث ہے جو ان آیات میں وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح وہ اشارات بھی ہیں جو ان آیات میں منافقین کے متعلق موجود ہیں۔ یہ تمام مضامین مدنی سورتوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔

تاہم، ہم بعد میں اس مطلب پر غور کریں گے کہ مفسرین کی یہ توجیہات اس سورہ کے مکی ہونے کے منافی نہیں ہیں۔

اس سورہ کے نام "سورۂ عنکبوت" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سورہ کی آیت نمبر اکتالیس میں بت پرستوں کے غیر خدا پر اعتقاد کو "عنکبوت (مکڑی)" سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس کا بھروسہ بھی نازک تاروں پر ہوتا ہے اور یہ بھروسہ بے بنیاد ہے۔

بطور کُلی کہا جا سکتا ہے کہ اس سورہ کے مضامین چار حصوں میں منقسم ہیں:

اوّل: اس سورہ کی ابتدا میں منافقین کی کیفیت اور اُن کے مبتلائے امتحان ہونے کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اُمور کا ناقابلِ انقطاع تعلق ہے۔ کیونکہ منافقین کی شناخت اُس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک وہ امتحان و آزمائش میں مُبتلا نہ ہوں۔

دوم: آیت کے مضامین کے دوسرے حصے میں پیمبرؐ اور مومنین کی دلجوئی کے لیے پیمبرانِ اُولوالعزم کی (مثلاً: حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ اور شعیبؑ) کی زندگی کے کچھ حالات بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے عہد کے نمرود اور خود پرست

Marfat.com

اہلِ دولت کا کس طرح مقابلہ کیا ۔ اُن کی جنگ کے آلات کیا تھے ، کیفیت جنگ کیا تھی اور پھر اس مُبارزہ کا نتیجہ کیا ہوا؟

اِس بیان کا مقصود یہ ہے کہ ایک طرف تو رسول اللہؐ اور مومنین کا دل قوی ہو اور دوسری طرف رسولِ اسلامؐ کے زمانے کے سنگدل اور ظالم بُت پرستوں کو تنبیہ ہو۔

سوم : اس سورہ کے مضامین کا تیسرا حصّہ جو خصوصیّت سے آخر میں ہے ۔ اُس میں توحید باری تعالیٰ ۔ عالمِ آفرینش میں اُس کی آیات اور شرک سے مبارزۃ کا بیان ہے ۔ اِس سلسلے میں اِنسان کی فطرتِ سلیم اور اُس کے وجدان کو مُخاطب کیا گیا ہے ۔

چہارم : اس سُورہ کے ایک اور حصّے میں متنوع قسم کے مضامین ہیں مثلاً : غیر حقیقی معبُودوں اور اُن کے عنکبوت صفت بچاریوں کی ناتوانی کا ذکر ہے ۔ اسی طرح اس حصّے میں قرآن کی عظمت ، پیمبرِ اسلامؐ کی حقانیت اور مخالفین کی سرکشی کا بیان ہے ۔

علاوہ بریں اس حصّے میں مسائل تربیتی کا بھی ایک سلسلہ ہے ۔ مثلاً : نماز ، والدین کے ساتھ نیک سلوک ، اعمالِ صالح اور مخالفینِ اسلام سے گفتگو اور بحث کا طریقہ تعلیم کیا گیا ہے ۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

اِس سُورہ کی فضیلت

تفسیر مجمع البیان میں جناب رسالتمآبؐ کا یہ قول درج ہے :۔

من قرء سورة العنكبوت كان له من الاجر عشر حسنات بعدد كل المؤمنين والمنافقين۔

جو آدمی سورہ عنکبوت پڑھتا ہے اُس کے حصے میں تمام مومنین اور منافقین کی تعداد سے دس گنا حسنات لکھے جاتے ہیں۔

بالخصوص ماہِ رمضان کی تیئیس ۲۳ تاریخ کی شب میں سورہ عنکبوت اور سُورہ رُوم کی تلاوت کے متعلق غیر معمولی فضیلت وارد ہوئی ہے یہاں تک کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے :

من قرء سورة العنكبوت والروم في شهر رمضان ليلة ثلاث وعشرين فهو والله من اهل الجنة لا استثنى فيه ابداً، ولا اخاف ان يكتب الله على في يميني اثماً، وان لهاتين السورتين من الله مكانا

جو آدمی ماہِ رمضان کی تیئیس ۲۳ تاریخ کی شب میں سورہ عنکبوت اور سورۂ روم کی تلاوت کرے قسم بخدا وہ اہلِ بہشت میں سے ہے۔ میں اِس معاملے میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا۔ اور اس بات سے بھی نہیں ڈرتا کہ اس قسم کے لیے میرے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ لکھ دے۔ بطور مسلّم ان دونوں سورتوں کا خدا کے حضور میں بڑا مرتبہ ہے۔[۱]

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں سورتوں کے نہایت منفعت بخش مضامین ۔ اُن کے توحید آموز اہم اسباق اور انسان کی عملی زندگی کے لیے باعثِ خیر و سعادت پروگرام اس امر کے لیے کافی ہیں کہ جو آدمی بھی صاحب فکر و عمل ہو گا ، وہ اسے بہشت کا مستحق کر دیں ۔

بلکہ اگر ہم صرف عنکبوت کے مضامین سے نورِ ایمان اور خلوصِ عمل کا سبق حاصل کریں تو ہم حضرت امام جعفر صادقؑ کی قسم میں شامل ہو جائیں گے ۔

ایک آیت میں انسانوں کے عام امتحان کا ذکر ہے اور یوں لکھا ہے کہ :

بغیر استثنیٰ تمام لوگ امتحان کی کٹھالی میں تپائے جائیں گے تاکہ جو لوگ گناہ گار ہیں وہ سیاہ رُو ہو جائیں ۔

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اس عظیم آزمائش پر یقینِ کامل رکھتا ہو اور خود کو اُس امتحان کے لیے تیار نہ کرے اور وہ متقی اور پرہیز گار نہ بن جائے ۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ الٓمّٓ ۚ

۲۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ○

۳۔ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ○

ترجمہ

۱۔ الٓمّٓ۔

۲۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور اُن کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

۳۔ جو لوگ اِن سے پہلے تھے ہم نے اُن کی بھی آزمائش کی تھی (اور ان کی بھی آزمائش کریں گے) ضروری ہے کہ خدا کا علم ان کے بارے میں بھی سچ ثابت ہو کہ جو سچے ہیں اور اُن کے بارے میں بھی کہ جو کاذب ہیں۔

شانِ نزول :

بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق اس سورہ کی ابتدائی گیارہ آیات مدینے میں نازل ہوئیں، اُن مسلمانوں کے متعلق جو مکہ میں تھے۔ اظہارِ اسلام کرتے تھے مگر مدینہ کو ہجرت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اُنھیں اپنے اُن بھائیوں کی طرف سے جو مدینے میں تھے' ایک خط ملا جس میں تحریر تھا کہ :

"تم جو ایمان کا اقرار کرتے ہو وہ خدا کو قبول نہیں ہے مگر یہ کہ ہجرت کرو اور ہمارے پاس آجاؤ۔"

Marfat.com

یہ خط پاکر انھوں نے ہجرت کا ارادہ کر لیا اور مکہ سے نکلے ۔ مشرکین کے ایک گروہ نے اُن کا تعاقب کیا اور اُن سے جنگ کی ۔ مہاجرین میں سے بعض تو مارے گئے اور بعض بچ رہے (۱ اور احتمال یہ بھی ہے کہ بعض نے مشرکین کی اطاعت کر لی اور مکہ کو واپس ہو گئے۔

بعض دیگر مفسرین نے دوسری آیت کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ عمار یاسر اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں کے متعلق ہے جو ایمان لے آئے تھے اور دشمنان اسلام کے مظالم برداشت کر رہے تھے ۔

بعض کا خیال ہے کہ اس سورہ کی آٹھویں آیت سعد ابن ابی وقاص کے اسلام لانے کے بارے میں نازل ہوئی تھی ۔

لیکن ان آیات کو دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا مسئلہ ہجرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں تو صرف اُن مظالم کا ذکر ہے جو اُس زمانے میں دشمنانِ اسلام روا رکھتے تھے یہاں تک کہ وہ مظالم بھی کہ جو مشرک والدین کی طرف سے اپنی اولاد پر بھی روا رکھے جاتے تھے ۔

یہ آیات دشمنانِ اسلام کی ستم کاریوں اور مظالم کے مقابلے میں مسلمانوں کو استقامت اور پامردی کی تعلیم دیتی ہیں اور اگر درمیان میں کسی مقام پر جہاد کا ذکر آگیا ہے تو اُس کا مفہوم بھی اس امتحان میں ثباتِ قدم ہے نہ کہ مسلمانوں کا مسلح جہاد، جس کا حکم مدینے میں نازل ہوا تھا ۔

اسی طرح اگر کہیں منافقین کا ذکر ہے تو ممکن ہے کہ اُس کا اشارہ اُن کمزور ایمان لوگوں کی طرف ہو جو مکہ میں مسلمانوں کے درمیان رہتے تھے ۔ وہ کبھی مسلمانوں سے مل جاتے تھے اور کبھی مشرکین سے ۔ غرض جس کسی کا پلہ بھاری دیکھتے اُسی کے ساتھ ہو جاتے تھے۔

بہر حال، ان آیات کی ترتیب و تنظیم اس امر کی شاہد ہے کہ ہم اُن سب کو مکی سمجھیں اور روایات بالا جن میں باہم توافق نہیں ہے وہ اس تنظیم کو ختم نہیں کر سکتیں۔

☆ ☆ ☆

تفسیر

آزمائش ایک دائمی سُنّت الٰہی ہے :

اس سورہ کی ابتدا بھی (الف ۔ لام ۔ میم) حروفِ مقطعات سے ہوتی ہے ۔ ہم نے بارہا مختلف زاویہ ہائے نظر سے ان حروف کی تفسیر بیان کی ہے[۱]

☆ ☆ ☆

اس سورہ میں حروفِ مقطعات کے بعد انسانی زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں سے ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ ہے اور وہ ہے اللہ کی طرف سے بندے کا امتحان اور اُس کی آزمائش ۔

سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور

۱ ۔ ان حروف کی تفسیر سورہ بقرہ جلد اول، سورہ آل عمران جلد دوم اور سورہ اعراف جلد ششم کے آغاز میں ملاحظہ کیجئے۔

Marfat.com

توحید و رسالتِ پیمبر کی شہادت دیں تو وہ اپنے حال پر چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کا امتحان نہ ہوگا :(احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنّا وھم لا یفتنون)[1]

٭ ٭ ٭

اُس کے بعد بلافاصلہ اس حقیقت کا ذکر ہے کہ اہلِ ایمان کا امتحان اللہ کی ایک دائمی اور جاودانی سُنّت ہے ۔ یہ امتحان صرف اُمّتِ اسلام ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ وہ سُنّتِ الٰہی ہے جو گزشتہ اُمّتوں کے لیے بھی جاری رہی ہے ۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ :

ہم نے گزشتہ اُمّتوں کی بھی آزمائش کی ہے : (ولقد فتنا الذین من قبلھم) ۔ ہم نے گزشتہ اُمّتوں کو بھی امتحان کی بھٹی میں ڈالا ہے ۔ وہ بھی تمہاری طرح بے رحم ، جاہل ، متعصب ، بے خبر اور جنگ پسند دشمنوں کے نرغے میں گرفتار تھیں ۔ الغرض اُمّتوں کے لیے ہمیشہ میدانِ امتحان تیار رہا ہے اور اُنھیں اس میدان سے گزرنا پڑتا ہے ۔

ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ ہر آدمی برترین مومن ، بالا ترین مجاہد اور فدا کار ترین انسان ہونے کا اِدّعا کرسکتا ہے ۔ اس لیے اس اِدّعا کی حقیقت اور اُس کا وزن امتحان سے ثابت ہونا چاہیئے ۔ امتحان ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدعی کے دعوے اور اُس کی ذہنی آمادگی اور باطنی خلوص میں ہم آہنگی ہے یا نہیں ؟

امتحان کی اس لیے بھی ضرورت ہے تاکہ اُن کے متعلق خدا کا یہ علم کہ ان میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا ۔ درست ثابت ہو : (فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین) ۔

یہ امر بدیہی ہے کہ خدا سب کے دلوں کا حال جانتا ہے ۔ یہاں تک کہ بنی نوع انسان کی خلقت سے پہلے بھی سب کچھ اس کے علم میں تھا ۔ اِس مقام پر " علم الٰہی " سے مُراد یہ ہے کہ جو کچھ اُس کے علم میں ہے وجود خارجی میں بطور عین الیقین اُس کا ثبوت مل جائے ۔ یعنی اس گروہ کے متعلق خدا کا جو علم ہے ۔ لوگ اُسے خارج میں بھی دیکھ لیں اور جس شخص کے دل میں جو کچھ ہے وہ نمایاں اور آشکار ہو جائے ۔

خُدا کے متعلق جہاں بھی کلمہ " علم " استعمال ہوا ہے اُس کا یہی مفہوم ہے ۔

یہ حقیقت قطعی واضح ہے کہ انسان کی نیّت اور اُس کا ارادہ جب تک عمل سے ظاہر نہ ہو تو اس کے لیے ثواب ، جزا یا بدلے کا تعین نہیں ہوسکتا ۔

آزمائش کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ انسان کی نیّت اور اُس کی نفسانی کیفیت کا حال معلوم ہو جائے ۔

اس مفہوم کو ایک اور پہلو سے بھی سمجھنا چاہیئے کہ :۔ اِس عالم کی مثال ایک یونیورسٹی یا ایک کھیت کی ہے (اسلامی احادیث میں یہ تشبیہات وارد ہوئی ہیں) جب ایک طالب علم یونیورسٹی میں تحصیل علم کے لیے آتا ہے تو دستورِ تعلیم یہ ہونا چاہیئے کہ اس کی فطری استعداد کی کلی کھل جائے ۔ جس قسم کی لیاقت بھی اُس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے ، اس کی پرورش ہو اور اُس کی مخفی صلاحیتیں قوّت سے فعل میں آجائیں ۔

---

[1] " یفتنون " کا مادہ " فتنہ " ہے جس کے معنی ہیں ، سونے کو آگ میں تپانا ، اُس کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے ۔ اس کے بعد مجازاً اس کلمہ کو ہر طرح کی ظاہری اور باطنی آزمائش کے لیے بولنے لگے ۔ مزید توضیح کے لیے جلد ۲ ، صفحہ ۲۹ (اُردو ترجمہ) دیکھیئے ۔

Marfat.com

نیز یہ کہ یہ عالم ایک کھیت ہے۔ اِس کھیت میں جو بیج بویا جائے تو اُس کی سرشت اور طینت کا اظہار ہونا چاہیئے۔ اُس کے اندر سے انکھوا پھوٹنا چاہیئے، اُسے خاک سے سر اُبھارنا چاہیئے۔ جب اُس کی پرورش ہو تو وہ چھوٹا سا پودا بن جائے پھر نشو و نما پاکر ایک تنومند اور بارآور درخت بن جائے۔ افراد اور اقوام دونوں کو اپنی نشو و نما کے لیے اِن امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ خدا کی طرف سے جو آزمائشیں آتی ہیں وہ محض افراد کی استعدادات کی شناخت کے لیے نہیں ہیں۔ بلکہ انسان کی مخفی صلاحیتوں کی پرورش کے لیے ہیں۔

یہ امر بھی محل لحاظ ہے کہ اگر ہم کسی شے یا کسی انسان کو آزماتے ہیں تو وہ کسی مخفی یا مجہول صفت کو معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ مگر خدا کی آزمائش کشفِ مجہول کے لیے نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُس کا علم تو ہر شے پر مُحیط ہے بلکہ خدا اس لیے آزماتا ہے تاکہ وہ انسانوں کی استعداد کی پرورش کرے اور جو صلاحیتیں اُس میں مخفی ہیں وہ قوت سے فعل میں آجائیں [1]

٭ ٭ ٭

آزمائشیں مختلف رنگ میں :

اگرچہ جُملہ اقوام اور جماعتوں کے لیے امتحان کا عمومی ذکر، مکّہ کے اُن مومنین کے لیے جو اُس زمانے میں اقلیت میں تھے نہایت مؤثر تھا۔ اِس حقیقت پر نظر کرکے اُن میں اپنے سخت ترین دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا مگر یہ آزمائشیں صرف مومنین مکّہ ہی کے لیے مخصوص نہ تھی۔ بلکہ جہاں کہیں بھی مومنین کی جماعت ہے وہ اِس سُنّت الٰہی کی مصداق ہے۔ خدا اُن کا مختلف صورتوں سے امتحان لیتا ہے ـــــــ مثلاً :۔

۱۔ مومنین کی کوئی جماعت ایسے معاشرے میں محشور ہو جاتی ہے جو ہر جہت سے آلودہٗ مفاسد ہے۔ اُس معاشرے میں مومنین کو ہر جانب سے بُرائیوں کی دعوت گھیرے رہتی ہے۔ اُس وقت ان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ایسے معاشرے کی بداخلاقیوں کا اثر قبول نہ کریں اور اپنی نیکی اور تقویٰ کو محفوظ رکھیں۔

۲۔ کبھی مومنین کی کوئی جماعت افلاس اور محرومی میں مبتلا ہوتی ہے۔ جب کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی قدر مخصوص کو جو ان کا حقیقی سرمایہ ہے فروخت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو بہت جلد اُن کی محرومیت اور افلاس دفع ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تونگری اُنھیں اسی صورت میں حاصل ہوگی جب وہ اپنا ایمان، تقویٰ، آزادی، عزّت اور شرف کو ہاتھ سے دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

۳۔ اِس کے برعکس مومنین کے امتحان کا ایک اور بھی رُخ ہے کہ :۔
مومنین کی کوئی جماعت دولت و ثروت میں مستغرق ہو جاتی ہے اور جملہ مادی وسائل اُس کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اندریں حال اُن کا امتحان یہ ہے کہ :۔
کیا وہ خدا کی نعمات کا شکر ادا کرتے ہیں یا وہ دولت پاکر غفلت، غرور، خُود غرضی، خُود بینی اور لذات و شہوات میں

---

[1] خدا کی آزمائش اور اُس کے مختلف جواب کی توضیح جلد اول آیت ۱۵۷، سورہ بقرہ کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

Marfat.com

مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو برتر سمجھ کر اپنے برادران ایمانی سے منقطع ہو جاتے ہیں ۔

۴ ۔ ہمارے زمانے میں قوموں کو ایک اور شدید امتحان درپیش ہے اور وہ ہے " مشرق یا مغرب زدگی " ۔ وہ مشرق یا مغرب کی بعض اقوام کو دیکھتے ہیں کہ وہ خدا اور فضائل اخلاق سے برگشتہ ہو کر دُنیا میں خیرہ کُن مادّی تمدن سے بہرہ مند ہیں اور اُن کا رفاہی اجتماعی نظام سلطنت بہت اچھا ہے ۔

اُن اقوام متمدّن کی حالت کو دیکھ کر پسماندہ اقوام کو ایک قوی مگر عجیب سا جذبہ اسی قسم کی زندگی اختیار کرنے کی طرف کھینچتا ہے وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ تمام اُصولِ اخلاق جن کے وہ معتقد رہے ہیں ، اُنھیں پاؤں کے نیچے روند کر اور اُن متمدّن اقوام میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی کی ذلّت برداشت کر کے ، اپنے اور سارے معاشرے کے لیے اُسی قسم کے اسباب حیات مہیا کر لیں ۔ درحقیقت اس عہد میں یہ بہت بڑا امتحان ہے ۔

۵ ۔ اس زمانے کے مصائب ، درد و رنج ، جنگیں اور نزاع ، گرانی اور آئے دن قیمتوں میں اضافہ ، اور وہ استحصال کرنے والی حکومتیں جو کمزور قوموں کو غلام بناتی ہیں اور انھیں اپنے طاغوتی نظام کی اطاعت پر مجبور کرتی ہیں ۔

علاوہ بریں انسانوں کی نفسانی خواہشات کی تند و تیز موجیں ، ان میں سے ہر ایک بندگانِ خدا کے لیے سخت امتحان ہے ۔ ان ہی حالات میں ایک شخص کے ایمان ، تقویٰ ، پاکیزگی ، امانت اور آزادی کا امتیاز ہوتا ہے ۔

لیکن ایسی سخت آزمائشوں میں کامیاب ہونے کے لیے صرف ایک ہی وسیلہ ہے کہ انسان میں استقامتِ ایمانی ہو اور خدا کے لُطف خاص پر بھروسہ رکھے ۔

اصول کافی میں : احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون کی تفسیر میں بعض معصومینؑ سے یہ حدیث منقول ہے :

یفتنون کما یفتن الذھب ، ثم قال یخلصون کما یخلص الذھب

انھیں آزمایا جاتا ہے جس طرح کہ سونے کو بھٹی میں تپایا جاتا ہے ۔ وہ لوگ ہر قسم کی آلودگی سے صاف ہوتے ہیں جس طرح کہ آگ سونے کو ہر قسم کے مَیل سے صاف کر دیتی ہے ۔[۱]

بہر حال وہ عافیت طلب لوگ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ صرف زبان سے اظہارِ ایمان کرنے سے وہ مومنین میں شمار ہونے لگیں گے اور اعلیٰ علیین بہشت میں وہ پیمبروں ، صدیقین اور شہدا کے ہم نشین ہو جائیں گے ، سخت غلطی پر ہیں ۔

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کا یہ قول نہج البلاغہ میں موجود ہے :

والّذی بعثه بالحق لتبلبلنّ بلبلة ، ولتغربلنّ غربلة ، ولتساطنّ سوط القدر ، حتّٰی یعود اسفلکم اعلاکم و اعلاکم اسفلکم

قسم ہے اس ذات کی جس نے پیغمبر کو حق پر مبعوث کیا کہ تم شدت سے آزمائے جاؤ گے اور چھانے جاؤ گے اور جس طرح کہ ہانڈی میں پانی اُبلتے وقت اُوپر نیچے ہوتا ہے تم بھی منقلب

---

[۱] (اصول کافی) طبق نقل تفسیر نور الثقلین ، ج ۴ صفحہ ۱۴۸

Marfat.com

ہوگے۔ اس طرح سے کہ تمہارے بلند لوگ پست اور پست لوگ بلند ہوجائیں گے۔[1]

یہ بات امیرالمومنینؑ نے اس وقت کہی جب نئے لوگوں نے آپؑ سے بیعت کی تھی اور وہ اس بات کے منتظر تھے کہ آپ بیت المال کے اموال کی تقسیم اور عہدوں کے عطا کرنے میں ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا علیؑ کا طرزِ عمل بھی اُسی گزشتہ معیار پر ہوگا جس میں امتیاز اور تخصیص تھی یا آپ کا معیار عدلِ محمدیؐ ہوگا۔

✧ ✧ ✧

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۔

Marfat.com

۴۔ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّسۡبِقُوۡنَا ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ○

۵۔ مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ ؕ وَ ہُوَ
السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ○

۶۔ وَ مَنۡ جَاہَدَ فَاِنَّمَا یُجَاہِدُ لِنَفۡسِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ○

۷۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ
وَ لَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ○

ترجمہ

۴۔ کیا وہ لوگ جو اعمالِ بد کرتے ہیں، یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؟ وہ جو خیال کرتے ہیں کتنا بُرا ہے۔

۵۔ جو کوئی خدا سے ملاقات (اور قیامت) کی اُمید رکھتا ہے (تو اُسے چاہیئے کہ اُس کے فرمان کی اطاعت میں فروگزاشت نہ کرے) یقیناً اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت ضرور آنے والا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۶۔ جو شخص جہاد اور کوشش کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے اور خدا جملہ اہلِ عالم سے بے نیاز ہے۔

۷۔ اور جو لوگ کہ ایمان لائے اور اُنھوں نے عمل صالح انجام دیئے ہم اُن کے گناہوں کو چھپالیں گے (اور بخش دیں گے) اور اُنھیں اُن کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دیں گے۔

Marfat.com

تفسیر

قدرتِ خُدا کی حدُود سے فرار ممکن نہیں :

گزشتہ آیات میں مومنین کے عام امتحان کا ذکر تھا۔ زیرِ نظر پہلی آیت میں کفار اور گناہ گاروں کو شدید تہدید کی گئی ہے تاکہ وہ یہ گمان نہ کریں کہ اگر انھوں نے مومنین پر ظلم و تعدی کی اور خُدا کا عذاب ان پر فوراً نازل نہیں ہوا، تو خُدا اُن سے غافل ہے یا اُس میں اُن پر عذاب نازل کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: وہ لوگ جو گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں کیا اُن کا یہ گمان ہے کہ وہ ہم پر سبقت لے جائیں گے اور ہماری سزا کی گرفت سے بچ نکلیں گے؟ اُن کا یہ خیال کتنا بُرا ہے: (ام حسب الّذین یعملون السیّئات ان یسبقونا ساء ما یحکمون)۔

خدا کی طرف سے دی ہوئی مُہلت اُن کو مغرور نہ کردے۔ کیونکہ یہ بھی اُن کے لیے ایک آزمائش ہے اور اُنھیں توبہ اور بازگشت کی مہلت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا مصداق گنہگار مومنین کو سمجھا ہے۔ اُن کا یہ خیال کسی طرح سے بھی سیاقِ آیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ بلکہ قرینہ اس امر کا شاہد ہے کہ اس آیت کا مصداق مشرکین اور کفار ہیں۔

اِس کے بعد قرآن میں بارِ دیگر مومنین کے دستور العمل اور اُن کے لیے نصیحت کا ذکر ہے یعنی "جو شخص بھی لقاء الٰہی کی اُمید رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اُس سے جہاں تک بھی ممکن ہو اُس کی اطاعت اور فرماں برداری سے سرتابی نہ کرے۔ کیونکہ خدا نے جو وقت مقرر کیا ہے وہ ضرور آکر رہے گا: (من کان یرجوا لقاء اللّٰہ فانّ اجل اللّٰہ لاٰتٍ)۔[۱]

البتہ خدا کا یہ وعدہ حتمی ہے اور اس راہ پر ضرور چلنا پڑے گا۔ علاوہ بریں خدا تمہاری باتوں کو سُنتا ہے اور وہ تمہارے اعمال اور نیات سے آگاہ ہے کیونکہ وہ "سُننے والا اور جاننے والا ہے": (وھو السمیع العلیم)۔

"لقاء اللّٰہ" سے کیا مُراد ہے، اس سلسلے میں آراء مختلف ہیں۔ بعض مفسرین نے "ملائکہ مقربین" سے ملاقات مراد لی ہے۔ بعض نے "حساب و جزا" کا پیش آنا مراد لیا ہے، بعض نے اس کی تفسیر میں "حکم و فرمانِ حق" مراد لیا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے قیامت کے لیے۔

جبکہ اس آیت کے یہ مجازی معنیٰ لینے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہیئے کہ آیتِ بالا میں بروز قیامت

---

[۱] اس آیت میں ایک فقرہ محذوف ہے۔ تقدیر میں اس طرح ہے:

من کان یرجوا لقاء اللّٰہ فلیبادر بالطاعۃ قبل ان یلحقہ الاجل ۔ یا

من کان یرجوا لقاء اللّٰہ ویقول اٰمنت باللّٰہ فلیقلہ مستقیماً صابراً علیہ ... ...

فانّ اجل اللّٰہ لاٰتٍ۔

Marfat.com

"لقائے پروردگار" سے مراد "ملاقات حسی" نہیں ہے۔ بلکہ لقائے رُوحانی اور ایک قسم کا شہود باطنی ہے۔ کیونکہ اُس روز انسان کی آنکھوں سے مادیات سے ضخیم پردے اُٹھ جائیں گے اور انسان جلوہ ہائے شہود کو دیکھے گا۔ نیز جیسا کہ علامہ طباطبائیؒ نے المیزان میں لکھا ہے :

"لقاء اللہ" کا مفہوم یہ ہے کہ بندگانِ خدا بروزِ قیامت ایک ایسی کیفیت میں ہوں گے کہ اُن کے ۔ اور ۔ خدا کے درمیان جو حجابات حائل ہیں وہ اُٹھ جائیں گے۔ کیونکہ روزِ قیامت کا مزاج ہی یہ ہوگا کہ اُس روز اُن حقائق کا ظہور ہوگا جو عالم مادی میں انسان کی نظروں سے پنہاں رہتے ہیں۔ چنانچہ خُدا فرماتا ہے :

و یعلمون ان اللہ ھوالحق المبین

اُس روز انسان جان لیں گے کہ خدا "حق آشکار" ہے۔[۱]

(سورہ نور آیۃ ۲۵)

٭ ٭ ٭

اگلی آیت اُس مضمون کی تعلیل ہے جو گزشتہ آیت میں گزر چکا ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ :۔ "مومنین لقاء الٰہی کے لیے جو کچھ اُن کی قدرت میں ہے اُس سے فروگزار نہ کریں" وہ اس لیے ہے تاکہ ہر شخص زندگی میں جہاد کرے اور سعی و کوشش کرے اور مصائب و مشکلات کو برداشت کرے۔ درحقیقت انسان کا یہ جہاد اُس کی تہذیب نفس ہی کے لیے ہے۔ کیونکہ خدا تو جملہ اہلِ جہان سے بے نیاز ہے: (ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العالمین)۔

انسان کے لیے خدا کی آزمائش کا یہ پروگرام کہ وہ ہوائے نفس کے خلاف جہاد کرے، اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے دشمنوں سے جنگ کرے اور تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کرے، درحقیقت یہ سب کچھ انسان ہی کے فائدہ کے لیے ہے۔

ورنہ "خُدا" تو ہر حیثیت سے ایک وجُودِ لامتناہی ہے۔ اُس کی کوئی احتیاج بھی نہیں ہے جو اُس کے بندوں کی عبادت یا اطاعت سے پُوری ہو جائے۔ اُس میں کسی قسم کا نقص یا کمی نہیں ہے جسے دوسرے پُورا کر دیں۔ بلکہ ماسوا اللہ کے پاس کوئی چیز بھی اپنی ذاتی نہیں ہے۔

اِس بیان سے یہ واضح ہے کہ اِس آیت میں کلمۂ جہاد سے مُراد دشمنانِ اسلام کے خلاف مسلح جہاد نہیں ہے۔ بلکہ یہ کلمہ اس مقام پر اپنے لغوی اور وضعی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ جس کا مفہوم ہے حفظِ ایمان اور تقویٰ کے لیے ہر قسم کی کوشش اور جدوجہد۔ اور ہر طرح کی سختی کو برداشت کرنا۔ نیز اس کلمہ کے مفہوم میں کینہ پرور اور جنگ پسند دشمن سے دفاع بھی شامل ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اِس "جہاد" کے تمام منافع مجاہد کی ذات ہی کو پہنچتے ہیں اور وہی اس جہاد کے نتیجے میں دُنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ اگر اُس کے ایسے "جہاد" سے معاشرے کو بھی فائدہ پہنچے تو وہ اُس کے اثرات مابعد ہوں گے۔ بنا بریں، جس کسی کو اس قسم کے جہاد کی توفیق عطا ہو اسے لازم ہے کہ وہ اس نعمت عظیم کے لیے خدا کا شکر ادا کرے۔

٭ ٭ ٭

---

[۱] "لقاء اللہ" کی تفسیر کے لیے دیکھئے، جلد اوّل ذیل آیت ۴۶ سُورۂ بقرہ۔

Marfat.com

آیات زیر بحث میں سے آخری آیت اُس مضمون کی توضیح و تکمیل ہے جو آیت ماقبل میں عنوان جہاد کے تحت سربستہ طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس آیت میں حقیقتِ جہاد کو واضح کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں ہم اُن کے گناہوں کو چھپاتے ہیں: (والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لنکفرنّ عنهم سیّئاتهم)۔ بنابریں، اس جہادِ عظیم (ایمان و عملِ صالح) کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ خدا اُن کے گناہوں کو چھپا لیتا ہے اور یہ فائدہ انسان ہی کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح جیسے اعمالِ خیر کا ثواب اُنھیں پہنچتا ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے آخر میں مذکور ہے :

ہم اُنھیں اُن کے اُن اعمالِ صالح کی جو اُنھوں نے انجام دیئے، بہترین جزا دیتے ہیں: (ولنجزینهم احسن الذی کانوا یعملون)۔

" نکفر " کا مصدر " تکفیر " ہے۔ اس کے وضعی معنی ہیں " چھپانا "۔ اِس مقام پر " گناہوں کو چھپانا " سے مُراد " عفو و بخشش الٰہی " ہے۔

" احسن الذی کانوا یعملون " کی تعبیر یہ ہے کہ خدا جملہ اعمال خیر کی جزا دے گا خواہ وہ " حسن " ہوں یا " اَحسَن "۔ ممکن ہے اِس قول کا اشارہ یہ ہو کہ ہم اُن کے اعمال نیک کو بھی نیک ترین اور بہترین اعمال میں شمار کریں گے یعنی اگر مومنین کے بعض اعمال عالی۔ بعضے خوب یا متوسط بھی ہوں تو ہم اُن سب کو عالی ہی شمار کریں گے۔ درحقیقت یہ تفضّلِ الٰہی ہے جس کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی (مثلاً: سورۂ نور کی آیت ۳۸ میں) اشارہ ہوا ہے :

لیجزیهم الله احسن ما عملوا ویزیدهم من فضله

خدا اُن کے بہترین اعمال کی جزا دیتا ہے اور اپنے فضل سے اُس پر اضافہ کرتا ہے۔

Marfat.com

۸۔ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۹۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ○

ترجمہ

۸۔ ہم نے انسان کو وصیت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے۔ اور اگر تیرے والدین تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک بنائے، جس کا تجھے علم نہیں ہے تو پھر تُو اُن کی اطاعت نہ کر۔ آخر کار تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو ہم تمہیں اُس سے آگاہ کریں گے۔

۹۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک کام کیے ہم اُنھیں نیک لوگوں میں داخل کریں گے۔

شانِ نزول:

مندرجہ بالا آیت کی شانِ نزول میں مختلف روایات بیان کی گئی ہیں۔ اُن تمام کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ:

کچھ افراد جو مکہ میں تھے اُنھوں نے اِسلام قبول کیا۔ مگر جب اُن کی ماں کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ نہ تو وہ غذا کھائے گی اور نہ پانی پیئے گی تا وقتیکہ اُس کا فرزند اسلام کو ترک نہ کر دے گا۔ اگرچہ کوئی ماں بھی اپنے اس قول پر ثابت نہ رہی اور اُنھوں نے ترکِ غذا کے عہد کو توڑ دیا۔ مگر یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے اس امر کو سب کے لیے واضح کر دیا کہ جب ایمان و کُفر کا مسئلہ پیدا ہو تو والدین کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے[1]۔

---

[1] ان روایات کے راوی کا نام سعد ابن ابی وقاص آیا ہے اور بعض جگہ عیاشں بن ابی ربیعہ مخزومی بھی نام ہے۔

Marfat.com

تفسیر

ماں باپ کی نسبت بہترین نصیحت :

خدا کی ایک اہم آزمائش اُس تضاد سے عہدہ برآ ہونا ہے جو راہِ ایمان وتقویٰ اور اعزا و اقارب سے جذباتی تعلق میں ہے قرآن مجید میں اس موضوع پر مسلمانوں کے فرض کے متعلق واضح ہدایت موجود ہے۔

قرآن میں سب سے پہلے اُس قانونِ کلّی کو بیان کیا گیا ہے جس کی بنیاد انسانی جذبات اور حق شناسی ہے۔ اس ضمن میں فرمایا گیا ہے :

ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرے۔ (ووصینا الانسان بوالدیہ حسنًا)۔

اگرچہ بظاہر یہ ایک حکم تشریعی ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ تصور ایک "قانون تکوینی" کے طور پر ہر شخص کی فطرت میں موجود ہے۔ بالخصوص — اس مقام پر جو کلمہ "انسان" استعمال ہوا ہے وہ لائق توجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قانون صرف مومنین سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ جس فرد پر بھی کلمہ "انسان" صادق آتا ہے، اسے لازم ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے احسانات کا حق شناس ہو اور ساری عمر ان کے احترام وتکریم اور اُن کے ساتھ نیکی کرنے کو نہ بھولے۔ اگرچہ انسان اِن تمام اعمال کے باوجود اُن کے قرض کو ادا نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد ایک صریحی استثنا کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ : اگر والدین یہ کوشش واصرار کریں اور اولاد سے کہیں کہ : تو میرے لیے کسی شریک کا قائل ہو جب کہ تو اُس شریک کو جانتا بھی نہ ہو، تو اس حالت میں والدین کی اطاعت نہ کرنا :

(وان جاھداك لتشرك بی ما لیس لك بہ علمٌ فلا تطعھما)۔

یہ استثنا اس لیے ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ماں باپ سے جذباتی تعلق انسان کے خدا سے تعلق پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس مقام پر کلمہ "جاھداك" کا مفہوم والدین کی کوشش اور اصرار ہے۔

اس کے بعد "ما لیس لك بہ علمٌ" کہا گیا ہے یعنی وہ چیز جس کا تجھے علم نہیں ہے۔ یہ اس جانب اشارہ ہے کہ شرک کوئی منطقی امر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر شرک واقعی درست ہوتا تو اُس کے لیے کوئی دلیل بھی موجود ہوتی۔ اس کی ایک اور تعبیر بھی ہو سکتی ہے کہ انسان کسی شی کا علم ہی نہ رکھتا ہو تو اُسے چاہیئے کہ اُس کی پیروی بھی نہ کرے۔ کجا یہ کہ انسان کسی شی کے باطل ہونے کا علم رکھتا ہو اور پھر بھی اُس کی پیروی کرے۔ ایسی شی کی پیروی تو جہالت پر مبنی ہے۔ اس لیے اگر تیرے ماں باپ تجھے جہالت کی پیروی اختیار کرنے کی طرف مائل کریں تو اُن کی اطاعت نہ کر۔

اصولی طور پر اندھی تقلید تو ایمان کے معاملے میں بھی غلط ہے۔ پھر شرک وکفر کے معاملے میں تو اس کی ضلالت کی کوئی انتہا ہی نہیں۔

ماں اور باپ کے متعلق یہی نصیحت سُورۂ لقمان میں بھی آئی ہے اِس میں یہ کلمات مزید ہیں :

وصاحبھما فی الدنیا معروفًا

Marfat.com

اس حالت میں کہ تو شرک کے معاملہ میں اُن کا کہا نہ مان۔ پھر بھی دُنیاوی معاملات
میں اُن کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کر اور رہن سہن میں اُن کے ساتھ نیکی کر۔

یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ مبادا کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ شرک کی طرف دعوت دینے کے معاملے میں والدین کی مخالفت کے یہ معنیٰ ہیں کہ اُن کے ساتھ معاملاتِ دُنیا میں بھی کج خُلقی اور بُرا سلوک کیا جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ والدین کے احترام کی اِسلام میں کتنی تاکید ہے۔

اِس پُوری بحث سے ایک اصولِ کُلی اخذ ہوتا ہے کہ خدا سے اِنسان کے تعلق پر کوئی شے بھی اثر انداز نہیں ہوسکتی کیونکہ تعلق بذاتِ الٰہی ہر شے پر مقدم ہے۔ یہاں تک کہ وہ والدین کے ساتھ محبت پر بھی (جو قریب ترین رشتہ ہے) مقدم ہے۔

اس سلسلے میں ایک مشہور حدیث ہے:

لاطاعة لمخلوق فى معصية الخالق

مخلوق کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی روا نہیں ہے۔

یہ حدیث امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے اور ایسے مسائل میں یہ ایک روشن معیار ہے۔

آیت کے اخیر میں یہ اضافہ ہے کہ "تم سب کی بازگشت میری طرف ہے۔ مَیں تم کو اُن اعمال سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیتے رہے ہو" اور ان اعمال کی جزا و سزا بے کم و کاست تمہیں ملے گی: (الیّ مرجعکم فانبئکم بما کنتم تعملون)۔

درحقیقت یہ جُملہ اُن لوگوں کے لیے ایک تہدید ہے جو شرک کی راہ اختیار کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو دوسروں کو بھی شرک کی طرف بُلاتے ہیں۔ کیونکہ صریحاً کہا گیا ہے کہ:

خدا اُن سب کے اعمال کا حساب اپنی نظر میں رکھتا ہے اور موقع پر اُنھیں اُن سے باخبر کرے گا۔

❊ ❊ ❊

آیت مابعد میں پھر اُس حقیقت کو اُن لوگوں کے متعلق جو ایمان لاتے ہیں اور اعمالِ صالح بجا لاتے ہیں مکرر اور تاکیداً بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح بجا لاتے ہیں ہم اُنھیں زمرہ صالحین میں داخل کریں گے۔ (والّذین اٰمنوا وعملوا الصّالحات لندخلنّهم فى الصّالحين)۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کے عمل کا اُس کی سیرت پر ردِّ عمل ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا عملِ صالح اُس کی سیرت کو صالح بناتا رہتا ہے۔ اِس طرح سے وُہ زمرۂ صالحین میں داخل ہو جاتا ہے اور اُس کا عملِ سُوء اُس کی سیرت کو ناپاک کر دیتا ہے اور وُہ بدوں اور غیر صالح لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔

اَب سوال یہ ہے کہ: اِس آیت میں اِس مضمون کی تکرار سے کیا مقصود ہے؟

اِس کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیات ماقبل میں اُن لوگوں کی طرف اشارہ تھا جو راہِ حق پر گام زن ہیں اور اِس آیت میں ہادیانِ دین اور رہنمایانِ طریقِ توحید کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ عموماً جب کلمہ "صالحین" استعمال ہوتا ہے تو اِس سے مُراد

Marfat.com

۔ انبیاء ہی ہوتے ہیں جو خدا سے دعا کرتے تھے کہ وہ انھیں صالحین سے ملحق کر دے۔

اس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجایش ہے کہ آیات ماقبل میں مومنین کے لیے اُن کے گناہوں کی بخشش اور اُن کے اعمالِ صالحہ کی اچھی جزا کا ذکر تھا۔ لیکن اس مقام پر اُن کے اعلیٰ مرتبہ کا ذکر ہے۔ جو بجائے خود ایک قسم کی جزا ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ صالحین، انبیاء، صدیقین اور شہدا کی صف میں شامل ہوں گے اور اُن کے ہمدم و ہم نشین ہوں گے۔

ماں باپ سے حُسنِ سلوک :

یہ کوئی پہلی بار نہیں ہے کہ قرآن مجید میں انسانی زندگی کے اس اہم مسئلہ کو بیان کیا گیا ہو۔ اس سے قبل بھی سُورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ میں اس مسئلے کی جانب اشارہ ہو چکا ہے اور آپ آئندہ سُورۂ لقمان کی آیت ۱۴، ۱۵ اور سورۂ احقاف آیت ۱۵ میں بھی اس اہم موضوع کے متعلق بیانات پڑھیں گے۔

درحقیقت اسلام ماں اور باپ دونوں کے لیے نہایت ہی احترام کا قائل ہے۔ یہاں تک کہ اس صُورت میں بھی کہ وہ مُشرک ہوں اور وہ اولاد کو شرک کی طرف دعوت دیں (جو کہ اسلام کی نظر میں بدترین کام ہے) پھر بھی اُن کے حفظِ احترام کو ملحوظ رکھتا ہے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ اُن کی دعوتِ شرک کو تو ہرگز قبول نہ کرو مگر اُن کے احترام کو واجب جانو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی خدا کی طرف سے انسان کا ایک بہت بڑا امتحان ہے (جس طرف اس سورۃ کے آغاز میں اشارہ ہوا ہے) کیونکہ انسان بعض اوقات عمر کی ایسی منزل میں پہنچ جاتا ہے کہ پھر اُس کی نگہداری بہت مُشکل ہو جاتی اور حالتِ پیری میں بوجہ ناتوانی اُس کی احتیاجات کا پُورا کرنا بہت دُشوار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اُس کی اولاد اس کی حق شناسی اور اُس کے متعلق فرمانِ الٰہی کی اطاعت کر کے امتحان سے عہدہ برا ہو۔

جناب رسولِ خدا کی ایک حدیث اس طرح منقول ہے کہ :

ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا :

مَیں کس شخص کے ساتھ نیکی کروں ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

اس نے دوبارہ سوال کیا : اس کے بعد کس کے ساتھ ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

اس نے سہ بارہ سوال کیا : اُس کے بعد کس کے ساتھ ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

البتہ جب اُس نے بارِ چہارم سوال کیا تو حضورؐ نے باپ کے ساتھ نیکی کی ہدایت کی اور اُس کے بعد تمام رشتہ داروں کے ساتھ اُن کی قربت کی ترتیب کے لحاظ سے۔[1]

جناب رسالت مآبؐ کی ایک اور حدیث بہت سی کتابوں میں درج ہے کہ :

---

[1] تفسیر مجمع البیان ذیل آیات زیر بحث۔

Marfat.com

الجنۃ تحت اقدام الامّہات

بہشت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

مُراد یہ ہے کہ ماں کی خدمت میں فروتنی اور عاجزی کرنے اور اُن کے حضور مثل خاک راہ ہونے ہی سے انسان کو بہشت نصیب ہو سکتی ہے۔[1]

❊ ❊ ❊

[1] تفسیر مجمع البیان، ذیل آیات زیر بحث۔

Marfat.com

۱۰۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ
فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ
اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۱۱۔ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝
۱۲۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ
خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝
۱۳۔ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫ وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ۧ

ترجمہ

۱۰۔ اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لاتے ہیں مگر جب اُنھیں راہِ خدا میں ایذا پہنچتی ہے تو وہ لوگوں کے فتنہ کو خدا کا عذاب سمجھتے ہیں۔ مگر جب تیرے پروردگار کی طرف سے مدد پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا خُدا جو کچھ اہلِ عالم کے سینوں میں ہے اُس سے خُوب ترین آگاہ نہیں ہے؟

۱۱۔ اور یقیناً خُدا اُن لوگوں کو بھی جانتا ہے جو ایمان لائے ہیں اور اُنھیں بھی جو منافق ہیں۔

۱۲۔ اور کافروں نے اُن لوگوں سے کہا جو ایمان لائے ہیں کہ تم ہمارے راستے کی پیروی کرو۔ ہم تمہارے گناہوں کو اُٹھالیں گے۔ مگر وہ اُن کا ذرّہ بھر گناہ بھی نہیں اُٹھائیں گے۔ کیونکہ وہ جھوٹے ہیں۔

Marfat.com

۱۳۔ یہ لوگ اپنا (اپنے گناہوں کا) بوجھ بھی اُٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور لوگوں کے بوجھ بھی اور یہ لوگ جو افترا کرتے رہے ہیں، قیامت کے روز اُس کے متعلق اُن سے سوال کیا جائے گا۔

تفسیر

وُہ لوگ جو کامیابیوں میں شریک ہیں مگر مشکلات میں نہیں:

گزشتہ آیات میں صالح مومنین اور مشرکین کا ذکر تھا۔ اِن آیاتِ زیرِ نظر میں ایک تیسرے گروہ "منافقین" کا ذکر ہے۔
چنانچہ مذکور ہے کہ: "بعض لوگ ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن مخالفین کی سختیوں اور مظالم کے مقابلے میں اُن میں تحمل اور استقامت نہیں ہوتی۔ جس وقت راہِ خدا میں اُنھیں سختیاں پیش آتی ہیں تو وہ ایمان سے رُوگرداں ہو جاتے ہیں اور ان مصائب کو خدا کا عذاب سمجھتے ہیں اور گھبرا جاتے ہیں۔ (ومن الناس من یقول اٰمنا باللّٰہ فاذا اُوذی فی اللّٰہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللّٰہ)۔
مگر جس وقت تجھے تیرے رب کی مدد پہنچتی ہے اور تم کامیاب ہوتے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے اور تمہاری کامیابیوں میں شریک ہیں: (ولئن جاء نصرٌ من ربك لیقولن انا کنا معکم)۔
کیا یہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ خُدا اُن کے دلوں کے خیالات سے باخبر نہیں ہے اور کیا خدا ان باتوں سے آگاہ نہیں ہے جو دنیا کے لوگوں کے سینوں میں ہیں: (اَولیس اللّٰہ باعلم بما فی صدور العالمین)۔
اِس آیت میں "اٰمنا" جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جبکہ اس کے بعد "جعل" صیغۂ مفرد استعمال ہوا ہے۔ شاید صیغۂ جمع اس لیے آیا ہو کہ یہ منافقین چاہتے ہوں کہ اپنے آپ کو مومنین میں شمار کرائیں اس لیے وُہ آمنا کہتے ہیں۔ یعنی ہم بھی دوسرے تمام مومنین کی طرح ایمان لائے ہیں۔
"اُوذی فی اللّٰہ" سے مُراد "اُوذی فی سبیل اللّٰہ" ہے۔ یعنی وہ لوگ کبھی راہِ خُدا اور راہِ ایمان میں دُشمنوں کی طرف سے موردِ آزار ہوتے ہیں

اُسے "فتنہ" کہا گیا ہے۔
آیتِ زیرِ نظر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو لوگوں کی طرف سے جو آزار پہنچتا ہے وہ درحقیقت عذاب نہیں ہے بلکہ آزمائش ہے اور یہ آزمائش اُن کے تکامل ایمان کا وسیلہ ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ "عذاب" اور "امتحان" میں فرق کریں اور اس بہانے سے کہ مخالفین اُنھیں ستاتے ہیں، ایمان سے دست بردار نہ ہوں۔ کیونکہ مخالفین کی طرف سے ستایا جانا بھی خدا کی طرف سے دُنیاوی امتحان کے پروگرام میں شامل ہے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ جُملۂ فوق "شرطیہ" ہے اور یہ مسلّم ہے کہ جُملہ شرطیہ کے لیے "وجودِ شرط" لازمی نہیں ہے

Marfat.com

بلکہ اُس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خُدا آئندہ تم کو (اہلِ ایمان کو) کامیابیاں عطا کرے گا تو یہ کمزور ایمان منافقین اُن میں اپنے آپ کو شریک سمجھیں گے۔

علاوہ بریں مکہ میں بھی مسلمانوں نے دشمنوں کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ اگرچہ وہ فوجی فتوحات نہ تھیں بلکہ وہ معنوی کامیابیاں تھیں مثلاً اسلامی تبلیغات عمومی افکار میں نفوذ کر رہی تھیں اور عوام میں اسلام کی پیش رفت ہو رہی تھی۔

اِن سب باتوں کے علاوہ مومنین کے لیے اذیّت و آزار صرف مکّی زندگی ہی تک تھا۔ مدینہ کی زندگی میں اِس قسم کی تکالیف کا بہت ہی کم اتفاق ہوتا تھا۔

اِس آیت سے ضمناً یہ امر بھی واضح ہوا کہ " منافق " صرف وہی لوگ نہیں ہیں جن کے قلوب میں ایمان تو ہرگز نہیں ہوتا مگر وہ " ایمان " کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ کمزور ایمان لوگ بھی جو مخالفین کا ظلم برداشت نہیں کر سکتے اس لیے جلد ہی اپنے عقیدے سے منحرف ہو جاتے ہیں، منافقین میں شمار ہوتے ہیں۔

اور آیت زیرِ بحث میں بظاہر اسی قسم کے منافقین کا ذکر ہے۔ اور یہ تصریح موجود ہے کہ خُدا اِن کی نیتوں سے آگاہ ہے۔

❖　❖　❖

اِس آیت کے بعد کی آیت میں پھر مزید تاکید کے لیے یہ اضافہ ہے کہ یقینی طور پر خدا مومنین کو پہچانتا ہے اور حتمی طور پر وہ منافقین کو بھی پہچانتا ہے: (ولیعلمنّ اللہ الّذین اٰمنوا ولیعلمن المنافقین)۔

اگر سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حقائق کو چھُپا کر احاطۂ علمِ الٰہی سے باہر رہ سکتے ہیں تو بہت ہی غلط فہمی میں مُبتلا ہیں۔

ہم بارِ دیگر بطور تکرار یہ کہتے ہیں کہ " اس آیت میں کلمہ " منافق " کا وجُود اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ امر مُسلّم ہے کہ کسی جماعت میں نفاق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اقتدار میں آکر حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اُس وقت مخالفین باقتدار جماعت سے منحرف ہو کر زیرِ زمین جماعت سازی شروع کر دیتے ہیں۔ مگر جیسا کہ ہم نے سطور مافوق میں کہا، نفاق کے بہت وسیع معنیٰ ہیں۔ اِن معنیٰ میں وہ ضعیف الایمان لوگ بھی شامل ہیں جو تھوڑی سی تکلیف بھی پیش آنے پر اپنا عقیدہ بدل لیتے ہیں۔

❖　❖　❖

آیت مابعد میں مشرکین کا ایک کمزور اور پوچ قول نقل کیا گیا ہے۔ جبکہ ابھی تک مشرکین کی تعداد زیادہ تھی۔ فرمایا گیا ہے: کافروں نے ایمان والوں سے کہا: " تم آؤ! ہمارے عقائد اور ہمارے مذہب کی پیروی کرو۔ اگر اِس راہ میں تمہارا کوئی گناہ ہوگا تو ہم اُسے اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیں گے:

(وقال الّذین کفروا للّذین اٰمنوا اتبعوا سبیلنا ولنحمل خطایاکم)۔[1]

---

[1] جملہ " ولنحمل " فعل امر ہے۔ اِس پر بعض مفسّرین نے اعتراض بھی کیا ہے کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے آپ ہی کو حکم دے؟
اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ امر قضیہ شرطیہ کے حکم میں داخل ہے۔ یعنی پُورا جُملہ یُوں ہے۔ " اگر تم ہمارا اتباع کرو تو ہم تمہارے گناہوں کو اُٹھا لیں گے " (تفسیر فخر رازی)
مگر ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اِس امر میں کوئی مانع نہیں کہ انسان اپنے آپ کو حکم دے۔ نیز یہ کہ آمر و مامور یہاں ایک ہی شخص ہے۔ لیکن دو اعتبار سے۔

Marfat.com

ہم آج بھی بہت سے بداندیش لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ کسی کو عملِ بد پر آمادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں، اگر اس فعل میں کوئی گناہ ہے تو وہ ہماری گردن پر حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی آدمی بھی کسی دُوسرے شخص کا گناہ اپنے ذمّے نہیں لے سکتا اور یہ بات ہرگز معقول نہیں ہے۔ (کیونکہ) خُدا عادل ہے۔ وہ کسی کو بھی دوسرے آدمی کے جُرم میں سزا نہیں دے گا۔ علاوہ بریں ان بے اساس باتوں سے کوئی آدمی بھی اعمال کی ذمّہ داری سے بری نہیں ہو جائے گا۔

نیز جیسا کہ بعض کوتاہ فکر لوگ خیال کرتے ہیں، اُن کی رائے کے برخلاف اِس قسم کی بے سرو پا باتیں انسان کے گناہوں کی سزا میں سُوئی کی نوک کے برابر بھی کمی نہیں کر سکتیں۔ اِس لیے کسی عدالت میں بھی اگر جج کے سامنے کوئی ایسی بات کہے کہ فلاں آدمی کا گناہ میں اپنے ذمّہ لیتا ہوں تو اس کی بات قبول نہیں کی جائے گی۔

یہ درست ہے کہ گناہ پر آمادہ کرنے والا شخص بھی گناہ گار کے جُرم میں شریک ہے مگر یہ شرکت اُس گناہ گار کی ذمّہ داری کو کسی طرح کم نہیں کر دیتی۔

لہٰذا دوسری آیت میں بصراحت کہا گیا ہے کہ: وہ لوگ دُوسروں کے گناہوں اور خطاؤں کو ہرگز اپنے کاندھوں پر نہ لیں گے (وما هم بحاملين من خطاياهم من شيء انهم لكاذبون)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صدق و کذب جُملہ خبریہ میں ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم جس جُملے پر بحث کر رہے ہیں وہ جُملہ خبریہ نہیں بلکہ جُملہ انشائیہ ہے (یعنی فعل امر) اور ہم جانتے ہیں کہ جُملہ انشائیہ میں صدق و کذب نہیں ہوتا۔ پس قرآن یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ "جھوٹ بولتے ہیں"؟ اِس سوال کا جواب بیانِ سابق سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جملہ اَمریہ اِس مقام پر ایک جُملہ شرطیہ خبریہ بن جاتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو تو ہم تمہارے گناہوں کی ذمّہ داری لیتے ہیں۔ اور ایسے جُملے میں احتمالِ صدق و کذب ہے۔[1]

٭ ٭ ٭

اور اِس امر کے پیشِ نظر کہ کہیں ایسا نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کفر و شرک، بُت پرستی اور ظُلم کی طرف دعوت دینے والے لوگ اپنے اعمال کی کوئی سزا نہیں پائیں گے، اِس لیے آیت مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا: وہ لوگ اپنے گناہوں کا بار اُٹھائیں گے اور اُن کے بار پر دُوسرے وزنی بار کا بھی اضافہ ہوگا: (وليحملن اثقالهم واثقالاً مع اثقالهم)۔

یہ اضافی بار لوگوں کو گمراہ اور دُوسروں کو گناہ کی رغبت دلانے کا ہوگا۔ یہ ویسا ہی بارِ گناہ ہوگا جیسا کہ کسی رسمِ بد کی بنیاد ڈالنے کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا:

من سنّ سنة سيئة فعليه وزرها و وزر من عمل بها من غير ان ينقص من وزره شيء

---

[1] اِس سوال کا جواب ایک اور طرح بھی دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جملہ انشائیہ میں صدق و کذب کا پہلو ہوتا ہے اور عُرفِ عام میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی کام کا حکم دیتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آدمی اُس کام سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت میں یہ نہیں چاہتا۔

Marfat.com

جو آدمی کسی رسم بد کی بُنیاد رکھتا ہے تو اس رسم بد اور اُن سب آدمیوں کا گناہ جو اس پر عمل کرتے ہیں اُس کی گردن پر ہے۔ بغیر اس کے کہ اُن پر عمل کرنے والوں کے گناہ میں سے ذرہ بھر کمی ہو۔[1]

آیت کے اخیر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ بروز قیامت اُن سے یقینی طور پر اُن کے افترآت اور دروغ گوئیوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور انھیں اُن کا جواب دینا ہو گا: (ولیسئلن یوم القیامة عما کانوا یفترون)۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس افترآ کا قیامت میں جواب دینا ہو گا وہ کیا ہے؟

تو ممکن ہے اس افترآ کا مطلب وہ دروغ گوئیاں ہوں جو یہ مشرکین خدا کے متعلق کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

خدا ہی نے ہمیں ان بُتوں کی پرستش کا حکم دیا ہے۔

یا اس سے یہ مُراد بھی ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ جو یہ کہتے تھے کہ "تمہارے گناہوں کو ہم اپنی گردن پر لیتے ہیں" اس قول سے اُن کفار کی یہ مُراد ہو کہ "یہ اعمال ہرگز گناہ نہیں ہیں" اور یہ ایک جھوٹ ہے جس کا اُنھیں جواب دینا ہو گا، یا یہ کہ بروز قیامت اُن سے کہا جائے گا کہ آؤ اور اُن لوگوں کے گناہ اُٹھاؤ! تو وہ لوگ انکار کر دیں گے اور اپنے جھوٹ کو ظاہر کر دیں گے۔

یا یہ مُراد بھی ہو سکتی ہے کہ اُن کے اقوال کا یہ مطلب تھا کہ ہر انسان دُوسرے انسان کے گناہوں کی ذمہ داری لے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی دروغ ہے۔ کیونکہ ہر آدمی صرف اپنے ہی اعمال کا ذمہ دار ہے۔

❊ ❊ ❊

چند اہم نکات

۱۔ اچھی اور بُری رسمیں: اگر کوئی شخص کسی ایسے کام کی بُنیاد رکھتا ہے جو اُس عہد کے پُورے معاشرے میں نفوذ کر جائے تو بُنیاد رکھنے والا شخص کُل معاشرہ کے اعمال کا ذمہ دار ہو گا۔ کیونکہ کسی عمل کی تحریک بھی اُس عمل کے اسباب میں سے ہے۔ یہ ثابت ہے کہ جو شخص بھی محرکِ عمل ہے وہ اُس عمل کے خیر و شر میں شریک سمجھا جائے گا۔ خواہ وہ عمل کتنا ہی معمولی ہو۔

جناب رسالت مآبؐ سے ایک حدیث روایت کی گئی ہے جو ہمارے اس قول کی مؤید ہے۔

جناب رسُولِ خداؐ ایک روز اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ ایک سائل آیا اور اُس نے مدد کے لیے سوال کیا۔ کسی نے بھی اُسے کچھ نہ دیا۔ اتنے میں اصحاب میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اُس فقیر کو کچھ دے دیا۔ یہ دیکھ کر دوسروں کو بھی خیال پیدا ہُوا اور اُنھوں نے بھی اُس سائل کی مدد کی اس موقع پر رسُول اللہؐ نے فرمایا:

من سن خیراً فاستن به کان له اجره ومن اجور من تبعه، غیر منتقص من اجورهم شیئاً، ومن سن شراً فاستن به کان علیه وزره ومن اوزار من تبعه، غیر منتقص من اوزارهم شیئاً۔

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲۵ صفحہ ۴۰

Marfat.com

جو آدمی کسی نیک رسم کی بُنیاد رکھتا ہے اور دُوسرے اس کی پیروی کرتے ہیں تو اُسے اس کے عملِ خیر اور دوسروں کے اعمالِ خیر کا بھی بدلہ ملے گا۔ بغیر اس کے کہ دُوسروں کی جزا میں کچھ کمی ہو اور جو کوئی رسمِ شر کی بُنیاد رکھتا ہے اور لوگ اُس کی پیروی کرتے ہیں تو اسے اس کے اپنے گناہ اور دُوسروں کے گناہوں کی بھی سزا ملے گی۔ اس کے بغیر کہ ان کی سزا میں کچھ تخفیف ہو۔[1]

اِس مطلب کی اور بھی حدیثیں شیعہ اور سُنّی کُتب احادیث میں مذکور ہیں۔ مگر اُن میں سے یہ مشہور ہے۔

❖　❖　❖

۲۔ ایک سوال کا جواب: اِس مقام پر یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان کا خُون بہا دُوسرے آدمی کے ذمّے ہوتا ہے۔ مثلاً قتل کے معاملہ میں خون بہا "عاقلہ" کے ذمّے ہے۔

"عاقلہ" اصطلاحِ فقہ میں ایک باپ کی اولادِ ذکور کو کہتے ہیں کہ خُون بہا کی رقم اُس اولادِ ذکور پر تقسیم ہو جائے گی اور ان میں سے ہر ایک اپنا حصّہ ادا کرے گا۔

کیا یہ مسئلہ مندرجہ بالا آیات کے مضامین سے متضاد نہیں ہے؟

ہم اِس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نے مباحث فقہی میں یہ واضح کر دیا ہے کہ "عاقلہ" کا خُون بہا کا ضامن ہونا ایک قسم کا ایک خاندان کے افراد میں متقابل اور لازمی بیمہ ہے۔

اِسلام نے اس وجہ سے کہ کسی خطا کی دِیت کا بار ایک فرد پر نہ رہے۔ پُورے خاندان کے افراد پر لازم کر دیا کہ وُہ سب باہم دگر "دیتِ خطا" کے ضامن رہیں اور دِیت کی رقم کو آپس میں بانٹ لیں۔ ممکن ہے کہ آج ایک شخص خطا کا مرتکب ہو اور کل کو دُوسرا۔

(ہم اس مسئلے کے بارے میں مزید بحث کو فقہ کی کتاب پر چھوڑتے ہیں)

بہر حال ادائے دِیت کا یہ نظام باہمی مفاد کی حفاظت کے لیے ایک قسم کا تعاون اور امدادِ باہمی ہے۔ اور اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ کوئی شخص دُوسرے آدمی کا گناہ اپنی گردن پر لے لے۔ بالخصوص قتل کا خُون بہا حقیقت میں اس گناہ کا جرمانہ نہیں ہے بلکہ وہ "تلافیٔ نقصان" ہے (یہ امر مستحقِ غور ہے)۔

❖　❖　❖

---

[1] تفسیر درالمنثور۔

Marfat.com

۱۴۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ
عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

۱۵۔ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

۱۶۔ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

۱۷۔ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا
عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

۱۸۔ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى
الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

۱۹۔ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○

ترجمہ

۱۴۔ اور ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا۔ وہ اُن میں پچاس سال کم ایک ہزار سال تک رہے۔ پھر اُن کو

Marfat.com

(قوم نوح کو) طوفان نے آپکڑا۔ جب کہ وہ ظالم تھے۔

۱۵۔ پھر ہم نے اُس (نوح) کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اُس کشتی کو اہلِ عالم کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔

۱۶۔ اور ہم نے ابراہیم کو بھیجا۔ جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا: تم خدا کی عبادت کرو اور اُس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم اِس بات کو سمجھو۔

۱۷۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر (پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے) بتوں کی عبادت کرتے ہو اور آپس میں دروغ بافی کرتے ہو۔ وہ ذاتیں جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو، تمہیں رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتیں۔ پس تم خدا ہی سے رزق طلب کرو اور اُسی کی عبادت کرو اور اُس کا شکر ادا کرو کہ جس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

۱۸۔ اگر تم میری تکذیب کرتے ہو تو تم سے پہلی اُمتیں بھی انبیاء کی تکذیب کرتی رہی ہیں اور رسول پر تو واضح ابلاغ کے سوا اور کچھ فرض نہیں ہے۔

۱۹۔ کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ خدا مخلوق کو کس طرح پیدا کرتا ہے اور پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے۔ اور یہ خدا کے نزدیک آسان ہے۔

تفسیر

سرگزشتِ نوحؑ اور ابراہیمؑ کا ذکر:

گزشتہ آیات میں انسانوں کی عمومی آزمائش کا ذکر تھا۔ یہاں سے اور اس کے بعد انبیاء اور گزشتہ اقوام کی آزمائشوں کا ذکر ہے وہ انبیاء اور اُن کے ساتھی کس طرح دشمنوں کے نرغے میں آزار و زحمات سے دوچار رہے، اُنھوں نے کس طرح صبر کیا اور پھر آخر کار اُنھیں حالات پر فتح نصیب ہوئی۔

یہ اذکار اصحاب پیغمبرِ اسلام کی دلجوئی کے لیے ہیں، جو اُن ایام میں مکہ میں طاقتور دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ نیز یہ دشمنوں کے لیے تہدید بھی ہے کہ وہ جان لیں کہ اُن کا انجام بڑا دردناک ہوگا۔

یہاں سب سے پہلے ایک اُولوا العزم پیغمبر حضرت نوحؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اُن کی زندگی کا اتنا حصّہ بیان کیا گیا ہے جو اُس وقت مسلمانوں کی وضع زندگانی کے لیے مناسب تر تھا۔

خدا فرماتا ہے: ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ اُن کے درمیان پچاس سال کم ایک ہزار سال تک رہا:
(ولقد ارسلنا نوحًا الیٰ قومہٖ فلبث فیھم الف سنۃٍ الّا خمسین عامًا)۔

حضرت نوح علیہ السلام شب و روز تبلیغ کرنے اور توحید کی طرف دعوت دینے میں مشغول رہتے تھے۔ خواہ خلوت و تنہائی ہو یا آپ لوگوں کے مجمع میں ہوں۔ بہر کیف آپ ہر موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنی قوم کو نوسو پچاس سال کی طویل مدّت تک خدا کی طرف

Marfat.com

بُلاتے رہے۔ آپ اِس خستہ کن کوشش سے نہ تو تھکے اور نہ اپنی طبیعت میں کسی ضعف کو پیدا ہونے دیا۔ لیکن اِس محنت کے باوجود ایک قلیل تعداد (تاریخ کے مطابق اسی افراد) کے سوا کوئی آپ کی تعلیم پر ایمان نہ لایا۔ "ضمناً" جناب رسالت مآبؐ کو یہ آگاہ کیا گیا ہے کہ: تم اِن مشرکین کو بجانب حق دعوت دیتے رہو اور ان کی سرکشی سے دل شکستہ نہ ہو۔ کیونکہ تمہارے سامنے جو مہم درپیش ہے وہ حضرت نوحؑ کی دشواریوں سے آسان تر ہے۔

مگر دیکھو کہ اِس ستمگر اور جھگڑالو قوم (یعنی قومِ نوحؑ) کا انجام کیا ہوا۔ آخر کار اُنھیں ایک عظیم طوفان نے گھیر لیا اس لیے کہ وہ ظالم اور ستمگر تھے۔ (فاخذھم الطوفان وھم ظالمون)۔

اِس طور سے ان کی شرمناک زندگیوں کا طومار لپیٹا گیا۔ اُن کے محلات اور حویلیاں اور اُن کے بے جان جسم سب کے سب امواجِ طوفان میں دفن ہوگئے۔

آیت میں جنابِ نوحؑ کی مُدتِ تبلیغ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: "ہزار سال مگر پچاس سال کم، حالانکہ ممکن تھا کہ خدا نو سو پچاس سال کہہ دیتا۔

یہ اُسلوبِ بیان طولِ زمان کی اہمیت کے اظہار کے لیے ہے، کیونکہ ایک ہزار کا عدد اور پھر وہ بھی "ہزار سال" کی صورت میں، تبلیغ کے لیے بہت بڑا عرصہ ہے۔

آیت فوق کے ظاہری معنیٰ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کُل عمر اتنی ہی نہ تھی۔ جب کہ موجودہ تورات میں حضرت نوحؑ کی کُل عمر اتنی ہی لکھی ہے۔ (توریت سفر تکوین فصل نہم)

لیکن یہ بات درست نہیں بلکہ نو سو پچاس سال کا عرصہ ماقبل طوفان تبلیغ کا ہے۔ آپ طوفان کے بعد بھی طویل مُدت تک زندہ رہے۔ بعض مفسرین نے تین سو سال لکھے ہیں۔

اگر ہم اپنے زمانے کی عمروں کے معیار سے دیکھیں تو حضرت نوحؑ کی اِتنی طولانی عمر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے اور ہرگز طبعی معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اُس زمانے میں لوگوں کی عمریں اِس زمانے کی عمروں سے مختلف ہوتی ہوں۔ بعض اسناد سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ کی عمریں طولانی ہوتی تھیں۔ اُن میں سے تو حضرت نوحؑ کی عمر غیر معمولی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جسم کی بناوٹ میں بھی طولِ عمر کا امکان ہوسکتا ہے۔

اِس زمانے میں حکمانے جو تحقیقات کی ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی حدِ عمر معیّن نہیں ہے اور جن لوگوں نے انسان کی عمرِ طبیعی ایک سو بیس سال یا اِس سے کسی قدر کم یا زیادہ سمجھی ہے اُن کا خیال بے اساس ہے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ شرائط بقائے حیات کے ساتھ یہ قیاس بدل جائے۔

ہمارے اِس زمانے میں سائنسدان تجربات کے وسیلہ سے اِس قابل ہوگئے ہیں کہ وہ بعض نباتات یا دیگر زندہ موجودات کی عمر کو اُن کی معمول کی مُدتِ حیات سے بارہ گنا زیادہ کردیں۔ بلکہ بعض اوقات تو (اگر آپ تعجب نہ کریں) ۹۰۰ گنا تک مُدتِ حیات کو طویل کردیا گیا ہے۔ اگر یہ تجربات کامیاب ہوتے رہے تو وہ انسان کی مدتِ حیات کو بھی طول دینے میں کامیاب ہوجائیں گے۔[1]

---

[1] طول عمر کے مسئلے کو با وضاحت سمجھنے کے لیے حضرت امام مہدی علیہ السلام کی طولانی عمر کی بحث کے سلسلہ میں "مہدی انقلابی بزرگ" کتاب کا مطالعہ کریں۔

Marfat.com

اور یہ ممکن ہو جائے گا کہ انسان ہزاروں سال تک زندہ رہ سکے۔

ضمناً یہ بھی ملحوظ رہے کہ کلمۂ "طوفان" کا مادہ "طواف" ہے۔ اس کے حقیقی معنیٰ ہر اس حادثے کے ہیں جو انسان کو گھیرلے۔ مجازاً اس کلمہ کا اطلاق اُس کثیر پانی یا سیل شدید پر ہونے لگا جو رُوئے زمین پر پھیل کر اُسے نگل لے۔ اس کا اطلاق ہوا، آگ اور پانی سب پر ہو سکتا ہے۔ یہ کلمہ کبھی شدید تاریکی شب کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[1]

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ قومِ نوح کو "وهو ظالمون" کہا گیا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ وقوعِ طوفان کے وقت بھی وہ لوگ اُسی طرح ظلم وستم کے مرتکب ہو رہے تھے۔ ان کلمات کا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ اگر وہ ان اعمال سے باز آجاتے اور خدا کی طرف رجوع کرتے تو ہرگز اِس عذاب میں مُبتلا نہ ہوتے۔

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ ہم نے نوح اور اصحابِ کشتی کو نجات دی اور اُسے اہلِ دُنیا کے لیے ایک نشانی قرار دیا:
(فانجیناه واصحاب السفینة وجعلناها آیة للعالمین)۔[2]

❖ ❖ ❖

حضرت نوحؑ اور اُن کی قوم کے واقعے کے ذکر کے بعد دُوسرے اُولوا العزم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے حالات کا تذکرہ ہے۔
"ہم نے ابراہیمؑ کو بھیجا۔ اور جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ: خدائے واحد کی پرستش کرو اور اُس کے لیے تقویٰ اختیار کرو کیونکہ اگر تم جانو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے: (وابراهیم اذ قال لقومه اعبدوا الله واتقوه ذالکم خیر لکم إن کنتم تعلمون)۔[3]

اس مقام پر تبلیغاتِ انبیاء کے دو اہم "اعتقادی اور عملی" ارکان کا ایک ہی جگہ بیان ہے اور وہ ہیں "توحید" اور "تقویٰ" کی طرف دعوت (توحید کا تعلق اعتقاد سے اور تقویٰ کا ربط عمل سے ہے)۔ آخر میں کہا گیا ہے کہ اگر تم فکرِ صحیح رکھتے ہو تو ایمان بہ توحید اور تقویٰ۔۔۔۔

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد حضرت ابراہیمؑ دلائل سے بُت پرستی کا باطل ہونا ثابت کرتے ہیں۔ آپ نے اِس دعویٰ کو مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے اور ان سے اُن مشرکین کے معتقدات اور روشِ حیات کو نا درست ثابت کیا ہے۔

---

[1] مفردات راغب و فرہنگ عمید۔

[2] اس امر میں کہ "جعلناها" کی ضمیر کا مرجع کون ہے، مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ضمیر "ها" کا مرجع کُل واقعہ اور حادثہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا اشارہ حضرت نوحؑ اور اُن کے اصحاب کی نجات کی طرف ہے۔ بعض نے اِس ضمیر کا مرجع کشتی کو قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کے ظاہری معنیٰ کے لحاظ سے آخری خیال درست ہے۔ درحقیقت یہ کشتی اُس زمانے میں خدا کی عظیم آیات میں سے ایک آیت تھی۔

[3] "ارسلنا" فعل ہے اور نوحاً معطوف علیہ اور ابراہیم معطوف ہے۔ دونوں مفعول ہوئے فعل "ارسلنا" کے۔ بعض نے ابراہیم کو فعل "انجینا" کے مفعول پر عطف سمجھا ہے۔ اور بعض نے فعل محذوف "اذکر" کا مفعول سمجھا ہے۔

Marfat.com

پہلی بات اُنھوں نے یہ فرمائی کہ : تم خدا سے منحرف ہوکے بُتوں کی عبادت کرتے ہو : (انما تعبدون من دون اللہ اوثانا) ۔

حالانکہ یہ بُت بے رُوح مجسّمے ہیں ۔ نہ یہ صاحب اِرادہ ہیں ، نہ صاحب عقل اور نہ صاحب شعور ۔ وُہ ان تمام اوصاف سے محروم ہیں ۔ اُن کی ہیئت ہی بُت پرستی کے عقیدے کو باطل ثابت کرنے کے لیے کافی ہے ۔

توجہ رہے کہ " اوثان " جمع ہے وَثَن کی (بروزن "صَنَم") وہ پتھر جنہیں بصورتِ انسان تراش کر اُن کی عبادت کی جاتی تھی ۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صرف ان بُتوں کی وضع ہی یہ ثابت نہیں کرتی کہ یہ معبُود نہیں ہیں " بلکہ تم بھی جانتے ہو کہ " تم دروغ بافی کرتے ہو اور ان بُتوں کو معبُود کہتے ہو " : (وتخلقون افکا) ۔

تمہارے پاس اس جھُوٹ کو ثابت کرنے کی بجز چند اوہام و خرافات کے اور کیا دلیل ہے ۔

چونکہ " تخلقون " کا مادہ خلق ہے ۔ یہ کلمہ کبھی پیدا کرنے یا بنانے کے معنیٰ دیتا ہے اور کبھی بہ معنیٰ جھُوٹ بولنا ، اس لیے بعض مفسّرین نے اس جملے کی اُس کے علاوہ بھی تفسیر کی ہے جو ہم نے سطور بالا میں تحریر کی ۔

اُنھوں نے کہا ہے کہ تخلقون سے مُراد یہ ہے کہ تم اِن مصنوعی معبُودوں کو اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو اور خلق کرتے ہو ۔ اس لحاظ سے کلمۂ " اِفک " کے معنی " غیر حقیقی معبُود " ہوئے اور " خلق " بمعنیٰ " تراشیدن "[ل] تراشنا ۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ تیسری دلیل دیتے ہیں کہ اگر تم اِن بُتوں کو مادی منفعت کے لیے پُوجتے ہو یا دُوسرے جہان میں فائدے کے لیے ، دونوں صُورتوں میں تمہارا یہ خیال باطل ہے کیونکہ تم خدا کے علاوہ جن کی پرستش کرتے ہو وہ تمہیں رزق اور روزی نہیں دے سکتے : (ان الذین تعبدون من دُون اللہ لا یملکون لکم رزقا) ۔

تم خُود اقرار کرتے ہو کہ یہ بُت خالق نہیں ہیں بلکہ خالق حقیقی خدا ہے ۔ اس بنا پر روزی دینے والا بھی وہی ہے ۔ لہٰذا تم روزی خُدا سے طلب کرو : (فابتغوا عند اللہ الرزق) ۔

اور چونکہ روزی دینے والا وہی ہے ۔ لہٰذا اسی کی عبادت کرو اور اُس کا شکر بجالاؤ : (واعبدوہ واشکروا لہ) ۔

اس مفہوم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ منعم حقیقی کے حضور میں " حسن شکرگزاری " سے بھی عبادت کی تحریک ہوتی ہے ۔

تم جانتے ہو کہ منعم حقیقی خدا ہی ہے ۔ پس شکر اور عبادت بھی اُسی کی ذات کے لیے مخصوص ہے ۔

نیز اگر تم سرائے آخرت کی زندگی کے خواستگار ہو تو سمجھ لو کہ ہم سب کی بازگشت اسی طرف ہے نہ کہ بُتوں کی طرف (الیہ ترجعون) ۔

یہ بُت نہ یہاں کچھ کام آسکتے ہیں نہ وہاں ۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس طرح چند مختصر مگر واضح دلائل سے مشرکین کے بے بُنیاد عقائد کو رد کر دیا ۔

٭ ٭ ٭

ل " افک " ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی اصل صُورت بدل جائے ۔ اس لیے دروغ ، بالخصوص " بڑے جھوٹ " کو افک کہتے ہیں ۔ اسی طرح بادِ مخالف کو بھی " افک " کہتے ہیں ۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ تہدید کے طور پر اور اُن مشرکین کی سرکشی سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں : اگر تم میرے پیام کی تکذیب کرتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ تم سے پہلے جو اُمتیں گزر چکی ہیں اُنھوں نے بھی اسی طرح اپنے پیغبروں کی تکذیب کی ہے اور آخر کار اُن کا انجام بڑا دردناک ہوا: (وان تکذبوا فقد کذب امم من قبلکم)۔

رسُول اور فرستادۂ خدا کا فرض واضح ابلاغ کے علاوہ اور کچھ نہیں خواہ لوگ اُسے قبول کریں یا نہ کریں: (وما علی الرسول الا البلاغ المبین)۔

اس مقام پر گزشتہ اُمتوں سے مُراد قوم نوح اور وہ اقوام ہیں جو اُس کے بعد وجُود میں آئیں۔

ارتباط آیات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قول حضرت ابراہیمؑ ہی کا ہے اور بہت سے مفسرین نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے یا کم ازکم بطور احتمال اس کا ذکر کیا ہے۔

اس مقام پر ایک اور احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں رُوئے سُخن مُشرکینِ مکہ اور رسول اللہؐ کے زمانے کے کافروں کی طرف ہو اور یہ جملہ:

"کذب امم من قبلکم" اس احتمال سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ سُورۂ زمر کی آیت ۲۵ اور سورۂ فاطر کی آیت ۲۵ میں پیغمبرِ اسلامؐ اور مشرکین عرب کے متعلق جو ذکر آیا ہے، اس آیت کا مفہوم بھی اُس کے مطابق ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا دونوں تفاسیر میں نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

اس مقام پر قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کو مطلقاً چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ توحید باری تعالیٰ اور اپنی رسالت کے اثبات میں جو دلائل دے رہے تھے اُنھیں معاد کے ذکر پر ختم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں : کیا یہ منکرین معاد نہیں دیکھتے کہ خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے اور پھر اُسے واپس لوٹاتا ہے: (اولو یروا کیف یبدئ اللہ الخلق ثم یعیدہ)۔

اس مقام پر "رؤیت" یعنی دیکھنے سے مُراد مشاہدۂ قلبی اور علم ہے۔ یعنی کیا یہ لوگ آفرینش الٰہی کی کیفیت کو نہیں جانتے ؟ وہ ذات جو بار اوّل ایجاد و آفرینش پر قدرت رکھتی ہے، اُس کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔ کیونکہ ایک چیز پر قدرت رکھنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اُس کے امثال و اشباہ پر بھی اسے قدرت ہے۔

اس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ "رُویت" کے معنیٰ "مشاہدہ بالعین" (آنکھ سے دیکھنا) ہو۔ کیونکہ انسان اس دُنیا میں یہ دیکھتا ہے کہ بارش کے فیض سے مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، زمین سے نباتات اُگتی ہیں۔ انسانی بچّوں کی تولید ہوتی ہے۔ مُرغی کے بچّے انڈوں سے نکلتے ہیں۔ کیا وہ یہ نہیں سوچتا کہ جو ذات اِن کاموں پر قُدرت رکھتی ہے، وہ بعد مرگ مردوں کو حیاتِ نو بخش سکتی ہے۔

آیت کے اخیر میں تاکید کے عنوان سے یہ اضافہ ہے کہ یہ کام خدا کے لیے آسان ہے، (ان ذالك علی اللہ یسیر)۔

کیونکہ باراوّل ایجاد و آفرینش کے مقابلے میں تجدید حیات آسان تر ہے۔

Marfat.com

ذاتِ الٰہی کے لیے کلماتِ " آسان اور دُشوار " کی تعبیرات انسان کے محدُود دماغ اور محدُود القدرت حالت کی اختراعات ہیں جو اُس نے اپنی فہم کے مطابق وضع کر لیے ہیں۔ کام کا آسان یا دُشوار ہونا تو مخلوق کے لیے ہے جس کا اختیار اور قُدرت محدُود ہے نہ کہ خدا کے لیے کہ اُس کی قدرت کے لیے کسی حد کا تعیّن نہیں ہے ۔ (غور کیجئے گا)۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۲۰۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○

۲۱۔ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ○

۲۲۔ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ○

۲۳۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَئِسُوا مِنْ رَحْمَتِي وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

ترجمہ

۲۰۔ (اے رسولؐ) کہہ دو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اُس نے پہلی مرتبہ کس طرح مخلوق کو پیدا کیا۔ اس کے بعد (اسی طرح) دُوسری دُنیا کو بھی پیدا کرے گا۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۱۔ خُدا جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) عذاب دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اور تم سب اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

۲۲۔ اور تم ہرگز خدا کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتے اور اس کے دائرہ قدرت سے نہ زمین میں فرار کرسکتے ہو نہ آسمان میں اور خدا کے سوا تمہارے لیے نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔

۲۳۔ اور جن لوگوں نے خُدا کی آیات اور اُس کی لقا سے انکار کیا وہ میری رحمت سے نا اُمید ہو گئے ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

Marfat.com

تفسیر

خدا کی رحمت سے مایوس لوگ :

یہ آیات معاد کی بحث کے بعد آئی ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کے وسط میں جملہ معترضہ کے طور پر ہیں۔

یہ پہلی بار نہیں ہے کہ ہم قرآن میں اس قسم کی طرزِ بحث کا سامنا کر رہے ہیں۔ قرآن کی روش یہ ہے کہ جس وقت کسی قصّے کا بیان ایک حسّاس مرحلے پر پہنچتا ہے تو اس قصّے سے مفید نتائج اخذ کرنے کے لیے اصل قصّہ چھوڑ کر اُن نتائج کا ذکر کرنے لگتا ہے۔

بہرحال زیرِ بحث آیات میں سے پہلی آیت میں مسئلہ معاد کے سلسلے میں دُنیا کی سیر کی دعوت دی گئی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کی آیت کا رُخ " سیر انفس " کی طرف تھا۔

خدا فرماتا ہے : ان سے کہو کہ رُوئے زمین کی سیر کریں۔ زندہ موجودات کی انواع کو دیکھیں، مختلف اور متنوع قسم کی اقوام اور جماعتوں کو اُن کی خصوصیات کے ساتھ ملاحظہ کریں۔ اور دیکھیں کہ خُدا نے اُنھیں بار اوّل کس طرح ایجاد کیا ہے۔ (قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدأ الخلق)۔

وہی خدا جو رنگا رنگ موجودات اور مختلف اقوام کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، آخرت میں بھی زندہ کرے گا : (ثم اللّٰہ ینشئ النشأة الاٰخرة)۔

کیونکہ اُس نے پہلی بار خلق کر کے سب پر اپنی قدرت ثابت کر دی ہے۔ ٹھیک ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر اور توانا ہے : (ان اللّٰہ علٰی کل شیء قدیر)۔

یہ آیت اور اس سے ماقبل کی آیت قدرتِ الٰہی کی وسعت کی دلیل سے معاد کے امکان کو ثابت کرتی ہیں۔

دونوں آیات میں فرق یہ ہے کہ آیت ماسبق میں خُود انسان اور جو کچھ اُس کے اطراف و جوانب میں ہے اس کی خلقتِ اوّل کا ذکر ہے اور دُوسری آیت میں انسان کو اقوامِ عالم اور دوسری موجودات کے مطالعے کی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ وہ خُدا کی ایجادِ اوّل کو مختلف مظاہر اور مختلف حالات و شرائط میں مشاہدہ کریں اور خدا کی لامحدود قدرت سے آشنا ہوں اور یہ سمجھیں کہ اُس میں اعادۂ حیات کی طاقت بھی ہے۔

جس طرح سے کہ کبھی " آیاتِ انفس " کے مشاہدے سے توحید کا اثبات ہوتا ہے۔ اور کبھی " آیاتِ آفاق " کے مشاہدے سے اسی طرح ان دونوں طریقوں سے معاد کا بھی اثبات ہوتا ہے۔

اِس زمانے میں یہ آیت سائنسدانوں کے لیے دقیق تر اور عمیق تر مفہوم رکھتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ سیاحت کریں اور اُن موجودات ذی حیات کے آثار دیکھیں جو کبھی رُوئے زمین پر موجود تھے اور اَب وہ سمندر کی گہرائیوں، پہاڑوں کی چٹانوں اور زمین کے طبقات میں ڈھانچوں وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔ اِس طرح وہ زمین پر آغازِ حیات کے اسرار اور خدا کی عظمت و قدرت سے آگاہ ہوں اور یہ بھی جانیں کہ وہ اعادۂ حیات پر قدرت رکھتا ہے۔[1]

---

[1] ہم نے اس تفسیر کی جلد سوم میں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۳۷ کے ذیل میں سیرِ ارض کے متعلق مفصل بحث کی ہے لیکن وہ بحث زیادہ تر گزشتہ نافرمان قوموں کے انجام سے درسِ عبرت حاصل کرنے کے سلسلہ میں تھی۔

Marfat.com

کلمہ "نشأة" کے حقیقی معنی کسی چیز کی ایجاد اور تربیت کے ہیں۔ کبھی دُنیا کو "نشأۃ اُولیٰ" اور قیامت کو "نشأۃ آخرت" سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اِس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ آیت نمبر ۱۹ میں "انّ ذالك على الله يسير" آیا تھا۔ اور یہاں "اِنّ الله على كُلّ شيءٍ قدير" آیا ہے۔ اظہار بیان کا یہ فرق ممکن ہے اِس وجہ سے ہو کہ آیت ماقبل میں محدود مشاہدہ کا ذکر ہے اور اس آیت میں ایک وسیع مشاہدۂ کائنات کی دعوت دی گئی ہے۔

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد کی آیت میں اُن مسائل میں سے جو معاد سے متعلق ہیں، ایک مسئلے کا ذکر ہے اور وہ ہے رحمت اور عذاب کا مسئلہ۔ چنانچہ مذکور ہے کہ: "وہ قیامت میں جس شخص کو مستحق سزا سمجھے گا اُسے سزا دے گا اور جس شخص کو لائق رحمت سمجھے گا اُس پر رحم فرمائے گا اور تم سب اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ (يعذّب من يشاءُ ويرحم من يشاءُ واليه تقلبونَ)۔

باوجودیکہ خدا کی رحمت اُس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ لیکن اس آیت میں پہلے عذاب کا ذکر ہے اور پھر رحمت کا کیونکہ یہ بطور تہدید ہے اور تہدید کے لیے یہی مناسب ہے۔

اِس مقام پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اوّل عذاب و رحمت کا ذکر ہے اور اُس کے بعد اُس کی طرف بازگشت کا۔ ایسا کیوں ہے ؟ جب کہ قضیہ اس کے برعکس ہے یعنی اوّل لوگ اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اُس کے بعد وہ مستحق عذاب و رحمت قرار پائیں گے۔ شاید اسی سبب سے بعض لوگ اس عذاب و رحمت کو دُنیا کا عذاب اور رحمت سمجھے ہیں۔

ہم اُس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آیات مابعد کے قرینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس عذاب و رحمت کا یہاں ذکر ہے اُس کا تعلق روزِ قیامت ہی سے ہے اور " اليه تقلبون " اِسی مفہوم کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی جب کہ ہم سب کی بازگشت اُسی کی طرف ہے اور وہی اعمال کا حساب لینے والا ہے تو عذاب و رحمت بھی اُسی کے اختیار میں اور اُسی کے ارادے سے ہوگی۔

یہ بھی بعید نہیں ہے کہ اس آیت میں عذاب و رحمت وسیع تر معنی ہوں جن میں دُنیا و آخرت دونوں کا عذاب و رحمت شامل ہو۔

یہ نکتہ بھی روشن ہے کہ " من يشاءُ " (وہ جسے چاہے گا) سے مُراد وہ مشیتِ الٰہی ہے جو حکمت سے ہم آہنگ ہے۔ یعنی وہ جسے مستحق عذاب و رحمت سمجھے گا۔ کیونکہ مشیتِ الٰہی اندھی نہیں ہے بلکہ وہ ہر شخص کے استحقاق کے مطابق ہے۔

کلمہ " تقلبون " کا مادّہ "قلب" ہے۔ اس کے وضعی معنی ہیں، کسی چیز کی صُورت کو بدل دینا۔

چونکہ قیامت کے دن انسان خاکِ بے جاں کی صُورت سے ایک ایسے زندہ موجود کی شکل اختیار کرلے گا جو ایک موجُودِ مکمل ہو گا لہٰذا اُس کی تجدیدِ آفرینش کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ کلمہ " تقلبون " سے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کر سرائے آخرت میں انسان اس طرح دگرگوں اور منقلب ہو جائے گا کہ اُس کا باطن ظاہر ہو جائے گا۔ اور اس کے دل کے بھید آشکارا ہو جائیں گے سورۂ طارق کی آیت ۹ " يوم تبلى السرائر " (وہ دن جب کہ دل کے بھید کھُل جائیں گے) ان معنی سے ہم آہنگ ہے۔

❊ ❊ ❊

اِس بحث کو مکمل کرتے ہُوئے کہ عذاب اور رحمت خدا کے اختیار میں ہے اور سب لوگوں کو اُسی کی طرف لوٹنا ہے، یہ اضافہ

Marfat.com

کیا گیا ہے: اگر تم یہ خیال کرو کہ تم خدا کی حکومت سے باہر نکل جاؤ گے اور اُس کا دستِ عدالت تمہارا گریبان نہ پکڑے گا، تو تم سخت غلطی پر ہو۔ کیونکہ تم خدا کے ارادے پر ہرگز غالب نہیں آسکتے اور اُس کے دائرۂ اختیار سے زمین یا آسمان میں فرار نہیں کرسکتے۔"

(وما انتم بمعجزین فی الارض ولا فی السماء)[1]

اور اگر تم سمجھتے ہو کہ کوئی سرپرست اور مددگار اُس وقت تمہاری یاوری کرے گا تو یہ بھی محض غلط فہمی ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے خدا کے علاوہ کوئی ولی اور یاور نہیں ہے: (ومالکم من دون اللہ من ولیّ ولا نصیر)۔

درحقیقت خدا کے عذاب سے اُسی وقت نجات مل سکتی ہے کہ یا تو تم اُس کی حکومت سے باہر نکل جاؤ۔ یا اُس کے دائرۂ فرمان روائی میں رہ کر دُوسروں کا سہارا لے کر اپنے آپ کو بچاؤ مگر نہ تو اُس کی سلطنت سے باہر نکلنا ممکن ہے (کیونکہ ہر مقام پر اُسی کی حکومت ہے اور تمام عالمِ ہستی اُسی کا وسیع مُلک ہے) اور نہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ اُس کی قدرت کے مقابلے میں عَلمِ اختیار بلند کرے یا کوئی تمہاری مدافعت کرسکے۔

دو سوال اور ان کا جواب:

پہلا سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے کہ اس آیت میں مُشرکین اور کفّار سے خطاب ہے اور یہ لوگ زمین کے ساکن ہیں تو یہ کہنا کہ "ولا فی السماء" کیا معنی رکھتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک طرح کی تاکید اور مُبالغہ ہے۔ یعنی تم نہ تو حدودِ زمین میں خدا کے احاطۂ قُدرت سے نکل سکتے ہو اور نہ آسمانوں میں۔ یعنی بالفرض اگر تم اتنی قدرت رکھتے ہو کہ آسمان پر چڑھ جاؤ تو پھر بھی اُس کے دائرۂ قدرت ہی میں رہو گے۔ یا یہ کہ نہ تو تم اہلِ زمین کے وسیلے سے خدا کو اُس کی مشیت میں عاجز کرسکتے ہو اور نہ اپنے اُن معبُودوں کے وسیلے سے جنہیں تم سمجھتے ہو کہ وہ آسمانوں میں ہیں۔ جیسے فرشتے یا جنّات (البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے)۔

دُوسرا سوال یہ ہے کہ "ولی" اور "نصیر" میں کیا فرق ہے؟

علّامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں لکھا ہے کہ "ولی" وہ ہے جو بغیر درخواست کے انسان کی مدد کرے۔ لیکن "نصیر" عمومیت رکھتا ہے۔ وہ کبھی درخواست پر اور کبھی بغیر درخواست کے مدد کرتا ہے۔ ان دونوں کلمات کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ "ولی" وہ سرپرست ہے جو بدونِ تقاضا مدد کرتا ہے اور "نصیر" اُس فریادرس اور یاور کو کہتے ہیں جو طلب اور درخواست کے بعد انسان کی مدد کرتا ہے۔

اس عنوان سے قرآن میں ان مجرموں کے لیے مجازاتِ الٰہی سے فرار کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

خدا آیت مابعد میں بطور قطع فرماتا ہے کہ: جو لوگ آیاتِ الٰہی اور اُس کی لقا کے مُنکر ہُوئے وہ میری رحمت سے مایوس ہیں:

---

[1] "معجزین" کا مادہ "عجز" ہے۔ اس کے معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے کے ہیں۔ لہٰذا ناتوانی کے وقت (جو کہ پیچھے رہ جانے کا باعث ہوتی ہے) اس کلمہ کو استعمال کرتے ہیں۔ بیہودہ شخص ہے جو دُوسرے کو عاجز کرنے اس لیے جو آدمی کسی کی قلمروِ قدرت سے بھاگ کر اُسے اپنا پیچھا کرنے سے عاجز کر دیتا ہے، اسے بھی معجز کہتے ہیں۔

Marfat.com

(والذین کفروا بآیات اللہ ولقائہ اولٰئک یئسوا من رحمتی)۔
اس کے بعد تاکید کے طور پر یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ اُن کے لیے دردناک عذاب ہے: (و اُولٰئک لھم عذاب الیم)۔
یہ عذابِ الیم رحمتِ خُدا سے مایوس ہونے کا لازمہ ہے۔
" آیاتِ اللہ" یا " آیات تکوینی " سے نظامِ آفرینش میں عظمتِ الٰہی کے آثار مُراد ہیں۔ اِس صُورت میں اِن کلمات سے اشارہ مسئلۂ توحید کی طرف ہوگا۔ جبکہ " لقائہ " سے اشارہ مسئلہ معاد کی طرف ہے۔
یعنی مُنکرِ مبدأ بھی ہیں اور مُنکرِ معاد بھی۔
یا ـــ " آیات اللہ" سے آیاتِ تشریعی مُراد ہیں۔ یعنی وُہ آیات جو خُدا نے اپنے پیغمبروں پر نازل کیں۔ جن میں مبدأ و معاد اور نبوّت کا ذکر ہے۔ اِس صُورت میں کلمہ " لقائہ " اِسی طرح کی تعبیر ہے جیسے خاص کے بعد عام کا ذکر کیا جائے۔
اِس کا امکان بھی ہے کہ " آیاتِ اللہ " سے وہ تمام آیاتِ الٰہی مُراد ہوں جو عالمِ آفرینش اور احکاماتِ تشریعی میں ہیں۔
اِس نکتہ کا ذکر بھی لازم ہے کہ " یئسوا " (وہ مایوس ہوگئے) فعل ماضی ہے۔ ہر چند کہ مقصودِ کلام زمانہ آئندہ یعنی روزِ قیامت ہے کیونکہ عربوں کا شیوۂ کلام یہ ہے کہ وہ حادثۂ آئندہ، جو سو فیصد حتمی الوقوع ہو اُس کے لیے فعل ماضی استعمال کرتے ہیں۔

❖　❖　❖

Marfat.com

۲۴۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ
فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

۲۵۔ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ
وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ
مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

۲۶۔ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝

۲۷۔ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ
الْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۴۔ لیکن اُس (ابراہیم) کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اُسے قتل کردو یا جلا دو۔ مگر خدا نے اُسے آگ سے نجات بخشی اور اس واقعے میں ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

Marfat.com

۲۵۔ (ابراہیم نے) کہا : تم نے خدا کو چھوڑ کر اپنے لیے بُتوں کو انتخاب کیا ہے تا کہ یہ تمہارے لیے دُنیا کی زندگی میں محبّت اور دوستی کا سبب ہوں مگر تم بروز قیامت ایک دُوسرے کی دوستی سے انکار کرو گے۔ اور ایک دُوسرے پر لعنت بھیجو گے۔ اُس روز تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور کوئی تمہارا مدد گار نہ ہوگا۔

۲۶۔ پس اُس (ابراہیم) پر لُوط ایمان لایا۔ اور (ابراہیم نے) کہا : میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں بے شک وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۲۷۔ اور ہم نے اُسے اسحٰق اور یعقوب عطا کیا اور اُس (ابراہیم) کے خاندان میں نبوّت اور کتاب عطا کی اور دُنیا میں اُس کا اجر دیا اور وُہ آخرت میں صالحین میں سے ہوگا۔

تفسیر

حضرت ابراہیمؑ کو مُتکبرین کا طرزِ جواب :

اَب ہم اس مقام پر ہیں کہ یہ دیکھیں کہ اُس گُم راہ قوم نے حضرت ابراہیمؑ کے اُن تین دلائل کا جو توحید، نبوّت اور معاد کے متعلق تھے کیا جواب دیا۔ اُن کے پاس کوئی مُدلّل جواب تو تھا نہیں لہٰذا اُنھوں نے دیگر تمام منہ زور بے منطق بدمعاشوں کی طرح اپنی شیطانی طاقت کا سہارا لیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو قتل کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے : ابراہیم کی قوم کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ اسے (ابراہیم کو) قتل کردو یا جلا دو۔ (فماکان جواب قومہ الّا ان قالوا اقتلوہ او حرقوہ)۔

قرآن کے اس طرزِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کی تو یہ رائے تھی کہ ابراہیم کو جلا دیا جائے اور کچھ یہ تجویز پیش کر رہے تھے کہ اُنھیں تلوار یا کسی اور ذریعے سے قتل کر دیا جائے۔ آخر کار، پہلے گروہ کی رائے مان لی گئی کیونکہ وہ قوم یہ سمجھتی تھی کہ کسی کو مارنے کا بدترین طریقہ یہی ہے کہ اُسے جلا دیا جائے۔ اس مقام پر یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ابتداً میں اُس قوم کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کو عام طریقے سے قتل کرنا چاہتے تھے مگر بعد میں وہ سب اس پر متفق ہوگئے کہ اُنھیں جلا دیا جائے اور اُنھیں شدید ترین عذاب دیا جائے۔

اس آیت میں یہ ذکر نہیں آیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں کس طرح جلایا گیا تھا۔ ہم اس جگہ صرف یہ پڑھتے ہیں کہ خُدا نے اُنھیں آگ سے نجات بخشی۔ (فانجاہُ اللّٰہُ من النّار)۔

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی تفصیل سُورۂ انبیاء کی آیات ۶۸ تا ۷۰ میں مذکور ہے۔ جس پر ہم نے تفسیر نمونہ کی تیرھویں جلد میں مفصّل بحث کی ہے۔

آیت کے آخر میں یہ اضافہ ہے کہ اس ماجرے میں ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (انّ فی ذٰلک لاٰیاتٍ لقومٍ یؤمنون) صرف ایک نشانی ہی نہیں بلکہ اس واقعے میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ روشن معجزہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جسم پر آگ کا اثر نہ ہوا۔ (اور جیسا کہ مشہور ہے) آگ گلستان میں تبدیل ہوگئی۔ یہ دوسرا معجزہ تھا۔

تیسرا معجزہ یہ تھا کہ وہ زبردست اقتدار کے حامل لوگ ایک ایسے فرد کے مقابلے میں جس کا ہاتھ ہر وسیلۂ ظاہری سے خالی تھا

Marfat.com

قطعی عاجز اور ناتواں ثابت ہوئے۔

اِس عجیب غیر معمولی حادثے کا اُن سیاہ دلوں کی طبیعت پر کچھ اثر نہ ہونا، یہ بھی قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی ہے۔ وہ یوں کہ خدا نے اِس مُعاند اور مخالفِ حق قوم کے افراد سے توفیقِ خیر کو اس طرح سلب کر لیا تھا کہ بڑی سے بڑی نشانیوں کا بھی اُن پر اثر نہ ہوتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ۔ جس وقت حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر آگ میں پھینکا گیا تو جو چیز جلی وہ صرف وہی رسی تھی جس سے آپ کو باندھا گیا تھا[1]

ہاں، ٹھیک ہے کہ اُن دُشمنانِ حق کی آتشِ جُرم و جہالت نے اُن چیزوں کو جلا دیا جس میں حضرت ابراہیمؑ کو قید کیا گیا تھا اور وہ آزاد ہوگئے۔ اور یہ بھی ایک نشانی ہے۔ شاید اِن وجُوہ کی بنا پر۔ حضرت نوحؑ اور بذریعہ کشتی اُن کی نجات کے قصّے میں "جعلناھا اٰیۃ" بصُورتِ مفرد، کہا گیا ہے اور اِس مقام پر "لاٰیات" بصُورت جمع آیا ہے۔

بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے اُس آگ سے بہ لطفِ الٰہی معجزانہ طور پر نجات پائی۔ اُس کے بعد صرف یہی نہیں ہوا کہ آپ اپنے مقاصدِ نبوّت اور ہدایت کی تبلیغ سے دست بردار نہیں ہُوئے بلکہ اس کے برعکس آپ نے اور بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے تبلیغ شروع کر دی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی مُشرک قوم سے کہا: تم نے خُدائے برحق کو چھوڑ کر اپنی عبادت کے لیے بُتوں کو اختیار کر لیا ہے تاکہ وہ دُنیاوی زندگی میں تمہارے درمیان دوستی اور محبّت کا سبب بنیں لیکن تم متنبہ رہو کر بروزِ قیامت تمہارا باہمی رشتۂ محبّت بالکل منقطع ہو جائے گا اور تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کر دے گا اور تم آپس میں ایک دوسرے پر لعنت اور نفرین کرو گے۔ پس تم سب کا مقام جہنّم ہے۔ اُس روز تمہارا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا: (وقال انما اتخذتم من دون اللہ اوثانا مودۃ بینکم فی الحیوۃ الدنیا ثم یوم القیامۃ یکفر بعضکم ببعض و یلعن بعضکم بعضا و مأواکم النار و ما لکم من ناصرین)[2]۔

بُتوں کا انتخاب بُت پرستوں کے درمیان مؤدّت کا سبب کس طرح ہوتا تھا؟

اِس سوال کا چند پہلوؤں سے جواب دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر قوم یا قبیلہ جب ایک ہی بُت کی پرستش کرتا تھا تو اُن میں باہمی وحدت اور یگانگت کا احساس پیدا ہوتا تھا۔

یہاں یہ اَمر ملحوظ رہے کہ اُس زمانے میں ہر قوم اور ہر قبیلے کا ایک مخصوص بُت ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب میں زمانۂ جاہلیت میں ہر بُت کسی شہر یا قبیلے سے منسُوب تھا۔ اُن میں سے بُت "عُزّیٰ" خصوصاً قریش سے منسُوب تھا۔ "لات" قبیلۂ ثقیف کا اور۔ "منات" اوس و خزرج کا تھا[3]

دُوسرے یہ کہ بُتوں کی پرستش اُس قوم کا اُن کے اَجداد اور بزرگوں سے تعلق قائم رکھتی تھی۔ غالباً دینِ حق کو قبول نہ کرنے کے لیے

---

[1] تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۰، صفحہ ۱۲۰۔

[2] "مودۃ بینکم" کے منسُوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ "لاجلہ" کا مفعول ہے۔ اِس ضمن میں مفسّرین نے اور بھی احتمالات بیان کیے ہیں۔

[3] سیرت ابن ہشام، ج ۱ صفحات ۸۶-۸۷۔

Marfat.com

اِسی وجہ سے وہ یہ عُذر کرتے تھے کہ یہ بُت ہمارے بزرگوں کی یادگاریں ہیں۔ اور ہم اُن ہی کی پیروی کرتے ہیں۔
علاوہ بریں کُفّار کے سردار اور بزرگ اپنے پیروؤں کو بُتوں کی پرستش کی ترغیب دیتے تھے۔ اور اُن سردارانِ قوم اور ان کے پیرؤں کے درمیان یہی حلقۂ اتصال تھا۔

لیکن قیامت میں یہ تمام بوچ اور کمزور رشتے منقطع ہو جائیں گے اور ہر آدمی اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالے گا اور اُس پر لعنت اور نفرین کرے گا اور اس کے عمل سے اظہارِ بیزاری کرے گا۔ حتیٰ کہ ان کے وہ معبود (بُت) جن کے متعلق اُن کا خیالِ خام یہ تھا کہ وہ اُن کے لیے خُدا سے ارتباط کا وسیلہ ہیں اور جن کی بابت وہ یہ کہا کرتے تھے:

مانعبدھم الّا لیقربونا الی اللہ زلفٰی

ہم تو اُن کی محض اس لیے پرستش کرتے تھے کہ وہ ہمیں خدا سے نزدیک کردیں گے۔ (زمر ۳)

بروزِ قیامت یہ پرستار اُن سے بھی اظہارِ بیزاری کریں گے۔
جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۸۲ میں ہے:

کلّا سیکفرون بعبادتھم ویکونون علیھم ضدًّا

وہ معبودانِ باطل بہت جلد اپنے پُجاریوں کی عبادت کا انکار کردیں گے اور اُن کے مخالف ہو جائیں گے۔

اور بروزِ قیامت ایک دوسرے کے انکار، ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس روز مشرکین ایک دُوسرے سے بیزاری کریں گے اور وہ چیز جو دُنیا میں اُن کی بے اصل و بے بُنیاد محبّت کا سبب تھی وہ آخرت میں اُن کے لیے باہمی عداوت اور بُغض کا باعث بن جائیں گی۔ جیسا کہ سُورۂ زخرف کی آیت ۶۷ میں فرمایا گیا ہے:

اَلاخلّاءُ یومئذٍ بعضھم لبعضٍ عدوٌّ الّا المتّقین

اُس روز دوست ایک دُوسرے کے دُشمن ہو جائیں گے۔ مگر پرہیزگار (نہیں ہوں گے)۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف بُت پرستوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ وُہ تمام لوگ بھی اس میں شامل ہیں، جنھوں نے دُنیا میں باطل امام اور باطل پیشوا چُنا ہے اور اس کی پیروی کرتے ہیں اور اُس سے پیمانِ مودت باندھتے ہیں۔
یہ سب بھی قیامت میں ایک دُوسرے کے دُشمن ہو جائیں گے اور ایک دُوسرے سے اظہارِ بیزاری کریں گے اور ایک دُوسرے پر لعنت کریں گے۔ [1]

مومنین کا باہمی پیوندِ محبت جس کی بُنیاد اس دُنیا میں توحید، خدا پرستی اور اطاعتِ فرمانِ حق پر ہے، وہ ہمیشہ برقرار رہے گا اور وہاں اور زیادہ محکم ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بروزِ قیامت مومنین ایک دُوسرے کے لیے استغفار و شفاعت کریں گے۔ جب کہ مشرکین ایک دُوسرے پر لعنت کرنے میں مشغول ہوں گے۔ [2]

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد کی آیت ۲۶ میں حضرت لُوطؑ کے ایمان لانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، لُوط ابراہیم پر ایمان لائے:

Marfat.com

(فامن لہٗ لوطٌ)۔

حضرت لُوط خود پیغمبرانِ بزرگ میں سے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے قریبی رشتہ دار تھے (کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے بھانجے تھے)۔ اگر ایک مردِ بزرگ کسی پیغمبر پر ایمان لائے اور اُس کے احکام کی پیروی کرے تو اس کا ایمان لانا ایک اُمّت و ملّت کے ایمان لانے کے مترادف ہے۔ خدانے یہاں خصوصیت سے حضرت لُوط کے ایمان لانے کا ذکر کیا ہے جو ایک عظیم شخصیت حضرت ابراہیمؑ کے معاصر تھے تا کہ یہ امر واضح ہو جائے کہ جب ایسا شخص ایمان لے آیا تو اذل الناس کا ایمان نہ لانا کچھ اہمیّت نہیں رکھتا۔

البتہ یہ قیاس ہوتا ہے کہ شہر بابل میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ دل موجود تھے۔ جنھوں نے اُس معجزۂ عظیم کو دیکھ کر آپ کی اتباع کی۔ مگر یقیناً وہ لوگ اقلیّت میں تھے۔

اس کے بعد یہ اضافہ فرمایا گیا ہے: ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کر رہا ہوں کیونکہ وہ عزیز و حکیم ہے:

(وقال انی مهاجرٌ الٰی ربی انه هوالعزیزالحکیم)۔

ظاہر ہے کہ جس وقت رہبرانِ الٰہی کسی مقام پر اپنا فرضِ رسالت انجام دیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ معاشرہ اور سارا ماحول اس قدر آلودہ بہ شرک وجہل ہے اور ظالموں کے دباؤ میں ہے کہ اُن کی دعوتِ حق کا اُس مقام پر پھیلنا ناممکن ہوگیا ہے تو وہ وہاں سے کسی اور جگہ ہجرت کر جاتے ہیں تاکہ اُس مقام پر دعوتِ الٰہی کو پھیلائیں۔

اس لیے حضرت ابراہیمؑ بھی شہر بابل سے حضرت لوطؑ اور اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر "خطۂ انبیا و توحید" یعنی ملک شام کی طرف سفر کر گئے تاکہ آپ وہاں ایک جماعت پیدا کر سکیں اور دعوتِ توحید کو وسعت دے سکیں[۱]۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ جملہ کہ "میں اپنے ربّ کی طرف ہجرت کر رہا ہوں" قابلِ توجّہ ہے آپ نے یہ جملہ اس لیے کہا کہ یہ راہ، راہِ پروردگار، اُس کی رضا کی راہ اور راہِ دین و آئین تھی۔

اگر فعل "قال" (کہا) کا مرجع حضرت لُوط ہوں۔ یعنی یہ معنیٰ ہوں کہ "لُوط نے کہا کہ میں اپنے ربّ کی طرف ہجرت کر رہا ہوں" تو سیاقِ عبارت اِس مفہوم سے مربُوط ہے۔ مگر تاریخی اور قرآنی شواہد یہ بتاتے ہیں کہ "کہا" فعل میں ضمیرِ غائب کا مرجع حضرت ابراہیمؑ ہی ہیں اور حضرت لُوطؑ نے اُن کے "ساتھ" ہجرت کی تھی۔

اس قول کی تائید سورۂ صافات کی آیت ۹۹ سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے:

انی ذاھبٌ الٰی ربی سیھدین

مَیں اپنے ربّ کی طرف جا رہا ہوں اور وہ میری راہنمائی کرے گا۔[۲]

✥ ✥ ✥

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں اُن چار نعماتِ الٰہی کا ذکر ہے جو خدا نے ہجرت کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو عطا کیں۔

پہلی نعمت لائق اور محترم بیٹے تھے۔ ایسے فرزند جنھیں یہ توفیق ارزانی ہوئی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان میں ایمان اور نبوت کا چراغ روشن رکھ سکیں۔

---

[۱] حضرت ابراہیمؑ کے بابل سے ملک شام کو ہجرت کرنے کی تفصیلی بحث سُورہ انبیاء کی آیت نمبر ۷۱ کے ذیل میں تفسیرِ نمونہ کی جلد تیرہ میں بیان ہوئی ہے۔

Marfat.com

چنانچہ خدا فرماتا ہے : ہم نے اُسے اسحاق اور یعقوب بخشے؛ (ووھبنالہ اسحٰق و یعقوب) ۔

یہ دونوں نہایت بزرگ اور لائق پیغمبر تھے۔ ان میں سے ہر ایک حضرت ابراہیمؑ کی راہِ بُت شکنی پر چلتا رہا ۔

دُوسری نعمت یہ کہ نبوت اور کتاب آسمانی خاندانِ ابراہیمؑ ہی کے اندر مخصوص ہوگئی : (وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتاب) ۔

صرف اسحاق و یعقوب (یعقوبؑ اسحاقؑ کے بیٹے تھے) ہی پیغمبر نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان میں رسالتمآب خاتم الانبیا تک رسالت کا سلسلہ جاری رہا ۔ اسی خاندان میں یکے بعد دیگرے بزرگ پیغمبر پیدا ہوتے رہے جنھوں نے دُنیا کو نُورِ توحید سے منور کیا

تیسرے یہ کہ " ہم نے اُسے دُنیا میں بھی بدلہ دیا " :

(واتیناہ اجرہٗ فی الدنیا) ۔

اس دُنیاوی اجر کا ذکر اشارتاً ہوا ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ مختلف اُمور کی طرف اشارہ ہو ۔ مثلاً نام نیک اور تمام اُمتوں میں آپ کا ذکرِ خیر بطورِ احترام ۔ کیونکہ تمام اُمتیں حضرت ابراہیمؑ کا ایک اولوالعزم پیغمبر کے طور پر احترام کرتی ہیں اور آپ کے وجود پر فخر کرتی ہیں اور اُنھیں شیخ الانبیاء کہتی ہیں ۔

نیز یہ کہ سرزمین مکہ آپ کی دُعا سے آباد ہُوئی ۔ اور ہر سال مراسم حج ادا کرتے ہوئے تمام حجاج کے دل آپ کی طرف کھنچتے ہیں ۔ اور سب لوگ آپ کے پُرشکوہ ، ایمان آفریں اور نیک ارادوں کو یاد کرتے ہیں ۔ (یعنی خانۂ کعبہ کو دیکھ کر اُس کے بانی کی یاد آتی ہے) گویا کہ یہ بھی ایک اجر ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو دُنیا میں ملا ۔

چوتھا اجر یہ ہے کہ آخرت میں اُن کا شمار صالحین میں ہوگا : (وانہ فی الاٰخرۃ لمن الصالحین) ۔

اور یہ سب باتیں یکجا ہوکر حضرت ابراہیمؑ کے لیے باعثِ افتخار ہیں ۔

چند اہم نکات

۱ ۔ **عظیم ترین افتخار** : جیسا کہ قرآن کی بہت سی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی انسان کا صالحین میں شمار ہونا اُس کے لیے مُنتہائے افتخار ہے ۔ اس لیے پیغمبروں میں سے بہت سے خُدا سے تمنا کرتے تھے کہ وُہ اُنھیں صالحین میں جگہ دے ۔

حضرت یُوسفؑ ظاہری شان و شوکت کے انتہائی مدارج پر پہنچنے کے بعد خدا سے یہ دُعا کرتے تھے ،

توفنی مُسلمًا والحقنی بالصالحین

اے خُدا تو مجھے اس حالت میں موت دے کہ میں مُسلمان ہوں اور بعدِ مرگ تو مجھے صالحین سے ملحق کر دے ۔ (یوسف - ۱۰۱)

حضرت سلیمانؑ بھی اپنی پوری حشمت اور جاہ و جلال کے باوجود خدا سے یہ دُعا کرتے ہیں :

اُدخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین

Marfat.com

اے خدا ! تو مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔ (نمل - ۱۹)

حضرت شعیبؑ کا جب موسٰی سے عہد و پیمان ہوتا ہے تو فرماتے ہیں :

ستجدنی ان شاء اللہ من الصالحین

اِن شاء اللہ تو مجھے صالحین میں سے پائے گا۔ (قصص - ۲۷)

حضرت ابراہیمؑ بھی خدا سے یہی دُعا کرتے ہیں کہ اُن کا شمار زمرۂ صالحین میں ہو :

رب ھب لی حکماً والحقنی بالصالحین) (شعرا - ۸۳)

حضرت ابراہیم یہ دُعا بھی کرتے ہیں کہ اُن کی اولاد صالح ہو :

رب ھب لی من الصالحین (صافات - ۱۰۰)

قرآن شریف کی بہت سی آیات میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جب خدا پیمبرانِ بزرگ کی مدح کرتا ہے تو اُن کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ صالحین میں سے ہیں ۔

ان کُل آیات کے مُطالعے سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان کا عالی ترین مرتبہ کمال صالح ہونا ہے ۔

اَب سوال یہ ہے کہ " صالح ہونا " کیا معنی رکھتا ہے ؟

اُس کے معنی ہیں: اعتقاد و ایمان کے لحاظ سے عظمت و پاکیزگی۔اسی طرح عمل اور گفتار و اخلاق کے لحاظ سے بھی مُراد یہ ہے کہ مردِ صالح وہ ہے جو اپنی فکر ، کردار اور گفتار غرض ہر طرح سے نیک ہو۔

" صالح " کی ضد " فاسد " ہے ۔ یہ واضح ہے کہ زمین پر فساد کرنے میں تمام ظلم وستم اور تمام بداعمالیاں شامل ہیں ۔

قُرآن مجید میں کلمہ " صلاح " " فساد " کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ اور کبھی " سیئۃ " کے مقابلہ میں بھی آیا ہے ۔ جن کے معنی ہیں گناہ اور بدی ۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ پر خُدا کی عظیم برکات : بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اِس آیت میں ایک لطیف نکتہ موجود ہے اور وُہ یہ ہے کہ :

خدا نے حضرت ابراہیمؑ کے تمام تکلیف دہ حالات کو اُن کی ضد میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ :۔

بابل کے بُت پرست یہ چاہتے تھے کہ اُنھیں آگ میں جلادیں۔ مگر وہ آگ اُن کے لیے گُلزار ہو گئی ۔

وُہ مُشرک یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا کوئی رفیق نہ ہو اور وہ تنہا رہیں ۔ مگر خدا نے اُنھیں ایسی جمعیت اور کثرت بخشی کہ دُنیا اُن کی نسل سے بھر گئی ۔

اُن کے بعض نزدیک ترین رشتہ دار گم راہ اور بُت پرست تھے ۔ اُن میں سے " آزر " بھی تھا ۔ خدا نے اِس کے عوض اُنھیں ایسے فرزند عطا کیے جو خود ہدایت یافتہ اور دوسروں کے لیے ہادی بھی تھے ۔

حضرت ابراہیمؑ اپنے ابتدائے حال میں مال و دولت نہ رکھتے تھے مگر اللہ نے اُنھیں عظیم مال وجاہ عطا کیا۔

حضرت ابراہیمؑ شروع شروع میں ایک گمنام انسان تھے ۔ یہاں تک کہ بابل کے مُشرک جب اُن کا ذکر کرتے تھے تو کہتے تھے:

Marfat.com

سمعنا فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیم

ہم نے سُنا ہے کہ ایک نوجوان بُتوں کی باتیں کرتا ہے ۔ لوگ اُس کا نام ابراہیم بتاتے ہیں ۔

مگر خدا نے اُن کا نام ایسا روشن کیا اور اُنھیں ایسی شہرت بخشی کہ اُنھیں سردارِ انبیاء اور سردارِ مرسلین کہا جاتا ہے[1]

❖ ❖ ❖

[1] تفسیر فخرالدین رازی ، کچھ فرق کے ساتھ ۔

Marfat.com

۲۸۔ وَلُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ
بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○

۲۹۔ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ
نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا
ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

۳۰۔ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۧ

ترجمہ

۲۸۔ (ہم نے لُوط کو بھیجا) جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بے حیائی کا کام کرتے ہو۔ تم سے پہلے دُنیا میں کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

۲۹۔ کیا تم مردوں کے پیچھے جاتے ہو اور راہ نسلِ انسانی کو قطع کرتے ہو۔ اور اپنی مجلسوں میں بُرے اعمال انجام دیتے ہو۔ مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اگر تو سچا ہے تو ہم پر خدا کا عذاب نازل کر دے۔

۳۰۔ (لُوط نے) کہا، اے میرے رب! تو میری اس مفسد قوم کے مقابلے میں میری مدد کر۔

تفسیر

بے شرم گناہ گار:

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کا مختصر سا واقعہ بیان کرنے کے بعد اُن کے ہم عصر پیغمبر حضرت لُوطؑ کا کچھ قصہ بیان کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: ہم نے لُوط کو مبعوث کیا۔ اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بہت ہی بُرا کام کرتے ہو۔ دُنیا میں کسی نے بھی

Marfat.com

اِس سے پہلے اِس گناہ کا کام نہیں کیا : (ولوطًا اذ قال لقومہٖ انکم لتأتون الفاحشۃ ماسبقکم بھا من احدٍ من العالمین)۔[۱]

"فاحشۃ" کا مادہ "فحش" ہے۔ اِس کے وضعی معنی ہر وہ کام یا بات ہے جو نہایت نازیبا اور ناپسندیدہ ہو۔ اس مقام پر ہم جنسی اور لواطت کے لیے کنایہ ہے۔

"ماسبقکم بھا من احدٍ من العالمین" سے خوب واضح ہوتا ہے کہ یہ گھٹیا اور شرمناک عمل عمومی اور قومی خصلت کی صُورت میں اس سے قبل کسی قوم و ملت میں بھی موجود نہ تھا۔

قومِ لُوط کے حالات میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ اُن کے اس گناہ میں مُبتلا ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ نہایت بخیل تھے۔ چونکہ اُن کے شہر شام کو جانے والے قافلوں کی راہ پر واقع تھے۔ اُنھوں نے بعض راہ گیروں اور مہمانوں کے ساتھ یہ عمل انجام دینے کی وجہ سے اُنھیں اپنے آپ سے متنفر کر دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم جنسی کے میلانات خود اُن ہی میں قوی ہو گئے اور وہ لواطت کی دلدل میں پھنس گئے۔

بہر حال وہ لوگ نہ صرف اپنے گناہوں کا بار اُٹھائیں گے بلکہ اُن کے گناہوں کا بھی جو آئندہ اُن کے عمل کی پیروی کریں گے (اس کے بغیر کہ اُن کے گناہ میں کوئی کمی ہو) کیونکہ جو آدمی بھی کسی گندی اور پلید رسم کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ اپنے مقلّدین کی بداعمالی میں حصہ دار ہوتا ہے اور وہ لوگ اس رسمِ بد کے بانی تھے۔

❊ ❊ ❊

حضرت لُوطؑ نے اِس کے بعد اپنے مقصد کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا اور کہا کہ آیا تم مردوں کے پیچھے جاتے ہو: (ائنکم لتأتون الرجال)۔

اور کیا تم نسلِ انسانی کی بقا کی راہ کو قطع کرتے ہو: (وتقطعون السبیل)۔[۲]

اور کیا تم اپنے اِن مقامات پر جہاں تم جمع ہوتے ہو بُرے اعمال کے مرتکب ہوتے ہو: (وتأتون فی نادیکم المنکر)۔

کلمہ "نادی" کا مادہ "ندا" ہے۔ اس کے معنی ہیں مجلسِ عمومی۔ اور کبھی تفریح گاہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ایسے مقام پر لوگ جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دیتے اور پکارتے ہیں۔

قرآن میں اس کی کوئی تفصیل موجود نہیں کہ وہ اپنی محفلوں میں کون سے بُرے اعمال کا ارتکاب کرتے تھے۔ لیکن بدون اظہار ہی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کچھ ایسے کام تھے جو اُن کی بدکاریوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جیسا کہ بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ وہ آپس میں فحش اور رکیک الفاظ کا ردّ و بدل کرتے تھے۔ ایک دُوسرے کی کمر ٹھونکتے تھے، جوا کھیلتے تھے۔ بچگانہ کھیل کھیلتے تھے۔ بالخصوص ایک

---

[۱] "لُوطًا" ممکن ہے کہ "نوحًا" پر عطف ہو۔ اِس بنا پر "ارسلنا" کا مفعول ہو گا۔ بعض لوگوں نے لُوطًا کو فعلِ مقدر "اذکر" کا مفعول سمجھا ہے۔

[۲] بعض مفسرین نے "تقطعون السبیل" کی تفسیر میں اور بھی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ اُس قوم کی تاریخ پر نظر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس قوم نے قافلوں کا راستہ روک دیا تھا۔ کیونکہ اہلِ کاروان کے لیے اُس قوم کے شر سے بچنے کے لیے سوائے اِس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ غیر معروف راستے سے چلیں تاکہ ان کے ہاتھ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر کی ہے کہ وہ قافلوں کو لوٹتے تھے لیکن ہم نے پہلے جو تفسیر بیان کی وہ مناسب تر ہے۔ کیونکہ تحریمِ لواطت کے مصالح میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نسلِ انسانی کے قطع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

Marfat.com

دوسرے کو اور راہ گیروں کو سنگریزے مارتے تھے۔ آلاتِ موسیقی بجاتے تھے اور سارے مجمع کے سامنے برہنہ ہوجاتے تھے۔[1]

جنابِ رسولِ خداؐ سے ایک حدیث مروی ہے جس کی راوی ام ہانی ہیں کہ جب آپؐ سے " وتأتون فی نادیکم المنکر " کا مفہوم پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

كانوا يخذفون من يمر بهم ويسخرون منه

جو کوئی اُدھر سے گزرتا وہ اسے سنگریزے مارتے تھے اور اُس سے مذاق کرتے تھے۔[2]

اَب اس پر غور کیجئے کہ حضرت لُوطؑ کے پیغامِ حق کے جواب میں اُس گُم راہ اور بے شرم قوم کا کیا جواب تھا؟

قرآن میں یہ ذکر ہے کہ: اُن کے پاس بجز اس کے کوئی جواب نہ تھا۔

اگر تو سچا ہے تو ہمارے لیے خدا کا عذاب لے آ۔ (فما كان جواب قومه الّا ان قالوا ائتنا بعذاب الله ان كنت من الصادقين)۔

اُن ہوس بازوں نے (جو کہ عقل و شعور سے محروم تھے) یہ بات حضرت لُوطؑ کی معقول اور مدلل دعوت کے جواب بطور مذاق کہی تھی۔

اس جواب سے یہ بھی مترشح ہے کہ حضرت لُوطؑ نے مُدلّل باتوں کے علاوہ اُنھیں یہ بھی تنبیہ کی تھی کہ اگر تم اسی باطل روش پر چلتے رہے تو تم پر خدا کا دردناک عذاب نازل ہوگا۔ لیکن اُنھوں نے راہِ ہدایت کی باتوں کو تو چھوڑ دیا اور صرف اِسی آخری بات کا جواب دینے لگے۔ اور وہ بھی استہزا اور تمسخر کے طور پر۔

سورہ قمر کی آیت ۳۶ میں اسی مفہوم کے مانند بیان ہے:

ولقد انذرهم بطشتنا فتماروا بالنذر

لُوط نے اپنی قوم کو ہمارے عذاب سے ڈرایا۔ مگر وہ ڈرانے والوں سے لڑنے لگے۔

اس گُم راہ قوم کا یہ قول یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے، عذاب نازل نہ ہونے کی صُورت میں یہ ثابت کریں کہ حضرت لُوط دروغ گو ہیں۔ حالانکہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ گناہ گار ترین اقوام کو بھی تجدیدِ نظر اور اپنی اصلاح کی مہلت دیتا ہے۔

یہ وہ مقام تھا کہ حضرت لوطؑ بالکل بے بس ہوگئے اور درگاہِ الٰہی میں غم واندوہ سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ عرض کی:

خدایا! تو مجھے اس مفسد قوم پر فتح عنایت فرما۔ (قال رب انصرني على القوم المفسدين)۔

یہ وہ قوم ہے جس نے زمین کو فساد اور تباہی سے بھر دیا ہے۔ اِنھوں نے اخلاق اور تقویٰ کو برباد کر دیا ہے۔ عفت اور پاکدامنی سے مُنہ موڑ لیا ہے۔ عدلِ اجتماعی کو روند ڈالا ہے۔ شرک و بُت پرستی میں فسادِ اخلاق اور ظلم و ستم بھی شامل کر لیا ہے اور نسلِ انسانی کو فنا اور نیستی کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ خدایا! تو ان مفسدین پر مجھے کامیابی عنایت فرما۔

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۲، صفحہ ۵١٧۔

[2] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

ہم جنسی کا رُجحان بدترین لعنت ہے :

ہم جنسی خواہ مردوں کے درمیان ہو (لواطت) یا عورتوں کے (مُساحقہ) وہ اُن بدترین انحرافات اخلاقی میں سے ہے جو معاشرے میں مفاسد کا سرچشمہ ہیں۔

اصولاً قدرت نے زن و مرد کے مزاج کو اِس طرح خلق کیا ہے کہ اُنھیں جنس مخالف سے تعلق پیدا کرنے میں آسودگی اور نفسیاتی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اِس صُورت کے علاوہ انسان میں جو بھی جنسی میلان پیدا ہوتا ہے وہ انسان کی طبع سلیم سے انحراف اور ایک قسم کی نفسیاتی بیماری ہے۔ اگر اس میلان کو روکا نہ جائے تو وہ روز بروز شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی جنس مخالف کی طرف میلانِ خاطر نہیں رہتا اور وہ پھر جنس موافق ہی سے غیر فطری آسودگی حاصل کرنے لگتا ہے۔

اِس قسم کے باہمی نامشروع تعلقات انسان کے نظامِ جسمانی حتیٰ کہ اس کے سِلسلۂ اعصاب اور اس کی نفسیاتی کیفیت کو متاثر کرتے ہیں اور جب یہ میلان عادت بن جاتا ہے تو مرد کو ایک کامل مرد اور عورت کو ایک کامل عورت بننے سے روک دیتا ہے۔ اِس طرح سے کہ اِس قسم کے ہم جنس باز مرد یا عورتیں شدید ضُعف جنسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی اولاد کے لیے اچھے ماں باپ ثابت نہیں ہوتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُن میں تولید نسل کی قابلیّت ہی نہیں رہتی۔

ہم جنسی کے میلان سے لوگوں میں بتدریج یہ نفسیاتی مرض پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خلوت پسند ہو جاتے ہیں، مجمع سے گھبرانے لگتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ اُن میں نفسیاتی تضاد کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں تو مختلف قسم کی جسمانی اور نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے ان ہی اخلاقی اور اجتماعی دلائل کی بناء پر ہم جنسی کو ہر شکل اور ہر صُورت میں حرام کیا ہے اور اُس کے لیے بڑی سخت سزا مقرر کی ہے (جس کی حد کبھی موت تک پہنچتی ہے)۔

اِس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ اِس زمانے کی متمدّن دُنیا کی بے لگامی اور تنوّع طلبی بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں میں نفسیاتی فساد پیدا کر دیتی ہے۔ لڑکوں میں ناموزوں اور زنانہ لباس پہننے اور خُود آرائی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور لڑکیوں میں مردانہ لباس زیب تن کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہیں سے نفسیاتی انحراف اور میلانِ ہم جنسی جنم لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اِس رُجحان اور ایسے قبیح ترین اعمال کو قانونی شکل دے دی جاتی ہے اور اسے ہر قسم کی سزا اور تعقیب سے بَری سمجھتے ہیں ان حالات کی شرح لکھتے ہُوئے قلم کو شرم آتی ہے [1]

❖ ❖ ❖

---

[1] اسلام میں ہم جنس پرستی کی حُرمت اور فلسفۂ حُرمت کے سلسلے میں تفصیلی بحث تفسیر نمونہ کی نویں جلد میں سُورۂ ہُود کی آیت ۸۱ کے ذیل میں کی جا چکی ہے۔

Marfat.com

۳۱۔ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚۖ

۳۲۔ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۫ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۤ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○

۳۳۔ وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۣ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○

۳۴۔ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

۳۵۔ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۳۱۔ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے تو (بیٹے کے تولد کی بشارت دیتے ہوئے) انھوں نے کہا کہ ہم (قوم لوط کی) اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیونکہ اس کے باسی ظالم ہیں۔

۳۲۔ (تو ابراہیم نے) کہا: اس بستی میں تو لوط بھی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ جو لوگ اِس بستی میں رہتے ہیں، ہمیں خوب معلوم ہے۔ ہم اُسے اور اس کے گھر والوں کو بچالیں گے۔ سوائے اُس کی بیوی کے کردہ

Marfat.com

اِس قوم میں باقی رہ جائے گی۔

۳۳۔ اور جب ہمارے فرستادگان لُوط کے پاس آئے تو وہ اُنھیں دیکھ کر غمگین ہو گئے تو اُنھوں نے کہا : ڈرو نہیں اور غم نہ کھاؤ۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچا لیں گے ۔ سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ قوم میں باقی رہ جائے گی۔

۳۴۔ ہم اس بستی کے باسیوں پر اُن کی بدکاری کے باعث آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔

۳۵۔ ہم نے اُس آبادی کی ایک کُھلی ہُوئی نشانی اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دی ہے ۔ جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

تفسیر

گناہ گاروں کا انجام :

آخر کار حضرت لُوطؑ کی دُعا مستجاب ہوئی اور خدا کی طرف سے اس قوم تباہ کار کے خلاف سخت سزا کا حکم صادر ہُوا۔ وہ فرشتے جو عذاب نازل کرنے پر مامور تھے قبل اس کے کہ سرزمین لُوط پر اپنا فرض ادا کرنے کے لیے جاتے، حضرت ابراہیمؑ کے پاس ایک اور پیغام لے کر گئے اور وہ پیغام تھا حضرت ابراہیمؑ کے فرزند کی پیدائش کی خوشخبری زیرِ نظر آیات میں اول فرشتوں کی حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات کا ذکر ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے : جس وقت ہمارے ایلچی حضرت ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر گئے (اُنھیں اسحاق اور یعقوب کے پیدا ہونے کی خوش خبری سُنائی) اور پھر (قوم لُوط کی بستی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے) کہا کہ ہم اس شہر اور اس میں بسنے والوں کو ہلاک کر دیں گے کیونکہ یہ لوگ ظالم ہیں : (ولما جاءت رسلنا ابراهيم بالبشرٰى قالوا انا مهلكوا اهل هٰذه القرية ان اهلها كانوا ظالمين)۔

چونکہ فرشتوں نے " هٰذه القرية " کہا۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم لُوط کی آبادی اُس مقام کے قرب و جوار ہی میں تھی جہاں حضرت ابراہیمؑ رہتے تھے۔

اور اُس قوم کو لفظ " ظالم " سے یاد کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے نفوس پر ظلم کرتے تھے کیونکہ اُنھوں نے شرک . فسادِ اخلاق اور بے عفتی کی راہ اختیار کی تھی ۔ نیز یہ کہ وُہ دُوسروں پر بھی ظلم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُس طرف سے گزرنے والے مُسافروں اور قافلوں پر بھی ستم کرتے تھے۔

ٙ ٙ ٙ

جب حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات سُنی تو اُنھیں حضرت لُوط پیمبرِ خُدا کی فکر ہُوئی اور کہا : اس آبادی میں تو لوط بھی ہے : (قال ان فيها لوطًا)۔ اُس پر کیا گزرے گی ؟

مگر فرشتوں نے فوراً جواب دیا : آپ فکر نہ کریں ہم اُن سب لوگوں سے خُوب واقف ہیں جو اس بستی میں رہتے ہیں : (قالوا نحن اعلم بمن فيها)۔

Marfat.com

ہم اندھا دُھند عذاب نازل نہیں کریں گے۔ ہمارا پروگرام نہایت سنجیدہ اور نپا تُلا ہے۔

فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ ہم لُوط اور اس کے خاندان کو نجات دیں گے۔ بجز اُس کی بیوی کے کہ جو اُس قوم کے ساتھ ہی مُبتلائے عذاب ہوگی۔ (لننجينّه واهله الّا امرأته كانت من الغابرين)۔

اس آیت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اُس علاقے کی تمام آبادیوں اور بستیوں میں صرف ایک ہی خاندان مومن اور پاک نفس تھا اور خُدا نے بھی اسے عذاب سے نجات دی۔ جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیت ۳۶ میں مذکور ہے:

فما وجدنا فيها غير بيتٍ من المسلمين

ہم نے وہاں ایک خاندان کے سوا کوئی بھی مُسلمان نہ پایا۔

یہاں تک کہ حضرت لُوطؑ کی زوجہ بھی مومنین کی صف سے خارج تھی اس لیے وہ بھی عذاب میں محشور ہوئی۔

کلمہ " غابرین " " غابر " کی جمع ہے۔ اس کے وضعی معنی یہ ہیں کہ راہ سفر میں کسی کے رُفقائے کار سفر تو آگے نکل جائیں اور وہ پیچھے رہ جائے۔

وُہ عورت جو خانوادۂ نبوت میں شامل تھی اُسے تو " مؤمنین اور مُسلمین " سے جُدا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر وُہ اپنے کفر و شرک اور بت پرستی کی وجہ سے اس صنف سے جُدا ہوگئی۔

اس طرزِ کلام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عورت منحرف العقیدہ تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ اُس میں یہ بدعقیدگی اُس مشرک معاشرے کے اثر سے پیدا ہوگئی ہو اور ابتدا میں مومن و موحد ہو۔ اس صُورت میں حضرت لُوطؑ پر یہ اعتراض نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے ایسی مُشرکہ سے نکاح ہی کیوں کیا تھا؟

یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اگر کچھ اور لوگ حضرت لُوطؑ پر ایمان لائے ہوں گے تو وہ حتماً نزول عذاب سے پہلے اُس گناہ آلود زمین سے ہجرت کر گئے ہوں گے۔ تنہا حضرت لوطؑ اور اُن کے عیال اُس مقام پر اِس توقع سے اخیر وقت تک ٹھہرے ہوں گے کہ ممکن ہے اُن کی تبلیغ اور ڈرانے کا لوگوں پر اثر ہو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیمؑ کو یہ شک تھا کہ عذاب الٰہی حضرت لوطؑ کو بھی گھیر لے گا؟ اسی لیے تو اُنھوں نے فرشتوں کے سامنے لوطؑ کے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اور اُنھوں نے اطمینان دلایا کہ لُوط اِس بلا سے محفوظ رہیں گے۔

اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جانتے تو سب کچھ تھے مگر اُنھوں نے — صرف اپنے اطمینانِ قلب کے لیے یہ سوال کیا تھا۔ چنانچہ اسی پیغمبر بزرگ کا ایک ایسا ہی اور واقعہ مسئلہ معاد کے متعلق ہے۔ جب کہ خدا نے پرندوں کو زندہ کر کے معاد کا منظر اُن کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

لیکن مفسّر بزرگ علامہ طباطبائی کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا مقصد یہ تھا کہ یہ کہہ کر کہ " لُوط بھی اُن میں ہے " لُوط کے وجود کو اُس قوم سے رفعِ عذاب کی دلیل قرار دیں۔ نیز سورۂ ہُود کی آیت ۷۴-۷۶ سے بھی اِس مطلب کی تائید ہوتی ہے کہ ابراہیمؑ چاہتے تھے کہ اس قوم کی سزا میں تاخیر ہو جائے تو ممکن ہے کہ اُن کے قلوب نُورِ ہدایت سے منوّر ہو جائیں۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کو یہ جواب ملا کہ آپ اس امر میں اصرار نہ کیجیے۔ اُن کی حالت اِس لیت و لعل سے گزر چکی ہے اور اُن کی سزا کا قطعی وقت آگیا ہے۔[1]

[1] المیزان، جلد ۱۶، صفحہ ۱۲۹۔

Marfat.com

لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اِس مقام پر فرشتوں نے حضرت لوطؑ اور اُن کے خاندان کی نجات کے متعلق جو جواب دیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اِن آیات کا موضوعِ سُخن صِرف حضرت لُوط کی ذات ہی تھی لیکن رہیں سُورۂ ہُود کی آیات تو اُن کا مطلب کچھ اور ہی ہے اور جیساکہ ہم نے کہا حضرت ابراہیمؑ نے یہ سوال محض اپنے مزید اطمینان کے لیے کیا تھا۔

❊ ❊ ❊

یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ سے فرشتوں کی گفتگو ختم ہوگئی اور وہ حضرت لوطؑ کے علاقے کی طرف روانہ ہوگئے۔

قرآن میں مذکور ہے کہ جس وقت ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو وہ اُنھیں دیکھ کر غمگین اور پریشان ہوگیا! ولمّآ ان جآءت رُسلنا لوطًا سیٓء بھم وضاق بھم ذرعًا)۔

حضرت لُوطؑ کا یہ اضطراب اس وجہ سے تھا کہ وُہ اُنھیں پہچانتے نہ تھے۔ وہ فرشتے خوبصُورت جوانوں کی صُورت میں آئے تھے اور ایسے آلودہ معاشرہ میں ایسے مہمانوں کا آنا ممکن تھا کہ حضرت لوطؑ کے لیے پریشانی اور اُن مہمانوں کے سامنے ہی بے آبروئی کا باعث ہوتا لہٰذا آپ کو سخت فکر دامن گیر ہوئی کہ دیکھیے اِس گم راہ، بے حیا اور بے شرم قوم کا ان مہمانوں کو دیکھ کر کیا ردِّعمل ہوتا ہے؟

کلمہ "سِیٓءَ" کا مادہ "ساءَ" ہے بہ معنی بدحال ہونا اور "ذرع" کے معنی دل یا خُلق کے ہیں۔ اِس لیے "ضاق بھم ذرعًا" کے معنی ہوں گے کہ حضرت لوطؑ پریشان اور بے چین ہوگئے۔

بعض مفسّرین نے یہ بھی کہا ہے کہ کلمہ "ضاق" کے معنی ہیں: "راستہ طے کرتے وقت اُونٹ کے دو قدموں کا فاصلہ" اور جس وقت اُس کی پُشت پر بھاری بوجھ لدا ہوتا ہے تو اُونٹ کے قدموں کا فاصلہ تنگ تر اور کم تر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا "ضاق ذرعًا" کسی سنگین اور طاقت فرسا واقعے کے لیے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے مگر اِن مہمانوں نے جب حضرت لوطؑ کے اضطراب کو دیکھا تو فوراً اپنا تعارف کروایا اور اُن کی پریشانی کو ختم کر دیا۔

اُنھوں نے کہا کہ آپ نہ تو خوف زدہ ہوں اور نہ غم کریں۔ یہ بے شرم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بہت ہی جلد یہ سب کے سب نابُود ہو جائیں گے۔ ہم آپ کو اور آپ کے خاندان کو بچا لیں گے۔ سوائے آپ کی بیوی کے کہ وہ اِن گناہ گاروں کے درمیان رہے گی اور ہلاک ہو جائے گی: (وقالوا لاتخف ولا تحزن انّا منجّوك واهلك الّا امرأتك كانت من الغابرين)۔

البتہ سُورۂ ہُود کی آیات سے خُوب معلوم ہوتا ہے کہ جب اُس بے شرم قوم کو حضرت لوطؑ کے مہمانوں کا علم ہوا تو بہت جلد اُن کے پاس آئے۔ اُن کا اِرادہ تھا کہ وہ اُن مہمانوں پر دست درازی کریں۔ حضرت لوطؑ (جنھوں نے ابھی فرشتوں کو پہچانا نہ تھا) یہ حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اُنھوں نے ان بے شرموں کو کبھی تو بذریعہ نصیحت، کبھی دھمکی کے ذریعہ اور کبھی اُن کے ضمیر کو اپیل کرتے ہوئے کہ کیا تم میں ایک آدمی بھی راست باز نہیں ہے۔؟ اور کبھی اُن کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ میں تمہارے ساتھ اپنی دُختر کا نکاح کر دوں گا، اُنھیں بُرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بے شرم کسی طرح باز نہ آئے۔ اُن کے پیشِ نظر تو صرف اُن کا بے شرمانہ مقصد تھا۔

لیکن پروردگار کے ایلچیوں نے حضرت لُوطؑ سے اپنا تعارف کروایا اور بطریقِ اعجاز اُن ہجوم آور لوگوں کو اندھا کر دیا۔ اِس طرح اُس عظیم نبیؑ کا دل مطمئن کر دیا۔[1]

---

[1] اس واقعے کی تفصیل جلد ۹ میں سُورہ ہُود کی آیات ۷۷ تا ۸۱ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

Marfat.com

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اُن فرستادگانِ پروردگار نے حضرت لوطؑ سے دو لفظ کہے، ایک تو " نہ ڈرو " دوسرے " غمگین نہ ہو "
دیکھنا یہ ہے کہ ان دو کلمات " خوف اور حُزن " میں کیا فرق ہے۔ تفسیر المیزان میں لکھا ہے کہ :

" خوف " اُس حادثے کا ہوتا ہے جس کے پیش آنے کا احتمال ہو اور " حزن " حادثے کے لازمی ہونے کا ہوتا ہے۔

بعض اہلِ لغت نے خوف اور غم میں یہ فرق کیا ہے کہ " خوف " کا تعلق آئندہ ہونے والے حادثے سے ہے اور غم کا تعلق ایسے حادثے سے ہے جو گزر چکا ہو۔ ان دونوں کلمات کے مفہوم میں یہ احتمال بھی ہے کہ " خوف " خطرناک باتوں کا ہوتا ہے اور " غم " دردناک واقعات کا خواہ اُن میں کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس مقام پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ سُورۂ ہُود کی آیات کا تاثر یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی پریشانی اپنی ذات کے لیے نہ تھی بلکہ اس لیے تھی کہ یہ بدکردار لوگ مہمانوں پر دست درازی کریں گے۔ لیکن فرشتوں نے جو جواب دیا وہ حضرت لوطؑ اور اُن کے خاندان سے متعلق تھا اور ان دونوں باتوں میں ہم آہنگی نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب سورہ ہُود کی آیت ۸۱ سے مل سکتا ہے۔ کیونکہ جب وہ بے شرم لوگ مہمانوں پر دست درازی کرنے آئے تو فرشتوں نے لُوط سے کہا کہ " یہ قوم آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی "۔ یعنی ہم تو ہم ہیں یہ تو تجھے بھی کچھ آزار نہیں پہنچا سکتے۔ اس بنا پر فرشتوں نے اپنے تحفظ کو تو مُسلّم قرار دیا۔ اور حق یہ ہے کہ اُن کا تحفظ مسلم بھی تھا۔ اور اُنھوں نے بشارتِ نجات کو حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان تک محدود کر دیا۔

❁ ❁ ❁

اس کے بعد اُن فرشتوں نے اس وجہ سے کہ اُس بے شرم قوم کے متعلق اُن پر جو فرض عائد کیا گیا تھا اس کی وضاحت کریں، یہ اضافہ کیا : چونکہ یہ قوم نہایت فاسق اور گناہ گار ہے اس وجہ سے ہم اس بستی اور اس کے باسیوں پر آسمان سے عذاب نازل کریں گے : (انا منزلون علیٰ اھل ھٰذہ القریۃ رجزًا من السمآء بما کانوا یفسقون)۔

اس مقام پر " قریۃ " سے مُراد وہی شہر سَدوم اور اُس کے اطراف و جوانب کے شہر اور آبادیاں مُراد ہیں جن میں قومِ لُوط آباد تھی۔ بعض لوگوں نے اُن کی مردم شماری ستر لاکھ لکھی ہے[1]

کلمہ " رجز " سے " عذاب " مُراد ہے۔ " رجز " کے حقیقی معنی اِضطراب کے ہیں۔ مجازاً ہر وہ امر جو موجب اضطراب ہو اُسے رجز کہنے لگے۔ عربوں نے اس کلمہ کے معنی کو وسیع کر لیا اور سخت بلاؤں، طاعون، برف اور ژالہ باری، شیطانی وساوس اور عذاب الٰہی کے معنی میں بولنے لگے۔

جملہ " بما کانوا یفسقون " سے اُن پر دردناک عذاب نازل ہونے کی یہ علت واضح ہوتی ہے کہ وہ فسق اور خدا کی نافرمانی میں مُبتلا تھے۔ اور فعل " یفسقون " جو کہ فعل مضارع ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس گناہ میں مسلسل اور دائمی طور پر مبتلا تھے۔ اس انداز کلام سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ اس گناہ کے مسلسل ارتکاب سے باز آجاتے اور حق پرستی، تقویٰ اور پاکیزگی کی راہ اختیار کر لیتے تو اللہ اُن کے گزشتہ گناہوں کو معاف کر دیتا اور اُن پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا۔

---

[1] رُوح البیان جلد ۶، صفحہ ۴۶۷۔

Marfat.com

اِس مقام پر قرآن شریف میں اُس دردناک عذاب کی نوعیّت کا جو اُس قوم پر نازل ہوا، تفصیلی ذکر نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی فرمایا گیا ہے کہ :

ہم نے اُن آبادیوں کے (ویرانوں، کھنڈرات اور آثار بلادیدہ) کو اُن لوگوں کے لیے جو عقل وفہم سے کام لیتے ہیں باقی رکھا ہے:

(ولقد ترکنا منہا اٰیۃً بیّنۃً لقوم یعقلون)۔

لیکن سُورہ ہُود کی آیت ۸۲ اور سُورۂ اعراف کی آیت ۸۴ میں اُن پر نازل شدہ عذاب کی تشریح کی گئی ہے کہ اوّل تو شدید زلزلے نے اُن کے شہروں کو کلیۃً زیروزبر کر دیا۔ اِس کے بعد اُن پر آسمان سے پتھر برسے۔ اِتنی کثیر مقدار میں کہ اُن کے بدن اور ویران شدہ مکانات و محلات اُن کے نیچے دفن ہو گئے۔

کلمہ "اٰیۃ بیّنۃ" (روشن نشانی) سے اشارہ ہے، شہر سدوم کے باقی ماندہ کھنڈرات کی طرف کہ جو آیات قرآنی کے مطابق حجازی قافلوں کی راہ آمد و رفت میں واقع تھا اور یہ آثار ظہور پیغمبر اسلام کے وقت تک باقی تھے۔ چنانچہ سُورۂ حجر کی آیت ۷۶ میں مذکور ہے:

وانہا لبسبیل مقیم

اُس کے آثار اہل قافلہ کی راہ کے کنارے موجود ہیں۔

اور سورۂ صافات کی آیت ۱۳۷، ۱۳۸ میں یوں آیا ہے :

وانکم لتمرون علیہم مصبحین و باللیل افلا تعقلون

تم صبح وشام اُن مقامات کے قریب سے گزرتے ہو کیا تم غور نہیں کرتے۔

Marfat.com

٣٦۔ وَاِلٰی مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا
الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

٣٧۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝

٣٨۔ وَعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫
وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۝

٣٩۔ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ
مُّوْسٰی بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۝

٤٠۔ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ
وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ
وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

٣٦۔ اور ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو مدین کی طرف بھیجا۔ اُس نے کہا : اے میری قوم ! خدا کی عبادت کرو اور یوم آخرت کی اُمید رکھو اور زمین میں فساد نہ کرو۔

Marfat.com

۳۷۔ مگر اُنھوں نے اُسے جھٹلایا۔ پس اُنھیں زلزلے نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے اور مر گئے۔

۳۸۔ اور ہم نے عاد و ثمود کو بھی ہلاک کر دیا۔ اور اُن کے (ویران شدہ) مکانات تمہارے سامنے موجود ہیں شیطان نے اُن کے اعمال کو اُن کی نظروں میں زینت دی تھی اور اُنھیں راہ سے روک دیا تھا جب کہ وہ دیکھ رہے تھے۔

۳۹۔ ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کر دیا۔ موسٰی اُن کے پاس کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ آئے مگر اُن لوگوں نے اپنے آپ کو بڑا بنایا (اور تکبر کیا) مگر وہ ہم پر سبقت لے جانے والے نہ تھے۔

۴۰۔ ہم نے اُن سب کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ ہم نے اُن میں سے بعض پر سنگریزوں کی بارش کا طوفان بھیجا اور اُن میں سے بعض کو ایک چیخ نے آپکڑا۔ اور بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو (پانی میں) غرق کر دیا اور خدا نے ہرگز ان پر ظلم نہیں کیا۔ یہ تو خود اُنہی نے اپنے اُوپر ظلم کیا تھا۔

تفسیر

ظالموں کے ہر گروہ کی سزا مختلف تھی:

حضرت لوطؑ اور اُن کی قوم کے تذکرے کے بعد دُوسری قوموں کا ذکر آتا ہے مثلاً: قوم شعیب، عاد و ثمود، قارون اور فرعون زیرِ نظر آیات میں ان میں سے ہر ایک کی طرف مختصر اور نتیجہ خیز اشارہ ہے۔

پہلے یہ کہا ہے: ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو مَدین کی طرف بھیجا: (والٰی مدین اخاھم شعیبًا)[1]

حضرت شعیبؑ کو "بھائی" کہا گیا ہے۔ ہم نے اس کے متعلق بارہا کہا ہے کہ اِس کلمہ کی وجہ استعمال یہ ہے کہ ان پیغمبروں کو اپنی اُمتوں سے انتہائی محبت تھی اور وہ اُن پر تفوّق حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نیز یہ کہ ان پیغمبروں کی اپنی قوموں سے رشتہ داری بھی تھی۔

"مَدیَن" اُردن کے جنوب مغرب میں ایک شہر ہے آجکل اُس کا نام "معان" ہے۔ یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق میں ہے۔ حضرت شعیب اور اُن کی قوم وہیں رہتی تھی۔[2]

حضرت شعیبؑ نے تمام پیغمبرانِ بزرگ کی طرح مبدأ و معاد کے اعتقاد سے (جو کہ ہر دین کی اساس ہے) اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ اور کہا: اے میری قوم! تم خدا کی عبادت کرو اور روزِ قیامت کی اُمید رکھو: (فقال یا قوم اعبدوا اللّٰہ وارجوا الیوم الاٰخر)۔

"مبداء" پر ایمان رکھنے سے انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ خدا دائمی طور پر اور مسلسل میرے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے۔

---

[1] یہ جملہ "ولقد ارسلنا نوحًا" کے جملہ اور اس کے بعد کے جملہ پر عطف ہے۔

[2] "مدین" کے متعلق سورہ قصص کی آیت ۲۳ کے ذیل میں تشریح کی گئی ہے۔

Marfat.com

اور معاد پر ایمان رکھنے سے انسان کو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ اُس روز بے کم و کاست میرے جُملہ اعمال کے متعلق بازپُرس ہوگی۔
ان باتوں کا اعتقاد انسان کی اخلاقی تربیت اور اصلاح میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے۔
حضرت شعیبؑ کی تبلیغ کا تیسرا حکم ایسا جامع عملی اصول تھا جس میں تمام معاشرتی اور اجتماعی پروگرام شامل تھے۔ آپؑ نے فرمایا:
زمین پر فساد کرنے کی کوشش مت کرو: (ولا تعثوا فی الارض مفسدین)۔
فساد کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر قسم کی تخریب کاری، ویران گری، راہِ راست سے انحراف اور ظلم شامل ہے۔ اس تصوّر کی ضد "صلاح و اصلاح" ہے کہ جس کے مفہوم میں ہر وہ عمل شامل ہے جو تعمیری اور بنی نوع انسان کی منفعت کے لیے ہو۔
کلمہ "تعثوا" کا مادہ "عثی" ہے۔ جس کے معنی ہیں دُنیا میں فساد برپا کرنا مگر یہ کلمہ زیادہ تر مفاسد اخلاقی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
اسی لیے اس کے بعد کلمہ "مفسدین" کا استعمال بطور تاکید ہے۔

☸ ☸ ☸

مگر قوم شعیب نے اس کے بجائے کہ اُس مصلح بزرگ کی نصائح کو گوشِ دل سے سُنتے، اُلٹی اُن کی تکذیب کرنی شروع کردی: (فکذّبوہ)۔ اُن کی یہ بدعملی اس بات کا سبب ہوئی کہ انھیں شدید زلزلے نے آپکڑا: (فاخذتھم الرجفۃ)۔
اور وہ لوگ اس حادثے سے اپنے گھروں میں اوندھے منہ گر گئے اور مر گئے: (فاصبحوا فی دارھم جاثمین)۔
کلمہ "جاثم" کا مادہ "جثم" ہے (بروزن چشم) اس کے معنی ہیں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھنا۔ اور ایک مقام پر ٹھہرنا۔ کچھ بعید نہیں کہ اس کلمہ کے استعمال کرنے سے یہ مراد ہو کہ جب یہ زلزلہ آیا تو وہ سو رہے تھے۔ جھٹکا محسوس کرکے وہ ناگہانی طور پر اُٹھے جیسے ہی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے تو حادثے نے اُنھیں جان بچانے کی مُہلت نہ دی۔ دیواریں گر پڑیں اور بجلی جو اس زلزلہ مرگ بار کے ساتھ ہی چمک رہی تھی گرتی رہی اور وہ سب لوگ مر گئے۔[1]
اس کے بعد کی آیت میں قوم عاد و ثمود کا ذکر ہے۔ مگر اُن اقوام سے اُن کے پیغام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ قومیں تھیں جنھیں اُس وقت کے مُخاطبینِ قرآن خُوب جانتے تھے۔ نیز یہ کہ قرآن کی دُوسری آیات میں اُن کے پیغمبروں کا ذکر مکرر آیا ہے۔
خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے عاد و ثمود کی قوموں کو ہلاک کر دیا: (وعادًا وثمودًا)۔[2]
اس کے بعد یہ اضافہ ہے کہ اُن اقوام کی بستیوں اور اُن کے مقامات کو تم خوب جانتے ہو (اُن کے شہروں کے ویرانے سرزمین حجر اور یمن میں تمہاری راہوں کے کنارے واقع ہیں) (وقد تبیّن لکم من مساکنھم)۔
تم ہر سال اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ یمن اور مُلکِ شام کی طرف سفر کرتے ہو۔ سرزمینِ "حجر" سے جو کہ جزیرۃ العرب کے شمال میں ہے اور احقاف سے جو کہ یمن کے قریب بجانب جنوب ہے گزرتے ہو اور عاد و ثمود کے شہروں کے کھنڈرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ پس تم ان کے انجام سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟

---

[1] قوم شعیبؑ کی تباہی کا دردناک حال تفصیلاً سورۂ ھُود کی آیات ۸۴ تا ۹۵، جلد نہم میں آیا ہے۔

[2] "عادًا و ثمودًا" فعل "اھلکنا" کا مفعول ہے جو کہ مقدر ہے۔ یہ بات آیت ماقبل سے سمجھ میں آتی ہے۔ بعض مفسرین نے اسے (اذکر) کا مفعول سمجھا ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد اُن اقوام کی اصل بدبختی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شیطان نے اُن کے اعمال کو اُن کی نظروں میں مزین کر دیا تھا اور انجام کار اُنھیں راہِ حق اختیار کرنے سے روک دیا تھا: (و زيّن لهم الشيطان اعمالهم فصدهم عن السبيل) ۔

حالانکہ وہ اقوام چشمِ بینا اور عقل و خرد رکھتی تھیں اور توحید و تقویٰ اُن کی فطرت میں تھا اور پیامبرانِ الٰہی نے بھی اُنھیں اچھی طرح راہِ راست کی طرف رہبری کی تھی: (و كانوا مستبصرين) ۔

بعض مفسرین نے " وكانوا مستبصرين " کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ وہ اقوام چشمِ بینا اور عقل و فہم رکھتی تھیں ۔ بعض نے خیال کیا ہے کہ وہ فطرتِ سلیم کی مالک تھیں ۔ بعض نے یہ معنی سمجھے ہیں کہ اُنھیں پیغمبروں کی رہنمائی میسر آئی تھی ۔

اگر اس آیت سے مذکورہ تمام معانی اخذ کیے جائیں تو کوئی امر مانع نہیں ہے ۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ قطعی جاہل نہ تھے بلکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حق کیا ہے ۔ اُن کا وجدان بیدار تھا، عقل و خرد سے بھی وہ بہرہ مند تھے اور پیمبرانِ الٰہی اُن پر اتمامِ حجت کر چکے تھے ۔ لیکن ــــ ان تمام باتوں کے باوجود اُنھوں نے عقل اور ضمیر کی آواز کی طرف سے کان بند کر لیے اور انبیاء کی دعوت سے منہ موڑ لیا اور شیطانی وساوس کی پیروی کرنے لگے ۔ اور روز بروز اُنھیں اپنے غلط اعمال زیبا تر نظر آنے لگے ۔ یہاں تک کہ وہ عصیان کی اُس منزل پر پہنچ گئے جہاں سے لوٹنا ناممکن ہوگیا ۔

اَب قانونِ فطرت نے اِن بے بار و بے ثمر خشک لکڑیوں کو پھونک دیا ۔ ہر وہ درخت جو پھل نہیں لاتا اُس کی سزا یہی ہے

⁂ ⁂ ⁂

اس کے بعد کی آیت میں اُن تین نافرمانوں کا ذکر ہے جن میں سے ہر ایک شیطانی طاقت کا واضح نمونہ تھا ۔ وہ تھے قارون ، فرعون اور ہامان ۔ فرمایا گیا ہے : ہم نے قارون ، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کر دیا : (و قارون و فرعون و هامان)[1]

قارون اُس ثروت کا مظہر ہے جس میں غرور ، غفلت اور خودغرضی بھی پائی جاتی تھی ۔

فرعون ایسی متکبرانہ طاقت کا مظہر ہے جس میں شیطنت آمیختہ تھی اور ہارون متکبر ظالموں کی معاونت کا نمونہ ہے ۔

اُس کے بعد مذکور ہے کہ : موسٰی اِن تینوں کے پاس روشن دلائل لے کر آئے اور اُن پر اتمامِ حجت کی : (و لقد جاءهم موسٰى بالبينات) ۔

مگر اُنھوں نے زمین پر غرور ، تکبر اور سرکشی کی راہ اختیار کی : (فاستكبروا في الارض) ۔

قارون اپنی دولت ، خزانوں ، علم و ہنر پر بھروسا کرتا تھا ۔

فرعون و ہامان اپنے لشکر ، فوجی طاقت ، اور جاہل عوام میں اپنے پروپیگنڈے پر بھروسا کرتے تھے ۔

مگر وہ لوگ ان اسبابِ ظاہری کے باوجود خُدا پر سبقت نہ لے جا سکے اور اُس کی قدرت کے پنجے سے نکل کے کہیں فرار نہ کر سکے : (وما كانوا سابقين) ۔

---

[1] یہ تینوں کلمات بھی فعل مقدر " اهلكنا " کا مفعول ہیں ۔ جیسا کہ گزشتہ آیات سے معلوم ہوتا ہے ۔ بعض نے انھیں فعل " اذكر " کا مفعول سمجھا ہے ۔

Marfat.com

خدا نے اسی زمین کو قارون کو فنا کرنے کا حکم دیا جو اس کے آرام و راحت کا گہوارہ تھی اور فرعون اور ہامان کو نابود کرنے کا حکم اُس پانی کو دیا جو انسان کے لیے سبب حیات ہے۔

خدا نے اِن سرکشوں کو نابود کرنے کے لیے زمین و آسمان کے لشکر جمع نہیں کیے بلکہ اُن ہی چیزوں کو جو اُن کی بقائے حیات کا مُوجب تھیں اُنھیں نیست کرنے پر مقرر کر دیا۔[1]

"سابقین" جمع ہے "سابق" کی۔ اس کا معنی ہے وہ آدمی جو کسی سے آگے بڑھ کر پیش قدمی اختیار کرے۔ اگر خدا یہ فرماتا ہے کہ "وہ لوگ آگے نہ بڑھ سکے" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی پُوری اِمکانی طاقت کے باوجود خدا کے دائرۂ قدرت سے باہر نکل سکے اور خدا کے عذاب سے نہ بچ سکے بلکہ جیسے ہی خدا نے ارادہ کیا اُسی وقت اُنھیں نہایت ذلت و رُسوائی کے ساتھ دیارِ عدم کو بھیج دیا۔

جیسا کہ خدا اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے: ہم نے اُن میں سے ہر ایک کو اُس کے گناہ کی پاداش میں پکڑ لیا: (فکلاً اخذنا بذنبه)۔

چونکہ ما قبل کی دو آیات میں چار قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا تھا مگر اُن کی سزاؤں کا ذکر نہ تھا۔ وہ تھے "قوم عاد و ثمود، قارون، فرعون اور ہامان"۔ اس لیے اس آیت کے اخیر میں بالترتیب ان کی سزاؤں کا ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: ہم نے اُن میں سے بعض پر شدید تباہ کُن طوفان سنگریزوں کے ساتھ بھیجا (فمنهم من ارسلنا عليه حاصبًا)۔

"حاصب" کا معنی وہ طوفان ہے جس میں سنگریزوں کی بارش ہو۔ "حصباء" کے معنی ہیں سنگریزہ۔

اس گروہ سے قوم عاد مُراد ہے۔ سورہ ذاریات، سورہ حاقہ اور سورہ قمر کے مطابق اُن پر سات روز اور آٹھ راتوں تک شدید تباہ کُن طوفان مُسلّط رہا۔ اُس طوفان نے اُن کے گھروں کو بالکل کھنڈر کر دیا اور اُن کے جسموں کو پت جھڑ کے پتوں کی طرح پراگندہ کر دیا۔ (حاقہ ۵ تا ۷)

اُن میں سے دُوسروں کو آسمانی کڑک نے گھیر لیا: (ومنهم من اخذته الصيحة)۔

ہم نے کہا ہے کہ صیحہ آسمانی بجلی کا وہ کوندا ہے جس کے ساتھ ہی زمین میں زلزلہ آ جاتا ہے۔

یہ وہ عذاب تھا جو قوم ثمود اور بعض دیگر اقوام پر نازل ہوا۔

جیسا کہ خدا سورہ ہُود کی آیت ۶۷ میں فرماتا ہے:

واخذ الذين ظلموا الصيحة فاصبحوا في ديارهم جاثمين

اور ہم نے اُن میں سے بعض کو زمین میں غرق کر دیا: (ومنهم من خسفنا به الارض)۔

یہ وہ سزا تھی جو بنی اسرائیل کے مغرور و متکبر قارون کو دی گئی تھی جس کا سُورہ قصص کی آیت ۸۱ میں ذکر گزر چکا ہے۔

آخر کار اُن میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا: (ومنهم من اغرقنا)۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ فرعون و ہامان اور اُن کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کا قرآن کی مختلف سُورتوں میں ذکر آیا ہے۔

بہرکیف اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ چار قسم کی سزائیں چار ہی قسم کے لوگوں کو دی گئی تھیں جن کی گمراہی، گناہوں اور

---

[1] قارون کی زندگی کے حالات سورہ قصص کی آیتوں ۷۶ تا ۸۱ میں مفصل ذکر ہو چکے ہیں۔ اور فرعون اور اُس کے ساتھیوں کی ہلاکت کا واقعہ سورۂ قصص کی تفسیر میں اسی جلد میں اور سورہ اعراف کی تفسیر، جلد ششم میں بیان کیا جا چکا ہے۔

Marfat.com

انحراف کا گزشتہ دو آیات میں ذکر آچکا ہے۔ مگر اُس مقام پر اُن کی سزاؤں کا ذکر نہیں تھا۔

لیکن ـــ بعض مفسرین نے اِس مقام پر جو یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ اِن سزاؤں میں دُوسری اقوام بھی شامل ہو سکتی ہیں (مثلاً: کلمہ "غرق" میں قومِ نوح بھی شامل ہے اور قومِ لُوط پر بھی سنگ باری ہوئی تھی)۔ اُن مفسرین کا یہ خیال حقیقت سے بہت بعید ہے۔ کیونکہ قرآن میں جس مقام پر اُن کا حال بیان کیا گیا ہے، وہیں اُن کی سزاؤں کا ذکر بھی ہے۔ تو پھر سزاؤں کے ذکر کی تکرار کی ضرورت نہ تھی۔ زیرِنظر سلسلۂ آیات میں جس چیز کا ذکر نہ تھا وہ اِن چار گروہوں کی سزائیں ہیں۔ جنہیں آخری دو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

آیت کے آخیر میں اِس حقیقت کی تاکید کے لیے کہ یہ لوگ اپنے ہی اعمالِ سیئہ کے ردِّعمل کے طور پر اِن عذابوں میں مبتلا ہوئے۔ اور اُنھوں نے جو بیج بویا تھا اُس کی فصل کاٹی۔ خدا فرماتا ہے: خدا نے ہرگز اُن پر ظلم و ستم نہیں کیا۔ بلکہ اِن لوگوں نے خُود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا تھا: (وماكان الله ليظلمهم ولكن كانوا انفسهم يظلمون)۔

گناہ گاروں کو خواہ اِس دُنیا میں سزا دی جائے یا اُس دُنیا میں، درحقیقت وہ اُن ہی کے گناہوں کا ردِّعمل ہوگا اور اُس مقام پر جہاں اصلاحِ احوال اور بازگشت کی تمام راہیں اُن پر بند ہو جائیں گی وہ بداعمالیاں اُن کے سامنے مجسّم ہو جائیں گی۔

خُدا اِس سے کہیں زیادہ عادل ہے کہ وہ اِنسانوں پر حقیر سے حقیر ترین ظلم بھی روا رکھے۔

قرآن کی دیگر متعدد آیات کی طرح اس آیت سے بھی انسان کی آزادیٔ ارادہ اور آزادیٔ اختیار ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فیصلۂ عمل خود انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور اُسے آزاد ہی دیکھنا چاہتا ہے۔

اِس بنا پر جو لوگ کہ "جبر" کے معتقد ہیں (افسوس ہے کہ مُسلمانوں میں بھی اِس عقیدے کے لوگ موجود ہیں) قرآن کے اِس توانا استدلال سے اُن کا عقیدہ باطل ٹھہرتا ہے۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۴۱۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ
الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۚ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

۴۲۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

۴۳۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ○

۴۴۔ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۴۱۔ جن لوگوں نے خُدا کے سوا دُوسروں کو اپنے اولیا بنا رکھا ہے وہ مکڑیوں کی مانند ہیں کہ وہ بھی اپنے لیے گھر بناتی ہیں اور مکڑی کا گھر کمزور ترین گھر ہے۔ کاش کہ وہ لوگ اِس بات کو سمجھتے۔

۴۲۔ اور وہ لوگ خدا کے علاوہ جسے بھی پکارتے ہیں خُدا اُسے جانتا ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۴۳۔ ہم لوگوں کے سمجھانے کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور اہلِ علم کے سوا کوئی انھیں نہیں سمجھتا۔

۴۴۔ خُدا نے آسمانوں اور زمین کو حق پر پیدا کیا ہے یقیناً اہلِ ایمان کے لیے اِن میں نشانیاں ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

مکڑی کے جالے کی مانند کمزور اُمید گاہیں :

گزشتہ آیات میں مُفسد ، مُستکبر ، ہٹ دھرم اور نا انصاف ظالم مشرکین کے حالات بیان ہوئے ہیں ۔ زیر بحث آیات میں اسی مناسبت سے ایک قابلِ توجہ اور ناطق مثال اُن لوگوں کے لیے ہے جو غیر خدا کو اپنا معبود اور ولی قرار دیتے ہیں ۔ ہم اس مثال پر جتنا بھی غور کریں اتنے ہی زیادہ نکات ہماری سمجھ میں آتے ہیں ۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے : جو لوگ غیر خدا کو اپنا معبُود اور ولی بناتے ہیں وہ مکڑی کی مانند ہیں جو اپنے لیے جالا تنتی ہے ۔ جب کہ مکڑی کا گھر سب سے کمزور گھر ہوتا ہے ۔ اے کاش وہ یہ جانتے ! (مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیآء کمثل العنکبوت اتخذت بیتًا وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون) ۔

سُبحان اللہ! یہ کیسی رسا اور جاذب مثال اور کیسی دقیق اور ناطق تشبیہ ہے ۔ ذرا غور کیجئے کہ ہر حیوان اور ہر کیڑا مکوڑا اپنے لیے گھر یا آشیانہ بناتا ہے ۔ مگر ان میں سے کسی کا گھر بھی مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور نہیں ہوتا ۔

اصولاً مکان ایسا ہونا چاہیئے جس میں دیواریں ، چھت اور دروازہ ہو جو اپنے مکین کی حوادث اور موسموں کے تغیرات سے حفاظت کرے ۔ اُس کی غذا ، خوراک اور دُنیاوی ضرورت کی چیزیں اُس میں محفوظ رہیں ۔ بعض عمارتوں کی چھت نہیں ہوتی ۔ مگر کم از کم دیواریں تو ہوتی ہیں ۔ یا اگر دیواریں نہیں تو چھت ہوتی ہے ۔ لیکن مکڑی کے جالے میں جو نہایت ہی نازک تاروں سے بنایا ہوا ہوتا ہے نہ دیوار ہوتی ہے نہ چھت ، نہ صحن ، نہ دروازہ ۔ یہ چیزیں تو رہیں ایک طرف ، دوسری طرف دیکھیئے تو اُس کی ساخت کا میٹریل اس قدر کمزور اور ناپائیدار ہوتا ہے کہ وہ کسی حادثے کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا ۔ اگر نرم رفتار ہوا بھی چلے تو اُس کے تانے بانے کو درہم برہم کر دے ۔ اگر اُس پر بارش کے چند قطرے گر جائیں تو اُسے برباد کر دیں ۔ اگر آگ کے معمولی سے شعلے کی گرمی بھی پہنچے تو اُسے نابود کر دے حتیٰ کہ اگر اُس پر گرد و غبار بھی بیٹھ جائے تو بھی پارہ پارہ ہو کر مکان کی چھت سے لٹک جاتا ہے ۔

اِس گروہ کے باطل معبُودوں کا بھی یہی حال ہے ۔ یہ نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان ، نہ کسی مشکل کو حل کر سکتے ہیں اور نہ مصیبت کے وقت کسی کی پناہ گاہ بن سکتے ہیں ۔

ہاں — یہ ٹھیک ہے کہ یہ گھر دراز پا مکڑی کے لیے مرکزِ استراحت بھی ہے اور اس کے حصولِ غذا کے لیے حشرات کو شکار کرنے کا جال بھی ہے ۔

لیکن اگر اُس کا دُوسرے حیوانات اور حشرات کے گھروں سے مقابلہ کیا جائے تو نہایت کمزور اور ناپائیدار ہے ۔

جن لوگوں نے خُدا کے علاوہ کسی غیر کو اپنا معبُود قرار دیا ہے ، اُن کا بھروسہ بھی تارِ عنکبوت پر ہے ۔ مثلاً : فرعونوں کے تخت و تاج ، قارونوں کا بے شمار مال و زر ، بادشاہوں کے خزانے اور محلات ۔ یہ سب تارہائے عنکبوت ہیں اور یہ سب اسباب نمائش طوفانِ حوادث کے مقابلے میں — ناپائیدار ۔ ضعیف ، ناقابلِ اعتماد اور فنا پذیر ہیں ۔

Marfat.com

تاریخ کے انقلابات ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ درحقیقت انسان اُن میں سے کسی چیز پر بھی بھروسہ نہیں کرسکتا۔
لیکن ـــــ جن لوگوں نے ایمان اور خدا پر توکّل کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہے۔ حقیقت میں اُن کا تکیہ مضبوط دیوار پر ہے۔

☫ ☫ ☫

اِس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ باوجودیکہ مکڑی کا جالا اور اُس کے تار کمزوری کے لیے ضرب المثل ہیں۔ لیکن وُہ عجائب آفرینش میں سے بھی ہے۔ اگر انسان اُس پر غور کرے تو وہ خالقِ حقیقی کی عظمت سے اور بھی زیادہ آشنا ہوجائے۔
مکڑی کے تار ایک چپکنے والے مادہ سے بنائے جاتے ہیں۔ یہ مادہ مکڑی کے پیٹ کے نیچے سُوئی کے ناکے کے برابر نہایت چھوٹے چھوٹے خلیوں میں ہوتا ہے۔ اُس کی ساخت ایک خاص ترکیب سے ہوتی ہے کہ وہ ہوا لگتے ہی سخت ہو جاتا ہے۔
مکڑی اِس مادے کو اپنی خاص طرح کی اُنگلیوں سے اُن خلیوں میں سے باہر نکالتی ہے اور اُس سے اپنا جالا بناتی ہے۔
علم الحیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ ہر مکڑی اِس قلیل ترین مائع مادہ سے پانچ سو میٹر تار بناسکتی ہے۔
بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مکڑی کا تار اپنی غیر معمولی نزاکت کی وجہ سے کمزور ہوتا ہے وگرنہ اگر اتنا ہی باریک تار فولاد کا ہو تو اُس سے مضبوط تر ہو۔
عجیب بات یہ ہے کہ مکڑی کے جالے کا ہر تار، چار تاروں سے مِل کر بنا ہوتا ہے۔ پھر اُن چار تاروں میں سے ہر تار ایک ہزار تاروں سے مِل کر بنا ہوتا ہے۔ جن میں سے ہر تار اُس کے بدن کے نہایت چھوٹے سے سُوراخ میں سے نکلتا ہے۔ غور طلب یہ امر ہے کہ اِن بافتوں کا ہر فرعی تار کس قدر باریک، لطیف اور نازک ہوتا ہوگا۔
مکڑی کے جالے کی ساخت میں جو میٹریل استعمال ہوتا ہے، اُس کے عجیب ہونے کے علاوہ اُس کی ساخت اور اور مہندسی شکل بھی قابلِ توجہ ہے۔ اگر ہم کسی مکڑی کے سالم گھر کو غور سے دیکھیں تو اِن ہی نازک تاروں میں ہمیں آفتابِ درخشاں کی طرح کا ایک دلچسپ منظر نظر آئے گا۔ البتہ مکڑی کے لیے یہ گھر نہایت مناسب اور آئیڈیل ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس سے زیادہ کمزور مکان کا تصور بھی نہیں ہوسکتا اور وہ معبود بھی جن کی خدا کے علاوہ پرستش کی جاتی ہے ایسے ہی ہیں۔
اِس چھوٹی سی مخلوق کی تخلیق میں قدرتِ الٰہی کی عظمت اُس وقت اور بھی زیادہ آشکار ہوتی ہے، جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ مکڑی صرف ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض ماہرین علم الحیات کا دعویٰ ہے کہ اب تک بیس ہزار قسم کی مکڑیاں پائی گئی ہیں اور اُن میں سے ہر نوع کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔
آیت میں " اصنام " (بتوں) کے بجائے کلمہ " اولیاء " (جمع " ولی ") استعمال ہوا ہے۔ شاید اس کلمے کے استعمال میں یہ حکمت ہے کہ نہ صرف انسان کے خود ساختہ معبود (بُت) بلکہ خدا کے مقرر شدہ پیشوا اور رہبر کو چھوڑ کر جسے بھی پیشوا اور رہبر بنایا جائے وہ سب اسی حکم میں شامل ہیں۔
جُملہ " لوکانوا یعلمون " (اگر وہ جانتے ہوں)، آیت کے اخیر میں آیا ہے۔ اس کا تعلق نہ تو باطل معبودوں سے ہے اور نہ خانۂ عنکبوت کی کمزوری سے۔ کیونکہ اُس کی کمزوری کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ اس بنا پر اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ

Marfat.com

اگر وہ لوگ اپنے باطل معبودوں اور اُن ہستیوں کی جن پر وہ تکیہ کرتے ہیں ناپائیداری اور بے بقائی کو سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ یہ سب اپنے ضعف اور عدم قدرت میں تارِ عنکبوت کی مانند ہیں ۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد کی آیت میں غافل اور بے خبر مشرکین کو تہدید آمیز تنبیہ کی گئی ہے ۔ چنانچہ کہا گیا ہے : خدا ہر اُس شے کو جسے وہ خدا کے علاوہ پکارتے ہیں جانتا ہے : (ان اللہ یعلم مایدعون من دونہ من شیء) ۔

اُن کا شرکِ جلی ہو یا شرکِ خفی کوئی بھی خدا سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ وہی خدا قادرِ مطلق ، لازوال اور حکیم علی الاطلاق ہے ۔ (وھو العزیز الحکیم) ۔

اگر خدا نے اُن کفار کو مہلت دے رکھی ہے تو اُس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اِن کے اعمال کو جانتا نہیں یا اُس کی قدرت محدود ہے بلکہ یہ اُس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ اُنھیں کافی مہلت دے تاکہ اِن سب پر اتمامِ حجت ہو جائے ۔ اور اُن میں سے جن افراد میں ہدایت پانے کی صلاحیت ہے وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں ۔

بعض مفسرین نے اِس جملے کو مشرکین کے اِن بہانوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو وہ اپنی بُت پرستی کے لیے تراشتے رہتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ :- ہم اِن بتوں کی پرستش اِن کی وجہ سے نہیں کرتے ۔ بلکہ درحقیقت بُت تو آسمان کے ستاروں ، پیمبروں اور فرشتوں کے مظہر اور علامات ہیں اور سجدہ کرتے وقت ہمارے تصور میں تو وہی ہستیاں ہوتی ہیں ۔ یہ تو ہم انہی کے احترام میں کرتے ہیں اور ہمارا سُود و زیاں بھی اُن ہی کے اختیار میں ہے ۔

مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ تم جن ذاتوں کو پکارتے ہو خدا اُنھیں خوب جانتا ہے ۔ خواہ وہ کچھ بھی ہوں ۔ مگر خدا کے حکم اور قدرت کے مقابلہ میں تارِ عنکبوت کی مانند ہیں ۔ اُن کے پاس تمھیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے ۔

٭ ٭ ٭

زیرِ نظر آیات میں سے تیسری آیت دشمنانِ پیغمبر کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ اِس قسم کی مثالوں پر کیا کرتے تھے ۔ وہ کہتے تھے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا جو زمین و آسمان کا خالق ہے ، مکڑی ، مکھی اور اسی طرح کے حشرات کی مثالیں دے ۔

قرآن میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور اہلِ علم کے سوا اُنھیں کوئی نہیں سمجھتا : (وتلک الامثال نضربھا للناس وما یعقلھا الا العالمون) ۔

کسی مثال کی اہمیت یا لطافت اُس کے عظیم یا حقیر ہونے میں نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے مقصود پر کس طرح منطبق ہوتی ہے ۔ بعض اوقات حقیر سی مثال سے اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں ۔

بطورِ مثال ـــــ جس وقت کمزور اور بے اساس سہاروں کی بابت گفتگو ہو تو اُس وقت مثال کے لیے "تارِ عنکبوت" کا انتخاب عینِ فصاحت و بلاغت ہے ۔ کیونکہ یہ مثال اُس بے اساس و ناپائیدار سہارے کو بہترین انداز سے واضح کرتی ہے ۔

اِسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اہلِ علم ہی قرآن میں بیان کردہ مثالوں کی لطافت و نزاکت کا ادراک کرتے ہیں ۔

٭ ٭ ٭

Marfat.com

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ : خُدا نے آسمان اور زمین کو حق پر خلق کیا ہے۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لیے عظیم نشانی ہے ۔ (خلق اللّٰہ السّمٰوات والارض بالحق انّ فی ذٰلک لاٰیۃ للمؤمنین) ۔

خُدا کا کوئی کام بھی باطل اور عبث نہیں ہے۔ اگر خدا کسی وقت مکڑی اور اُس کے کمزور اور بے بُنیاد گھر کی مثال دیتا ہے تو درُست ہے اور اگر وہ مثال کے لیے کسی حقیر سے وجُود کا انتخاب کرتا ہے تو حق کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ وگرنہ اُس کے لیے کسی بڑی چیز کی مثال کو اختیار کرنا کونسا مُشکل تھا کیونکہ وہ تو عظیم کہکشاؤں اور نظامہائے آسمانی کا خالق ہے۔

یہ اَمر بھی قابلِ غور ہے کہ ان چند آیات کے آخیر میں آیاتِ الٰہی کے ادراک کا معیار علم و ایمان کو قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے کہ " لو کانوا یعلمون " (اگر وہ جانتے) دُوسری جگہ فرماتا ہے : " ما یعقلھا الّا العالمون " (ان مثالوں کی نزاکت کا بجز عالمان آگاہ کے کوئی ادراک نہیں کر سکتا) ۔

اِس آخری آیت میں فرماتا ہے :" انّ فی ذٰلک لاٰیۃ للمؤمنین "

اس میں اہلِ ایمان کے لیے بڑی نشانی ہے۔

اِن تمام معیارات سے مُراد یہ ہے کہ حق تو جمال آفتاب کی طرح روشن ہے مگر اہل اور بیدار دل ہی اُس کی کرنوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہ قلوب جو آگاہ ہیں اور جستجوئے حق رکھتے ہیں۔ حق کو قبول کرنے کے لیے بیدار رُوح اور قلبِ سلیم کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کور دل مُشرک جمالِ حق کو نہیں دیکھتے تو اِس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ مخفی ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ وُہ بصیرت سے عاری ہیں۔

٭ ٭ ٭

Marfat.com

۴۵۔ اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ ○

ترجمہ

۴۵۔ کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے پڑھا کرو اور نماز قائم کرو کیونکہ نماز فحشات اور منکرات سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بڑا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خُدا اُسے جانتا ہے۔

تفسیر

نماز اعمالِ قبیح سے روکتی ہے:

پیمبرانِ اُولوالعزم اور اقوامِ گزشتہ کی سرگزشت کے حصّے، اور اِن رہبرانِ الٰہی سے اُن کا نامناسب و ناسزا سلوک اور اُن اقوام کی زندگی کے غم انگیز انجام کے بعد، خداوندِ عالم کا رُوئے سُخن بجانب پیمبرِ اسلامؐ اُن کی دل جوئی، تسلّی خاطر، تقویت رُوح اور اُنھیں ایک نئی اور جامع دستور العمل دینے کے لیے مُنعطف ہوتا ہے۔ اُنھیں دو حُکم دیئے گئے ہیں:

اوّل یہ کہ: کتابِ الٰہی کا جتنا حصّہ تمھیں وحی کیا گیا ہے اُس کی تلاوت کرو۔ (اُتل ماآوحی الیك من الکتاب)۔

تم اِن آیات کو پڑھو کیونکہ تم جو چاہتے ہو وہ اِن میں ہے۔ علم و حکمت، نصیحت، معیارِ شناختِ حق و باطل، وسیلہ تنویرِ رُوح و قلب اور ہر گروہ اور ہر جماعت کے لیے زندگی کا پروگرام اِن آیات میں موجود ہے۔ تم ان آیات کو پڑھو اور اُن پر عمل کرو۔ اُنھیں پڑھو اور اُن سے ہدایت حاصل کرو، پڑھو اور اُن کی تلاوت سے اپنا قلب روشن کرو۔

پہلے حکم کے بعد جس میں تعلیم کا پہلو ہے۔ دُوسرا حکم یہ ہے کہ: نماز قائم کرو۔ (واقم الصّلٰوۃ)۔

اِس کے بعد نماز کے عظیم فوائد کا ذکر ہوا ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ نماز انسان کو اعمالِ فحش اور منکرات سے باز رکھتی ہے، (ان الصّلٰوۃ تنھٰی عن الفحشآء والمنکر)[1]

چونکہ نماز کی خُوبی ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو مبدأ و معاد کی یاد دلاتی ہے جو کہ کج روی سے بچے رہنے کا قوی ترین سبب ہے۔

---

[1] "فحشآء" اور "منکر" کا فرق جلد ۱۱ میں سورہ نحل کی آیت ۹۰ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ "فحشاء" سے مراد مخفی گناہانِ کبیرہ ہیں اور منکر آشکار اگناہانِ کبیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ یا "فحشا" وہ گناہ ہیں جو قوائے شہویہ کے تحت کیے جائیں اور منکر وہ گناہ ہے جو قوّتِ عقلیہ کے تحت کیا جائے۔

Marfat.com

اس لیے وہ اُسے اعمالِ فحش اور منکرات سے باز رکھتی ہے۔
جب کوئی آدمی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو ــــ تکبیر کہتا ہے۔ یعنی خدا کے ہر شے سے برتر و بالا ہونے کا اقرار کرتا ہے اُس کی نعمتوں کو یاد کرتا ہے، اُس کی حمد و ثنا کرتا ہے، اُس کی رحمانیت اور رحیمیت کی تعریف کرتا ہے، روزِ جزا کو یاد کرتا ہے، اُس کی بندگی کا اعتراف کرتا ہے، اُس سے صراطِ مستقیم کی ہدایت کا خواستگار ہوتا ہے اور گمراہوں اور مغضوب لوگوں کی پیروی سے خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ (مضمون سورہ حمد)
بدونِ شک ایسے انسان کے قلب اور رُوح میں جو پابندِ صلوٰۃ ہو قبولِ حق کی تحریک، پاکیزگی کا خیال اور تقویٰ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے آدمی رکوع کرتا ہے اور اپنے خالق کے حضور پیشانی خاک پر رکھتا ہے اور اُس کی عظمت کے تصور میں ڈوب جاتا ہے، تو اُس کے دِل سے خود غرضی اور تکبّر کے جذبات محو ہو جاتے ہیں۔
وہ توحیدِ الٰہی کی شہادت دیتا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کا اقرار کرتا ہے۔ اِس حالت میں وہ جنابِ رسالت مآبؐ پر دُرود بھیجتا ہے اور خدا کے حضور میں دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتا ہے کہ وہ اُسے صالح بندوں میں شمار کرے۔ (تشہد و سلام)
یہ تمام امور پابندِ صلوٰۃ انسان کے نفس میں رُوحانی لہریں پیدا کر دیتے ہیں اور اُس کی قوّتِ رُوحانی گناہ کے مقابلے میں مستحکم دیوار بن جاتی ہے۔
اس عمل کی شب و روز میں چند بار تکرار ہوتی ہے۔ چنانچہ جب انسان صبح کو نیند سے بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی یاد میں غرق ہو جاتا ہے۔ وسطِ روز میں جس وقت آدمی دُنیاوی کاروبار میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں مؤذن کی صدائے تکبیر سُنتا ہے تو اپنی مصروفیات کو چھوڑ کر درگاہِ الٰہی کی طرف رُخ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ دن کے ختم ہونے اور رات کے شروع ہوتے وقت اپنے بسترِ استراحت پر جانے سے پہلے بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہو کر اپنے دل کو مرکزِ انوار بناتا ہے۔
علاوہ بریں جس وقت کوئی آدمی نماز کی تیاری کرتا ہے تو پہلے نہاتا دھوتا اور اپنے آپ کو پاک کرتا ہے۔ ہر حرام اور غصب کردہ شے کو اپنے آپ سے دُور کرتا ہے۔ پھر بارگاہِ رب العزّت میں حاضر ہوتا ہے۔ یہ تمام امور اُسے فحشاء اور منکر سے باز رکھتے ہیں۔
بلحاظ شرائط کمال اخلاص اور رُوحِ عبادت جس نمازی کا جتنا معیار ہے وہ اُسی قدر فحشاء اور مُنکر سے دُور رہتا ہے۔ بمناسبت معیار کبھی تو مکمل طور پر انسان بچا رہتا ہے۔ اور کبھی محدود طور پر۔
یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی آدمی نماز پڑھے اور اُس پر کوئی اثر نہ ہو خواہ اُس کی نماز دکھاوے ہی کی کیوں نہ ہو۔ یا وہ شخص آلودہ گناہ ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ ایسی نماز کے نفس پر اثرات کم ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ دکھاوے کی نماز بھی نہ پڑھتے تو اور زیادہ گناہوں میں آلودہ ہوتے۔
ہم اِس مطلب کو قدرے واضح طور پر یوں بیان کر سکتے ہیں کہ فحشاء اور مُنکر سے پرہیز کرنے کے بھی بہت سے مراتب و درجات ہیں۔ اور ہر نمازی کا مرتبہ و مقام اُس کے رُوحانی مدارجِ کمال کے مطابق ہے۔
اِس آیت کے متعلق ہم نے جو کچھ سطور بالا میں کہا ہے، اُس سے واضح ہوتا ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لاحاصل زحمت اُٹھائی ہے اور نامناسب تفاسیر کے انتخاب میں بیکار محنت کی ہے۔ شاید انھوں نے یہ دیکھا کہ بعض لوگ نماز

Marfat.com

پڑھتے ہیں اور مرتکب گناہ بھی ہوتے ہیں اِس لیے اُنھوں نے آیت کے مطلق معنی پر نظر ڈالی اور سلسلۂ مراتب کا لحاظ نہیں کیا ۔ لہٰذا وہ شک میں پڑگئے اور آیت کی تفسیر کے لیے دُوسری راہیں اختیار کرلیں ۔

مثلاً ـــــــ بعض نے کہا ہے کہ نماز انسان کو فحشاء اور منکر سے اتنی ہی دیر کے لیے باز رکھتی ہے جب تک وُہ مشغولِ نماز ہوتا ہے۔

یہ کیا عجیب بات ہے ۔ یہ کچھ نماز ہی کی خصوصیت نہیں ہے ۔ بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ اُن میں بحالت مشغولیت انسان مرتکبِ گناہ نہیں ہوتا۔

بعض اور لوگوں نے کہا ہے کہ نماز کے اعمال و اذکار ایسے جُملے ہیں جن میں سے ہرایک انسان کو فحشاء اور منکر سے باز رکھتا ہے۔ مثلاً تکبیر و تسبیح و تہلیل انسان سے کہتی ہے کہ گناہ نہ کر ۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اِس صدائے نہی کو سنتا بھی ہے یا نہیں۔

اِسی طرح بعض نے اِس آیت کی اِس عنوان سے تفسیر کی ہے کہ اِس مقام پر کلمہ "نہی" صرف "نہی تشریعی" ہے وہ اِس حقیقت سے غافل رہے ہیں کہ یہاں نہی تکوینی مُراد ہے ۔ آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ :- نماز کی تاثیر ہی انسان کو ارتکابِ گناہ سے باز رکھنے والی ہے ۔ اِس لیے آیت زیرِ نظر کی اصلی تفسیر وہی ہے جو ہم نے سطور بالا میں بیان کی البتہ اِس امر میں کوئی مانع نہیں کہ نماز فحشاء اور مُنکر سے نہی تکوینی بھی کرتی ہے اور نہی تشریعی بھی ۔

ٗ ٗ ٗ

چند توجہ طلب احادیث

(۱) ایک حدیث میں جو پیغمبرِ اسلامؐ سے مروی ہے :

من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر لم يزدد من الله الّا بُعدًا

جس آدمی کی نماز اُسے فحشاء اور مُنکر سے نہیں روکتی اسے نماز سے خُدا سے دُوری کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔[۱]

(۲) آنحضرتؐ سے ایک اور حدیث میں اس طرح منقول ہے :

لاصلٰوة لمن لم يطع الصلٰوة ـ وطاعة الصلٰوة ان ينتهي عن الفحشآء والمنكر ـ

جو آدمی نماز کے حکم کی اطاعت نہیں کرتا اُس کی نماز نماز نہیں ہے ۔ اور اطاعتِ نماز یہ ہے کہ فحشاء اور مُنکر سے اُس کی نہی پر عمل کرے۔[۲]

---

[۱] و [۲] مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں (دُوسری حدیث میں نہی تشریعی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) ۔

Marfat.com

(۳) آنحضرتؐ سے مروی ہم ایک اور حدیث میں یُوں پڑھتے ہیں کہ : انصار میں سے ایک جوان رسُول اللہؐ کی اقتدا میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ مگر وہ قبیح گناہوں میں مُبتلا تھا۔ لوگوں نے رسول اللہؐ سے یہ بات بیان کی تو آپ نے فرمایا :

ان صلاتہٗ تنھاہ یوماً

آخرکار اُس کی نماز کسی دن اُسے اِن اعمال سے روک دے گی ۔[1]

(۴) نماز کا یہ اثر اِس قدر اہم ہے کہ بعض روایات میں اُسے نماز کے مقبول یا نامقبول ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ جناب امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے :

من احبّ ان یعلم اقبلت صلٰوتہ ام لم تقبل؟ فلینظر ھل منعت صلٰوتہ عن الفحشآء والمنکر؟ فبقدر ما منعتہ قبلت منہ

جو آدمی یہ جاننا چاہے کہ اُس کی نماز خدا کے حضور میں مقبُول ہوئی یا نہیں تو اُسے چاہیئے کہ یہ دیکھے کہ کیا اُس کی نماز نے اُسے فحشاء اور مُنکرات سے روکا ہے یا نہیں۔ پس اُس کی نماز نے جس قدر اُسے اِن افعال سے روکا ہے اُسی قدر اُس کی نماز مقبول ہوئی ہے ۔[2]

✽ ✽ ✽

آیت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں (ولذکر اللہ اکبر)۔

"ذکرِ خدا اُس سے بھی زیادہ برتر و بالا ہے۔"

اِس جُملے میں نماز کا ایک اہم ترین فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی نماز کی برکات و آثار میں سے نہی عن الفحشآء والمنکر سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ نماز انسان کو خدا کی یاد میں مشغول کر دیتی ہے۔ یہی وُہ چیز ہے جو ہر خیر و سعادت کی بُنیاد ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے فحشاء اور مُنکر سے بچے رہنے کا اصل عامل بھی ذکر اللہ ہی ہے۔ اور حقیقت میں نماز کی جُملہ برکات میں سے اِس کی برتری کا باعث یہ ہے کہ یہی ہر خیر و سعادت کی بُنیاد ہے۔

یادِ خُدا اصولاً باعثِ حیاتِ دل اور راحت القلوب ہے۔ اور کوئی شے بھی اِس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

آگاہ رہو کہ یادِ خُدا ہی دلوں کے اطمینان کا سبب ہے۔ (رعد - ۲۸)

اصولی طور پر تمام عبادات خواہ وہ نماز ہو یا کوئی اور عبادت سب کی رُوح ذکرِ خُدا ہی ہے۔ نماز کے الفاظ، افعالِ نماز، مقدّماتِ نماز، اور تعقیباتِ نماز یہ سب کی سب چیزیں درحقیقت انسان کے دل میں یادِ خُدا کو زندہ کر دیتی ہیں۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ سُورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۴ میں نماز کے اِس بُنیادی فلسفے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ چنانچہ مُوسٰیؑ کو مخاطب

---

[1] [2] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

کرکے کہا گیا ہے :

اقم الصلوٰۃ لذکری

نماز کو میری یاد کے لیے قائم کرو۔

بزرگ مفسرین نے جملہ بالا (ولذکر اللہ اکبر) کی اس سے مختلف تفاسیر بھی لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض کے متعلق روایاتِ اسلامی میں بھی اشارات ملتے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ :

خُدا تمہیں اپنی رحمت کے وسیلے سے یاد کرتا ہے اور تم اُسے اطاعت کے وسیلے سے یاد کرتے ہو۔[1]

دُوسرے یہ کہ :۔ ذکرِ خُدا نماز سے بھی برتر و بالاتر ہے کیونکہ ہر عبادت کی رُوح ذکرِ خدا ہی ہے۔

مذکورہ بالا تفاسیر جن میں سے بعض کا ذکر روایات اسلامی میں بھی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کا مقصود بطونِ آیت ہو۔ وگرنہ آیت کا ظاہری مفہوم تو وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے کیونکہ اکثر مقامات پر جہاں کلمۂ ذکر اللہ آیا ہے اس سے مُراد بندوں کا خدا کو یاد کرنا ہے۔ آیتِ بالا سے بھی ذہن اسی مفہوم کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ خُدا بندوں کو یاد کرتا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ یہ براہِ راست نتیجہ ہو، اس بات کا کہ بندے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اس طرح سے ان دونوں معانی کا تضاد برطرف ہو جاتا ہے۔

معاذ بن جبل سے منقول ایک حدیث کے مطابق عذابِ الٰہی سے نجات کے لیے انسان کا کوئی عمل بھی " ذکر اللہ " سے بہتر نہیں ہے تو اس کے بارے میں لوگوں نے ان سے سوال کیا کہ کیا راہِ خدا میں جہاد بھی اس سے بہتر نہیں ہے۔ تو معاذ بن جبل نے جواب دیا ہاں۔ کیوں خدا فرماتا ہے :

ولذکر اللہ اکبر

ظاہراً یوں لگتا ہے کہ معاذ بن جبل نے یہ بات رسُول اللہ ؐ سے سُنی تھی کیونکہ وُہ خود بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے پیغمبرِ خدا سے سوال کیا کہ تمام اعمال میں کونسا عمل برتر ہے ؟

تو رسول اللہ ؐ نے فرمایا :

ان تموت ولسانك رطب من ذکر اللہ عزّ وجلّ

یہ کہ مرتے وقت تیری زبان ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو۔

انسان کی نیّت اور اُس کے حضورِ قلب کی کیفیت و کمیت نماز اور دیگر تمام عبادات میں مختلف رہتی ہے اس لیے آیت کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے : (واللہ یعلم ما تصنعون)۔ یعنی خدا جانتا ہے کہ تم کیا کام کرتے ہو۔

تم کونسے اعمال مخفی طور پر اور کون سے آشکارا طور پر انجام دیتے ہو۔ تمہاری کیا کیا نیتیں ہوتی ہیں اور تم زبان سے کیا کچھ کہتے ہو۔ خدا ان سب باتوں کو جانتا ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] اس تفسیر کے مطابق اس مقام پر اللہ فاعل ہے۔ لیکن گزشتہ تفسیر کے مطابق آیت میں مذکور فعل کا فاعل ہے۔

Marfat.com

فرد اور جماعت کی تربیّت میں نماز کا اثر :

اگرچہ نماز ایسی چیز نہیں کہ اُس کا فلسفہ کسی سے مخفی ہو۔ لیکن جب ہم متون آیات اور روایاتِ اسلامی کو دقتِ نظر سے دیکھتے ہیں تو بہت سی باریکیاں اور نکات ہمارے سامنے آتے ہیں، مثلاً :

۱۔ نماز کا فلسفہ اس کی رُوح و اساس، مقصد و عمل اور نتیجہ غرض سب کچھ یادِ خدا ہے۔ یعنی وہی ذکر اللہ جسے آیت بالا میں "برترین" کہا گیا ہے۔

البتہ "ذکر" ایسا ہونا چاہیئے جو تمہید فکر ہو اور فکر وہ کہ جو محرّک عمل ہو۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث "ولذکر الله اکبر" کی تفسیر میں منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا :

ذکر الله عند ما احل وحرم

افعال حلال وحرام کے بارے میں خدا کو یاد کرنا (یعنی خدا کا ذکر ایسا ہونا چاہیئے کہ انسان حلال کام انجام دے اور حرام سے بچے)۔[۱]

۲۔ نماز گناہوں کو دھو دیتی ہے اور خدا کی مغفرت و بخشش کا وسیلہ ہے۔ کیونکہ نماز انسان کو توبہ اور اصلاحِ عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں ہے کہ جنابِ رسولِ خداؐ نے اپنے اصحاب سے سوال کیا :

لو کان علیٰ باب دار احدکم نهر واغتسل فی کل یوم منه خمس مرات اکان یبقی فی جسده من الدرن شیٔ ؟

قلت لا۔ قال :- فان مثل الصلٰوۃ کمثل النهر الجاری کلما صلی کفر ما بینهما من الذنوب۔

اگر تم میں سے کسی کے مکان کے دروازہ کے سامنے صاف و پاکیزہ پانی کی نہر ہو اور وہ آدمی دن میں پانچ دفعہ اُس نہر میں غسل کرے تو کیا اُس آدمی کے جسم پر کسی قسم کی کثافت اور مَیل باقی رہ جائے گا ؟

جواب میں عرض کیا گیا۔ نہیں۔

تب رسول اللہؐ نے فرمایا : نماز بھی اُسی آبِ جاری کی مانند ہے۔ جس وقت بھی انسان نماز پڑھتا ہے تو وہ گناہ جو دو نمازوں کے درمیان اُس نے انجام دیئے ہوتے ہیں، محو ہو جاتے ہیں۔[۲]

اِس طرح سے اِنسانی رُوح پر گناہوں سے جو زخم لگ جاتے ہیں نماز کی مرہم سے بھر جاتے ہیں اور دل پر جو زنگ لگ جاتا ہے وُہ صاف ہو جاتا ہے۔

۱۔ بحار الانوار جلد ۸۲ صفحہ ۲۔

۲۔ وسائل الشیعہ جلد ۳ صفحہ ۷ (باب ۲ از ابواب اعداد الفرائض حدیث ۳)۔

Marfat.com

۳۔ نماز آئندہ گناہوں کے مقابلے میں دیوار بن جاتی ہے کیونکہ وہ انسان کے اندر رُوحِ ایمانی کو قوی کرتی ہے اور دل میں تقویٰ کے پودے کی پرورش کرتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایمان و تقویٰ گناہوں کو روکنے کے لیے مضبوط ترین دیوار ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے زیرِ بحث آیت میں " تنھٰی عن الفحشاء والمنکر " کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔
اِس مطلب کی متعدد احادیث کے مطابق پیشوایانِ اسلام کے سامنے بعض گناہ گار لوگوں کا حال بیان کیا گیا تو اُنھوں نے فرمایا:

فکر نہ کرو ۔ نماز اُن کی اصلاح کر دے گی ۔

۴۔ نماز غفلت کو دُور کر دیتی ہے ۔ راہِ حق کے راہیوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو بُھول جائیں اور زندگی کی مادی راحتوں اور زود گزر لذتوں میں غرق ہو جائیں ۔
مگر ــ نماز ــ جو کہ وقت کے مختلف فاصلوں سے ہر شب و روز میں پانچ بار ادا کی جاتی ہے ۔ مسلسل انسان کو آگاہ اور متنبہ کرتی رہتی ہے ۔ وُہ انسان کو اُس کا مقصدِ آفرینش سمجھاتی رہتی ہے اور دُنیا میں اس کی حیثیت اور فرض آگاہ کرتی رہتی ہے ۔ انسان کے لیے یہ ایک بڑی نعمت ہے کہ " اس کے پاس ایک ایسا وسیلہ ہے جو ہر رات دن میں اُسے چند مرتبہ خوابِ غفلت سے جگاتا رہتا ہے " ۔

۵۔ نماز تکبّر اور خود بینی کو دُور کر دیتی ہے ۔ کیونکہ انسان ہر شب و روز میں سترہ رکعت نماز پڑھتا ہے اور ہر رکعت میں دو بار خدا کے سامنے خاک پر پیشانی رکھتا ہے ۔ اِس حالت میں اپنے آپ کو اُس کی عظمت کے سامنے صرف ایک ذرّہ ناچیز ہی نہیں بلکہ اُس کی لامحدودیت کے مقابلہ میں ایک صفر سمجھتا ہے ۔
نماز انسان کے غرور اور خُود پرستی کو دُور کر دیتی ہے نیز تکبّر اور احساسِ برتری کو ختم کر دیتی ہے ۔
امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی اُس معروف حدیث میں جس میں عباداتِ الٰہی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے ، ایمان کے بعد نماز کہ جو افضل عبادات ہے ، کی یہی غایت بیان فرمائی ہے :

فرض الله الایمان تطهیرًا من الشرك والصلوٰة تنزیهًا عن الکبر

خدا نے ایمان کو شرک کی نجاست سے پاک کرنے کے لیے فرض کیا اور نماز کو تکبّر سے پاک کرنے کے لیے ۔ (نہج البلاغہ کلمات قصار ۲۵۲) ۔

۶۔ نماز انسان کے فضائل اخلاق اور اس کے کمالِ رُوحانی کی پرورش کا وسیلہ ہے کیونکہ وہ انسان کو عالمِ مادّی اور عالمِ طبیعت کی چار دیواری سے آزاد کرتی ہے اور اُسے ملکوتِ آسمانی کی طرف بُلاتی ہے ۔ اُسے فرشتوں کے ساتھ ہم صدا اور ہم راز کر دیتی ہے ۔ انسان حالتِ نماز میں اپنے آپ کو بلاواسطہ خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اُس سے باتیں کر رہا ہوں ۔
شب و روز میں انسان کئی مرتبہ اِس عمل کی تکرار کرتا ہے ۔ اس صُورت میں کہ انسان خُدا کی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت اور

Marfat.com

اُس کی عظمت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اور سُورۂ الحمد کہ جو نیکی اور پاکبازی کی بہترین رہبر ہے، کے بعد قرآن کی دوسری آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ یہ عمل نفسِ انسانی میں بہترین فضائلِ اخلاق کی پرورش کرتا ہے۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فلسفۂ نماز کے متعلق ایک حدیث میں فرمایا :

الصّلوٰة قربان کُلّ تقی

نماز ہر پرہیزگار کے لیے تقربِ الٰہی کا وسیلہ ہے۔[1]

۷۔ نماز انسان کے تمام اعمال کو قدر و قیمت اور رُوح عطا کرتی ہے۔ کیونکہ نماز انسان کے اندر رُوحِ اخلاص کو زندہ کرتی ہے۔ نماز نیتِ خالص، گفتارِ پاک اور اعمالِ صالح کا مجموعہ ہے۔ رات دن میں اِن تمام چیزوں کی تکرار انسان کی رُوح میں تمام اعمالِ خیر کا بیج بو دیتی ہے۔ اور نفس کی کیفیتِ اخلاص کو تقویت بخشتی ہے۔

ایک مشہور روایت میں ہے کہ جب امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کا سرِ اقدس ظالم ابن ملجم کی تلوار سے شگافتہ ہو چکا تھا تو آپؑ نے اپنی وصیتوں میں یہ بھی فرمایا :

اللہ اللہ فی الصلوٰة فانها عمود دینکم

نماز کے بارے میں خُدا سے ڈرو، خُدا سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے دین کا ستون ہے۔[2]

یہ مُسلّم ہے کہ اگر چوبِ خیمہ ٹوٹ جائے یا گر پڑے تو خیمے کی طنابیں یا میخیں خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں وہ بے فائدہ ہیں۔ اِسی طرح اگر نماز کے وسیلے سے بندوں کا خدا سے تعلق باقی نہ رہے، تو دُوسرے اعمال بے اثر ہو جاتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے :

اوّل ما یحاسب به العبد الصلوٰة فان قبلت قبل سائر عمله وان ردت رد علیه سائر عمله۔

قیامت میں جس چیز کا سب سے پہلے بندوں سے حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اگر خدا نے نماز کو قبول کر لیا تو دیگر اعمال بھی مقبول ہو جائیں گے اور اگر وہ رد کر دی گئی تو تمام اعمال رد ہو جائیں گے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نماز خالق و مخلوق کے درمیان ایک راز ارتباط ہے۔ اگر نماز اپنی شرائط کے ساتھ صحیح طور پر ادا ہو جائے تو اُس میں قربت اور اخلاص کے جذبات کہ جو جملہ اعمال کی قبولیت کی بُنیاد ہیں، فطرتاً پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر اخلاص اور نیتِ صادق نہ ہو تو تمام اعمال بیکار اور غیر نتیجہ بخش ہیں اور اعتبار کے درجے سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

۸۔ مشتملات نماز سے قطع نظر اگر نماز اپنی شرائط کے ساتھ توجہ سے ادا کی جائے تو وہ انسان کو تقویٰ کا عادی بناتی ہے۔ کیونکہ ——— ہم جانتے ہیں کہ صحتِ صلوٰة کی شرائط میں یہ اُمور شامل ہیں کہ نمازگزار کا مکان، اُس کا لباس، وہ فرش

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۱۳۶۔

[2] نہج البلاغہ، وصیت ۴۷۔

Marfat.com

جس پر وہ نماز پڑھتا ہے ، وہ پانی جس سے وضو اور غُسل کرتا ہے اور وہ مقام جہاں وہ غُسل اور وضو کرتا ہے ، اُن سب کو غصب سے مبرا اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز سے پاک ہونا چاہیئے ۔

جس آدمی کا کردار تجاوز ، ظلم ، سُود خوری ، غصب ، کم فروشی ، رشوت خوری اور کسب اموالِ حرام سے آلودہ ہو تو وہ ادائے نماز کی شرائط کو کیونکر پُورا کر سکتا ہے ۔

اِس بنا پر رات دن میں پانچ مرتبہ نماز کی تکرار بنی نوعِ انسان کے حقوق کا احترام کرنے کی تعلیم دیتی ہے ۔

۹۔ نماز کے لیے ، اُن شرائط کی صحت کے علاوہ جو اُس کی قبولیت کے لیے لازمی ہیں کچھ اور شرائطِ کمال بھی ہیں کہ ان کا لحاظ رکھنا بہت سے گناہوں کے ترک کرنے کے لیے مؤثر ہے ۔ علمِ فقہ اور حدیث کی کتابوں میں ایسے بہت سے امُور کا ذکر ہے جن کی وجہ سے نماز قبول نہیں ہوتی ۔ اُن میں سے ایک شراب خوری بھی ہے ۔ روایات میں ذکر ہے کہ :۔

لا تقبل صلوٰة شارب الخمر اربعين يوماً الّا ان يتوب

شراب خوار کی نماز چالیس روز تک قبول نہیں ہوتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ توبہ کرے[1]

متعدد روایات میں ہے کہ جن لوگوں کی نماز قبول نہیں ہوگی اُن میں سے ظالم رہنما بھی ہے[2]

بعض دوسری روایات میں یہ تصریح موجُود ہے کہ جو آدمی زکوٰة ادا نہیں کرتا اُس کی نماز قبول نہیں ہوگی ۔ اِسی طرح اور روایات میں آیا ہے کہ حرام غذا کھانے ، غرور و تکبّر اور خود بینی سے بھی نماز قبول نہیں ہوتی ۔ ظاہر ہے کہ قبولیت نماز کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھنے سے کیسی تربیّتِ اخلاق ہوتی ہے ۔

۱۰۔ نماز انسان میں نظم و ضبط کی عادت پیدا کرتی ہے کیونکہ اُسے لازماً معین وقت پر ادا کرنا ہوتا ہے ۔ ہر نماز کی ادائیگی میں تقدیم یا تاخیر دونوں سے نماز باطل ہو جاتی ہے ۔ اِسی طرح سے نماز کے دیگر آداب و احکام ہیں ، مثلاً نیّت ، قیام وقعود رکوع و سجود وغیرہ کہ جب اِنسان اِن سب کو پُوری توجہ کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے تو اُس کے کردار اور اُس کی زندگی کے نظام میں نظم و ضبط کا پیدا ہو جانا آسان ہو جاتا ہے ۔

نماز با جماعت سے قطع نظر کرتے ہوئے فرادیٰ نماز میں یہ تمام فوائد مضمر ہیں ۔ اور ہم اِن پر خصوصیاتِ جماعت کا اضافہ کریں کہ جو رُوحِ نماز کا تقاضا ہے تو نمازیں اور بھی بے شمار برکات ہیں ، جن کے تفصیلی ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے ۔ علاوہ بریں ہم سب ہی کم و بیش اُنھیں جانتے ہیں ۔

فلسفہ و اسرارِ نماز کے متعلق امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی ایک جامع حدیث نقل کر کے ہم اپنے بیان کو ختم کرتے ہیں ۔

امامؑ کی خدمت میں ایک خط آیا جس میں فلسفۂ نماز کے متعلق سوال کیا گیا تھا تو اُس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ :

نماز کے واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی ادائیگی کے دوران میں اِنسان کی توجہ اللہ کی طرف رہتی ہے اور

---

[1] بحار الانوار ، ج ۸۴ ص ۳۱۷ تا ص ۳۲۰ ۔

[2] بحار ، ج ۸۴ ص ۳۱۸ ۔

Marfat.com

وہ اپنے پروردگار کی ربوبیت کا اقرار کرتا رہتا ہے۔ نمازی آدمی شرک و بُت پرستی کے خلاف جنگ کرتا ہے، اپنے پروردگار کے حضور نہایت خضوع و خشوع سے کھڑا ہوتا ہے، وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے، اپنے گزشتہ گناہوں کی خدا سے بخشش طلب کرتا ہے۔ اور ہر روز خدا کی تعظیم کے لیے زمین پر پیشانی رکھتا ہے۔

نماز کا مقصود یہ بھی ہے کہ انسان ہمیشہ ہوشیار رہتا ہے اور اس بات کو یاد رکھتا ہے کہ خدا سے غفلت کا گرد و غبار اس کے دل پر نہ بیٹھنے پائے۔ وہ دنیا کی دولت پرست و مغرور نہ ہو جائے، بلکہ ہمیشہ خدا کے حضور میں خضوع و خشوع کی حالت میں رہے اور اُسی سے دُنیا کی دولت اور دین کی نعمات میں اضافے کا طالب ہو۔

علاوہ بریں ذکرِ خدا کا تسلسل کہ جو نماز کے سبب سے حاصل ہوتا ہے، اِس امر کا مُوجب ہوتا ہے کہ انسان اپنے مولا، مُدبّر اور خالق کو فراموش نہیں کرتا اور اُس پر سرکشی کے جذبات کا غلبہ نہیں ہوتا۔

خُدا کی طرف یہی توجہ اور اُس کی درگاہ میں حاضری انسان کو گناہوں سے باز رکھتی ہے اور طرح طرح کی بُرائیوں سے بچاتی ہے[1]

❖ ❖ ❖

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۳ صفحہ ۔

Marfat.com

٤٦۔ وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ
اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝
٤٧۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ
بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۝
٤٨۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ
اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝
٤٩۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا
يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

٤٦۔ اور تم اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر احسن طریقے سے، سوائے اُن لوگوں کے جو ظلم کے مرتکب ہوں اور اُن سے کہو کہ خُدا کی طرف سے جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے ہم اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے اور

Marfat.com

ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

۴۷۔ اس طرح ہم نے تمہارے اُوپر کتاب نازل کی ہے پس جن لوگوں کو ہم نے اس سے قبل آسمانی کتاب دی تھی وہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور (مشرکین کے) اس گروہ میں سے بھی بعض اس پر ایمان لائیں گے اور ہماری آیات کا کفار کے سوا کوئی اِنکار نہیں کرتا۔

۴۸۔ اور تم نے اِس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وُہ لوگ ضرور شک کرتے کہ جو تمہاری باتوں کو باطل کرنے کے دَرپے ہیں۔

۴۹۔ بلکہ یہ (کتاب آسمانی) روشن آیات ہیں جو اُن لوگوں کے سینوں میں ہیں، جنہیں علم دیا گیا ہے۔ اور ظالموں کے سوا ہماری آیات کا کوئی اِنکار نہیں کرتا۔

تفسیر

بحث کے لیے بہترین روش اختیار کرو:

گزشتہ آیات میں جاہل اور آمادہ بجنگ بُت پرستوں کے متعلق گفتگو تھی، جس کا لہجہ مقتضائے حال کے مطابق تند اور سخت تھا اُن میں اُن کے معبودوں کو تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور بتایا گیا تھا۔

لیکن آیاتِ زیرِ بحث میں اہلِ کتاب سے بحث و مباحثہ کا ذکر ہے کہ وہ عُمدہ طریقہ سے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اُنھوں نے کُتب آسمانی اور انبیاء کے احکامات کچھ تو سُنے تھے۔ اور مُدلل بات سُننے کے لیے وُہ کچھ زیادہ آمادہ تھے۔ یوں بھی ہر آدمی سے اس کی عقل و علم اور اخلاق کے معیار کے مطابق گفتگو کرنی چاہیئے۔

اِس سلسلے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے کہ بجُز اُس روش کے جو سب سے بہتر ہے اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو (ولا تجادلوا اهل الكتاب الا بالتي هي احسن)۔[1]

"لا تجادلوا" کا مادہ "جدال" ہے۔ اس کے حقیقی معنی رسّی کو بٹنے، بل دینے اور اسے مضبُوط کرنے کے ہیں۔ یہ کلمہ مضبُوط عمارت وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

جب دو آدمی کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں۔ تو ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وُہ دوسرے کو اُس کے عقیدے سے

---

[1] اَلّتی موصوف مقدر کی صفت ہے مثلاً "الطریقة"۔

Marfat.com

موڑدے اس وجہ سے اِس عمل کو " مجادلہ " کہتے ہیں ۔کشتی لڑنے کو بھی " جدال " کہتے ہیں ۔ بہرکیف اِس مقام پر " تجادلوا " سے مُراد مُدلّل گفتگو ہے ۔

اِس مقام پر " التی ھی احسن " کہنا نہایت جامع تعبیر ہے کیونکہ یہ الفاظ مباحثے میں ہر لحاظ سے صحیح اور مناسب طریقہ اختیار کرنے کا مفہوم لیے ہوئے ہیں، خواہ وہ الفاظ کا استعمال ہو، خواہ گفتگو کے مشمولات ہوں، خواہ طرزِ گفتگو ہو ۔ خواہ گفتگو کے دوران میں دیگر امور ہوں ۔

بنا بریں اِس جُملے کا مفہوم یہ ہے کہ بدورانِ مباحثہ ، تمہارے الفاظ مؤدبانہ ہوں، گفتگو کا لہجہ دوستانہ ہو اور مضمون مُدلّل ہو ۔ آہنگِ صدا میں شور و غل ، خشونت اور ہتکِ احترام کا شائبہ نہ ہو ۔ اسی طرح ہاتھوں اور چشم و ابرو کی حرکات جن سے انسان اپنا مطلب واضح کرتا ہے نہایت مہذّب ہوں ۔

تعبیراتِ قرآن بھی کیسی جامع ہیں کہ ایک مختصر سے جُملے میں معنی کی ایک دُنیا ، پوشیدہ ہے ۔

یہ نصیحت اِس وجہ سے کی گئی ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے بحث کی غایت طرفِ مقابل کو شرمندہ کرنا ، اُسے شکست دینا یا اس پر تفوق حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ طرف ثانی کے دل میں ہمارے کلام کا اثر ہو اور حق اس کی رُوح کی گہرائی میں اُتر جائے ۔ یہ مقصود بہترین طور پر اُسی اندازِ گفتگو سے حاصل ہو سکتا ہے جس کی قرآن میں نصیحت کی گئی ہے ۔

حتّٰی کہ ایسا کرنا ہوتا ہے کہ انسان کسی کے سامنے قولِ حق کو اگر اس طرح پیش کرے کہ طرف ثانی کو خیال پیدا ہو کہ یہ تو میرے ہی دل کی بات ہے ، تو وہ حق کی طرف بہت جلد مائل ہو جاتا ہے کیونکہ انسان اپنے افکار سے اپنی اولاد کی طرح پیار کرتا ہے ۔

اِسی وجہ سے کہ قرآن مجید میں بہت سے مسائل سوالیہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں ۔ تاکہ اس سوال کا جواب مخاطب کے دل سے موج زن ہو اور وہ اُسے اپنی ہی بات سمجھے ۔

مگر ہر قانون میں اِستثنا بھی ہوتا ہے ۔ مثلاً اسی اسلامی اصولِ بحث کے تحت نرم گفتاری اور حُسن تکلم کو بعض اوقات فریق مخالف مؤقف کی کمزوری پر محمول کر سکتا ہے یا ممکن ہے کہ یہ مبنی بر انسانیت شیوہ گفتار طرف مقابل کی جرأت اور جسارت میں اضافہ کر دے ۔ اسی لیے آیت کے آخر میں اِن الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے مگر اُن لوگوں کے ساتھ یہ اُسلوب گفتگو اختیار نہ کرو جنہوں نے اِن میں سے ظلم کیا ہے ۔ (الّا الذین ظلموا منھم) ۔

یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اُوپر اور دُوسروں پر ظلم کیا اور اُنھوں نے بہت سی آیاتِ الٰہی کو چھپایا تاکہ لوگ پیغمبرِ اسلامؐ کے اُوصاف سے آشنا نہ ہوں ۔

وُہ لوگ کہ جنھوں نے ظلم کیا ۔ اور ۔ خدا کے اُن احکامات کی توہین و تحقیر کی جو اُن کے مفادات دُنیا کے خلاف تھے ۔

وُہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا اور مشرکین کی طرح دین میں خرافات شامل کر لیں مثلاً : حضرت مسیح یا عزیر کو خدا کا بیٹا کہنے لگے ۔

مختصر یہ کہ ـــ اُن لوگوں کے ساتھ نرم گفتاری لاحاصل ہے کہ جنھوں نے ظلم کیا ہے اور استدلالی گفتگو کی بجائے تلوار کھینچ لی اور دلیل کی بجائے طاقت پر بھروسا کیا اور امن و صلح کی بجائے شیطنت اور شرارت پر اُتر آئے ۔

آیت کے آخر میں " مجادلۂ احسن " کی ایک ایسی مثال پیش کی گئی ہے کہ وُہ اس قسم کی بحثوں کے لیے ہمیشہ ایک نادر نمونہ ہے ۔

Marfat.com

چنانچہ فرمایا گیا ہے : تم ان سے کہو کہ ہم اُس پر جو خدا کی طرف سے ہم پر اور تم پر نازل ہوا ہے، ایمان رکھتے ہیں، تمہارا اور ہمارا معبود ایک ہے اور ہم اُس کی اطاعت کرتے ہیں: (وقولوا اٰمنا بالذی اُنزل الینا وانزل الیکم والٰهنا والٰهکم واحدٌ ونحن لهٗ مسلمون)۔

اس آیت میں گفتگو کا کیا ہی دلچسپ اسلوب اور کیسا ہی پیارا طرز ہے۔ اُس شے پر جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے ایمان اور عقیدہ کی ہم آہنگی ہے۔ تمام تعصبات کو دُور کر دیا گیا ہے۔ ہم اور تم کا تفرقہ مٹا دیا گیا ہے اور آخر میں توحید باری تعالیٰ کا اقرار ہے اور غیر مشروط طور پر اُس کی اطاعت کا اقرار ہے۔

"مُجادلہٗ احسن" کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جو کوئی اُسے سُنتا ہے وہ طبعاً پسند کرتا ہے۔ یہ اسلوب گفتگو ثابت کرتا ہے کہ اسلام "گروہ بندی" نہیں چاہتا اور نہ وہ بنی نوع میں تفرقہ اندازی کو پسند کرتا ہے۔ اسلام تو صرف وحدت کی دعوت دیتا ہے اور ہر حق بات کو مان لینے کی نصیحت کرتا ہے۔

اس قسم کی بحث کے نمونے قرآن میں بکثرت ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کی طرف امام صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں :

"مجادلہٗ احسن" کی مثال وہ گفتگو ہے جو "سورہ یٰسٓ" کے آخر میں منکرین معاد کے سلسلے میں آئی ہے۔

وہ منکرین جب ایک بوسیدہ ہڈی کو رسول اللہؐ کے سامنے لائے اور کہا کہ کس میں یہ قدرت ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کر دے؟ تو جواب میں آنحضرتؐ نے فرمایا :

"یحییها الذی انشاٴها اول مرة ......"

وہی خدا جس نے پہلے پیدا کیا تھا زندہ کرے گا۔ وہی خدا جو سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کرتا ہے۔[1]

⁂

اس کے بعد کی آیت اُن چار اصولوں کی تاکید کے طور پر آئی ہے جو آیت ماقبل میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: ہم نے تم پر اِسی طرح کتاب آسمانی نازل کی ہے : (وکذٰلک انزلنآ الیک الکتاب)۔

اس قرآن کے نزول کی اساس یہ ہے کہ ذات معبود واحد دیکھتا ہے، تمام پیمبران برحق کی دعوت کی غایت ایک ہی تھی، فرمانِ الٰہی کی بے چون وچرا اطاعت کی جائے اور لوگوں سے مجادلہ و مباحثہ بہترین طریقہ پر کیا جائے۔

بعض مفسّرین کی رائے یہ ہے کہ اس جُملے میں پیغمبرِ خداؐ پر نزولِ قرآن کو، انبیاء ماقبل پر نازل ہونے والی کتابوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے گزشتہ پیمبروں پر آسمانی کتابیں نازل کیں اسی طرح تم پر بھی قرآن نازل کیا ہے۔

مگر پہلی تفسیر زیادہ پُر معنی معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند کہ دونوں تفاسیر کو قبول کر لینا بھی ممکن ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۱۶۳۔

Marfat.com

اس کے بعد قرآن اضافہ کرتا ہے : وہ لوگ جنہیں ہم نے اس سے قبل آسمانی کتاب دی تھی (اور وہ واقعی اس کی اتباع کرتے ہیں) وہ اس کتاب پر ایمان لے آئیں گے : (فالذین اٰتیناھم الکتاب یؤمنون بہ)۔

کیونکہ اُنھوں نے اِس کتاب کی صداقت کی نشانیاں اپنی کتاب میں دیکھی ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اُصولی طور پر اس کتاب کے مضامین کو اپنی کتاب کے مضامین سے ہم آہنگ پاتے ہیں۔

مگر ہم جانتے ہیں کہ تمام اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) پیمبر اسلامؐ پر ایمان نہیں لاتے۔ اس بنا پر یہ جملہ اُن حقیقی اور طالبانِ حق مومنین کے لیے آیا ہے جو ہر قسم کے تعصبات سے پاک تھے اور جن کے لیے درحقیقت "اہل کتاب" کی صفت موزوں تھی۔

اس کے بعد مزید کہا گیا ہے : ان میں سے بھی ایک گروہ (اہل مکہ و مشرکین عرب) اس (قرآن) پر ایمان لے آئیں گے (ومن ھٰؤلاء من یؤمن بہ)[1]

آیت کے آخر میں دونوں قسم کے کفار کے متعلق کہا گیا ہے : ہماری آیات کا کفار کے علاوہ کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ (وما یجحد باٰیاتنا الا الکافرون)[2]

"جحد" کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا معتقد تو ہو مگر بظاہر اُس کا انکار کرتا ہو۔ لہٰذا مذکورہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ درحقیقت کفار اپنے دل میں ان آیات کی عظمت کے معترف تو ہیں اور وہ اس کلام میں صداقت و راستی کی علامات کا ادراک بھی کرتے ہیں۔ نیز جناب رسالت مآبؐ کی پاکیزہ سیرت اور اُن کے پیروکاروں کے مخلصانہ کردار کو دیکھ کر وہ اس کلام کی حقانیت کے قائل ہیں مگر بزرگوں کی کورانہ تقلید، جاہلانہ تعصب، اور نامشروع اور وقتی دُنیاوی مفاد کا خیال اُنھیں انکار پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اور کلمۃ الحق کہنے سے روکے رکھتا ہے۔

اس ترتیب سے خدا نے قرآن کے مقابلہ میں مختلف اقوام کے مواقف کو بیان کیا ہے۔

اُن میں سے ایک صف میں اہلِ ایمان ہیں۔ چاہے وہ علمائے اہلِ کتاب اور ان میں سے راست باز مومنین ہوں۔ یا وہ مُشرک ہوں، جو تشنۂ حق تھے مگر جب اُنھوں نے حق کو پالیا تو اُس سے دل لگا لیا۔

دُوسری صف میں ہٹ دھرم منکرین ہیں۔ جنھوں نے حق کو دیکھا مگر چمگادڑ کی طرح اُس نور سے چھپ گئے کیونکہ اُن کے تاروپُود میں کفر کی ظلمت سمائی ہوئی تھی، اس لیے اُنھیں نورِ ایمان سے وحشت تھی۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ گروہ ثانی نزولِ آیات سے پہلے بھی کافر ہی تھا۔ لیکن اُن کے کُفر پر تاکید مزید ممکن ہے کہ اس وجہ سے ہو کہ اس سے قبل اُن پر اتمامِ حُجت نہ ہوئی تھی۔ اب اتمامِ حجت کے بعد اُن کا کُفر حقیقی ثابت ہوگیا ہے۔ وہ یہ کہ علم و آگاہی

---

[1] بعض مفسرین نے جُملہ " الذین اٰتیناھم الکتاب" کا اشارہ مُسلمانوں کی طرف سمجھا ہے اور " من ھٰؤلاء من یؤمن بہ " سے اہلِ کتاب مُراد لی ہے۔ مگر یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ " الذین اٰتیناھم الکتاب" اور اُسی جیسی تعبیرات قرآن میں یہود و نصاریٰ کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوئیں۔

[2] راغب، مفردات میں کہتے ہیں "جحود" کے معنی ہیں " اُس بات کی نفی جس کا دل میں اثبات ہو اور اِس بات کا اثبات جس کی دل میں نفی ہو۔

Marfat.com

کے باوجود وہ راہِ مستقیم کو چھوڑ کر دانستہ گمراہ ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد پیغمبرِ اسلامؐ کے دعویٰ کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے (جو کہ حقیقت میں آیۂ گزشتہ کے مضمون پر تاکید ہے) فرمایا گیا ہے:

اے رسولؐ! تم نے قرآن نازل ہونے سے قبل کوئی کتاب نہیں پڑھی اور تم ہرگز اپنے ہاتھ سے کچھ نہ لکھتے تھے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ تمہارے وُہ دشمن جو ہر وقت تمہاری دعوت کی تکذیب کی فکر میں رہتے ہیں، اُنھیں شک و تردّد کا موقع مل جائے اور وہ کہیں کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وُہ پُرانی کتابوں کے مطالعے اور اُن سے اخذ و نقل کا نتیجہ ہے: (وماکنت تتلوا من قبله من کتاب ولا تخطه بیمینك اذًا لارتاب المبطلون)۔[1]

اے رسولؐ! تم ہرگز مکتب میں نہیں گئے اور کبھی عبارت نہیں لکھی لیکن وحی الٰہی کے ذریعے مدرسین کو پڑھانے والا معاملہ ہوگیا۔ بھلا اِس بات کا کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے نہ تو کبھی سبق پڑھا ہو، نہ کبھی کسی اُستاد اور مکتب کی شکل دیکھی ہو اور وہ اپنی طرف سے ایک کتاب تصنیف کر کے لے آئے اور تمام بنی نوع انسان کو مقابلے کا چیلنج کر دے اور سب لوگ اُس جیسی کتاب تصنیف کرنے سے عاجز ہو جائیں؟

کیا۔ رسُول کا یہ اعجاز اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی لامحدود قدرت کی وجہ سے ظہور میں آرہا ہے اور اُنھوں نے جو کتاب پیش کی ہے وہ آسمانی ہے جو کہ خدا کی طرف سے اُن پر نازل ہوئی ہے۔

اگر کوئی شخص بطورِ اعتراض یہ کہے کہ ہم یہ کیونکر جانیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ نہ کبھی کسی مکتب میں گئے اور نہ لکھنا ہی سیکھا؟ تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسے معاشرے میں رہتے تھے جس میں لکھے پڑھے لوگ بہت ہی محدود اور گنے چنے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ تمام شہر مکہ میں سترہ آدمیوں سے زیادہ لکھنے پڑھنے کے قابل نہ تھے۔ ایسے معاشرے میں اگر کوئی مکتب میں جائے اور پڑھنا لکھنا سیکھے تو وہ اپنے آپ کو نہیں چھپا سکتا۔ وہ تو ہر طرف مشہور ہو جائے گا اور اُسے تعلیم دینے والے اُستاد کو بھی لوگ جانتے ہوں گے۔

بھلا ایسا آدمی کیونکر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں پیغمبر برحق ہوں اور کیونکر ایسا سفید جھوٹ بول سکتا ہے؟ بالخصوص یہ آیات مکہ میں نازل ہوئی تھیں جہاں پیغمبرِ خداؐ پلے بڑھے تھے اور وہ بھی اُن ہٹ دھرم دشمنوں کے سامنے جن کی نظر سے چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد کی آیت میں حقانیتِ قرآن کے اور دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے: یہ کتاب آسمانی ایسی آیاتِ بیّنات کا مجموعہ ہے جن کی جگہ اہلِ علم کے سینوں میں ہے: (بل هو اٰیات بیّنٰت فی صدور الذین اوتوا العلم)۔

---

[1] "من قبلہ" میں جو ضمیر ہے اس کا مرجع قرآن ہے اور کلمہ "یمین" (دایاں ہاتھ) اس لیے کہا کہ عام طور پر انسان داہنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ "مُبطلون"، "مبطل" کی جمع ہے اور یہ اُس آدمی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو باطل کرنے کے درپے ہو۔

Marfat.com

کلمہ "آیات بینات" اِس امر کا مظہر ہے کہ حقانیت قرآن کے دلائل خود اسی میں موجود ہیں، وہ آیات ہی سے روشن ہیں اور یہ آیات خود اپنی صداقت کی دلیل ہیں۔

یہ آیاتِ قرآن خدا کی آیاتِ تکوینی کی طرح ہیں کہ انسان جن کے مطالعے سے کسی دوسری چیز کی احتیاج کے بغیر حقیقت کو پالیتا ہے۔ یہ آیاتِ تشریعی اگر انھیں بغور دیکھا جائے تو اپنے مشمولات کے لحاظ سے خود ہی اپنی صداقت کی دلیل ہیں۔

علاوہ بریں ان آیات کے طرف دار اور گرویدہ وہ لوگ ہیں جنھیں علم و معرفت حاصل ہے۔ ہر چند کہ وُہ تہی دست اور پا برہنہ ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی فکر و خیال کی وقعت اور قدر کی شناخت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اُس مکتبِ فکر کے حامی کون لوگ ہیں۔ اگر اُس کے بانی کے گرد نادان یا چالاک و عیار لوگ جمع ہو گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ وُہ بھی اسی قماش کا ہوگا۔ لیکن اگر اُس مکتبِ فکر کے حامی وہ لوگ ہیں جن کے سینے میں اسرارِ علوم پوشیدہ ہیں تو یہ اُس فکر کی حقانیت کی دلیل ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صداقتِ قرآن کے حامیوں اور عاشقوں میں علمائے اہلِ کتاب کا ایک گروہ اور حضرت ابوذر، حضرت سلیمان، حضرت مقداد، حضرت عمار یاسر اور حضرت علیؑ جیسی بلند شخصیتیں تھیں۔

اہلِ بیت علیہم السلام سے جو روایات مروی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اہلِ بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ مگر آیت کا مفہوم اسے منحصر نہیں کرتا اس لیے یہ روایات "الذین اوتوا العلم" کا واضح مصداق بتاتی ہیں[1]

اگرچہ بعض روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ اس آیت میں "الذین اوتوا العلم" سے خصوصیت سے مراد آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ درحقیقت یہ قرآن کے علم کامل کے مرحلے کی طرف اشارہ ہے جو انھیں عطا ہوا ہے۔ لیکن اِس امر میں کوئی مانع نہیں ہے کہ دیگر علما اور صاحبانِ عقل و خرد بھی علومِ قرآنی سے بہرہ وَر ہوں۔

ضمناً: اس آیت سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ علم و دانش کا انحصار صرف کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے اور کتاب پڑھنے پر نہیں ہے کیونکہ آیاتِ گزشتہ سے صریحاً یہ ثابت ہے کہ رسول اللہؐ کبھی کسی مکتب میں نہیں گئے تھے اور اُنھوں نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا مگر پھر بھی وہ "الذین اوتوا العلم" کے بہترین اور افضل ترین مصداق ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ علم رسمی کے ماورا ایک برتر علم ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے قلب میں بصورتِ نُور ودیعت کیا جاتا ہے:

العلم نورٌ یقذفه الله فی قلب من یشآءُ

اور درحقیقت جوہرِ علم یہی ہے۔ باقی تو پوست اور چھلکا ہے۔

اِس آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے۔ عناد پیشہ ستمگروں کے علاوہ کوئی بھی ہماری آیات کا انکار نہیں کرتا (وما یجحد بایاتنا الا الظالمون)۔

کیونکہ اُن آیات کے معانی و مفاہیم روشن ہیں اور وہ پیغمبرؐ اُنھیں لایا ہے۔ جس نے کبھی سبق نہیں پڑھا اور اُمّی ہے۔ اور صاحبانِ فکر اہلِ علم اُن پر ایمان لائے ہیں۔

---

[1] یہ روایات تفصیلی طور پر تفسیر برہان کی جلد ۳ صفحہ ۲۵۲ پر مذکور ہیں۔

Marfat.com

علاوہ بریں مجموعی طور پر ان آیات کے مضامین اور مشمولات روشن و آشکارا ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں بیّنات کہتے ہیں اور گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی اُن کے مضامین آئے ہیں۔

اِن سب باتوں کے باوجود کیا سوائے اُن لوگوں کے جو نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ مُعاشرے پر ظلم کرتے ہیں، کوئی شخص بھی اُن کا انکار کر سکتا ہے؟ (بطور تکرار تحریر ہے کہ کلمہ "جحد" اُس مقام پر بولا جاتا ہے کہ انسان کسی چیز کا جان بُوجھ کر انکار کرے)۔

چند اہم نکات

۱۔ **ہمارے محبوب پیمبر جو کبھی مکتب میں نہیں گئے:** یہ درست ہے کہ لکھنا پڑھنا ہر انسان کے لیے باعثِ کمال سمجھا جاتا ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے عدم واقفیت ہی کمال بن جاتا ہے۔ یہ اصول حضرت خاتم الانبیاءؐ پر بالخصوص صادق آتا ہے۔

کیونکہ، بالفرض اگر کوئی تعلیم یافتہ عالم یا کوئی آگاہِ علوم اور کثیر المطالعہ فلسفی نبوّت کا دعویٰ کرے اور قوم کے سامنے کوئی کتاب یہ کہہ کر پیش کرے کہ "یہ کتاب آسمانی ہے" تو اِس صُورت میں قوم کی طرف سے شکوک پیش آنے کا امکان ہے کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب خود اسی شخص نے تصنیف کرلی ہو۔ لیکن ——— اگر ہم یہ دیکھیں کہ ایک علمی لحاظ سے پس ماندہ قوم میں سے ایک ایسا انسان اُٹھتا ہے جس نے کبھی کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، کوئی کتاب نہیں پڑھی اور نہ کبھی کوئی صفحہ لکھا اور وہ ایک ایسی عظیم المرتبت کتاب پیش کرتا ہے جو نہایت بلند اور عالی مضامین پر مشتمل ہے تو یہ ادراک کرنا قطعی آسان ہے کہ یہ کتاب اُس کی تصنیف یا تخلیقِ فکر نہیں ہے۔ بلکہ وحی آسمانی اور تعلیمِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔

قرآن کی دوسری آیات میں آنحضرتؐ کے لیے کلمہ "اُمّی" استعمال ہُوا ہے۔ چنانچہ ہم نے سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے تحت اِس کلمہ کی تین تفسیریں لکھی ہیں۔ اُن میں سے بہتر تفسیر "درس ناخواندہ" ہے۔ درحقیقت حجاز میں کوئی مدرسہ نہ تھا کہ جہاں پیمبرِ اسلامؐ تعلیم حاصل کرتے اور نہ کوئی معلّم تھا جس سے علمی استفادہ کر سکتے۔ ہم نے اِس سے پہلے یہ کہا ہے کہ مکّہ میں ایسے لوگ جو لکھ پڑھ سکتے تھے، سترہؐ سے زیادہ نہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت صرف ایک ہی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔[1]

یہ امر خلافِ فطرت ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں مبادی علم سے آشنا لوگ بھی اس قدر کمیاب اور انگشت شمار ہوں اگر کوئی آدمی صاحبِ علم و معرفت ہو اور لوگ اُسے نہ جانتے ہوں۔ اِن میں سے اگر کسی نے قطعی طور پر یہ کہا ہو کہ میں نے ذرا بھی تعلیم حاصل نہیں کی اور اُس کے اِس دعویٰ پر کسی نے بھی شک نہ کیا ہو تو یہ واقعہ مُدعی کے صدقِ قول پر دلیل ہے۔

بہرحال آیات زیرِ بحث میں جنابِ رسالت مآبؐ کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے وہ اعجازِ قرآن کو ثابت کرنے اور بہانہ جُو لوگوں کی بہانہ شکنی کے لیے نہایت مؤثر اور کافی ہے۔

---

[1] فتوح البلدان بلاذری طبع مصر ص۴۵۹۔

Marfat.com

جی ہاں! رسالت مآبؐ بے نظیر اور عظیم عالم تھے اور آنحضرتؐ نے صرف مکتب وحی میں تحصیلِ علم کی تھی۔

بعض لوگوں کے لیے جو ایک بہانہ باقی رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے بعثت نبوت سے پہلے ملک شام کے ایک دو سفر کیے تھے۔ (وہ بھی قلیل مُدّت کے لیے جس میں آپ تجارتی کاروبار میں مصروف رہے تھے) تو ممکن ہے اُن ایک دو سفروں میں آپؐ علمائے اہلِ کتاب سے ملے ہوں اور اُن سے دینی مسائل تحصیل کیے ہوں۔

اس ادّعا کے ضُعف کی دلیل خُود اسی میں پوشیدہ ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسا انسان جس نے کبھی مکتب کا مُنہ نہیں دیکھا نہ کوئی حرف پڑھا وہ پیمبرانِ گزشتہ کی تمام تاریخ، احکام و قوانین اور معارفِ عالی کو لوگوں سے سُن کر اتنی جلد یاد کرلے اور اُنھیں تئیس سال کی مُدّت میں بروئے کار لائے اور جب اُسے ایسے مسائل سے سابقہ پڑے جن کے پیش آنے کا کبھی گمان بھی نہ ہو تو اس کا ردّ عمل نہایت حق بجانب ہو۔

یہ بات ٹھیک ویسی ہی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص نے تمام طبّی علوم چند روز میں ازبر کرلیے ہیں کیونکہ وُہ فلاں ہسپتال میں ڈاکٹروں کو بیماروں کا علاج کرتے دیکھتا رہا تھا۔ یہ بات تو بالکل مذاق معلوم ہوتی ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ لازمی ہے کہ یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ آنحضرتؐ کو نبوّت پر فائز ہونے کے بعد تعلیماتِ الٰہی کے ذریعے پڑھنے لکھنے پر قدرت حاصل ہوگئی ہو۔ اگرچہ کسی تاریخ میں بھی یہ نہیں لکھا کہ آپؐ نے رسمی طور پر تحصیلِ علم کی ہو۔ آپؐ کوئی تحریر پڑھ سکتے ہوں یا اپنے ہاتھ سے خط بھی لکھ سکتے ہوں۔

اور ہوسکتا ہے یہ بھی کہا جائے کہ آنحضرتؐ تمام عمر جو اس کام سے پرہیز فرماتے رہے، شاید اس وجہ سے تھا کہ بہانہ جو لوگوں کے ہاتھ کوئی ثبوت نہ آجائے۔

کُتب تاریخ اور حدیث میں صرف ایک موقع کا ذکر ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور وہ ہے صُلح حدیبیہ کا واقعہ۔ مسند احمد میں یہ لکھا ہے کہ آں جنابؐ نے خُود اپنے ہاتھ میں قلم پکڑا اور صُلح نامہ لکھا۔ [۱]

لیکن علمائے اسلام کی ایک جماعت نے اس حدیث کا انکار کیا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ یہ قول زیرِ بحث آیات قرآنی کے صریحًا خلاف ہے۔ ہرچند کہ بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ آیت میں صراحت نہیں ہے۔ کیونکہ بقول اُن کے ان آیات میں پیغمبرؐ کی قبل از نبوّت کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ آپؐ نے مقام نبوّت پر فائز ہونے کے بعد بطور استثناء ایک موقع پر کچھ لکھا ہو۔ آپؐ کا یہ فعل بھی معجزہ شمار ہوگا۔

بہرکیف ایسے مسئلے میں خبرِ واحد پر بھروسا کرنا حزم و احتیاط کے خلاف ہے اور علم اصول میں جو بات طے شدہ ہے اُس کے بھی خلاف ہے۔ ہرچند کہ اس حدیث کے صحیح مان لینے سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔ [۲]

* * *

۲۔ دُوسروں کے دِلوں میں نفوذ کا طریقہ : دِلوں کو مُسخّر کرنے اور دُوسروں کے افکار میں کلمۃُ الحق کے نفوذ کے لیے

[۱] مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۲۹۸۔

[۲] تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے تحت پیمبرِ اُمّی کی تشریح ملاحظہ ہو۔

Marfat.com

صرف قوی اور مستحکم استدلال ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ مدِمقابل سے رُو در رُو ہونے اور اُس سے گفتگو کرنے کے اُسلوب کو بھی عمیق ترین اثر پیدا کرنے میں دخل ہے۔

کیونکہ ـــــ بہت سے لوگ ہیں جو نہایت دقیق اور موشگاف بحث کر سکتے ہیں اور مسائل علمی سے باخبر اور ماہر ہیں۔ لیکن چونکہ وہ بطورِ احسن اور نتیجہ بخش بحث کرنے کے اسلوب سے واقف نہیں ہیں اس لیے اُن کی گفتگو دُوسروں کے دلوں میں بہت کم اثر کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کو قائل کرنے کے لیے صرف اس کی عقل و فکر کو مطمئن کرنا یا اُسے لاجواب کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ کلمۂ حق کے کسی کی شخصیت میں اُترنے کے لیے اُس کی تسکینِ جذبات ضروری ہے کیونکہ انسان کی نصف شخصیت کی تعمیر جذبات و احساسات سے ہوئی ہے۔

اِس بات کو دُوسرے الفاظ میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ مطالب گفتگو کا صرف کیفیتِ شعُور میں اُترنا کافی نہیں ہے بلکہ اُنھیں نفس کے تحتِ شعور کا حصّہ بن جانا چاہیئے۔

انبیاءؑ کرام اور بالخصوص پیمبرِ اسلامؐ اور آئمہ ہدیٰؑ کے حالات پر غور کرنے سے خُوب واضح ہوتا ہے کہ یہ بزرگوار اپنے تبلیغی اور تربیتی مقاصد کو حاصل کرنے اور لوگوں کے قلوب میں کلمۂ حق کے نفوذ کے لیے اخلاقِ اجتماعی اور نفسیاتی اصول کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ اُن کا لوگوں سے گفتگو کرنے کا طریقہ ایسا تھا کہ وہ بہت جلد انہیں اپنے مقصد کی طرف متوجہ اور جذب کر لیتے تھے۔ اگرچہ بعض حضرات آئمہؑ کے ایسے اثرات کو معجزہ قرار دینا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اگر ہم بھی لوگوں سے گفتگو کرنے میں اُن ہی کے شیوۂ بحث اور سُنّت و روش کو اختیار کریں تو بہت جلد اُنھیں متاثر کر سکتے ہیں اور اُن کی رُوح کی گہرائی میں نفوذ کر سکتے ہیں۔

پیمبرِ اسلامؐ کے متعلق قرآن میں بصراحت مذکور ہے :-

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك۔

یہ رحمتِ الٰہی ہے کہ تُو اُن کے لیے نرم خو ہے اگر تو سخت اور سنگدل ہوتا تو یہ لوگ تیرے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ (آلِ عمران - ۱۵۹)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ گھنٹوں بحث اور گفتگو کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنے مذاکرات میں کامیاب نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس مدِمقابل اپنے عقیدۂ باطل میں سخت تر اور زیادہ متعصب ہو جاتا ہے۔ محض اِس وجہ سے کہ اُنھوں نے اپنی بحث میں " روشِ احسن " کو ملحوظ نہیں رکھا۔

بحث میں سختی، اپنی برتری کا اثبات، دوسرے کی تحقیر، اظہارِ کبر و غرور، دُوسروں کے عقاید و خیالات کا عدمِ احترام اور بحث میں خلوص کا فقدان یہ سب باتیں مباحثہ میں انسان کی شکست کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن اخلاقِ اسلامی کے مباحث میں " جدال " اور " مراء " کی تحریم کے تحت ایک بحث کا ذکر آتا ہے۔ اُس سے مُراد ایسی بحث ہے جس میں حق جوئی اور حق طلبی

Marfat.com

کی نیت نہ ہو بلکہ اُس کی غایت محض لفظی جنگ، اپنی برتری کا اثبات اور اپنی بات کی پچ ہو۔

"جدال" اور "مراء" کی حرمت اِن کے اخلاقی اور معنوی پہلوؤں کے علاوہ اِس لیے بھی ہے کہ اِس قسم کی بحثوں سے فکری ارتقا نہیں ہوتا۔

"جدال اور" مراء" کی حُرمت تو یکساں ہے۔ مگر علمائے اسلام نے اِن دونوں میں فرق کیا ہے۔ اُنھوں نے "مراء" کو بمعنی اظہار فضل وکمال اور "جدال" کو ایسا وتیرہ کہا ہے جو دُوسرے کی تحقیر کے لیے ہو۔ نیز "جدال" بحث میں ابتدائی حملے کو کہتے ہیں اور "مراء" دفاعی حملے کو کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں — علمی مسائل میں بحث کرنے کو "جدال" کہتے ہیں۔ اور "مراء" عام ہے خواہ بحث علمی ہو یا غیرعلمی

البتہ "جدال ومراء" کی اِن تفاسیر میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بہرحال مخالفین سے بحث ومجادلہ کبھی تو "جدال بہ اُحسن" کے اُصول پر کیا جاتا ہے۔ اور وہ ایسی بحث ہوتی ہے۔ جس میں اُن شرائط کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے اور کبھی وہ بحث "غیر احسن" ہوتی ہے۔ اور وُہ ایسی بحث ہے جس میں شرائط مذکورہ کو فراموش کردیا جاتا ہے۔

اَب ہم اِس گفتگو کو چند سبق آموز اور ناطق روایات لکھ کر ختم کرتے ہیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے آپ فرماتے ہیں :

لا یستکمل عبد حقیقة الایمان حتّٰی یدع المراء وان کان محقّا ۔

کوئی آدمی بھی بطور کمال حقیقتِ ایمان کو نہیں پاتا تاوقتیکہ وہ "مراء" کو ترک کرے۔ خواہ وُہ حق پر ہی ہو۔[1]

ایک اور روایت میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمانؑ پیغمبر نے اپنے فرزند سے کہا :

"یا بُنیّ ایاك والمراء فانّهٗ لیست فیه منفعة وهو یهیج بین الاخوان العداوة "

اے میرے بیٹے ! تو "مراء" سے پرہیز کر کیونکہ صرف یہی نہیں کہ اُس میں کوئی منفعت نہیں بلکہ وہ بھائیوں کے درمیان دُشمنی کی آگ بھڑکاتا ہے۔[2]

نیز پیمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے کہ :

ماضلّ قوم بعد ان هداهم الّا اُوتوا الجدال

کوئی قوم ہدایت یافتہ ہونے کے بعد گمراہ نہیں ہوئی۔ مگر یہ کہ وہ آپس میں جنگ جُویانہ اور اثبات برتری کی ایسی بحثیں کرنے لگے جن میں کوئی حقیقت نہ ہو۔[3]

---

[1] سفینة البحار مادہ "مراء"۔
[2]، [3] احیاء العلوم۔

Marfat.com

۳۔ کفّار اور ظالمین : آیات زیر بحث میں ایک مرتبہ ہمیں یہ جملہ نظر آتا ہے :
ہماری آیات کا کوئی انکار نہیں کرتا مگر کفّار کہ وہ از روی عناد انکار کرتے ہیں۔
یہی جملہ بار دیگر قدرے تفاوت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جس میں کافرون کے بجائے ظالمون استعمال ہوا ہے :
" ہماری آیات کا ظالموں کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا"
ان دونوں آیات کے تقابل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تکرارِ مطلب نہیں ہے بلکہ ان میں دو مختلف مطالب بیان کیے گئے ہیں۔

آیت ۴۷ میں جہاں کافرون استعمال ہوا ہے یہاں اشارہ منکرین کے عقیدے کی طرف ہے اور آیت ۴۹ میں جہاں ظالمون کہا گیا ہے یہاں اہلِ انکار کا عمل مراد ہے۔

اوّل یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنی رائے اور تجویز یا اپنے بزرگوں کی کورانہ تقلید کی وجہ سے کفر و شرک کو اختیار کر لیا ہے، وہ ہر مُنزل من اللہ آیت کا انکار کرتے ہیں۔ خواہ اُن کی عقل اُسے درست اور حق ہی سمجھتی ہو۔

دُوسرے مقام پر یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنی ذات پر اور معاشرے پر ظلم کی راہ اختیار کی ہے، اسی طرزِ عمل میں اپنے ناجائز مفادات دیکھتے ہیں اور اس ظلم کو جاری رکھنے کا مُصمّم ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ تو یہ فطری امر ہے کہ وُہ ہماری آیات کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ہماری آیات جس طرح اُن کے اُسلوبِ فکر سے ہم آہنگ نہیں ہیں اُن کے شیوۂ عمل سے بھی مطابقت نہیں رکھتیں۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۵۰۔ وَقَالُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ
عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○

۵۱۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

۵۲۔ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا
بِاللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

۵۳۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ
الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

۵۴۔ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۙ

۵۵۔ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ
وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۵۰۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف سے معجزات نازل کیوں نہیں ہوئے تو

Marfat.com

اُن سے کہہ دو کہ معجزات تو خُدا ہی کے پاس ہیں (اور اسی کے حکم سے نازل
ہوتے ہیں نہ کہ میری اور تمہاری پسند کے مطابق) اور مَیں تو کُھلم کُھلا ڈرانے والا ہوں۔

۵۱۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر یہ آسمانی کتاب نازل
کی ہے کہ جو پیہم اُنھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لیے
رحمت اور نصیحت ہے۔

۵۲۔ اِن سے کہہ دو : میرے اور تمہارے درمیان خُدا ہی گواہ کافی ہے۔ اور وہ جو کچھ
آسمانوں اور زمین میں ہے اُسے جانتا ہے۔ اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور
اُنھوں نے خُدا کا انکار کیا وہ خسارے میں ہیں۔

۵۳۔ یہ لوگ تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ اگر ایک وقت مقرر نہ ہو چکا
ہوتا تو اُن پر (اللہ کا) عذاب آجاتا اور یہ عذاب آخر کار اُن پر ناگہانی طور پر نازل ہوگا
جب کہ وُہ بے خبر ہوں گے۔

۵۴۔ یہ تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ دراں حالیکہ جہنّم تو کافروں کو گھیرے
ہُوئے ہے۔

۵۵۔ اور جس دن (اللہ کا) عذاب اُنھیں اُوپر سے نیچے تک ڈھک لے گا تو اُن سے
کہا جائے گا تم جو کام کیا کرتے تھے اَب اُس کا مزہ چکھو (اور یہ بہت سخت
اور دردناک دن ہوگا)

Marfat.com

تفسیر

کیا قرآن بطور معجزہ کافی نہیں ہے؟

جو لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور باطل پر اصرار کی وجہ سے اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ قرآن کے استدلال اور منطقی بیان کو بہ اطاعت قبول کرلیں اور آنحضرتؐ کی حقانیت کی اس جہت سے پذیرائی کریں کہ وہ تحصیل علم نہ کرنے کے باوجود ایسی کتاب لائے۔ اُنھوں نے ایک نیا بہانہ تلاش کرلیا۔ چنانچہ قرآن کی زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت میں اُس کا ذکر ہے اُنھوں نے بطور تمسخر کہا کہ اُس پر (موسٰی اور عیسٰی کی طرح) خدا کی طرف سے معجزات کیوں نازل نہیں ہوئے: (وقالوا لولا انزل علیه اٰیاتٌ من ربه)۔

اُس کے پاس عصائے مُوسٰی، یدِ بیضا اور دمِ مسیحا جیسے معجزات کیوں نہیں ہیں؟

وُہ اپنے دُشمنوں کو اپنے عظیم معجزات کے ذریعے نابُود کیوں نہیں کر دیتا۔ جس طرح کہ موسٰیؑ، شعیبؑ، ہُودؑ اور نوحؑ و ثمودؑ نے نابود کر دیا تھا۔

یا جس طرح کہ سُورہَ بنی اسرائیل میں اس گروہ کا قول پایا جاتا ہے کہ (اُنھوں نے کہا) پیمبرِ اسلامؐ مکہ کے خشک بیابان میں پانی کے چشمے کیوں جاری نہیں کر دیتا، اُس کے پاس سونے کا محل کیوں نہیں ہے۔ وہ آسمان پر کیوں چڑھ نہیں جاتا اور اوران کے لیے خدا کی طرف سے آسمان سے ایک خط کیوں نہیں لاتا؟ [1]

تواریخ میں بصراحت یہ واقعات موجود ہیں کہ پیمبرِ اسلام قرآن کے علاوہ اور بھی معجزات رکھتے تھے۔ مگر کفار ان باتوں سے درحقیقت طلب گارِ معجزہ نہ تھے۔ بلکہ وہ اِن بہانہ سازیوں سے ایک طرف تو اعجازِ قرآن سے صرف نظر کرنا چاہتے تھے۔ دُوسری طرف وُہ منہ مانگے معجزے کے خواہش مند تھے۔ من پسند کے معجزات کا تو مطلب یہ ہے کہ پیغمبرِ خداؐ ہر شخص کی خواہش کے مطابق، وُہ جس قسم کے بھی معجزے کا طلب گار ہو، کر دکھائیں مثلاً: اُن میں سے ایک آدمی کہے کہ "آپ آبِ شیریں کا چشمہ جاری کر دیجیے۔

دُوسرا کہے کہ مجھے تو یہ معجزہ پسند نہیں، آپ مکہ کے پہاڑوں کو سُونے کا بنا دیجیے۔ تیسرا کہے کہ یہ معجزات کافی نہیں ہیں، آپ ہمارے سامنے ہی آسمان پر چڑھ جائیں۔

اِس صُورت سے یہ لوگ معجزات کو بے قدر بازیچہَ اطفال بنا دیں۔ اور پھر انجام یہ ہو کہ معجزات دیکھنے کے بعد بھی کہیں کہ یہ تو جادوگر ہے۔

لہٰذا قرآن میں سورہَ انعام کی آیت ۱۱۱ میں بیان کیا گیا ہے:

ولو اننا نزلنا الیهم الملٰئکة وکلمهم الموتٰی وحشرنا علیهم

---

[1] سورہَ بنی اسرائیل آیت ۹۰ تا ۹۳۔

Marfat.com

كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا

اگر ہم اُن کی طرف فرشتوں کو بھیجتے اور مردے اُن سے باتیں کرتے اور تمام چیزوں کو اُن کے سامنے موجود کر دیتے تو وُہ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔

بہر حال قرآن میں ان ہٹ دھرم بہانہ ساز لوگوں کو دو طرح سے جواب دیا گیا ہے۔

اوّل یہ کہ اے رسول ان سے کہہ دو کہ معجزہ میرا کام نہیں جو تمہاری خواہش کے مطابق صادر ہوتا ہے بلکہ تمام معجزات خدا کے اختیار میں ہیں: (قُلْ اِنَّمَا الْاٰيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ)۔

خدا ہی اس مصلحت کو بہتر جانتا ہے کہ کس قوم کے لیے، کس وقت اور کونسا معجزہ مناسب ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کون لوگ جویائے حق اور ذوقِ تحقیق رکھتے ہیں۔ تو وہ معجزہ بھی اُن ہی کو دکھاتا ہے نیز وہ جانتا ہے کہ کون سے لوگ بہانہ ساز اور اپنی خواہشاتِ نفس کے غلام ہیں۔

اور ان سے کہہ دو کہ میں تو فقط ڈرانے والا اور خبردار کرنے والا ہوں: (وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ)۔

میرا فرض تو صرف ڈرانا، تبلیغ کرنا اور تمہیں کلامِ خدا سنانا ہے۔ رہا معجزات اور خوارق عادات کا دکھانا، سو یہ خدا کے اختیار میں ہے۔

٭ ٭ ٭

دُوسرا جواب یہ ہے کہ کیا اُن کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب آسمانی نازل کی ہے جو ہمیشہ اُنھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے: (اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ)۔

یہ لوگ مادی معجزات کا تقاضا کرتے ہیں، درآں حالیکہ قرآن برترین رُوحانی معجزہ ہے۔

یہ لوگ زُود گزر معجزہ کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ قرآن جاودانی معجزہ ہے اور رات دن اُس کی آیات اُنھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ناخواندہ انسان (اور اگر بالفرض اُس نے پڑھا بھی ہو) ایسی کتاب پیش کرے جس کے مشمولات اور مضامین ایسے عجیب ہیں اور جس کی فصاحت میں ایسا جذب ہے جو انسانوں کی طاقت سے بالا ہے۔ اور وُہ جملہ اہلِ عالم کو مقابلے کا چیلنج کر دے۔ اور سب لوگ اس کتاب کا جواب پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ رہ جائیں۔

اگر ـــــ وہ واقعاً معجزے کے طلب گار ہیں تو ہم نے قرآن نازل کر کے اُن کے مطالبے سے بھی بڑا معجزہ اُن کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ مگر نہیں ـــــ وہ لوگ حق طلب نہیں ہیں بلکہ بہانہ ساز ہیں۔

یہ امر مدِّ نظر رہے کہ جملہ "اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ" (کیا اُن کے لیے کافی نہیں ہے) معمولاً ایسے موقع پر بولا جاتا ہے کہ جب انسان کوئی کام ایسا کرے جو طرفِ مقابل کی توقع اور اُمید سے کہیں بالا ہو اور مدِّ مقابل اُس کی قدر و وقعت سے غافل ہو یا تجاہلِ عارفانہ سے کام لے۔ مثلاً مدِّ مقابل یہ اعتراض کرے کہ تُو نے میری فلاں خدمت کیوں نہیں کی؟ اور ہم اُس کی خواہش سے بھی عظیم تر خدمت کی نشان دہی کریں (جسے اُس نے نظر انداز کر رکھا ہو) اور کہیں کہ کیا یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری اتنی بڑی خدمت کی ہے؟

Marfat.com

اِن سب باتوں سے قطع نظر معجزہ کو پیغمبر کی دعوت کی کیفیت اور زمان و مکان کی شرائط سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔
اِس لیے جس پیمبر کی شریعت جاودانی ہے، اُس کا معجزہ بھی جاودانی ہی ہونا چاہیئے۔
جس پیغمبر کی دعوت جہان گیر ہے اور آئندہ زمانوں پر بھی حاوی ہو اُس کا معجزہ بھی رُوحانی اور عقلی اُسلوب کا ہونا چاہیئے۔
جو تمام اہلِ فکر اور اہلِ خرد کے لیے موجب جذب وکشش ہو۔ یقیناً قرآن ہی اس مقصد کو پُورا کرتا ہے نہ کہ عصائے مُوسٰی اور ید بیضا۔

آیت کے آخر میں مزید توضیح و تاکید کے لیے کہا گیا ہے: اِس آسمانی کتاب میں ایمان لانے والوں کے لیے عظیم رحمت اور نصیحت موجود ہے: (انّ فی ذالك لرحمةً وذكرٰى لقومٍ يؤمنون)۔
واقعاً قرآن رحمت بھی ہے اور پند و نصیحت حاصل کرنے کا وسیلہ بھی ہے لیکن صرف اہلِ ایمان کے لیے۔ صرف اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے حقیقت کو خوش آمدید کہنے کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیئے ہیں، صرف اُن لوگوں کے لیے جو طالب نور ہیں اور راہِ مُستقیم کے جُویا ہیں۔ ایسے لوگ اس رحمت کا اپنی پُوری شخصیت کے ساتھ ادراک کرتے ہیں اور اُس کے سائے میں راحت پاتے ہیں۔ یہ لوگ آیاتِ قرآنی کو جتنی مرتبہ بھی پڑھتے ہیں اُن کے قلوب پر اُن کے نئے معانی روشن ہو جاتے ہیں۔
ممکن ہے کہ "رحمت" اور "ذكرٰى" میں یہ فرق ہو کہ قرآن صرف ایک معجزہ اور دفترِ نصیحت ہی نہیں ہے بلکہ اِن باتوں کے علاوہ، وہ حیاتِ انسانی کے لیے ایسے قوانین اور اصول عمل سے پُر ہے جن کی اِتباع اِنسان کے لیے باعثِ نزولِ رحمت ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ اس میں انسان کی اخلاقی اور رُوحانی تربیت اور تکمیلِ انسانیت کے قواعد اور نصائح موجود ہیں۔
اِس کے موازنہ میں عصائے موسٰی ایک معجزہ تو تھا مگر لوگوں کی روزمرّہ کی زندگی میں تو اُس کا کچھ اثر نہ تھا۔
برخلاف اس کے قرآن اپنے اسلوب کے لحاظ سے معجزہ تو ہے ہی مگر اُس میں اِنسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے مکمل پروگرام بھی ہے اور باعثِ رحمتِ الٰہی ہے۔

❖ ❖ ❖

چونکہ ہر مُدعی کو اپنے اثباتِ دعویٰ کے لیے شاہد و گواہ کی ضرورت ہے، اس لیے آیۂ مابعد میں فرمایا گیا ہے:
اے رسُول اِن سے کہہ دو کہ یہی کافی ہے کہ: میرے اور تمہارے درمیان خدا گواہ ہے: (قُل كفٰى بالله بينى وبينكم شهيدًا)۔
یہ امر واضح ہے کہ کوئی گواہ جس قدر بھی حقیقتِ قضیہ سے زیادہ باخبر ہوگا، اُس کی گواہی کی قدر اُسی نسبت سے زیادہ ہوگی۔
لہٰذا جُملہ مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے: وہ خدا جو میرا گواہ ہے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُس سب کو جانتا ہے: (يعلم ما فى السّمٰوات والارض)۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا نے اپنے پیمبرؐ کی حقانیت پر کس طرح گواہی دی ہے۔
ممکن ہے کہ صداقت پیغمبرؐ کی یہ گواہی عملی ہو۔ جب خُدا نے قرآن جیسا عظیم معجزہ پیغمبرؐ کو عطا کیا تو گویا عملاً اُن کی حقانیت

Marfat.com

کی سند بھی جاری کر دی کیونکر کیا یہ ممکن ہے کہ خُدائے حکیم و عادل قرآن جیسا معجزہ (العیاذ باللہ) کسی دروغ گو کو عطا کر دے؛ اس بنا پر کسی کو ایسا معجزہ عطا کرنا ہی اُس کی نبوّت کی صداقت پر خدا کی بہترین گواہی ہے۔

مذکورۂ بالا عملی گواہی کے علاوہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں خدا کی قولی شہادت بھی موجود ہے۔ چنانچہ سورہ احزاب کی آیت ۴۰ میں مذکور ہے:

ماکان محمد ابا احدٍ من رجالکم ولٰکن رسول اللّٰہ وخاتم النّبیین

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں وہ تو اللہ کے رسُول اور خاتم النبیین ہیں۔

اور سُورہ فتح کی آیت ۲۹ میں ہے:

محمد رسول اللّٰہ والّذین معہ اشدّاءُ علی الکفار رحماءُ بینھم

محمدؐ رسُولِ خدا ہیں اور جو لوگ اُس کے ساتھ ہیں وُہ کفّار کے مقابلے میں سخت ہیں اور باہم ایک دوسرے پر رحیم اور مہربان ہیں۔

بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ آیت مدینہ کے بعض اشراف یہود کے جواب میں نازل ہوئی ہے جیسے کعب ابن اشرف اور اس کے مُتبعین تھے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ اے محمدؐ کیا کوئی شخص اس بات کا گواہ ہے کہ تم خدا کے رسول ہو؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہُوئی اور کہا کہ یہ گواہی خدا دیتا ہے۔

اس کی تفسیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شہادتِ خدا سے مُراد یہ ہے کہ سابق آسمانی کتابوں میں یہ شہادت موجود ہے جسے اہلِ کتاب کے علماء اچھی طرح جانتے ہیں۔ بہرکیف ان تینوں تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے اور ممکن ہے کہ اِس آیت میں یہ تمام مفاہیم جمع ہوں۔

آیت کے آخیر میں بطور تہدید و تنبیہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اُنھوں نے خدا کا انکار کیا، وہ درحقیقت خسارے میں ہیں: (والّذین اٰمنوا بالباطل وکفروا باللّٰہ اُولٰئک ھم الخاسرون)

اس سے بڑا اور کون سا خسارہ ہوگا کہ انسان اپنی شخصیت کے تمام سرمائے کو کسی ناچیز اور بے قدر شے کے لیے گنوائے جیسا کہ مشرکین کا عمل تھا کہ اُنھوں نے اپنا دل و جان بُتوں کے حوالے کر دیا تھا اور اُنھوں نے اپنی تمام جسمانی توانائیں اور مجبلہ انفرادی اور اجتماعی وسائل کو آئینِ بُت پرستی کی ترویج و تبلیغ اور نامِ خدا کو محو کر دینے میں صَرف کر دیا تھا مگر اُنھیں خسران و زیاں کے علاوہ اس کا کچھ بھی پھل نہ ملا۔

غالباً آیاتِ قرآنی میں اسی عظیم خسران کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کبھی کلمہ " اخسر " کہہ کر بھی اس حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یعنی اس سے بڑا اور کوئی نقصان نہیں ہے۔ (ہُود - ۲۲، نمل - ۵ - کہف - ۱۰۳)

Marfat.com

یہ بات بھی اہم ہے کہ انسان کو کسی تجارت میں نقصان ہو جاتا ہے اور وہ اپنا سرمایہ گنوا بیٹھتا ہے اور اس کا دیوالیہ نکل جاتا ہے مگر کبھی اس سے بھی زیادہ نقصان ہوتا ہے کہ اُس تاجر کے شانوں پر قرض کا بار رہ جاتا ہے اور دیوالیہ ہونے کی یہ بدترین شکل ہے ۔ مُشرکین کا بالکل یہی حال تھا ۔ بلکہ وہ کبھی دوسروں کی گمراہی اور ایمان کے دیوالیہ پن کا باعث بھی ہوتے تھے[1]

ٹ ٹ ٹ

گزشتہ آیات میں جناب رسالت مآبؐ کی دعوت الی الحق کے مقابلے میں کفار کی دو بہانہ تراشیوں اور اُن کے جوابات کا ذکر ہوا تھا ۔

اوّل یہ کہ وہ کہتے تھے کہ پیغمبر کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتا ؟

قرآن میں اس کا یہ جواب دیا گیا تھا کہ یہ کتاب آسمانی خود برترین معجزہ ہے ۔

دُوسرے یہ کہ اس پیغمبر کی حقانیت کا گواہ کون ہے ؟

قرآن میں یہ جواب دیا گیا کہ وہ خدا گواہ ہے جو عالمِ کُل ہے ۔

زیرِ بحث آیت میں کفار کی ایک تیسری بہانہ سازی کا ذکر ہے کہ : یہ لوگ عذاب الٰہی کے بارے میں عجلت کرتے ہیں ۔ اور اُسے تجھ سے بہت جلدی چاہتے ہیں : (ویستعجلونك بالعذاب) ۔

وُہ کہتے ہیں کہ اگر عذاب الٰہی حق ہے اور وُہ کُفار پر نازل ہوتا ہے تو وُہ ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتا ؟

قرآن میں اِس سوال کے تین جواب دیئے گئے ہیں :

اوّل یہ کہ : اگر وقت موعُود متعیّن نہ ہوتا تو اُن پر فوراً خُدا کا عذاب نازل ہو جاتا : (ولولا اجل مسمّی لجاءھم العذاب) ۔

وقت اِس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ منشائے الٰہی یہ ہے کہ اوّل تو یہ خواب کفر سے بیدار ہوں اور اگر ایسا نہ ہو تو مُہلتِ وقت سے اُن پر اتمامِ حُجت ہو جائے ۔ کیونکہ خدا اپنے کاموں میں بخلافِ حکمت جلد بازی نہیں کرتا ۔

دُوسرے یہ کہ : جو لوگ یہ بات کہتے ہیں ، اُنھیں اس کا کیا اطمینان ہے کہ اُن کے طلب کرتے ہی اُن پر عذاب نازل ہو جائے گا ؟ کیونکہ یہ عذاب تو اس حالت میں کہ وہ بے خبر ہوں گے اُن پر ناگہاں اور بدون آثار نازل ہو جائے گا : (ولیأتینھم بغتة وھم لا یشعرون)[2]

اگرچہ عذاب کا وقت موعود ، مُعیّن و مقرر ہے ۔ مگر اس کی تاخیر میں مصلحت یہ ہے کہ کُفار اُس سے آگاہ نہ ہوں اور وُہ ابتدائی آثار کے بغیر اُنھیں آ پکڑے ۔ کیونکہ اگر اُس وقت کا اعلان کر دیا جاتا تو گنہگاروں کی جراُت و جسارت اور بھی بڑھ جاتی ۔ وُہ وقت موعُود کے آخری لمحے تک اپنے گناہ و کفر کو جاری رکھتے اور جب یہ دیکھتے کہ وقتِ موعود کے مطابق عذاب کی گھڑیاں

[1] اِس موضوع پر تفصیلی بحث جلد ۱۲ میں سُورہ کہف کی آیت ۱۰۳ کے تحت درج کی جا چکی ہے ۔

[2] " بغتة " کا مادہ " بغت " (بروزن " وقت ") ہے اس کا معنی ہے کسی حادثہ کا ناگہاں اور بلا انتظار ہونا ۔

Marfat.com

نزدیک ہیں تو آخری لمحات میں سب توبہ کر لیتے اور خدا کی طرف رجوع کرتے۔

قوموں کی تربیتِ اخلاقی میں اس قسم کی سزاؤں کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کا وقتِ مقررہ نامعلوم رہے۔ تاکہ اُن کا خوف اور ڈر اُنھیں گناہوں سے باز رکھنے کا ایک مؤثر عامل ثابت ہو اور ہر گھڑی اپنا اثر دکھاتا رہے۔

ہم نے نزولِ عذاب کی جس حکمتِ تاخیر کا ذکر کیا ہے، اُس سے ثابت ہے کہ جُملہ " وھو لایشعرون " سے یہ مُراد نہیں ہے کہ اُنھیں اصلاً وجود عذاب ہی کا اِدراک نہ ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو عذاب میں کوئی حکمت ہی باقی نہ رہتی۔ بلکہ اس جُملے کا مقصود یہ ہے کہ اُنھیں وقوعِ عذاب کے وقت اور اُس کے آثار نزول کی مطلق خبر نہ ہوگی۔ بالفاظِ دیگر، اُن پر عذاب بحالتِ غفلت بجلی کی مانند ٹوٹ پڑے گا۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہانہ جُوئی صرف کُفّارِ مکہ ہی تک منحصر نہ تھی بلکہ قبل از آن دُوسری قومیں بھی تعجیلِ عذاب پر اصرار کرتی رہی تھیں۔

* * *

تیسرا جواب قرآن کی آیت مابعد میں دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ: اے رسولؐ یہ کفار تم سے عذاب الٰہی میں تعجیل کا تقاضا کرتے ہیں جب کہ جہنم نے اِن کافروں کا احاطہ کیا ہوا ہے: (یستعجلونك بالعذاب وانّ جهنّم لمحيطة بالكافرين)

مُراد یہ ہے کہ اگر عذاب دنیا میں تاخیر ہو جائے تو عذابِ آخرت تو اُن کے لیے سو فیصد قطعی اور یقینی ہے اور ایسا مُسلّم ہے کہ قرآن میں اس کا ذکر ایک امرِ وقوعی کے طور پر کیا گیا ہے۔ بایں الفاظ کہ جہنم گویا اب بھی اُن کا احاطہ کیے ہُوئے ہے۔

اِس آیت کی ایک دقیق تر تفسیر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بہ معنی حقیقی دو جہتوں سے جہنم اَب بھی اُنھیں گھیرے ہوئے ہے: اوّل تو دُنیاوی جہنم ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ شرک اور گناہوں کی جہنم میں مبتلا ہیں جو اُنھوں نے اپنے جلنے کے لیے خود فراہم کی ہے۔ وہ جنگ و خوں ریزی، نزاع و اختلاف باہمی، بدامنی اور عدم سکون، ظلم و بیدادگری اور ہوا و ہوس اور سرکشی کی جہنم میں گھرے ہوئے ہیں۔

دُوسرے یہ کہ آیاتِ قرآنی کے ظاہری مفہوم کے مطابق اِن کُفّار کے لیے جہنم اَب بھی موجود ہے اور جیسا کہ ہم نے سطور ماقبل میں تشریح کی ہے اسی دُنیا کے باطن میں ہے۔ اور اُس نے درحقیقت کُفّار کو گھیر رکھا ہے۔ چنانچہ سورہ تکاثر کی آیات ۵، ۶، ۷ میں اس کا ذکر موجود ہے:

كلّا لو تعلمون علم اليقين لترونّ الجحيم ثمّ لترونّها عين اليقين

ایسا نہیں ہے اگر تمہیں علم الیقین ہوتا تو جہنم کا مشاہدہ کرتے اور پھر اس کو عین الیقین سے دیکھتے۔ [1]

* * *

[1] اس موضوع کی توضیح کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد سوم میں آل عمران کی آیت ۱۳۳ کی تفسیر دیکھیے۔

Marfat.com

اُس کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ روز بڑا سخت اور دردناک ہوگا۔ جب عذاب الٰہی اُنھیں سر کے اُوپر اور پاؤں کے نیچے سے گھیر لے گا اور اُن سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم کرتے تھے آج اُس کا مزہ چکھو: (یوم یغشاھم العذاب من فوقھم ومن تحت ارجلھم ویقول ذوقوا ما کنتم تعملون)[۱]

یہ آیت ممکن ہے بروزِ قیامت کفار کے لیے احاطۂ عذاب جہنم کی توضیح کے لیے ہو۔

نیز ممکن ہے کہ اُس دردناک عذاب کا بیان ہو جس نے اُن کے اعمال کی وجہ سے اُنھیں آج گھیرا ہوا ہے اور کل کو ظاہر و آشکار ہوگا۔

بہرحال قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ عذاب اُن کے سر کے اُوپر اور پاؤں کے نیچے سے آئے گا اور بقیہ اطراف و جوانب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ بیان اِس مطلب پر حاوی ہے کہ جب آگ کے شعلے پاؤں کے نیچے سے بلند ہوں گے اور سر کے اُوپر سے نازل ہوں گے تو وہ اُن کفار کے تمام اطراف و جوانب کو گھیر لیں گے۔

اُصولاً فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص سر سے پاؤں تک بے عفتی کی دلدل میں ڈوبا ہوا ہے۔ یعنی اُس کا تمام وجود اِس گناہ میں غرق ہو گیا ہے۔

اِس طرح سے بعض مفسرین کو جو یہ مشکل پیش آئی کہ اُنھوں نے یہ غور کیا کہ قرآن میں بالا و پایئں کا ذکر تو ہوا ہے باقی چار اطراف کو کیوں چھوڑ دیا ہے، وہ حل ہو جاتی ہے۔

یہ واضح ہے کہ جملہ "ذوقوا ما کنتم تعملون" کا کہنے والا خدا ہے۔

علاوہ براں، یہ اِس قسم کے لوگوں کے لیے ایک نفسیاتی سزا ہے۔ اِس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ آخرت کی زندگی میں عذاب الٰہی انسان کی دُنیاوی بداعمالیوں کے ردِّ عمل، انعکاس اور تجسم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

⁂

چند اہم نکات

۱۔ دلائلِ اعجازِ قرآن: اِس میں شک نہیں کہ قرآن پیغمبرِ اسلام کا عظیم ترین معجزہ ہے اور یہ معجزہ جاودانی، اپنی دلیل آپ، منہ بولتا، محسوس اور ہر زمانہ کے لیے مُناسب اور انسانوں کے ہر طبقہ کے لیے ہے۔

ہم نے اعجازِ قرآن کے متعلق مشرح اور توضیحی بحث جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴ کے تحت تحریر کی ہے۔ اس مقام پر اس کی تکرار کی حاجت نہیں ہے۔

۲۔ انکارِ معجزات کا ثبوت: بعض مغرب زدہ دانشور چاہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے معجزات کا انکار کر دیں۔ اُن کا اصرار ہے کہ پیغمبرِ اسلام سے قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ صادر نہیں ہوا۔ اِن حضرات کے مزاج سے یہ بھی اِمکان ہے کہ وہ قرآن کو بھی معجزہ نہ سمجھیں حالانکہ اُن کا اِنکار معجزات آیاتِ قرآنی، روایاتِ متواترہ اور اسلام کی مسلّمہ تاریخ کے خلاف ہے۔

---

[۱] بعض مفسرین نے "یوم" کو فعل مقدّر کا ظرف سمجھا ہے اور بعض نے "محیطۃ" سے متعلق جانا ہے۔

Marfat.com

ہم نے اس موضوع کو جلد ۱۲ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ کے تحت بیان کیا ہے۔

۳۔ **من پسند کے معجزات :** پیمبروں کے مخالفین کی ہمیشہ ایک روش یہ بھی رہی ہے کہ وہ معجزات کو ایک ایسا عمل بناتے رہے ہیں جو پیمبروں سے فی البدیہہ ارتجالاً سرزد ہوتا ہے۔

وہ اپنے اس عمل سے ایک طرف تو معجزے کی اہمیت کم کرکے اُسے بے قدر اور مبتذل ثابت کرنا چاہتے تھے۔

دُوسری طرف وُہ اس بہلانے سے انبیاءؑ کی دعوت کو ردّ کرنا چاہتے تھے۔

لیکن انبیاءؑ کبھی بھی اُن کی اس سازش کا شکار نہیں ہوئے۔ جیساکہ آیاتِ بالا میں مذکور ہے۔ وُہ اِن کے جواب میں کہتے تھے کہ :

"معجزات ہمارے اختیار میں نہیں ہیں کہ جنہیں تمہاری مرضی اور خواہش کے مطابق ہر روز اور ہر گھڑی دکھایا جائے بلکہ معجزہ تو صرف حکمِ خُدا سے صادر ہوتا ہے اور ہمارے اختیار سے باہر ہے"۔

معجزاتِ اقتراحی کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ہشتم میں سورۂ یونس کی آیت ۲۰ کے تحت تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۵۶۔ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعۡبُدُوۡنِ ○

۵۷۔ کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ۟ ثُمَّ اِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ○

۵۸۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ
غُرَفًا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ
نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ○

۵۹۔ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ○

۶۰۔ وَکَاَیِّنۡ مِّنۡ دَآبَّۃٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَہَا ٭ۖ اَللّٰہُ یَرۡزُقُہَا
وَاِیَّاکُمۡ ۫ۖ وَہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ○

ترجمہ

۵۶۔ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو میری زمین وسیع ہے، تم میری ہی عبادت کرو (اور دشمن کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ)۔

۵۷۔ ہر متنفّس موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ پھر تم ہماری طرف لوٹ آؤ گے۔

۵۸۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک اعمال کیے ہم اُنھیں بہشت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وُہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔ نیک عمل

Marfat.com

کرنے والوں کا کیا خوب بدلا ہے۔

۵۹۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صبر (اور استقامت) اختیار کرتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔

۶۰۔ اور کس قدر چلنے پھرنے والے جاندار ایسے ہیں کہ جو اپنا رزق اٹھانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اللہ انھیں اور تمھیں رزق دیتا ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ زیرِ نظر پہلی آیت اُن مومنین کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ میں کفّار کا ظلم برداشت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ فرائض اسلامی کو بھی ادا نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے اُنھیں حکم دیا گیا کہ اس سرزمین سے ہجرت کر جائیں۔

نیز بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آخری زیرِ نظر آیت یعنی "وکاین من دابۃٍ لا تحمل رزقھا" اُن مومنین کی شان میں ہے جو مکہ میں دشمنوں کے ستم سہہ رہے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہم مدینہ کو ہجرت کر جائیں تو وہاں نہ ہمارا کوئی گھر ہوگا نہ زمین۔ وہاں ہمیں کون آب و غذا دے گا؟ تب یہ آیت نازل ہوئی جس میں ہے کہ زمین پر تمام حرکت کرنے والے خدا کے خوانِ نعمت سے روزی کھاتے ہیں۔ تم بھی اپنی روزی کی فکر نہ کرو۔

تفسیر

ہجرت کرنی چاہیئے:

گزشتہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ مشرکین نے اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں کیا کیا مختلف مواقف اختیار کیے مگر زیرِ بحث آیات میں خود مسلمانوں کی حالت بیان کی گئی ہے یعنی ان مشکلات کی حالت میں جو مسلمانوں کو کفّار کے نرغے میں اُن کی طرف سے اذیت و آزار کی صورت میں پیش آرہی ہیں، مسلمانوں کا کیا فرض ہے۔

خداوندِ عالم فرماتا ہے: اے میرے بندو کہ جو ایمان لائے ہو اور دشمنانِ اسلام کے نرغے میں فرائض دینی ادا نہیں کر سکتے، تو میری زمین وسیع ہے۔ تم دوسرے مقام کو ہجرت کر جاؤ اور وہاں میری عبادت کرو: (یا عبادی الّذین اٰمنوا اِنّ ارضی واسعۃ فایای فاعبدون)۔

Marfat.com

یہ امر بدیہی ہے کہ یہ حکم اُس زمانے کے صرف مومنینِ مکہ ہی کے لیے مخصوص نہ تھا اور آیت کی شانِ نزول اُس کے وسیع اور دراز دامنِ معنی کو جو کہ قرآن کی دُوسری آیات سے ہم آہنگ ہے محدود نہیں کرتی۔

اِس جہت سے یہ آیت ایک اُصولِ کُلی کی حامل ہے کہ جس زمانے میں اور جس معاشرہ و مقام میں مُسلمانوں کی آزادی کاملاً سلب ہو جائے، وہاں رہنے سے ذلت و خواری کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور وہاں رہ کر الٰہی پروگرام پر عمل نہ ہو سکے تو مُسلمانوں کا فرض ہے کہ وہاں سے ایسے مقامات کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں وہ مطلق آزادی یا نسبتاً آزادی کے ساتھ اپنے فرائض دینی ادا کر سکیں۔

بہ الفاظِ دیگر ـــــ آفرینش اِنسان کا مقصود خدا کی عبادت ہے۔ وہ عبادت جس میں زندگی کے ہر میدان میں انسان کی آزادی، سرفرازی اور کامیابی کا راز مخفی ہے۔ " فایای فاعبدون " میں اِسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نیز سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ میں یہ الفاظ آئے ہیں :

وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون

جب یہ بنیادی اور آخری مقصد انسان کے پیشِ نظر ہو تو ہجرت کے سوا اور کوئی راہ نہیں رہتی۔ خدا کی زمین وسیع ہے۔ اِس لیے کسی اور جگہ قدم رکھنا چاہیئے۔ ایسے مواقع پر قبیلہ و قوم، وطن اور گھر بار کے تعصبات میں مقید رہ کر کسی قسم کی ذلت کو برداشت نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اِن چیزوں کا احترام اُسی وقت تک جائز ہے جب تک مقصودِ حقیقی کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السّلام نے ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا ہے :

لیس بلد باحق بك من بلد خیرالبلاد ما حملك

تیرے لیے کوئی شہر بھی دوسرے شہر سے بہتر نہیں ہے۔ بس بہترین شہر وہی ہے جو تجھے قبول کر لے اور تیری ترقی کے اسباب فراہم کر دے۔[۱]

یہ مُسلم ہے کہ حُبِّ وطن اور اپنی جائے ولادت سے ذہنی تعلق انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ مگر زندگی میں کبھی ایسے مسائل بھی پیش آجاتے ہیں کہ یہ چیزیں حقیر اور بے مقدار ہو جاتی ہیں۔

ہجرت کے متعلق اِسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اِس سلسلے میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ہم نے اُنھیں سُورۂ نسا کی آیت ۱۰۰ کے تحت جلد چہارم میں بیان کیا ہے۔

خُدا نے اپنے بندوں کو "یا عبادی" کہا ہے۔ یہ اُس کی طرف سے نہایت ہی محبت آمیز طرزِ خطاب ہے۔ درحقیقت یہ انسان کے لیے تاجِ افتخار ہے جو مقامِ رسالت و خلافت سے بھی برتر ہے۔ جیسا کہ تشہد میں ہمیشہ کلمہ "عبد" کو شہادتِ رسالت سے پہلے ادا کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں :

" اشھد انّ محمداً عبدہٗ و رسولہٗ "

یہ اَمر جالبِ توجہ ہے کہ جب خدا نے آدم کو پیدا کیا تو اُسے " خلیفۃ اللہ " کے لقب سے عزت بخشی۔ مگر شیطان

---

[۱] نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ نمبر ۴۴۲۔

Marfat.com

پھر بھی اُسے بہکانے سے مایوس نہ ہُوا۔ وہ آدم کے پاس آیا اور پھر جو ہونا تھا وہ ہُوا۔ مگر خدا نے آدم کو مقام عبودیت پر سرفراز کیا تو شیطان نے اُس کے مقابلے میں ہار مان لی اور کہا :

فبعزتك لاغوينهم اجمعين الا عبادك منهم المخلصين

مجھے قسم ہے تیری عزت کی کہ میں تمام فرزندانِ آدم کو بہکاؤں گا۔ مگر اُن میں سے تیرے مُخلص بندوں کو نہیں بہکا سکتا۔ (ص - ۸۲، ۸۳)

یہاں تک کہ خدا نے بھی اِس امر کی ضمانت دی ہے اور فرمایا ہے :

ان عبادی لیس لك علیهم سلطان

تو ہرگز میرے بندوں پر تسلّط حاصل نہ کر سکے گا۔ (حجر - ۴۲)

اس بناء پر عبودیت خالص کا مقام زمین پر خلافتِ الٰہی کے مقام سے بھی برتر و بالاتر ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا اُس سے یہ خوب واضح ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث میں کلمہ "عباد" سے تمام انسان مُراد نہیں ہیں بلکہ صرف وہ انسان مُراد ہیں جو مومن ہیں اور آیت میں جملہ "الذین امنوا" تاکید اور توضیح کے لیے استعمال ہوا ہے۔[1]

چونکہ ــــ وہ لوگ جو مُشرکین کے شہروں میں رہتے تھے اور ہجرت کے لیے آمادہ نہ تھے، اُن کے دیگر عُذروں میں سے ایک یہ تھا کہ ہم اِس بات سے ڈرتے ہیں کہ اپنے شہروں سے نکل جائیں اور دُشمنوں کی طرف سے مَوت یا بھوک اور دیگر خطرات سے دوچار ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ہم اپنے خویش و اقارب، اولاد اور شہر و دیار سے جُدائی کے غم میں مُبتلا ہو جائیں۔

قرآن میں اُن کے خطرات کا ایک جامع جواب دیا گیا ہے : آخر کار سب انسانوں کا انجام مَوت ہے اور ہر شخص موت کا مزہ چکھے گا۔ پھر تم ہماری طرف لَوٹ آؤ گے : (کل نفس ذائقة الموت ثم الینا ترجعون)۔

یہ جہان کسی کے لیے بھی "دارالبقا" نہیں ہے۔ یہاں سے بعض لوگ جلد اور بعض دیر میں چلے جائیں گے۔

بہرحال ہر شخص کو دوستوں، اعزا و اقارب اور اولاد کی جُدائی کا صدمہ سہنا ہے۔ تو پھر انسان اِن زُود گزر مسائل کے لیے شرک اور کفر کی آبادیوں میں رہ کر کیوں ذلت و قید کو برداشت کرے؟ کیا صرف اِس لیے کہ چند روز اور زندہ رہ جائے؟ اِن سب باتوں کے علاوہ ڈرنا اِس بات سے چاہیئے کہ قبل اس کے کہ تم ایمان و اسلام کی زمین میں پہنچو تمہیں شرک و کفر کی جگہ موت آ جائے۔ سوچو کہ ایسی مَوت کتنی خوفناک اور دردناک ہے۔

پھر یہ بھی گمان نہ کرو کہ موت ہی ہر چیز کی انتہا ہے۔ موت تو درحقیقت انسان کی اصلی زندگی کا آغاز ہے۔ کیونکہ تم سب ہماری طرف لَوٹ آؤ گے۔ یعنی خدائے بزرگ اور اُس کی بے پایاں نعمتوں کی طرف۔

---

[1] "فایای فاعبدون" کا جُملہ درحقیقت جزائے جملہ شرطیہ پر عطف ہے جو محذوف ہے اور جملہ مقدر یہ ہے :

ان ضاقت بکم الارض فاهجروا منها الی الاخری وایای اعبدون۔

Marfat.com

اس کے بعد کی آیت میں ، چند نعمتوں کا اس طرح ذکر ہے :
جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے عمل صالح انجام دیے ، ہم اُنھیں بہشت کے بالا خانوں میں جگہیں دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی : (والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لنبوئنھم من الجنة غرفا تجری من تحتها الانهار)[1]
وُہ لوگ ایسے محلات میں سکونت اختیار کریں گے جنہیں ہر طرف سے جنّت کے درخت گھیرے ہوں گے اور طرح طرح کی نہریں، جن کے پانی کا ذائقہ اور اُس کا منظر مختلف ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے ثابت ہے ، درختوں کے جھُرمٹ میں سے نکل کر ان محلات کے نیچے رواں ہوں گی ۔
یہ ملحوظ رہے کہ " غرف " جمع ہے "غرفه " کی۔ اس کے معنی ہیں : بلند عمارت اور بالا خانہ کہ جو اپنے اطراف سے ممتاز ہو۔
بہشتی بالا خانوں کا امتیاز یہ ہے کہ وُہ دُنیاوی مکانات اور محلّات کے مانند نہ ہوں گے کہ جن میں انسان تھوڑی دیر بھی آرام نہیں کر پاتا کہ کوچ کا نقارہ گونجنے لگتا ہے بلکہ اہل ایمان اور صالحین اُن میں ہمیشہ رہیں گے :(خالدین فیھا)۔
آیت کے اخیر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے : کیا اچھا اجر ہے اُن لوگوں کا جو صرف خوشنودیٔ خدا کے لیے عمل کرتے ہیں : (نعم اجر العاملین) ۔
اِس آیت میں مومنین اور صالحین کے اجر کا جو ذکر ہے اُس سے گزشتہ آیات میں کُفار اور گناہ گاروں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اگر سادہ سا موازنہ بھی کیا جائے تو مومنین اور صالحین کے اُجر کی عظمت روشن ہو جاتی ہے ۔
گزشتہ آیات کے مضمون میں کُفار کے آگ اور ایسے عذاب میں مُبتلا ہونے کا ذکر تھا کہ جس نے اُنھیں سر سے پاؤں تک گھیرا ہُوا ہے۔ اور اُن سے بطور سرزنش یہ کہا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کرتے تھے اب اُس کا مزہ چکھو۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ مومنین نعمات بہشتی میں غوطہ ور ہیں اور رحمتِ پروردگار ہر طرف سے اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ ملامت بار جملوں کے بجائے ایسے کلمات سُنتے ہیں جن سے سراسر خداوندکریم کے لُطف و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن سے کہا جاتا ہے : "عمل کرنے والوں کا اُجر کتنا اچھا ہے" !
ظاہر ہے کہ " عاملین " جملہ ہائے ماقبل کے قرینے کے مطابق وہ لوگ ہیں جن سے پہ کیفیّت ایمان عمل صالح سرزد ہوتا ہے۔ ہر چند کہ کلمہ " عاملین" اپنے لغوی معنی میں محدُود نہیں ہے بلکہ مُطلق ہے ۔
جناب رسالت مآبؐ سے ایک حدیث مروی ہے :

ان فی الجنة لغرفا یُری ظهورها من بطونها وبطونها من ظهورها ۔

بہشت میں ایسے شفاف محلات ہیں کہ اُن کے اندر کا حصّہ باہر سے اور باہر کا منظر اندر سے نظر آتا ہے ۔

---

[1] "لنبوئنھم" کا مادہ تبوئه (بروزن تذکرہ) ہے اس کا معنی ہے ، بغرض بقائے دوام کسی کو سکونت دینا۔

Marfat.com

حضورؐ نے یہ فرمایا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کی :

یا رسول اللہؐ وہ محلات کس کی ملکیت ہوں گے ؟

آنحضرتؐ نے جواب دیا :

ھی لمن اطاب الکلام واطعم الطعام و ادام الصیام و صلی اللہ باللیل والناس نیام

یہ محلات اُس شخص کے لیے ہیں جو اپنی گفتگو کو پاکیزہ کرے ، بھوکوں کو کھانا کھلائے بکثرت روزے رکھے اور وقتِ شب جب سب لوگ محوِ خواب ہوں تو وہ اللہ کے لیے نماز پڑھے ۔[۱]

ٌ ٌ ٌ

اِس کے بعد کی آیت مومنینِ عامل کے اہم اوصاف کو بیان کرتی ہے۔ یعنی : یہ وہ لوگ ہیں جو مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں : (الّذین صبروا و علیٰ ربھم یتوکلون)۔

یہ لوگ اپنے بیوی بچوں ، دوستوں ، عزیزوں اور گھر بار سے جُدا ہوتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔

یہ مومنین غربت کی تلخیاں ، وطن سے نکل کر بے وطنی کی سختیاں سہتے ہیں اور صبر کرتے ہیں ، اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے دُشمنوں کے آزار کو جان و دل سے برداشت کرتے ہیں اور اپنے نفس سے جہاد کی راہ میں ، جو جہادِ اکبر اور اپنے سے قوی دُشمنوں سے لڑائی میں جو کہ جہادِ اصغر ہے ، طرح طرح کی مشکلات برداشت کرتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔

بے شک اِس صبر و استقامت ہی میں اُن کی کامیابی کا راز ہے اور یہی اُن کے شرف کا باعث ہے۔ کیونکہ صبر و استقامت کے بغیر زندگی میں کوئی تخلیقی اور مثبت عمل نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں وہ مومنین نہ اپنے مال و دولت پر بھروسا کرتے ہیں ، نہ اپنے دوستوں اور عزیزوں پر۔ اُن کا توکل صرف خدا پر ہے اور صرف اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ اگر ایک ہزار دشمن بھی اُنھیں ہلاک کرنے کا ارادہ کریں تو وہ یہ کہتے ہیں :

اے خدا ! اگر تو میرا دوست ہے تو مجھے دشمنوں سے کچھ خوف نہیں۔

اگر ہم سچ مچ غور کریں تو صبر و توکل ہی جُملہ فضائلِ انسانی کی جڑ ہے۔ " صبر " انسان کو موانع اور مشکلات کے مقابلے میں استقامت بخشتا ہے اور " توکل " اِس راہِ پُر نشیب و فراز میں انسان کو آمادہ بہ عمل رکھتا ہے۔ درحقیقت اعمالِ صالح انجام دینے کے لیے اِن دو فضائلِ اخلاقی یعنی صبر و توکل سے مدد لینی چاہیئے۔ کیونکہ صبر و توکل کے بغیر وسیع پیمانے پر اعمالِ صالح کا انجام دینا ممکن ہی نہیں ہے۔[۲]

---

[۱] تفسیر قرطبی ، ذیل آیت زیر بحث ، جلد ۷ ، صفحہ ۵۰۷۵۔

[۲] توکل کی حقیقت اور اس کے فلسفہ کے بارے میں مفصل بحث جلد ۱۰ میں سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۲ کے ذیل میں مذکور ہے اور صبر کے بارے میں جلد ۱۰ صفحہ ۱۶۷ اور جلد ۶ میں صفحہ ۲۷۴ (اُردو ترجمہ) دیکھیے۔

Marfat.com

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں اُن لوگوں کے شکوک وشبہات کا جواب ہے جو اپنی زبانِ قال یا زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ : اگر ہم اپنے شہر سے ہجرت کریں گے تو ہمیں روزی کون دے گا ۔ قرآن میں اُن کے اس خوف کا یہ جواب دیا گیا ہے : تم روزی کی فکر نہ کرو اور ذلت واسارت کے عیب و عار کو برداشت نہ کرو ــــ روزی رساں خدا ہے نہ کہ تم بلکہ زمین پر چلنے والے بہت سے جاندار ایسے بھی ہیں جو اپنا رزق اُٹھا نہیں سکتے اور نہ وہ اپنے گھونسلوں اور بلوں میں غذا کا ذخیرہ کرتے ہیں اور ہر روز انہیں نئے رزق کی طلب ہوتی ہے مگر خدا انہیں بھوکا نہیں چھوڑتا اور انہیں رزق دیتا ہے وہی خدا تمہیں بھی رزق دے گا : (وکاین من دآبۃ لا تحمل رزقھا اللہ یرزقھا وایاکم) ۔

انسان سے قطع نظر زمین پر حرکت کرنے والوں اور حیوانات وحشرات میں ، بہت ہی کم ایسی انواع ہیں جو چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح اپنی غذا صحرا و بیابان سے لاکر اپنے بل یا چھتے میں ذخیرہ کرتی ہوں ۔ اکثر مخلوقات " قانع الیوم " ہیں یعنی وہ ہر روز اپنے لیے تازہ رزق حاصل کرتی ہیں ۔ اور جو کمایا سو کھایا کے طرزِ عمل پر زندگی گزارتی ہیں ۔ اس قسم کی کروڑوں مخلوقات ہمارے اطراف وجوانب میں دُور و نزدیک ، بیابانوں ، سمندروں کی گہرائیوں ، پہاڑوں کی بلندیوں اور دروں میں موجود ہیں ۔ یہ سب اپنے پروردگار کے خوانِ بے دریغ سے اپنا رزق کھاتے ہیں ۔

لہٰذا ــــ تو اے انسان جو کہ ایسی مخلوق کے مقابلہ میں اپنی روزی حاصل کرنے اور اُسے ذخیرہ کرنے کے لیے زیادہ باہوش اور توانا ہے ، اپنی قطع روزی کے خوف سے ایسی مکروہ اور شرمناک زندگی سے کیوں چمٹا ہوا ہے ؛ اور دُنیا میں ہر قسم کے ظلم وستم اور ذلت وخواری کو کیوں برداشت کرتا ہے ؛ تو بھی اس تنگ وتاریک زندگی کے دائرہ سے باہر نکل اور اپنے پروردگار کے وسیع دسترخوان پر بیٹھ اور روزی کی فکر نہ کر ۔

اُس حالت میں جب کہ تُو اپنی ماں کے شکم میں ایک ناتوان جنین کی شکل میں تھا اور کوئی شخص بھی یہاں تک کہ تیرے باپ اور تیری مادرِ مہربان کا دستِ شفقت بھی تجھ تک نہ پہنچ سکتا تھا ، تیرے خدا نے تجھے فراموش نہیں کیا اور جس چیز کی تجھے ضرورت تھی وہ بہم پہنچائی ۔ اِس وقت تو تُو ایک توانا اور طاقتور وجود ہے ۔ نیز چونکہ حاجت مندوں کو روزی پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ روزی رساں اُن کی ضروریات سے آگاہ ہو ، اِسی لیے آیت کے آخر میں : (وھو السمیع العلیم) فرمایا گیا ہے ۔ یعنی وہی سُننے والا اور جاننے والا ہے ۔

وہ تم سب کی باتیں سُنتا ہے یہاں تک کہ تمہاری اور تمام حرکت کرنے والے جانداروں کی زبانِ حال کو بھی سُنتا اور جانتا ہے ، تم سب کی ضروریات سے خُوب آگاہ ہے اور کوئی چیز اُس کے بے پایاں علم سے پنہاں نہیں ہے ۔

Marfat.com

۶۱۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى
يُؤْفَكُوْنَ ۝

۶۲۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ۝

۶۳۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ
الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

۶۴۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ
الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

۶۵۔ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ
فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝

۶۶۔ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚۙ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

Marfat.com

ترجمہ

۶۱۔ اگر اُن سے تو پُوچھے کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے خلق کیا اور کس نے تمہارے لیے شمس و قمر کو مُسخر کیا ہے، تو وہ کہیں گے اللہ نے تو پھر وُہ (عبادتِ خدا سے) منحرف کیوں ہو رہے ہیں ؟

۶۲۔ خُدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

۶۳۔ اگر تُو اُن سے پُوچھے کہ آسمان سے پانی کس نے برسایا اور اُس کے وسیلہ سے زمین کو اُس کی موت کے بعد کس نے زندہ کر دیا ؟ تو کہیں گے کہ اللہ نے تو اُن سے کہہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ مگر اُن میں سے اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

۶۴۔ یہ دُنیا کی زندگی تو لہو و لعب کے سوا کچھ نہیں اور حقیقی زندگی کا مقام تو دارِ آخرت ہی ہے۔ کاش کہ وہ لوگ جانتے۔

۶۵۔ جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خلوص کے ساتھ اللہ کو پُکارتے ہیں (اور اُس کے غیر کو بُھول جاتے ہیں)۔ مگر جب اللہ اُنھیں نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وُہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔

۶۶۔ (چھوڑو انہیں) تا کہ ہم نے جو آیات اُنھیں بخشی ہیں اُن کا انکار کریں اور دُنیا کی زُود گزر لذات سے فائدہ اُٹھائیں۔ لیکن بہت جلد اُنھیں معلوم ہو جائے گا۔

Marfat.com

تفسیر

دل میں خُدا زبان پر بُت :

آیاتِ گزشتہ میں رُوئے سُخن ان مُشرکین کی طرف تھا جنھوں نے حقانیت اسلام سمجھ تو لیا تھا لیکن اِس خوف سے کہ اُن کی بسر اوقات کے ذرائع منقطع ہو جائیں گے وہ ایمان کو قبول کرنے اور ہجرت کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ آیات زیر بحث میں رُوئے سُخن بجانب پیمبرِ اسلامؐ اور درحقیقت تمام مومنین کی طرف ہے۔ ان آیات میں دلائل توحید کو " خلقت "، ربوبیت اور " فطرت " کی بُنیاد پر تین مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ ان دلائل کے ذریعے یہ بات اُن کے دل نشین کی گئی ہے کہ اُن کی تقدیر اُس خدا کے ہاتھ میں ہے جس کی قدرت کے آثار تم انفس و آفاق میں دیکھتے ہو، نہ کہ بُتوں کے اختیار میں کیونکہ اس معاملے میں اُن کا کچھ دخل نہیں ہے۔

سب سے پہلے خلقت زمین و آسمان کا ذکر کیا گیا ہے اور مُشرکین کے باطنی اعتقادات کا حوالہ دیتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: اگر تم ان سے یہ سوال کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا ہے ؛ اور کس نے بندوں کے مفاد میں سُورج اور چاند کو اپنے زیرِ فرمان مُسخر کر رکھا ہے، تو سب کے سب بیک زبان جواب دیں گے:" اللہ " نے :(ولئن سألتھم من خلق السماوات والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ)۔

کیونکہ یہ مُسلّم ہے کہ بُت پرست یا اُن کے علاوہ کوئی آدمی بھی یہ نہیں کہتا کہ خالق زمین و آسمان اور تسخیر کنندۂ خورشید و ماہ یہ حقیر سے پتھر اور لکڑی کے بُت ہیں جنہیں انسانوں نے اپنے ہاتھ سے تراشا ہے۔

بہ الفاظِ دیگر بُت پرست بھی خدا کی توحید میں کوئی شک نہ کرتے تھے۔ البتہ وہ لوگ عبادت میں مُشرک تھے۔ وہ کہتے تھے: " ہم بُتوں کو اس لیے پُوجتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہیں۔ جیسا کہ سُورۂ یونس کی آیت ۱۸ میں مذکور ہے :

ویقولون ھٰؤلاء شفعاؤنا عند اللہ

(اُن کا قول تھا) ہم اِس لائق نہیں ہیں کہ براہِ راست خُدا سے ارتباط حاصل کریں۔
اِس لیے ہمیں چاہیئے کہ بُتوں کے ذریعہ سے رابطہ برقرار رکھیں:

ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفٰی

ہم اُن کی پرستش نہیں کرتے مگر اس وجہ سے تاکہ ہمیں اُن کے وسیلہ سے خُدا کی قُربت حاصل ہو جائے۔ (زمر - ۳)

وہ لوگ اس حقیقت سے غافل تھے کہ خالق اور خلق کے درمیان کوئی فاصلہ موجود نہیں ہے اور وہ ہم سے رگِ جاں سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ انسان موجوداتِ عالم کُل سرسبد اور شاہکار ہے، وہی اس قابل ہے کہ خدا سے بلاواسطہ

Marfat.com

رابطہ پیدا کر سکے۔ کوئی اور مخلوق اُس کے لیے واسطہ نہیں بن سکتی۔

بہر حال، اس روشن دلیل کے بعد، آیت کے اخیر میں فرمایا گیا ہے: جب حقیقت یہ ہے تو یہ کُفار خدا کی عبادت سے مُنہ موڑ کے پتھر اور لکڑی سے تراشے ہوئے ناچیز بُتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں: (فانّٰی یؤفکون)۔

"یؤفکون" مادہ افک (بروزن "فکر") سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی واقعی اور حقیقی شکل کو بدل دینا۔ اِسی مناسبت سے اس کا اطلاق دروغ اور بادِ مخالف پر بھی ہوتا ہے۔

اِس مقام پر "یؤفکون" صیغۂ مجہول استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مُراد ہے کہ مُشرکین بحالت شعور استدلال عقلی کے ساتھ ایسا نہیں کرتے بلکہ بلا ارادہ بُت پرستی کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔

تسخیرِ شمس و ماہ سے مُراد وہ نظامات ہیں جو خدا نے اُن کے لیے مقرّر کر دیئے ہیں اور یہ نظامات بہ اعتبارِ نتائج انسانوں کے لیے منفعت بخش ہیں۔

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد اِس مفہوم کی تاکید کے لیے کہ خالق و رازق وہی ہے، یہ اضافہ کیا گیا ہے: خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے۔

اور جس کے لیے چاہتا ہے محدود اور تنگ کر دیتا ہے: (اللہ یبسط الرزق لمن یشآء من عبادہ و یقدر لہ)۔

روزی کی کلید اُسی کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسانوں اور بُتوں کے ہاتھ میں۔

آیات ماقبل میں یہ جو کہا گیا ہے کہ "راست باز مومنین صرف اُسی پر توکّل کرتے ہیں" اسی وجہ سے ہے کہ جب کہ ہر چیز کا کُلی اختیار اُسی کو حاصل ہے، تو وُہ پھر اظہارِ ایمان سے کیوں ڈریں اور یہ کیوں سوچیں کہ ہماری زندگیاں دشمنوں کی طرف سے خطرہ میں ہیں۔

اگر مومنین یہ تصور کریں کہ خدا قُدرت تو رکھتا ہے مگر اُن کے حال سے آگاہ نہیں ہے تو یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ خدا عالمِ کُل ہے: (انّ اللہ بکلّ شیءٍ علیم)۔

یہ بات ہرگز قابلِ تصور نہیں کہ خدا خالق و مُدبّرِ عالم ہو اور اُس کا فیض بہ تسلسلِ لمحات موجودات کو پہنچ رہا ہو اور وُہ اُن کی حالت سے آگاہ نہ ہو۔

❊ ❊ ❊

دُوسرے مرحلے میں خدا کی ربوبیّت اور اُس کی طرف سے رزق کے چشمے جاری ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: اگر اُن مشرکین سے تم یہ سوال کرو کہ آسمان سے پانی کون برساتا ہے۔ اور زمین کو اُس کے مُردہ ہونے کے بعد اُس کے وسیلہ سے کون زندہ کرتا ہے، تو وہ سب بیک زبان کہیں گے، "اللہ": (ولئن سألتھم من نزّل من السّمآء مآءً فاحیا بہ الارض من بعد موتھا لیقولنّ اللہ)۔

Marfat.com

بُت پرستوں کا یہ باطنی اعتقاد ہے۔ یہاں تک کہ اُنھیں اُس کے زبان سے اقرار کرنے سے بھی انکار نہ تھا کیونکہ وہ بھی خدا ہی کو خالق اور رَبّ سمجھتے تھے اور اُسی کو مُدبّرِ عالم سمجھتے تھے۔

اُس کے بعد فرمایا گیا ہے: کہو کہ حمد و ستائش صرف اللہ ہی کے لیے ہے: (قل الحمد للہ)۔

حمد و سپاس اُس ذات کے لیے ہے جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے کیونکہ پانی (جو کہ اصل سرچشمۂ حیات ہے اور سب جانداروں کے لیے باعثِ حیات ہے) اُس کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہر قسم کا رزق بھی اُسی کی طرف سے آتا ہے۔

اِس بنا پر حمد و ستائش بھی اُسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیئے۔ اور دُوسرے معبُودوں کا اس میں کچھ حصّہ نہیں ہے۔

تم خدا کا شکر کرو کہ مشرکین کو بھی ان حقائق کا اعتراف ہے۔ نیز اس بات کا بھی شکریہ ادا کرو کہ ہمارا استدلال اِس قدر مُستحکم اور ناطق ہے کہ کسی شخص میں بھی اُس کے ابطال کی قدرت نہیں ہے۔

اور چُونکہ مُشرکین کی گفتگو اور اُن کے عمل میں تناقض تھا، اس لیے آیت کے آخیر میں ان کلمات کا اضافہ کیا گیا ہے:

(بل اکثرھم لا یعقلون)۔ ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

وگرنہ کیونکر ممکن ہے ایک عاقل و فہمیدہ انسان اس قدر پراگندہ گوئی کرے کہ ایک طرف تو وہ اُس ذات کو خُدا کہے جو خالق و رازق و مُدبّرِ عالم ہے اور دُوسری طرف بُتوں کو سجدہ کرے۔ جنہیں اُس کے احوالِ حیات میں کوئی دخل ہی نہیں ہے۔

ایک طرف تو وُہ "خالق" و "ربّ" کی توحید کا قائل ہو اور دوسری طرف عبادت میں شرک کرے۔

یہ الفاظ لائقِ توجہ ہیں کہ یہ نہیں کہا کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ یعنی عقل ہے تو سہی مگر اُس سے کام نہیں لیتے۔

٭ ٭ ٭

اور اس غرض سے کہ اُن (مُشرکین) کے خیالات و افکار کو اِس محدُود زندگی کے اُفق سے بلند کرے اور اُن کی عقول کے سامنے ایک وسیع ترین عالم کا منظر پیش کرے، خُدا اس کے بعد کی آیت میں اس دُنیا کی زندگی کی کیفیت کو سرائے آخرت کی حیاتِ جاوداں کے مقابلے میں ایک بلیغ اور پُر معنی عبارت میں اس طرح بیان کرتا ہے: اس دُنیا کی زندگی لہو و لعب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اِس زندگی میں کھیل کُود اور لایعنی مشاغل کے سوا اور کوئی مقصد نہیں: (وما ھٰذہ الحیٰوۃ الدّنیا الّا لھوٌ و لعب)۔

حقیقی زندگی دارِ آخرت ہی کی ہے۔ کاش کہ وُہ لوگ اِس بات کو جانتے: (وان الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان لوکانوا یعلمون)۔

یہ الفاظ کتنے جاذب اور مؤثر ہیں۔ کیونکہ "لھو" کے معنی ایسا ہر مشغلہ اور ایسا ہر کام ہے جو انسان کو زندگی کے بنیادی مسائل سے مُنحرف کر دیتا ہے اور "لعب" خیالی مقصد کے لیے خیالی پلاؤ پکانے کو کہتے ہیں۔ کھیل کو بھی لعب کہتے ہیں۔

جب بچّے کوئی کھیل کھیلتے ہیں تو اُن میں سے ایک بادشاہ بنتا ہے، دُوسرا وزیر بنتا ہے، تیسرا سپہ سالارِ فوج بنتا ہے، کوئی اُن میں قافلہ سالار بنتا ہے اور کوئی راہ زن بنتا ہے۔ جنگ کے بعد جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو یہ تمام عہدے خواب و

Marfat.com

خیال بن کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ دُنیا کی زندگی ایک قسم کا مشغلہ اور کھیل ہے۔ اس دُنیا میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے تصورات سے دل لگاتے ہیں، چند روز کے بعد پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ پھر زیرِ خاک پنہاں ہو جاتے ہیں۔ اُس کے بعد اُن کی زندگی اور اُن کے مشاغل کے متعلق لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

لیکن حقیقی زندگی جس کو نہ فنا ہے، نہ اس میں درد و رنج ہے، نہ خوف و اضطراب ہے اور نہ تضاد و تزاحم ہے وہ حیاتِ آخرت ہی ہے۔ مگر ـــــ کاش کہ انسان اس حقیقت کو جانے اور نظرِ دقیق اور تحقیق سے کام لے۔

جو لوگ کہ اس دُنیا سے دل لگاتے ہیں اور اس کی ظاہری سج دھج پر فریفتہ ہو جاتے ہیں وہ بچوں کی طرح ہیں۔ خواہ اُن کی عمر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو۔

ضمناً یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ کلمہ "حیوان" (بروزن "ضربان") بہت سے مفسرین اور اہلِ لغت کے نزدیک بمعنی "حیات" کا مفہوم رکھتا ہے۔ (معنی مصدری رکھتا ہے) [1]

آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ سرائے آخرت ہی عین حیات ہے۔ گویا اُس میں ہر طرف سے زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ وہاں بجز زندگی کچھ اور نہیں ہے۔

یہ بدیہی ہے کہ قرآن کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ خدا حیاتِ سرائے آخرت کے ذکر سے اُن نعمات کی قدر کم کرے جو اس نے اپنے بندوں کو اس دُنیا میں عنایت کی ہیں۔ بلکہ اس موازنہ سے مقصود صرف یہ ہے کہ خدا انسان کے سامنے دونوں جہان کی زندگیوں کی قدر و حیثیت کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ علاوہ بریں یہ بھی پیشِ نظر ہے کہ وہ انسان کو متنبہ کرے کہ وہ ان نعماتِ دُنیاوی کا اسیر نہ ہو جائے بلکہ اُن کا حاکم ہو اور اپنی شخصیت کے جواہرِ اصلی کو ان کے عوض ضائع نہ کر دے۔

❖ ❖ ❖

تیسرے مرحلے میں انسان کی فطرت و سرشت کا بیان ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ بحرانی ترین حالات میں انسان کے دل میں نورِ توحید چمکنے لگتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک نہایت ہی واضح مثال سے روشن کیا گیا ہے۔

جس وقت وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو اخلاص کامل سے یاد کرتے ہیں۔ اُس وقت غیرِ خدا اُن کے ذہن سے قطعی محو ہو جاتا ہے۔ لیکن جب خدا انہیں طوفان اور گرداب سے رہائی بخش دیتا ہے اور بسلامت خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ پھر مُشرک ہو جاتے ہیں: (فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین فلما نجاھم الی البر اذا ھم یشرکون)۔

یہ درست ہے کہ شدائدِ زندگی اور طوفانِ حوادث ہی میں انسان کی فطرت کے جوہر کھلتے ہیں۔ کیونکہ ہر انسان کی رُوح میں توحید کا نُور چھپا ہوا ہے مگر معاشرت کے لایعنی آداب و رسوم، غلط تربیت اور شر و فساد آگیں تعلیم اُس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ مگر جب ہر طرف سے مصیبتوں کے طوفان اُٹھتے ہیں اور انسان مشکلات کے گرداب میں پھنس جاتا ہے تو پھر وہ تمام وسائل ظاہری سے

[1] یہ کلمہ دراصل "حی" سے ماخوذ ہے اور "حییان" تھا۔ حرف "یا" "واؤ" سے تبدیل ہو گیا اور "حیوان" ہو گیا۔

Marfat.com

دست کش ہو جاتا ہے۔ پھر اُس کی فطرت اسے ماورائے عالم کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اُس وقت اُس کے دل سے شرک آلود خیالات محو ہو جاتے ہیں اور وہ ان حوادث کی بھٹی میں تپ کر بہ مصداق "مخلصین له الدین" ہر کھوٹ سے صاف ہو جاتا ہے۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ انسان کے قلب میں ایک نقطہ نورانی موجود ہے۔ جس کا تعلق اُس عالم سے ہے جو جہانِ مادی سے ماوراء ہے اور ذاتِ الٰہی سے اُس کا نزدیک ترین ربط ہے۔

غلط تعلیمات، غفلت و غرور بالخصوص ہر جہت سے سلامتی اور فراوانیٔ دولت کی حالت میں اس نقطۂ نورانی پر پردے پڑ جاتے ہیں مگر حوادث کے طوفان ان پردوں کو چاک کر دیتے ہیں، غفلت کی گرد جھڑ جاتی ہے اور وہ نقطۂ نورانی پھر چمکنے لگتا ہے۔

عظیم ہادیانِ اسلام منکرین خدا کو اسی طریقہ سے راہِ راست پر لاتے تھے۔

ہم سب نے اُس شکی کی داستان سُنی ہے جو معرفت الٰہی کے معاملہ میں سخت شک میں مبتلا تھا اور امام جعفر صادقؑ نے اسی لاشعوری جذبے کے حوالے سے اس کو ہدایت فرمائی۔ اُس آدمی نے امام کی خدمت میں عرض کی:

یا بن رسول الله دلنی علی الله ما هو ؟ فقد اکثر علی المجادلون وحیرونی فقال له الامام (ع) : یا عبد الله ! هل رکبت سفینة قط ؟

قال : نعم

قال : فهل کسر بك حیث لا سفینة تنجیك ولا سباحة تغنیك ؟

قال : نعم

قال : فهل تعلق قلبك هنالك ان شیئاً من الاشیاء قادر علی ان یخلصك من ورطتك ؟

قال : نعم

قال الصادق (ع) : فذلك الشیء هو الله القادر علی الانجاء حیث لا منجی، وعلی الاغاثة حیث لا مغیث.

اے فرزندِ رسولؐ! آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ خدا کون ہے؟ کیونکہ مجھے ایک عظیم وسوسہ نے حیران کر دیا ہے۔

امامؑ نے فرمایا: اے بندۂ خدا! کیا تو کبھی کشتی میں سوار ہوا ہے؟

اُس نے عرض کیا: ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ تیری کشتی ایسی جگہ ٹوٹی ہو کر وہاں تجھے بچانے کے لیے کوئی کشتی موجود نہ ہو اور تُو تیر بھی نہ سکتا ہو؟

اُس نے عرض کیا: ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کیا اُس حالت میں تیرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کوئی ہستی ایسی ہے جو

Marfat.com

تجھے اس مصیبت سے بچا سکتی ہے؟

اُس نے عرض کیا: ہاں۔

امامؑ نے فرمایا: وہ خدا ہی ہے جو اس حالت میں نجات دینے پر قدرت رکھتا ہے جب کوئی نجات دہندہ اور فریاد رس نہ ہو۔ ؎

⁂

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں خدا پرستی اور توحید باری تعالیٰ پر ان تمام استدلات کے بعد مخالفین اسلام کو سخت کن تہدید شدید کے بعد، ارشادِ خداوندی ہے: وُہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں اور ہماری عطا کردہ نعمات کے ناشکر گزار ہیں۔ وہ چند روز اِن زود گزر لذّات سے لُطف اُٹھالیں۔ لیکن وہ جلد سمجھ جائیں گے کہ کفر و شرک کا انجام کیا ہوگا اور وہ اُنھیں کن آفات میں مُبتلا کر دے گا: (لیکفروا بما اٰتیناھم ولیتمتّعوا فسوف یعلمون)۔

اگرچہ اِس آیت میں کُفر اور انکارِ آیات کا ذکر ہے لیکن یہ بدیہی ہے کہ اِن الفاظ کا مقصد تہدید ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی جرائم پیشہ انسان سے کہا جائے کہ تم سے جو گناہ اور جُرم بھی ہو سکتا ہے کر لو لیکن اپنے اعمال کا نتیجہ جلد ہی بھگتو گے۔ اگرچہ عبارت میں صیغۂ امر استعمال ہوا ہے مگر اُس سے کسی شے کی طلب مُراد نہیں بلکہ تہدید مراد ہے۔

نیز یہ کہ "فسوف یعلمون" مطلق صورت میں آیا ہے اور یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ کیا جان لیں گے۔ صرف اتنا کہا ہے کہ وہ جلد جان لیں گے۔

یہ شیوۂ کلام صرف اِس لیے ہے کہ اس کا مفہوم جتنا بھی زیادہ وسیع ہوگا۔ سُننے والے کا ذہن کسی حد میں محدود نہ رہے گا۔ بداعمالیوں کا نتیجہ عذابِ الٰہی، دونوں جہان میں رُسوائی اور ہر قسم کی بدبختی ہے۔

⁂

سختیوں میں فطرتِ انسانی کے جوہر کُھلتے ہیں:

ہم اِن شاءَ اللہ سُورۂ رُوم کی آیت ۳۰ کے ذیل میں اصل توحید و خدا شناسی کے امرِ فطری ہونے کے متعلق تفصیل سے بحث کریں گے۔

اِس مقام پر جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں زندگی کی مشکلات اور سختیوں کا ذکر اِس عنوان سے کیا گیا ہے کہ وہ انسان کی اِس فطرت کے ظہور کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔

ایک مقام پر فرمایا گیا ہے:

وما بکم من نعمةٍ فمن اللہ ثمّ اذا مسّکم الضرّ فالیه تجئرون ثمّ اذا کشف الضرّ عنکم اذا فریقٌ منکم بربّھم یشرکون ۝

؎ بحار الانوار جلد ۳ طبع جدید صفحہ ۴۱

Marfat.com

تمہارے پاس جتنی بھی نعمات ہیں وہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں اور جب تم پر کوئی بلا نازل ہوتی ہے تو تم اُس کی درگاہ میں فریاد کرتے ہو۔ مگر جب خدا وہ بلا تم سے ٹال دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ پھر مُشرک ہو جاتا ہے۔ (نحل ۵۳ - ۵۴)

سُورہ یونس میں یہ بات ایک اور طرح سے بیان ہوئی ہے:

واذا مسّ الانسان الضرّ دعانا لجنبہ او قاعدًا او قائمًا فلمّا کشفنا عنہ ضرّہ مرّ کان لم یدعنا الی ضرّ مسّہ جب انسان کو مصیبت آلیتی ہے تو سوتے، بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی حالت میں ہمیں پکارتا ہے۔ لیکن جب ہم وہ مشکل دُور کر دیتے ہیں تو وہ اپنی پہلی غفلت میں جا پڑتا ہے ۔ گویا کہ اس نے اپنی مشکل کے حل کے لیے ہمیں پکارا ہی نہ تھا (یونس ۱۲)

سُورہ رُوم کی آیت ۳۳، سُورۂ زمر کی آیت ۴۹ اور سُورہ بنی اسرائیل کی آیات ۶۷ - ۶۹ میں یہی مطلب عبارات دیگر اور اشارات پُر معنی کے ساتھ آیا ہے۔

ہم نے آیات زیر بحث میں بھی یہ پڑھا ہے کہ مُشرکین کا یہ گروہ جب اُن کے دل نجاستِ کفر سے آلودہ ہوتے ہیں، تو بُتوں کے پاس جاتا ہے مگر جب یہ سمندری سفر پر روانہ ہوتے ہیں اور وہاں اُنھیں طوفان، بھنور اور مخالف ہوائیں گھیر لیتی ہیں اور اُن کی کشتیاں سطح اَمواج پر گھاس کے تنکے کی طرح حرکت کرنے لگتی ہیں اور وہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اُن کے قلب میں نُورِ توحید چمکنے لگتا ہے اور تمام خود ساختہ معبُود غائب ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے دل میں " خلوص کامل " پیدا ہوتا ہے (مگر یہ خلوص مجبوراً پیدا ہوتا ہے اور بے قدر ہوتا ہے)۔

لیکن جیسے ہی طوفان ٹل جاتا ہے اور حالات پھر معتدل ہو جاتے ہیں تو اُن کے دل پر پھر پردے پڑ جاتے ہیں اور گُل توحید کے اطراف میں شرک اور بُت پرستی کے کانٹے اُگ آتے ہیں۔

ممکن ہے کہ کُفار کی اس قلبی کیفیت کے لیے عُذر پیش کیا جائے کہ اُن کی یہ حالت شعور میں اُن تہ نشین خیالات اور اُن اثرات کی وجہ سے ہے، جو اُنھوں نے اپنے معاشرے اور تہذیب سے حاصل کر لیے ہیں۔

مگر یہ عذر اس صُورت میں قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ یہ حالت صرف اُن مذہبی لوگوں کی ہوتی جو مذہبی ماحول میں رہتے ہیں۔ لیکن تجربہ یہ ہے کہ غیر مذہبی معاشرے میں سخت ترین منکرینِ خدا کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نورِ توحید کا راز کہیں اور مخفی ہے۔ یعنی وہ انسان کے لاشعور اور اُس کی فطرت و سرشت میں داخل ہے۔

Marfat.com

۶۷۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ
حَوۡلِهِمۡ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ وَ بِنِعۡمَةِ اللّٰهِ یَكۡفُرُوۡنَ ○

۶۸۔ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ
بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَیۡسَ فِیۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡكٰفِرِیۡنَ ○

۶۹۔ وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ
لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ ع

ترجمہ

۶۷۔ کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقامِ اَمن بنایا ہے۔ درآں حالیکہ لوگ اُس کے اطراف سے اُچک لیے جاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور خُدا کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟

۶۸۔ اُس سے زیادہ ظالم کون ہے جو خُدا پر جھوٹ باندھتا ہے یا جب اس کے سامنے حق بات آئے تو اُس کی تکذیب کرتا ہے؟ کیا کافروں کا ٹھکانا جہنّم نہیں ہے؟

۶۹۔ اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں (خلوصِ نیّت کے ساتھ) جہاد کیا ہم ضرور اُنھیں ہدایت کریں گے اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

Marfat.com

شانِ نزول

تفسیر " دُرالمنثور " میں زیرِ بحث آیت کے متعلق ابنِ عباس سے یہ روایت منقول ہے :

مشرکین کے ایک گروہ نے رسول اللہؐ سے یہ کہا : اے محمدؐ ! ہم آپ کے دین میں اس وجہ سے داخل نہیں ہوتے کہ ہم ڈرتے ہیں کہ لوگ (مخالفین) ہمیں اُٹھا کرلے جائیں گے (اور جلد ہی مَوت کے گھاٹ اُتار دیں گے) کیونکہ ہماری تعداد کم ہے اور مشرکینِ عرب کی جمعیت زیادہ ہے، جیسے ہی اُنھیں یہ اطلاع ملے گی کہ ہم نے آپ کا دین قبول کرلیا ہے تو وہ ہمیں اُٹھا کر لے جائیں گے ۔ ہم اُن میں سے صرف ایک ہی شخص کی خوراک ہیں ۔

اس مقام پر آیت " اولم یروا ... " نازل ہوئی ۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں بھی مشرکین کے اِس بہانے کی طرف دُوسری صُورت سے اِشارہ ہوا تھا کہ :

" ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر ہم اظہارِ ایمان کردیں اور اُس کے ساتھ ہجرت کریں تو ہماری زندگی توُ مختل ہوجائے گی "

قرآن میں اُن کے اِس بہانے کا مختلف طریقوں سے جواب دیا گیا ہے ۔

زیرِ بحث آیات میں اُنھیں ایک اور طریقے سے جواب دیا گیا ہے ۔ خدا فرماتا ہے : کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن کے لیے حرم امن قرار دیا ہے ۔ (یعنی سرزمینِ پاک و مقدس مکہ) : (اولم یروا انا جعلنا حرماً اٰمناً) ۔

جب کہ سارے عرب بدامنی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ " اِس سرزمین سے باہر انسانوں کو اُٹھا کے لے جاتے ہیں " ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہے مگر اس سرزمین میں بیک حال امن و امان برقرار رہتا ہے : (ویتخطف الناس من حولھم) ۔

وہ خدا جو اس امر پر قادر ہے کہ حجاز کے اِس بحرِ متلاطم و طوفانی میں حرم مکہ کو آرام و امن کے ایک جزیرہ کی مانند بنادے، تو کیا اُس میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ اُنھیں دُشمنوں سے محفوظ رکھے ؟ وہ لوگ خدائے قادر و توانا کے مقابلے میں اِن ضعیف و ناتوان لوگوں سے کیوں ڈرتے ہیں ؟

کیا اس کے باوجود وہ باطل پر ایمان رکھیں گے اور خدا کی نعمت کا انکار کرتے رہیں گے : (اَفبالباطل یؤمنون وبنعمۃ اللہ یکفرون) ۔

مختصر بات یہ ہے کہ جو خدا اِس اَمر پر قادر ہے کہ ایک پُرفساد ملک میں جہاں نیم وحشی لوگ آباد ہیں ، ایک چھوٹے سے علاقے کو جائے امن قرار دے دے ۔ کیا وہ یہ نہیں کرسکتا کہ کافر اور بے ایمان لوگوں میں مومنین کو آفات سے محفوظ رکھے ۔

٭ ٭ ٭

قرآن میں اِس روشن دلیل کے ذکر کے بعد بطورِ استفرا، ایک کُلیّہ قائم کیا گیا ہے : آیا اُن لوگوں سے بھی زیادہ ظالم کوئی ہے جو

Marfat.com

خدا پر بہتان باندھتے ہیں یا جب حق اُن کے پاس آتا ہے تو اُس کا انکار کرتے ہیں۔ (ومن اظلم ممن افترٰی علی اللّٰہ کذبًا او کذّب بالحق لمّا جاءہ)۔

ہم نے تمہارے لیے اس امر کی واضح دلائل قائم کر دی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں ہے۔ مگر تم تو خدا پر بہتان لگاتے ہو اور اُس کے لیے شریک بنا لیتے ہو۔ یہاں تک اپنے اس کفر و شرک کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ یہ سب کچھ بھی رضائے الٰہی سے ہو رہا ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ ہم نے تم پر قرآن نازل کیا جس میں حق کے دلائل واضح اور روشن ہیں۔ لیکن تم ان چیزوں سے قطع نظر کر کے اُنھیں پسِ پُشت ڈال دیتے ہو۔ کیا اس سے بھی بڑا کوئی ظلم و ستم متصور ہو سکتا ہے؟

یہ شیوہ اپنے اُوپر اور تمام بنی نوعِ انسان پر ظلم ہے کیونکہ شرک اور کُفر ظلم عظیم ہے۔

بہ الفاظ دیگر وسیع معنی کے لحاظ سے ظلم کا مفہوم یہ ہے کہ "کسی چیز کو اُس کے مناسب مقام سے نکالنا اور منحرف کر دینا" اِس لحاظ سے ـــــ کیا اِس سے بھی بدتر کوئی بات ہو سکتی ہے کہ انسان ایک بے حقیقت پتھر اور لکڑی کو خالق زمین و آسمان کا شریک و سہیم بنا دے۔

علاوہ ازیں شرک جُملہ معاشرتی مفاسد کی بُنیاد ہے۔ درحقیقت دُوسرے مظالم اسی سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً ہوا پرستی جاہ پرستی یا دُنیا پرستی۔ ان میں سے ہر ایک۔ ایک قسم کا شرک ہے۔

لیکن ہر شخص متنبّہ رہے کہ " ایک نامُبارک انجام " مُشرکین کے انتظار میں ہے۔ کیا کافروں کا مقام و محل دوزخ نہیں ہے: (الیس فی جھنّم مثوًی للکافرین)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید میں پندرہ مقامات پر جن لوگوں کو ظالم ترین افراد کہا گیا ہے۔ اُن سب کا ذکر جُملہ استفہامیہ سے کیا گیا ہے۔ یعنی " من اظلم " (یہ استفہام انکاری ہے)۔

اِن آیات میں غور و فکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ بظاہر ان میں مختلف مسائل بیان ہوئے ہیں مگر دیکھا جائے تو ان سب کی بُنیاد شرک ہے۔ اِس لیے اِن میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لیے جلد پنجم میں سُورہ انعام آیت ۲۱ کے تحت دیکھیے:

٭ ٭ ٭

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت میں جس پر سُورۂ عنکبوت کا اختتام ہوتا ہے، ایک اہم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ جو اس تمام سُورت کا جُوہر ہے اور اُس کے آغاز سے ہم آہنگ ہے۔

فرمایا گیا ہے اگرچہ راہِ خدا میں بہت سی مشکلات ہیں۔ مثلاً ایک دُشواری حق کو پہچاننے کی جہت سے ہے۔ شیاطین جنّ و انس کے وسوسوں کے لحاظ سے بھی دشواری ہے۔ بے رحم اور مغرور دُشمنوں کی مخالفت بھی ایک دُشواری ہے، علاوہ بریں وہ لغزشیں بھی ایک مشکل ہیں جن کا انسان سے سرزد ہونا ممکن ہے۔ لیکن اِس مقام پر ایک ایسی حقیقت بھی ہے جو اِن مُشکلات کے مقابلے میں دل کو اطمینان بخشتی اور قوی رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ " جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم

Marfat.com

انھیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں اور خدا نیکو کاروں کے ساتھ ہے": (والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین)۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اس مقام پر کلمہ " جہاد " سے کیا مُراد ہے ؟ آیا اس سے مُراد " جہاد با دُشمن " ہے ؟ یا جہاد بالنفس ؟ یا جہاد در راہِ معرفتِ خُدا " بذریعہ علم و استدلال ہے ؟

مفسّرین نے اس کے مفہوم کے لیے متعدد احتمالات کا ذکر کیا ہے ۔ اسی طرح کلمہ " فینا " کی تعبیرات میں بھی اختلاف ہے آیا اس سے مُراد " راہ رضائے الٰہی " ہے ؟ یا راہِ جہاد بالنفس مُراد ہے ؟ یا طریقِ عبادت مُراد ہے ؟ یا دشمنانِ اسلام سے جنگ کرنا مُراد ہے ؟

لیکن —— یہ ایک روشن امر ہے کہ کلمہ " جہاد " اور اسی طرح کلمہ " فینا " کا مفہوم نہایت وسیع ہے اور اس کا اطلاق ہمہ جہت ہے ۔ وہ تمام کوششیں اور ہر قسم کا جہاد جو راہِ خدا میں صرف اُس کی رضا کے لیے کیا جائے اور جس کی غایت یہ ہو کہ انسان منشائے الٰہی کے تحت زندگی بسر کرے ، اس مفہوم میں شامل ہیں ۔ خواہ انسان اکتسابِ معرفتِ الٰہی کی راہ میں کوشش کرے یا اپنے نفس سے جہاد کرے یا دشمنانِ اسلام سے جنگ کرے یا اطاعتِ الٰہی کی مشقت کو برداشت کرے یا وسوسۂ معصیت کے مقابلہ میں استقامت اختیار کرے یا اپنی توانائی مستضعف افراد کی مدد کرنے میں صرف کرے یا کوئی اور نیک کام کرے ۔ غرض سب باتیں کلمات " جہاد " اور " فینا " کے مفہوم میں شامل ہیں ۔

الغرض جو لوگ مذکورہ راہوں میں جس شکل و صورت سے بھی مُجاہدہ کرتے ہیں خدا کی حمایت و ہدایت اُنکے شاملِ حال رہتی ہے ۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اُس سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آیت میں کلمہ " سُبُل " (جمع سَبیل بمعنی راہ) سے مُراد مختلف راستے ہیں ، جو خُدا تک پہنچتے ہیں ۔ یعنی جن کی غایت رضائے الٰہی ہے مثلاً : راہِ جہاد بالنفس ، راہِ جہاد با دُشمنانِ اسلام ، راہِ تحصیل علم و دانش وغیرہ ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان مقاصد میں سے انسان کسی مقصد کے لیے بھی جہاد کرے تو وہ اس راہ پر گام زن ہو جاتا ہے جو خُدا تک پہنچتی ہے ۔

خدا نے اپنی راہ کے تمام مُجاہدین سے یہ وعدہ کیا ہے ۔ تو اس وعدہ کو مختلف تاکیدات سے (مثلاً لام تاکید اور نونِ تاکید ثقیلہ سے) مؤکد کیا ہے اور انسان کی کامیابی ، ترقی اور حصولِ مقاماتِ رُوحانی کو دو چیزوں میں محصور کر دیا ہے اور وہ ہیں " جہاد " اور " خلوصِ نیّت " ۔

کچھ فلاسفر کا عقیدہ ہے کہ " تفکر اور مطالعہ " سے علم و دانش حاصل نہیں ہوتی ۔ بلکہ یہ ورزشِ ذہنی انسان کی رُوح کو " صُورِ معقولات " کے قبول کرنے کے لیے تیار کر دیتی ہے اور جس وقت انسان کی رُوح اُنھیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے تو خالق متعال و واہب الصُّوَر کی جانب سے انسان کی رُوح پر فیضِ علم کی بارش ہوتی ہے ۔

اس بنا پر انسان کو اس راہ میں جہاد تو ضرور کرنا چاہیئے لیکن ہدایت خُدا کے اختیار میں ہے ۔ نیز حدیث میں یہ جو وارد ہوا ہے کہ :

Marfat.com

حصولِ علم کا انحصار تعلیم و تعلّم کی کثرت پر نہیں ہے بلکہ علم ایک نُور ہے کہ خدا جس قلب کو اہل اور مناسب حال سمجھتا ہے اُس میں ودیعت کر دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس کا اشارہ بھی ہمارے بیان کردہ مفہوم کی طرف ہو۔

❊ ❊ ❊

چند اہم نکات

۱۔ جہاد و اخلاص : آیات ماقبل سے یہ مطلب بخوبی اخذ ہوتا ہے کہ ہمیں جو بھی شکست و ناکامی پیش آتی ہے، وہ اِن دو اسباب میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یا تو ہم نے جہاد میں کوتاہی کی ہے یا ہمارے عمل میں خلوص نہ تھا۔ اگر یہ دونوں شرائط (جہاد و اخلاص) باہم جمع ہو جائیں تو اللہ کے تاکیدی وعدے کے مطابق اُن کے لیے مقاصد میں کامیابی اور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت یقینی ہے۔

اگر ہمارے منہاجِ فکر درست ہو تو ہم اسلامی معاشروں کو پیش آنے والی مُشکلات اور مصائب کے اسباب معلوم کر سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں کہ جو مُسلمان کل تک رہنمائے عالم تھے، آج پس ماندہ کیوں ہو گئے ہیں ؛

وُہ زندگی کے ہر پہلو یہاں تک کہ ثقافت، کلچر اور اپنے قوانین کے لیے بھی دوسروں کی طرف دستِ نیاز کیوں دراز کرتے ہیں ؟

وُہ سیاسی طُوفانوں اور بیرونی فوجی حملوں کی صُورت میں دوسروں پر بھروسہ کیوں کرتے ہیں ؟

ایک وقت وُہ تھا کہ دُوسرے اُن کے خوانِ علم و ثقافت کے ریزہ چیں تھے۔ اور آج وہ دوسروں کے دسترخوان سے رفعِ احتیاج کرتے ہیں۔

وہ کیوں اغیار کے دستِ ہوس میں گرفتار ہیں اور اُن کے مُلک دوسروں کے تصرف میں کیوں ہیں ؟

اِن تمام سوالات کا ایک ہی جواب ہے وہ یہ کہ یا تو ہم نے جہاد کو فراموش کر دیا ہے یا ہماری نیتوں میں خلوص باقی نہیں رہا۔

ہاں ــــ بالکل درست ہے کہ علمی و ادبی، سیاسی و اقتصادی اور فوجی محاذوں پر ہم نے جہاد کو قطعی فراموش کر دیا ہے۔ اس کے بجائے مُسلمانوں پر حُبِ نفس، دُنیا کی محبت، راحت طلبی، تنگ خیالی اور اغراضِ شخصی غالب آگئی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے اپنے ہاتھ کے مقتولین کی تعداد اُس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کہ دُشمن نے قتل کی ہے۔

ایک مغرب زدہ یا مشرق زدہ گروہ ہے جس نے اپنی عزّتِ نفس اور اپنی خُودی کو اُن اقوام کے مقابل ہار دیا ہے۔ اسلامی ممالک کے صاحبانِ اقتدار اور رہنمایانِ قوم نے اپنے آپ کو غیر اقوام کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

اہلِ دانش اور صاحبانِ فکر و تدبیر نے مایوس ہو کر خلوت نشینی اختیار کر لی ہے۔ اِن سب اسباب نے جذبۂ جہاد اور اخلاص کو محو کر دیا ہے۔

Marfat.com

جس وقت بھی ہمارے اندر تھوڑا سا اخلاص بھی پیدا ہوجائے گا اور ہمارے مجاہدین میں حرکتِ عمل پیدا ہوگی تو یکے بعد دیگرے کامیابیاں حاصل ہوتی جائیں گی۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ مایوسیاں اُمید سے اور ناکامیاں کامیابی سے، ذلت عزّت و سربلندی سے، انتشار و نفاق وحدت و تنظیم باہمی سے بدل جائے گی۔

قرآن کتنا باعظمت والہام بخش ہے کہ اُس نے ایک مختصر سے جُملے میں درد و درمان دونوں کو بیان کر دیا ہے۔

درست ہے کہ جو لوگ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں ہدایتِ الٰہی اُن کے شاملِ حال رہتی ہے اور یہ بدیہی ہے کہ ہدایتِ الٰہی کے ہوتے ہوئے گمراہی اور شکست کبھی پیش نہیں آسکتی۔

اہلِ بیتؑ کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت کا مرجع آلِ محمدؐ اور اُن کے پیرو ہیں۔ تو درحقیقت وہ اِس مفہوم کے مصداقِ کامل ہیں کیونکہ یہ حضرات طریقِ جہاد اور راہِ اخلاص میں پیش قدم اور پیش رَو تھے۔ اِس تفسیر سے آیت کا مفہوم محدود نہیں ہوتا۔

بہرحال ہر شخص اپنی جدوجہد کے دوران میں اِس حقیقتِ قرآنی کو واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ جس وقت بھی وہ راہِ خُدا میں سعی و کوشش اور جہاد کے لیے آمادہ ہوتا ہے تو اُس کے لیے آسانیوں کے دروازے کُھل جاتے ہیں اور مُشکلات آسان ہوجاتی ہیں اور اُس کے لیے سختیاں قابلِ تحمل ہوجاتی ہیں اور وُہ اُن پر غالب آجاتا ہے۔

۞ ۞ ۞

۲۔ **لوگ تین قسم کے ہیں:** (۱) ایک گروہ ہٹ دھرم مُنکرین کا ہے کہ کوئی ہدایت بھی اُن کے لیے سُود مند نہیں ہے۔

(۲) دُوسرا گروہ اُن مُخلصین کا ہے جو حق کی جستجو میں رہتے ہیں اور نتیجتاً حق کو پا لیتے ہیں۔

(۳) تیسرا گروہ اِن سے بھی برتر ہے۔ وہ لوگ حق سے دُور نہیں ہیں کہ کوشش کرکے نزدیک ہوں۔ وُہ حق سے جُدا نہیں ہیں کہ کوشش کرکے اُس سے جا ملیں بلکہ وُہ ہمیشہ حق کے ساتھ ہیں۔

آیت ۶۸ میں " ومن اظلم ممّن افترٰی " کا اِشارہ گروہِ اوّل کی طرف تھا۔ اور۔ آیت ۶۹ میں " والّذین جاھدوا فینا " سے گروہِ دُوم مراد ہے۔ اور اِسی آیت میں " اِنّ اللّٰہ لمع المحسنین " گروہِ سوم کے لیے ہے۔ اِن الفاظ سے یہ مفہوم بھی اخذ ہوتا ہے کہ " مُحسنین " کا مقام مجاہدین سے ارفع ہے۔ کیونکہ یہ لوگ جہاد اور اپنی نجات کے لیے کوشاں رہنے کے علاوہ مقامِ ایثار و احسان پر بھی فائز ہیں اور دُوسروں کے لیے اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے سے پہلو تہی نہیں کرتے۔

۞ ۞ ۞

اے پروردگار! تو ہمیں ایسی توفیق عنایت فرما کہ تمام عمر تیری راہ میں سعی و کوشش سے دست بردار نہ ہوں۔

خُداوندا! ۔ تو ہمیں ایسا اخلاص مرحمت فرما کہ ہمیں تیرے سوا کسی غیر کا خیال بھی نہ آئے اور کسی غیر کی طرف ہمارا قدم نہ اُٹھے۔

Marfat.com

بارِالٰہا !

تُو ہمارا مقام مجاہدین سے بلند کردے اور ہمیں مُحسنین کے مقام احسان و ایثار پر فائز کردے اور تمام عمر تو ہمارے سروں پر اپنی ہدایت کا سایہ رکھ۔ آمین یا رب العالمین ۔

تفسیر سُورَہ "عنکبُوت" اختتام کو پہنچی

۲۱ شوال ۱۴۰۳ھ ہجری

○

Marfat.com

سُورۃ رُوم

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۶۰ آیات ہیں

Marfat.com

سُورۂ رُوم کے مُندرجات

قولِ مشہور کے مطابق چونکہ یہ تمام سُورہ مکہ میں نازل ہُوئی ہے لہٰذا اس میں مکی سُورتوں کے سے مضامین اور رُوح موجود ہے ۔ یعنی اس میں سب سے زیادہ مبداء و معاد کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے ۔ کیونکہ اسلام کا مکی عہد ایسا زمانہ تھا جس میں بُنیادی اعتقادات کی تعلیم پر زور تھا ۔ مثلاً توحید ، مبارزہ باشرک ، توجہ بہ معاد اور بروزِ قیامت اعمال کی جزا و سزا وغیرہ ۔ ان مباحث کے ضمن میں کچھ اور مطالب بھی آگئے ہیں جو ان ہی سے مربُوط ہیں ۔

درحقیقت اِس سُورۃ کے مضامین کا اِن سات حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے :

۱ ۔ اِس میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ آئندہ ہونے والی جنگ میں اہلِ روم کو ایرانیوں پر فتح حاصل ہوگی ۔ یہ پیش گوئی اُس گفتگو کی مناسبت سے ہے جو اِس موضوع پر مُسلمانوں اور مُشرکین میں ہُوئی تھی ۔ اِن شاء اللہ آئندہ ہم تفصیل سے اس کا ذکر کریں گے ۔

۲ ۔ کسی قدر بے ایمان افراد کی طرزِ فکر اور اُن کی کیفیتِ حالات کا ذکر ہے اور اُس کے بعد اُنھیں بروزِ قیامت اُن کی بداعمالیوں کی سزا اور عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ۔

۳ ۔ اس سُورۃ کی آیات کے ایک اہم حصّے میں خُدا کی عظمت کا ذکر ہے اور اس کے لیے ان امور کی نشاندہی کی گئی ہے : آسمان و زمین ، اِنسان کے وجُود ، موت سے حیات اور حیات سے موت کے ظہور ، خاک سے انسان کی پیدائش ، اُس کے لیے نظامِ زوجیت اور اِس نظام سے ہم جنس افراد کی پیدائش ، پھر اُن کے درمیان رابطہ محبت ، بوقتِ شب نیند کی نعمت ، دن کو حصولِ معاش کے لیے حرکت و عمل ، ظہورِ رعد و برق و باران ، موت کے بعد زمین کا دوبارہ زندہ ہونا اور امرِ الٰہی کے مطابق زمین اور دیگر سیاروں کے نظام کی تدبیر ۔

۴ ۔ ان دلائل کے ذکر کے بعد جو معرفتِ الٰہی کے لیے انفس و آفاق میں موجود ہیں ، یہ ذکر ہے کہ توحید ایک امرِ فطری ہے ۔

۵ ۔ بے ایمان افراد کے حالات کو مشرح طور پر مکرر بیان کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اُن کے گناہوں کے نتیجے میں زمین فساد سے بھر گئی ہے ۔

۶ ۔ سُود خواری کی مذمّت کی گئی ہے نیز مسئلہ مالکیت اور حقِ ذی القربیٰ کا ذکر ہے ۔

۷ ۔ دلائلِ توحید کے لیے حق کی نشانیوں کا مکرّر ذکر ہے اور اُن مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو معاد سے متعلق ہیں ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اِس سُورۃ میں بھی قرآن کی دُوسری سُورتوں کی طرح دلائلِ عقلی بھی ہیں ، جذب و احساس کو بھی بیدار کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خطابت کا ایسا مرکب ہے کہ مجموعی طور پر نفوسِ انسانی کی ہدایت اور تربیت کے لیے ایک جامع منصوبہ ہے ۔

Marfat.com

فضیلتِ سُورۂ رُوم

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے۔ جس کی طرف ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

جو شخص ماہِ رمضان کی تئیسویں شب میں سُورۂ عنکبوت اور سُورۂ رُوم پڑھے گا۔
قسم بخُدا وہ اہلِ بہشت میں سے ہے۔ مَیں اس کلیہ میں کوئی استثنا نہیں کرتا۔
ان دو سُورتوں کی خُدا کے نزدیک بڑی وقعت ہے[1]

جنابِ رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث اس طرح سے منقول ہے:

من قرئها كان له من الاجر عشر حسنات بعدد كل ملك سبح الله بين السمآء والارض وادرك ما ضيع في يومه وليلته۔

جو شخص کہ سُورہ رُوم کو پڑھے گا اُسے ہر اُس فرشتے کے حسنات کے مقابل جو زمین اور آسمان کے درمیان خُدا کی تسبیح کرتا ہے، دس گناہ اجر ملے گا اور جو کچھ اُس نے رات یا دن میں تلف کیا ہے اُس کی بھی تلافی ہو جائے گی۔[2]

یہ امر واضح ہے کہ جو شخص اس سُورۃ کے مضامین کو جو کہ سراسر درسِ توحیدِ خدا ہے اور بروز قیامت عظیم عدل و انصاف کے بیان پر مشتمل ہیں۔ اپنے قلب و روح میں جگہ دے گا، وہ محسوس کرے گا کہ خدا ہر لحہ اُس کا محافظ و نگہبان ہے اور وہ روزِ جزا اور بروز قیامت عدلِ الٰہی کا یقین رکھے گا اور اُس کا دل خدا کے خوف سے اس طرح سے معمور ہو جائے گا کہ وہ ایسے اجرِ عظیم کا مستحق ٹھہرے گا۔

۞ ۞ ۞

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۴ صـ۱۶۹ بحوالہ ثواب الاعمال از شیخ صدوق۔

[2] مجمع البیان آغاز سُورۂ روم۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ الٓـمّٓ ۚ

۲۔ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ

۳۔ فِىۡۤ اَدۡنَى الۡاَرۡضِ وَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُوۡنَ ۙ

۴۔ فِىۡ بِضۡعِ سِنِيۡنَ ؕ لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَيَوۡمَئِذٍ
يَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ

۵۔ بِنَصۡرِ اللّٰهِ ؕ يَنۡصُرُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۙ

۶۔ وَعۡدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخۡلِفُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ
لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝

۷۔ يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۖۚ وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ
هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝

ترجمہ

۱۔ الٓم ۔

Marfat.com

۲۔ اہل رُوم مغلوب ہو گئے۔
۳۔ (اور یہ شکست) نزدیک کے مُلک میں رُونما ہُوئی۔ لیکن وُہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آ جائیں گے۔
۴۔ چند ہی سال ہیں۔ سب کام حکمِ خدا سے ہوتے ہیں خواہ (اس شکست و کامیابی سے) قبل ہوں یا بعد ہیں اور اُس روز مومنین خوش ہو جائیں گے۔
۵۔ خُدا کی مدد کے سبب سے۔ خُدا جسے چاہتا ہے فتح و نصرت دیتا ہے اور وُہ عزیز د رحیم ہے۔
۶۔ یہ خُدا کا وعدہ ہے اور وُہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔
۷۔ یہ لوگ تو دُنیا کی صرف ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت کی زندگی سے غافل ہیں۔

شانِ نزول

چند مفسرین بزرگ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سُورۃ کی پہلی آیات اُس وقت نازل ہوئی تھیں جب جناب رسالت مآبؐ مکہ میں تھے اور مومنین بہ لحاظ تعداد اقلیت میں تھے۔ اُس زمانے میں ایرانیوں اور رُومی حکومت میں جنگ ہوئی۔ جس میں ایرانی فوج کو فتح ہوئی تھی۔

مکہ کے مُشرکین نے اس فتح کو فال نیک سمجھ کر اپنے شرک کو مبنی برحق ہونے کی دلیل قرار دیا اور کہا کہ ایرانی تو مُشرک اور مجُوسی ہیں کیونکہ وہ ثنویت پرست ہیں مگر رُومی مسیحی اور اہل کتاب ہیں۔ لہٰذا جس طرح ایرانی غالب اور رُومی مغلوب ہُوئے اسی طرح آخری فتح شرک ہی کی ہوگی، اِسلام کا دُور جلد ختم ہو جائے گا اور ہم فتح مند ہوں گے۔

اگرچہ اس قسم کی خوش فہمیاں بے بُنیاد ہوتی ہیں۔ لیکن اُس معاشرے اور ماحول کے جُہلا میں یہ پروپیگنڈا بے اثر نہیں رہ سکتا تھا۔ لہٰذا یہ امر مُسلمانوں پر گراں گزرا۔

اُس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ جن میں حتمی طور پر یہ کہا گیا کہ اگرچہ ایرانی اِس جنگ میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ رُومی فوج سے شکست کھائیں گے۔ یہاں تک کہ اس پیش گوئی کے پُورا ہونے کا وقت بھی بتا دیا گیا اور کہا کہ چند سال کے اندر ہی یہ امر وقوع پذیر ہو گا۔

Marfat.com

قرآن کی یہ حتمی پیش گوئی ایک طرف تو اس کتاب آسمانی کے اعجاز کی علامت اور اس امر کی دلیل تھی کہ اُس کے لانے والے کو خدا کے علم بے پایاں اور اُس کے عالم الغیب ہونے پر کتنا بھروسہ تھا۔ دوسری طرف یہ مشرکین کی فال گیری کی نقیض تھی اس پیش گوئی نے مسلمانوں کو ایسا آسودہ و مطمئن کر دیا کہ اُن میں سے بعض نے اس مسئلے پر مشرکین سے شرط باندھنی شروع کر دی۔ (یہ ملحوظ رہے کہ اُس وقت تک اِس قسم کی شرط بندی کی ممانعت کا حکم نہیں آیا تھا) [۱]

تفسیر

ایک عجیب پیش گوئی :

یہ سُورۃ اُن اُنتیس سُورتوں میں سے ایک ہے جو حروفِ مُقطعہ سے شروع ہوتی ہیں (الٓمٓ) ہم ان حروفِ مقطعہ کی تفسیر کے بارے میں بارہا بحث کر چکے ہیں بالخصوص سُورہ بقرہ، سُورہ آلِ عمران اور سُورۂ اعراف کی ابتداء میں۔

اس مقام پر جو چیز جاذبِ توجہ ہے وہ صرف یہ ہے کہ بہت سی اُن سُورتوں کے برخلاف جو حروفِ مقطعہ سے شروع ہوتی ہیں اور معاً بعد ازاں اُن میں عظمتِ قرآن کا ذکر شروع ہو جاتا ہے،

اس سُورہ میں عظمتِ قرآن کی بحث نہیں ہے بلکہ ایرانیوں کے مقابلے میں اہلِ رُوم کی شکست اور پھر اُن کی فتح کا ذکر ہے۔ لیکن غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بحث بھی عظمتِ قرآن ہی کا بیان ہے۔ کیونکہ یہ غیبی خبر جو زمانۂ مُستقبل سے متعلق ہے، اس کتابِ آسمانی کی عظمت و اعجاز کے دلائل میں شمار ہوتی ہے۔

❁ ❁ ❁

خداوندِ عالم حروفِ مُقطعہ کے ذکر کے بعد فرماتا ہے، رُومی مغلوب ہو گئے: (غُلِبَتِ الرُّوْمُ)۔

اور یہ شکست اُس مقام پر ہوئی ہے جو تم سے نزدیک ہے: (فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ)۔

"اے ساکنانِ مکہ!" تمہارے نزدیک کے علاقہ میں یہ واقعہ نمودار ہوا ہے۔ یعنی جزیرۃ العرب کے شمال سرزمین شام میں۔ اس علاقے میں جو بصری اور اذرعات کے درمیان واقع ہے۔

اس مقام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ "رُوم" سے مشرقی رُوم (موجودہ ترکی) مُراد ہے نہ کہ مغربی۔

بعض مفسّرین (مثلاً شیخ طُوسی نے تبیان میں) نے یہ خیال کیا ہے کہ "ادنی الارض" سے مُراد مُلکِ ایران ہے یعنی یہ شکست ایران اور رُوم کی سرحد پر واقع ہوئی۔ [۲]

کلمہ "الارض" کی ابتداء میں الف و لام عہد کے پیش نظر پہلی تفسیر درست معلوم ہوتی ہے لیکن بعض جہات سے

---

[۱] یہ شانِ نزول مختلف تعبیرات سے تفاسیر مجمع البیان، المیزان، نور الثقلین، ابو الفتوح رازی تفسیر فخر رازی، تفسیر آلوسی، تفسیر فی ظلال اور دُوسری تفاسیر میں آئی ہے۔

[۲] تفسیر تبیان، جلد ۸ صفحہ ۲۰۶۔

Marfat.com

جن کا ذکر ہم کریں گے دُوسری تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

کلمہ " ادنی الارض " سے ایک تیسرا مفہوم بھی اخذ ہو سکتا ہے جو باعتبار نتیجہ تفسیر دوم سے زیادہ مختلف نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ " زمین " سے مُراد روم کا علاقہ ہے یعنی اہلِ روم نے اپنی سرحد کے قریب ترین علاقے میں ایرانیوں سے شکست کھائی۔

کلمہ " ادنیٰ " سے اس شکست کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اگر کسی فوج کو اُس کے مُلک کی سرحد سے دُور دراز علاقے میں شکست ہو جائے تو یہ امر اس قدر اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کسی فوج کو اُس کے مُلک کے قریبی علاقے میں جہاں اُسے ہر طرح کی کُمک پہنچ سکتی ہے اور جو زیادہ مضبُوط علاقہ شمار ہو وہاں شکست ہو جائے۔

اس بناء پر " فی ادنی الارض " کے مفہوم میں رُومیوں کی شکست کی اہمیت شامل ہے۔ اس حالت میں مغلوب قوم کے لیے یہ پیش گوئی کہ اُنھیں آئندہ چند سال میں فتح حاصل ہو گی اور بھی زیادہ اہم ہے اور ایسی پیش گوئی طریق اعجاز کے علاوہ اور کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

اس شکست کے ذکر کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ رُومی اس شکست کے بعد جلد ہی فتح یاب ہوں گے: (وھم من بعد غلبھم سیغلبون)۔

صرف کلمہ " سیغلبون " ہی (یعنی وہ جلد غالب ہوں گے) بیان مقصود کے لیے کافی تھا مگر " من بعد غلبھم " کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے " تاکہ فتح کی اہمیت زیادہ ہو جائے۔ کیونکہ ایک شکست خوردہ فوج کا ایک قلیل مُدّت میں پھر غالب آجانا غیر متوقع ہے اور قرآن میں مُستقبل میں اس کے وقوع کی خبر دی گئی ہے۔[1]

اس کے بعد اس حادثے کے وقوع کی مُدّت بالفاظ (فی بضع سنین)۔ چند سال ہی میں بیان کی گئی ہے۔ جب کلمہ " بضع " کہا جاتا ہے تو اس سے کم از کم تین سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال مُدّت مُراد ہوتی ہے۔[2]

---

[1] خسرو اوّل انوشیرواں کے بعد اس کا بیٹا ہرمزد اور ہرمزد کے قتل کے بعد پرویز ملقب بہ خسرو دوم تخت نشین ہوا۔ ۶۱۲ء میں روم کے بادشاہ قیصر ماریس کو ایک شخص مسمی فوکس نے قتل کر دیا۔ خسرو نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر رُوم کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں جو ۶۱۵ء تک جاری رہی ایرانی سپہ سالاروں نے الرّہا، انطاکیہ، دمشق اور یروشلم پر قبضہ کر لیا اور شمالی مصر کے بعض حصے بھی فتح کر لیے " غُلبتِ الرُّوم " اس واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ قیصر ماریس کے بعد ہرقل روم کا بادشاہ بنا اس نے ۶۲۳ء ۶۲۴ء عیسوی میں ایرانیوں سے نہ صرف مفتوحہ علاقے واپس لے لیے بلکہ وہ ایرانی حدُود میں داخل ہو کر شہر گنزک تک پہنچ گیا۔ ۶۲۸ء میں وہ ایران کے دارالسلطنت تیسفون تک آ پہنچا۔ خسرو وہاں سے فرار ہو گیا اور تھوڑی مُدّت بعد ایک بغاوت میں مارا گیا۔ " وھم من بعد غلبھم سیغلبون " رُومیوں کی اس فتح کی پیشین گوئی ہے۔

[2] کلمہ " بضع " سے اور معنی بھی مُراد لیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مُدّت کم از کم تین سال اور زیادہ سے زیادہ دس سال ہوتی ہے یا کم از کم ایک سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال یا کم از کم چھ سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال۔ مگر ہم نے جو کہا وہ زیادہ مشہور ہے۔

Marfat.com

اگر خدا زمانۂ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی خبر دیتا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر چیز اور ہر کام اُسی کے اختیار میں ہے۔ خواہ کوئی بات اس شکست خوردہ قوم کی فتح سے پہلے ہو یا بعد میں: (لله الامر من قبل ومن بعد) ۔

یہ امر بدیہی ہے کہ کائنات میں ہونے والے ہر واقعے کا خُدا کے حکم اور اس کے ارادے سے وقوع پذیر ہونا ہمارے اختیار و آزادیٔ ارادہ اور پیشِ نظر مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے سعی و کوشش میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ اس عبارت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ انسان سے اختیار کو سلب کرے بلکہ یہ نکتہ سمجھانا مقصود ہے کہ درحقیقت قادر بالذات اور مالک علی الاطلاق وہی ہے اور کسی انسان کے پاس جو کچھ ہے اُسی کا دیا ہوا ہے۔

اس کے بعد اِن الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے کہ: اگر آج رُومیوں کو شکست ہوگئی ہے اور مُشرک اس سے خوش ہیں تو جب رُومی غالب ہوں گے تو مومنین خوش ہوں گے: (ويومئذ يفرح المؤمنون) ۔

البتہ مومنین نُصرتِ الٰہی سے خوش ہوں گے: (بنصر الله) ۔

خدا جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، وہ شکست ناپذیر اور مہربان ہے: (ينصر من يشاء وهو العزيز الرحيم)

اُس روز مُسلمانوں کی خوشنودی سے کیا مراد ہے؟

اس کے متعلق کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رُومیوں کی فتح سے خوش ہوں گے۔ ہرچند کہ ان کا شمار بھی کفار میں تھا۔ لیکن ـــــ چونکہ وہ کتاب آسمانی کے حامل تھے اس لیے مُشرک مجوسیوں پر اُن کی فتح گویا شرک پر توحید کی فتح کا ایک مرحلہ تھی۔

اس مسئلے میں بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ مومنین اس وجہ سے خوش ہوئے کہ اُنھوں نے اس واقعے کو فالِ نیک سمجھا اور مُشرکین پر اپنی فتح کی دلیل خیال کیا۔

یا یہ کہ ـــــ اُن کی خوشی کا باعث یہ تھا کہ اس واقعے سے اُس روز قرآن کی عظمت اور اُس کی پیش گوئی کی صداقت ظاہر ہوگئی۔ یہ بات بھی مُسلمانوں کے لیے ایک اہم معنوی فتح خیال کی گئی۔

یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے کہ رُومیوں کی فتح مُسلمانوں کی مشرکین پر فتوحات میں سے ایک فتح کی ہم زمان تھی۔ بالخصوص بعض بزرگ مفسّرین نے لکھا ہے کہ رُومیوں کی یہ فتح مُسلمانوں کی جنگ بدر میں فتح یا صلح حُدیبیہ کے ہم زمان تھی کہ وہ بھی اپنی حیثیت سے ایک بڑی فتح شمار ہوتی تھی۔ خاص طور پر کلمہ " بنصر الله " اس مطلب سے مناسبت رکھتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مُسلمان اُس روز مختلف جہتوں سے خوش ہوئے۔

اوّل تو اس وجہ سے کہ اہلِ کتاب کو مجوسیوں پر فتح حاصل ہوئی جو کہ خدا پرستی کی شرک پر فتح کی علامت تھی۔

دوم: چونکہ قرآن کی معجزانہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی، اس لیے یہ بھی ایک معنوی فتح تھی۔

Marfat.com

سوم : اُسی زمانے میں مُسلمانوں کو دوسری فتوحات کے علاوہ ایک اور فتح حاصل ہوئی تھی، وہ تھی صلح حدیبیہ۔

٭ ٭ ٭

پھر بطور تاکید مزید فرمایا گیا ہے : یہ وہ وعدہ ہے جو خدا نے کیا ہے : (وعد اللہ)[1]۔
اور خدا ہرگز وعدہ خلافی نہ کرے گا ، اگرچہ اکثر آدمی نہیں جانتے: (لا یخلف اللہ وعدہٗ ولٰکنّ اکثر الناس لا یعلمون)۔

اور لوگوں کی لاعلمی کا باعث یہ ہے کہ اُنھیں خدا اور اُس کے علم و قدرت کی معرفت حاصل نہیں ہے۔ درحقیقت اُنھوں نے خدا کو پہچانا ہی نہیں۔ اس لیے وہ اِس حقیقت سے کہ خدا کا اپنے وعدے سے پھر جانا محال ہے، آگاہ نہیں ہیں کیونکہ وعدہ سے پھر جانا یا تو جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی وعدہ کرتے وقت کوئی بات نامعلوم تھی مگر جب بعد میں معلوم ہوئی تو رائے بدل گئی یا وعدہ خلافی ضعف و ناتوانی کی وجہ سے ہوتی ہے جس کے باعث وعدہ کرنے والا اپنی رائے بدل لیتا ہے۔ کیونکہ اُس میں اپنا وعدہ پُورا کرنے کی قدرت نہیں ہوتی۔
لیکن وہ خدا جو ہر کام کے انجام سے باخبر ہے اور اس کی قدرت جُملہ اہلِ جہان کی قدرتوں پر فوقیت رکھتی ہے، ہرگز اپنے وعدے سے نہ پھرے گا۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ : یہ کوتاہ بیں لوگ دُنیا کی صرف ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں اور آخرت اور انجامِ کار سے بے خبر ہیں: (یعلمون ظاھراً من الحیٰوۃ الدنیا وھم عن الاٰخرۃ ھم غافلون)۔
یہ لوگ صرف دُنیاوی زندگی سے آگاہ ہیں اور اِس زندگی کی بھی صرف ظاہری حالت پر قناعت کیے ہُوئے ہیں۔ اِن لوگوں نے دُنیاوی زندگی سے جو حاصل کیا ہے وہ صرف چند مصروفیات ۔ لذّات زودگزر اور خواب و خیال ہیں اور اس زندگی کے ماحصل میں جو غرور اور غفلت پوشیدہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔
اگر وہ لوگ دُنیا کی اس زندگی کے باطن اور مخفی کیفیت کو بھی جانتے ہوتے تو یہی بات اُن کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھی کہ آخرت میں کیا ہوگا۔ کیونکہ اگر اس حیاتِ ناپائیدار پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طویل زنجیرِ حیات کی ایک کڑی ہے اور طویل سفر کی ایک منزل ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شکمِ مادر میں بچے کی زندگی مقصود بالذّات نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک طویل زندگی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔
ہاں ٹھیک ہے کہ وہ لوگ اس دُنیاوی زندگی کے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور اس کی باطنی کیفیت اور مخفی حالت سے غافل ہیں۔
اس موقع پر جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ آیت ہفتم میں ضمیر " ھم " مکرّر استعمال ہوئی ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اِس غفلت و بے خبری کا باعث وہ خود ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ہم سے کہے کہ : " تو نے مجھے اس

---

[1] " وعد اللہ " بطور مفعول مطلق منصوب ہے اور اس کا عامل محذوف ہے اور اس کے ماقبل جملہ " سیغلبون " سے جو کہ وعدۂ الٰہی کا مصداق ہے، معلوم ہوتا ہے اور بحالتِ تقدیر پُورا جُملہ یوں ہے : " وعد اللہ ذٰلک وعداً "۔

Marfat.com

کام سے غافل کر دیا۔ اور ہم اُس کے جواب میں یہ کہیں کہ : تو تو خود ہی غافل ہوگیا۔ یعنی تو خُود ہی اپنی غفلت کا باعث تھا۔

چند اہم نکات

۱۔ اعجازِ قرآن ـــــ علم غیب کے لحاظ سے : قرآن کا مُعجزہ ثابت کرنے کے دلائل میں سے ایک دلیل قرآن کی غیبی خبریں بھی ہیں کہ جن کا ایک نمونہ آیاتِ زیر بحث میں آیا ہے۔ چنانچہ آیات کے اندر مکرر تاکیدات کے ساتھ ایک شکست خوردہ فوج کی چند سال بعد عظیم فتح کی خبر دی گئی ہے اور اس اطلاع کو خدا کے تخلّف ناپذیر وعدہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس پیش گوئی کے چند اہم پہلو ہیں، اوّل تو مطلقاً فتح کی خبر دی گئی ہے :

وهم من بعد غلبهم سيغلبون

اور اس کے بعد انہیں جلد ہی فتح نصیب ہوگی۔

دوسرے کُفار پر اُسی زمانے کے قریب مُسلمانوں کی فتح کی خبر ہے :

ويومئذٍ يفرح المؤمنون بنصر الله

اور اُس نصرتِ الٰہی کے باعث اہل ایمان خوش ہوں گے۔

تیسرے یہ تصریح ہے کہ واقعہ چند سال بعد ظہور پذیر ہوگا : في بضع سنين۔

چوتھے دو بار تاکید کے ساتھ، اِس وعدے کا قطعی ہونا ثابت کرتا ہے :

وعد الله لا يخلف الله وعده

یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ نو سال بھی نہیں گزرے تھے، یہ دونوں واقعات وقوع پذیر ہوگئے۔ نئی جنگ میں رومیوں نے ایرانیوں پر فتح حاصل کی اور قریباً اُسی زمانے میں صلح حدیبیہ کے ذریعے (اور ایک روایت کے مطابق جنگِ بدر میں) مُسلمانوں کو دُشمنوں پر قابلِ دید فتح حاصل ہوئی۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک انسان اپنے عام اکتسابی علم کے ساتھ ایسے اہم واقعے کی بطور قطعی خبر دے سکتا ہے ؟

یہاں تک کہ بالفرض اگر کوئی سیاسی آدمی پیش بینی کے قابل بھی ہو، تب بھی وہ ایسی بات نہایت محتاط الفاظ میں بطور احتمال کہے گا، نہ کہ اس طرح صراحت اور تیقّن کے ساتھ کیونکہ اگر یہ پیش گوئی غلط ثابت ہو جاتی تو دشمنوں کے ہاتھ ابطالِ نبوّت کی ایک سند آجاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسائل مثلاً اہلِ رُوم کی فتح یا واقعہ مُباہلہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے علم و اطلاع کا منبع

Marfat.com

کوئی دُوسرا تھا۔ وگرنہ کوئی شخص بھی معمول کے اور عام حالات میں نہ اِتنی توانائی رکھتا ہے، نہ جرات کرسکتا ہے کہ تیقن کے ساتھ ایسی بات کہہ دے۔

بالخصوص پیغمبر اسلامؐ کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو غیر محتاط بات کہہ دیتے ہیں بلکہ آپؐ کے تمام کام منظم و محکم تھے۔ ایسا شخص اگر اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کی اطلاعات کا مرکز ماورائے طبیعت ہے اور اس کا انحصار وحیٔ الٰہی اور خدا کے بے پایاں علم پر ہے۔

اس پیش گوئی کی تاریخی مطابقت پر ہم جلد ہی بحث کریں گے۔

٭ ٭ ٭

۲۔ ظاہر بین لوگ : اُصولاً ایک مومن اور صاحب معرفت انسان اور ایک مادہ پرست یا مُشرک کی بصیرت میں بہت فرق ہے۔

مقدم الذکر انسان اپنے عقیدۂ توحید کی بنا پر کائنات کو خدائے حکیم و دانا کی مخلوق سمجھتا ہے۔ اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ کے تمام افعال ایک پیش نظر غایت کے تحت حکمت پر مبنی ہیں۔ اور اسی دلیل سے وہ عالم کو نہایت دقیق اسرار و رموز کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے، اس عالم میں کوئی چیز بھی غیر اہم نہیں ہے۔ اس کتاب کائنات کے تمام کلمات پُرمغز و پُرمعنی ہیں۔

یہ بصیرت توحیدی اُسے مُتنبّہ کرتی رہتی ہے کہ دُنیا کے کسی واقعے اور کسی امر سے سرسری نہ گزر جانا کیونکہ ممکن ہے کہ جو بات بالکل سادہ نظر آتی ہے اُس میں پیچیدہ ترین راز ہوں۔

توحید پرست انسان کی نظر اِس دُنیا کی گہرائی کو دیکھتی ہے، صرف اُس کے ظاہر پر قناعت نہیں کرتی۔ اُس نے مکتب توحید میں یہ سبق پڑھا ہے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدا کا کوئی فعل بھی عبث نہیں ہے اور تخلیقِ عالم کی کوئی غایت ہے۔ اس لیے کائنات کے ہر جزو کو اُسی غایت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔

اُس کے مقابلے میں مؤخر الذکر مادہ پرست بے ایمان انسان دُنیا کو اندھے، بہرے اور بے مقصد واقعات کا ایک مجموعہ سمجھ کر صرف اُس کے ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس حقیقت کا قائل ہی نہیں ہے کہ اس کا باطن اور عمق بھی ہے۔

اس گروہ کا خیال ہے کہ بالفرض ایک کتاب ہے جس کے اوراق پر ایک طفلِ نادان نے اپنی اُنگلیوں سے بے مقصد لکیریں اور خطوط کھینچ دیئے ہیں تو کیا اس کتاب کی کوئی اہمیت ہوگی؟ یا اُس میں کچھ معنی ہوں گے؟ اُن کی نظر میں یہ دُنیا بھی ایسی ہی ہے۔

یہاں تک کہ بعض عظیم سائنس دانوں کا قول ہے کہ بنی نوع انسان میں سے ہر طبقہ اور ہر گروہ کے وہ مفکرین جو نظام کائنات کے متعلق غور و فکر کرتے رہے ہیں وہ مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ (غور کیجیے گا)۔

چنانچہ دانش مند معروف معاصر آئن سٹائن یُوں کہتا ہے[1]:

---

[1] آئن سٹائن (EINSTEIN) کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

Marfat.com

دُنیا کے مغز ہائے متفکر THINKING BRAINS میں سے بمشکل کوئی ایسا شخص مِل سکتا ہے جو ایک قسم کا مخصوص مذہبی احساس نہ رکھتا ہو۔ اگرچہ اُس کا مذہب عامۃ الناس کے مذہب سے مختلف ہوتا ہے۔

اس عالم کا مذہب کائنات کے عجیب و دقیق نظام پر غور کرنے کے بعد ایک مسرت بخش حیرت پر مبنی ہوتا ہے۔ جب کبھی ان اسرار سے پردہ اُٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے اَب تک اپنی منظم کوشش اور غور و فکر سے اس کائنات کے متعلق جو کچھ جانا ہے، وہ علم کے ایک ہلکے عکس سے زیادہ نہیں ہے۔

آئن سٹائن ایک دُوسری جگہ کہتا ہے:

سائنس دانوں، متفکرین اور انکشاف کرنے والوں کے لیے وہ شے جو اس بات کا سبب ہوئی کہ وہ عمر اور سالہا سال تک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر کائنات کے دقیق اسرار کا مطالعہ کرتے رہیں، اُن کا یہی مذہبی اعتقاد تھا۔[1]

ایک وہ آدمی ہے جو اس دُنیا ہی کو آخری مرحلہ اور مقصودِ حیات سمجھتا ہے۔

دُوسرا وہ شخص ہے جس کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور اس کی زندگی تو ایک کھیت اور اُس حیاتِ جاودانی کے لیے میدانِ امتحان ہے جو اس کے بعد آنے والی ہے۔ بھلا ان دونوں آدمیوں کا دُنیا کے متعلق طرزِ عمل یکساں کیسے ہو سکتا ہے؟

اُن میں سے ایک کی نظر صرف اس کے ظاہر پر ہوتی ہے اور دُوسرا اس کی عمیق حقیقت پر غور و فکر کرتا ہے۔

اور زاویۂ نظر کا یہ اختلاف اُن لوگوں کی تمام زندگی کو متاثر کرتا ہے۔

ظاہر بیں انسان راہِ خدا میں خرچ کرنے کو نقصانِ مایہ سمجھتا ہے۔ جب کہ مردِ موحد اسے پُر منفعت تجارت خیال کرتا ہے۔

اُن میں سے ایک سُود خوری کو اپنی آمدنی میں افزائش کا ذریعہ خیال کرتا ہے اور دُوسرا اُسے باعثِ وبال و بدبختی و زیاں سمجھتا ہے۔

اُن میں سے ایک جہاد کو اپنے لیے باعثِ زحمت اور شہادت کو بہ معنی فنا سمجھتا ہے اور دُوسرا جہاد کو رمزِ سربلندی اور شہادت کو حیاتِ جاوداں خیال کرتا ہے۔

یہ درست ہے کہ بے ایمان لوگ دُنیا کی صرف ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں:

یعلمون ظاہرا من الحیوٰۃ الدنیا وھم عن الاٰخرۃ ھم غافلون ۝

۲۔ تاریخی مطابقت: اس پیش گوئی سے جنگِ ایران و رُوم کی مطابقت تاریخی یوں ہے کہ:

خسرو پرویز کے عہد میں ایرانیوں اور رُومیوں کے درمیان ایک طویل جنگ کا سلسلہ شروع ہُوا جو قریباً چوبیس سال تک جاری رہی یعنی ۶۰۴ء سے شروع ہو کر ۶۲۸ء عیسوی میں ختم ہوئی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۶۱۶ء عیسوی میں ایران کے دو سپہ سالاروں شہر براز اور شاہین نے رُوم کے مشرقی علاقے پر

---

[1] ورلڈ از کتاب "دُنیائی کہ من بینم"۔

Marfat.com

حملہ کر دیا اور رومیوں کو شکست دے کر شامات ، ایشیائے کوچک اور مصر تک کو فتح کر لیا۔ روم کی مشرقی حکومت جس نے شدید شکست کھائی تھی تباہی کے کنارے جا پہنچی اور ایرانیوں نے اُن کے تمام ایشیائی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔

یہ واقعہ بعثت پیمبرؐ کے قریباً ساتویں سال پیش آیا۔ اس کے بعد قیصر روم "ہرقل" نے ۶۲۲ء عیسوی میں ایران پر جوابی حملہ کیا اور خسرو پرویز کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیں۔ اس جنگ کا سلسلہ جس میں رُومی فاتح رہے ۶۲۸ء عیسوی تک جاری رہا۔ ایرانیوں نے شکست سے متاثر ہو کر خسرو پرویز کو سلطنت سے معزول کر کے اُس کے بیٹے "شیرویہ" کو بادشاہ بنا دیا۔

تاریخی لحاظ سے یہ امر پیشِ نظر رہے کہ جناب رسولِ خداؐ کی ولادت ۵۷۰ء عیسوی میں ہوئی اور آپ کی بعثت ۶۱۰ء عیسوی میں ہوئی۔ اس حساب سے ایرانیوں کے ہاتھوں رومیوں کو بعثت کے ساتویں سال شکست ہوئی اور پھر رومیوں کو فتح اور ایرانیوں کو شکست ہجرت کے پانچویں یا چھٹے سال سے منطبق ہوتی ہے۔

ہجرت کے پانچویں سال جنگ خندق ہوئی اور چھٹے سال صلح حُدیبیہ واقع ہوئی۔

البتہ ایران اور روم کے مابین جنگ کی خبروں کو حجاز و مکہ تک پہنچنے تک کچھ دیر لگی ہوگی۔ بہرحال اس تاریخی مطابقت سے قرآن کی پیش گوئی کی صداقت واضح ہوتی ہے۔ (غور کیجئے گا)

Marfat.com

۸۔ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ
كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝

۹۔ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا
الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ
فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ۝ۭ

۱۰۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ۧ

ترجمہ

۸۔ کیا وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتے کہ اللہ نے آسمانوں، زمین اور اُن دونوں کے درمیان جو کچھ ہے، کو نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ اور ایک معیّنہ مُدّت کے لیے۔ مگر بہت سے لوگ (قیامت اور) اپنے ربّ کی لقا کے مُنکر ہیں۔

Marfat.com

۹۔ کیا اُن لوگوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ دیکھ لیتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہُوا جو اُن سے پہلے تھے۔ وُہ قوت میں اُن سے زیادہ تھے۔ اُنھوں نے زمین کو (زراعت اور آبادی کے لیے) دگرگوں کیا اور اس سے زیادہ آباد کیا جتنا ان لوگوں نے آباد کیا ہے۔ اُن کے لیے مبعوث شدہ نبی اُن کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ آتے رہے (لیکن انہوں نے انکار کیا اور اپنی سزا پائی) اور خُدا ایسا نہ تھا جو اُن پر ظلم کرتا یہ تو اُنھوں نے خود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا تھا۔

۱۰۔ پھر اُن لوگوں کا انجام جو اعمالِ بد کے مرتکب ہوئے، اس مقام تک پہنچا کہ اُنھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا اور اُن کی ہنسی اُڑائی۔

تفسیر

بدکاروں کا انجام :

گزشتہ زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں اُن ظاہر بیں لوگوں کا ذکر تھا جن کے اُفقِ فکر کی وسعت صِرف اِس محدود عالَم اور جہانِ مادّی تک ہے۔ وُہ لوگ قیامت اور وجُودِ عالَمِ ماورائے طبیعت سے غافل ہیں۔

مگر —— آیات زیرِ بحث اور آیات آئندہ میں مبداٗ و معاد کے متعلق مختلف مطالب کا ذکر ہے۔

اوّل —— بطورِ استفہام اعتراض آمیز قرآن کہتا ہے: کیا یہ لوگ اپنے ذہن میں یہ نہیں سوچتے کہ خدا نے آسمانوں کو، زمین کو اور اُن کے درمیان جو کچھ ہے اُسے بھی حق کے بغیر پیدا نہیں کیا اور اُن کے لیے ایک معیّن مُدت مقرر کی ہے:

(اولم یتفکّروا فی انفسھم ما خلق اللّٰہ السّماوات والارض وما بینھما الّا بالحق واجلٍ مسمًّی)۔

یعنی اگر وہ لوگ صحیح طور پر سوچیں اور اپنے وجدان اور عقل کے فیصلے کی طرف رجوع کریں تو وہ اِن دو اُمور سے خُوب آگاہ ہو جائیں گے جن میں سے اوّل یہ ہے کہ یہ کائنات اساسِ حق پر پیدا کی گئی ہے۔ اور اس کا وُجود ایسے نظام کے تحت قائم ہے جو اس کے خالق کی عقل، قُدرتِ کامل اور اس کے وجود کی دلیلِ کامل ہے۔

دُوسرے —— یہ کائنات زوال اور فنا کی طرف رَواں ہے۔

Marfat.com

چونکہ ـــــ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس خالق حکیم نے اسے بے مقصد و بے غایت پیدا کیا ہو ۔ اس کا وجود، اس امر کی دلیل ہے کہ اس جہان کے بعد ایک اور دُنیا اور دارالبقا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اس جہان کی آفرینش بے معنی تھی اور یہ قطعی لا یعنی بات تھی کہ انسان کی چند روزہ زندگی کے لیے اس طویل و عریض کائنات کو پیدا کر دیا جائے ۔ اسی سے وجود آخرت کا ثبوت ملتا ہے۔

اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ یہ کارخانۂ کائنات ایک نظم و ترتیب کے تحت چل رہا ہے ۔ کائنات کا کوئی جز بھی آزاد اور مستقل نہیں بلکہ ہر جز اپنے وجود و بقا کے لیے ایک دوسرے کا محتاج اور باہم دگر منحصر ہے تو ہمیں تو ہمارے ذہن کی رسائی کسی مبدا یعنی خالق حکیم کی طرف ہوتی ہے اور " اجل مسمّٰی " معاد کی دلیل ہے ۔ یعنی اس کائنات کا وجود ایک معینہ وقت تک ہے (غور کیجیے گا) ۔

لہٰذا آیت کے آخیر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ بہت سے لوگ اپنے پروردگار کی لقا کے منکر ہیں: (وان كثيرًا من الناس بلقائ ربهم لكافرون) ۔

یا اکثر آدمی " معاد " ہی کے منکر ہیں ۔ جیسا کہ قرآن شریف میں مشرکین کا قول بار بار نقل ہوا ہے کہ وہ کہتے تھے :

کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے ۔ تو ہم پھر زندہ ہو جائیں ؟ یہ تو عجیب بات ہے اور یہ غیر ممکن ہے ۔ یہ ، اس بات کے کہنے والے کے جنون کی دلیل ہے ۔ (رعد - ۵ ، مومنون - ۳۵ ، نمل - ۶۷ ، ق - ۳)

یا ـ یہ کہ وہ زبان سے تو انکار نہیں کرتے لیکن اُن کا عمل ایسا پُر عصیان اور شرم ناک ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معاد پر قطعی یقین نہیں رکھتے ۔ کیونکہ اگر وہ معاد کے معتقد ہوتے تو ان کا عمل ایسا فاسد نہ ہوتا اور وہ خود ایسے مفسد ہوتے

آیت میں جو " فی انفسهم " کے الفاظ ہیں اُن کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ لوگ اپنے " اسرارِ وجود " کا مطالعہ کریں ، جیسا کہ فخر رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے : بلکہ ۔ ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عقل و وجدان کو کام میں لاکر زمین اور آسمان کی خلقت پر غور کریں ۔

ممکن ہے کہ کلمہ " بالحق " کے دو معنی ہوں ۔ ایک تو یہ کہ کائنات کی آفرینش، اُس کا نظم و ترتیب اور قانونِ فطرت حق کے ساتھ ہے ۔

دوسرے یہ کہ تخلیق کا مقصد حق ہے ۔ ان دونوں تفسیروں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے [1]

" لقاء ربهم " سے مراد (جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے) یہ ہے کہ بروزِ قیامت حجابات اُٹھ جائیں گے اور انسان اپنے " شہود باطنی " سے خدا کو اُس کی عظمت کے ساتھ پہچانے گا ۔

ٔ ٔ ٔ

" اجل مُسمّٰی " کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس دُنیا کی زندگی کو دوام اور بقا نہیں ہے ۔ گویا یہ تمام دُنیا پرست لوگوں کو ایک تنبیہ ہے ۔

آیت مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے ۔ کیا اُنھوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ وہ دیکھتے کہ اُن لوگوں کا کیا انجام ہوا جو اُن سے پہلے تھے : (اولم يسيروا في الارض فينظروا كيف كان عاقبة الذين من قبلهم) ۔

[1] اگر پہلے معنی مراد لیے جائیں تو " بالحق " میں جو "با" ہے وہ مصاحبت کے لیے ہوگی ۔ دوسری صورت میں یہ " لام " کے معنی میں ہوگی ۔

Marfat.com

وہ لوگ طاقت میں ان سے زیادہ تھے۔ اُنھوں نے زمین کو دگرگوں کیا اُسے اِن سے زیادہ آباد کیا تھا: (کانوا اشد منھم قوۃ واثاروا الارض وعمروھا اکثر مما عمروھا)۔

اُن کی طرف مبعوث پیغمبر اُن کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ آئے: (وجاءتھم رسلھم بالبیّنات)۔

لیکن اُنھوں نے احکامِ الٰہی سے بغاوت کی اور حق کی اطاعت نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وُہ خدا کی طرف سے دردناک عذاب میں مُبتلا ہوئے۔

خدا نے تو اِن پر ہرگز ظلم نہیں کیا۔ لیکن اُنھوں نے خُود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا: (فما کان اللہ لیظلمھم ولٰکن کانوا انفسھم یظلمون)۔

درحقیقت آیت ۹ میں اُن اقوام کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبرؐ کے ہم عصر مشرکین کے مقابلے میں مال، جسمانی طاقت اور قدرت کے لحاظ سے کہیں بہتر اور برتر تھے۔ نیز اُن کے دردناک انجام کو ان کُفار کے لیے درسِ عبرت قرار دیا گیا ہے۔

آیت میں " اثاروا الارض " کے الفاظ اِستعمال ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے زراعت و شجرکاری کے لیے زمین کا جوتنا یا کھودنا مُراد ہو یا نہریں اور کاریز کا کھودنا، یا کسی بڑی عمارت کی تعمیر کے لیے بُنیاد کھودنا مراد ہو یہ تمام چیزیں مراد ہوں۔ کیونکہ " اثاروا الارض " کا مفہوم بہت وسیع ہے یہاں تک کہ تعمیر و آبادی کے جُملہ مراحل اس میں شامل ہیں۔[۱]

چونکہ اس زمانے میں وہی لوگ سب سے زیادہ صاحبِ قوت و اقتدار سمجھے جاتے تھے جو کاشت کاری میں ترقی یافتہ تھے یا جنھوں نے فنِ تعمیر میں خوب ترقی کی تھی۔ لہذا ظاہر ہے کہ اُن لوگوں کو مُشرکینِ مکہ کے مقابلے میں (جو کہ اِن فنون میں نہایت پس ماندہ تھے) یقیناً برتری حاصل تھی۔

لیکن جب اُنھوں نے ان فنون میں برتری کے باوجود آیاتِ الٰہی اور اُس کے پیمبروں کا انکار کیا اور اُن کی تکذیب کی تو ان میں عذابِ الٰہی سے بچ کر نکل جانے کی طاقت نہ تھی۔ لہذا اے مشرکینِ مکہ! تم سوچو کر تم کس طرح اُس کے عذاب سے بچ سکتے ہو؟

وہ یہ دردناک عذاب اور اپنے اعمال کی پاداش کو خُود ہی لائے تھے۔ اُنھوں نے خُود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا تھا۔ خدا تو کبھی کسی پر ظلم وستم روا نہیں رکھتا۔

*

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں اقوامِ گزشتہ کے آخری مرحلہ کفر کا بیان ہے کہ: اُن کی بداعمالیاں اور سرکشی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اُنھوں نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی اور اس سے بھی بدتر یہ کہ اُن کا مذاق اُڑانے لگے: (ثم کان عاقبۃ الذین اساؤا السوآی ان کذبوا بایات اللہ وکانوا بھا یستھزءون)۔

البتہ گناہ اور آلودگی نفس جذام کی بیماری کی طرح ہے، جو رُوحِ ایمان کو کھا کر فنا کر دیتی ہے یہاں تک کہ انسان آیاتِ الٰہی

---

[۱] "اثار" کا مادہ "ثور" (بوزن غور) ہے، جس کے معنی پراگندہ کرنے کے ہیں۔ عرب بیل کو ثَور کہتے تھے۔ وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ اُسے ہل میں جوتتے تھے۔

Marfat.com

کی تکذیب کرنے لگتا ہے۔ اس منزل سے بھی آگے بڑھ کر آیاتِ الٰہی اور پیغمبروں کا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کفر کے اُس مرحلے پر پہنچ جاتا ہے کہ اُس پر کسی وعظ، نصیحت یا تخویف کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ اِس حالت میں اُس کے لیے صِرف عذابِ الٰہی کا تازیانہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

گناہ گاروں اور اوامرِ الٰہی کے باغیوں کے صفحاتِ زندگی کو اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ابتدا میں ایسے سرکش اور طغیان کوش نہ تھے۔ اُن کے دلوں میں نُورِ ایمان کی کوئی کرن ضرور چمکتی تھی۔ لیکن پے در پے گناہوں کا ارتکاب انھیں روز بروز ایمان اور تقویٰ سے دُور کرتا گیا اور انجام یہ ہوا کہ وہ کفر کے آخری مرحلے پر پہنچ گئے۔

کربلا کی شیر دل خاتون جناب زینب سلام اللہ علیہا نے دمشق میں یزید کے سامنے جو خطبہ دیا ہے۔ اُس میں آپ نے اس آیت کو اِنہی معنی میں استعمال کیا ہے جو ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں۔

اُن معظمہ نے دیکھا کہ یزید کفر آمیز کلمات کہہ رہا ہے اور وہ مشہور اشعار پڑھ کر جن میں سے ایک کی ابتدا یُوں ہے لعبت ھاشم بالملك ...۔" اسلام کی ہر شئے کا مذاق اُڑا رہا ہے اور اُس کی اِن باتوں سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کا اسلام کے بنیادی اُصولوں میں سے کسی پر بھی ایمان نہیں ہے، تو، اُن مخدومہ نے حمدِ الٰہی اور پیغمبرِ اکرمؐ پر درود کے بعد یُوں فرمایا:

صدق الله كذالك يقول ثم كان عاقبة الذين
اساءوا السوای ان كذبوا بايات الله وكانوا بها يستهزءون ....

اگر آج تو ان کفر آمیز اشعار کے ذریعے اِسلام اور ایمان کا انکار کر رہا ہے اور اپنے مُشرک بزرگوں سے جو جنگِ بدر میں مُسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے یہ کہہ رہا ہے کہ:

"کاش کہ تم زندہ ہوتے اور یہ دیکھتے کہ مَیں نے خاندانِ بنی ہاشم سے تمہارا انتقام لے لیا ہے۔"[1]

تو یہ کچھ تعجب کا مقام نہیں ہے کیونکہ یہ وہی بات ہے جو خدا نے فرمائی ہے کہ "مجرمین آخر کار ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔"

اُن معظمہ نے اِس سلسلے میں بہت سے مطالب ارشاد فرمائے۔

(مزید توضیح کے لیے بحار الانوار، جلد ۴۵، صفحہ ۱۵۷ دیکھیے)[2]

---

[1] نفیِ اسلام اور انکارِ نبوّت کے سلسلے میں تاریخوں میں یزید کے متعدد اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے:

نہ کوئی نبی آیا اور نہ وحی اُتری۔ یہ تو بنی ہاشم کی ملک و مال پر قبضہ کرنے کے لیے محض ایک چال تھی۔

گویا کہ اعلانِ نبوّت محض ایک سیاسی کھیل تھا۔

([2] اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

Marfat.com

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ)

لے آیت نمبر ۱۰ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کے مطابق " السوای " " اساوًا " کا مفعول ہے اور " ان کذبوا بآیات اللہ " اس " کانَ " کے بجائے ہے اور اس کی خبر عاقبة ہے۔ علامہ طباطبائی مرحوم نے اس مطلب کا بطور احتمال ذکر کیا ہے۔ اگرچہ خود اُنھوں نے اس کی تصدیق نہیں کی۔ اور ابوالبقاءؔ نے کتاب " املاء ما من به الرحمٰن " کے صفحہ ۱۸۵ جلد ۲ پر اس مطلب کا احتمالات میں سے ایک کو قابلِ قبول ہونے کے طور پر ذکر کیا ہے مگر مفسرین کی اکثریت مثلاً طبرسی، صاحب المیزان، فخرازی، آلوسی، ابوالفتوح رازی، اور قرطبی نے فی ظلال و تبیان میں اس آیت کی تفسیر میں ایک دوسرے احتمال کو قوی سمجھا ہے اور وہ یہ ہے کہ " سوئٰ " کان کا اسم ہوگا اور " ان کذبوا " تعلیل کے لیے ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کے معنی یہ ہوں گے:

" آخرکار اُن لوگوں کا انجام جو اعمالِ بد انجام دیتے رہے، بد ہی ہوا۔ کیونکہ اُنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔"

یہ جملہ للذین احسنوا الحسنیٰ " کے مشابہ ہے جس کا معنی ہے۔ جنھوں نے نیکی کی اُن کے لیے نیکی ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ آیت کے ظاہری معنی سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے یہ تفسیر اُس کے برخلاف ہے اور ان مفسرین نے اگر اس تفسیر کو اختیار کیا ہے تو ہمیں یہ امر اس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ آیت کے ظاہری معنی سے جو مفہوم ہم آہنگ ہے اُسے ترک کر دیں۔ بالخصوص وہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے اس امر پر مجبور ہیں کہ " جملہ " ان کذبوا " میں حرف " لام " کو مقدر سمجھیں اور یہ تقدیر ظاہر کلام کے خلاف ہے۔ (غور کیجیے گا)

Marfat.com

۱۱۔ اَللّٰہُ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ○

۱۲۔ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یُبۡلِسُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ○

۱۳۔ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہُمۡ مِّنۡ شُرَکَآئِہِمۡ شُفَعٰٓؤُا وَ کَانُوۡا بِشُرَکَآئِہِمۡ کٰفِرِیۡنَ ○

۱۴۔ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یَوۡمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوۡنَ ○

۱۵۔ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَہُمۡ فِیۡ رَوۡضَۃٍ یُّحۡبَرُوۡنَ ○

۱۶۔ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآیِٔ الۡاٰخِرَۃِ فَاُولٰٓئِکَ فِی الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۱۔ خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے۔ پھر تم سب اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

۱۲۔ اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو مُجرمین مایوسی اور غم و اندوہ میں ڈوب جائیں گے۔

۱۳۔ اور جنہیں اُنھوں نے خُدا کا شریک قرار دیا تھا اُن میں سے کوئی بھی اُن کا شفیع نہ ہوگا

Marfat.com

اور وہ (اُس روز) اُن شریکوں کا انکار کر دیں گے ۔

۱۴۔ اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو (لوگ) ایک دُوسرے کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

۱۵۔ مگر وُہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے وُہ باغِ جنّت میں شاداں و مسرور ہوں گے ۔

۱۶۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اور ہماری آیات اور لقائے آخرت کی تکذیب کی وُہ عذابِ الٰہی میں حاضر کیے جائیں گے۔

تفسیر

قیامت میں مُجرمین پر کیا گزُرے گی :

گزشتہ آیت میں اُن تکذیب کرنے والوں کا ذکر تھا جو آیاتِ الٰہی کا مذاق اُڑاتے تھے اور زیرِ نظر آیات میں کچھ معاد اور قیامت میں مُجرمین کی حالت کا ذکر کر کے مُعاد کے متعلق اُس مضمون کی تکمیل کی گئی ہے جس کا ذکر آیات ماقبل میں آیا تھا ۔

پہلے یہ فرمایا گیا ہے : خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے ۔ اور پھر اُس کا اعادہ کرے گا اور تم سب پھر اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے ۔ (اللہ یبدؤا الخلق ثم یعیدہ ثم الیہ ترجعون) ۔

اِس آیت میں مسئلہ معاد کے بارے میں ایک پُر معنی اور مختصر دلیل دی گئی ہے ۔ قرآن کی دوسری آیات میں بھی بالفاظِ مختلف اِس دلیل کی تکرار ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ :

وہی ذات جو آفرینشِ اوّل پر قُدرت رکھتی تھی، معاد پر بھی قدرت رکھتی ہے ۔ نیز قانونِ عدالت اور حکمتِ الٰہی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مخلوق فنا ہوکر دوبارہ پیدا ہو۔

" ثم الیہ ترجعون " سے یہ مُراد ہے کہ بروزِ قیامت زندہ ہونے کے بعد سب کے سب خدا کے دار العدل کی طرف وہاں سے سزا یا جزا پانے کے لیے لوٹیں گے ۔ اِس سے برتر یہ کہ وہ مومنین جو دُنیا میں اوامرِ الٰہی کی اطاعت کر کے مدارجِ رُوحانی کی تکمیل کرتے رہے ہیں ، وُہ اپنی رُوحانی تکمیل میں اُسی طرح ختم ناپذیر منزلِ معرفت اور پروردگار کی قربت کی طرف بڑھتے رہیں گے ۔

Marfat.com

آیت مابعد میں مجرموں کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ : جس روز قیامت برپا ہوگی، مجرمین نااُمیدی اورغم واندوہ میں ڈوب جائیں گے ۔(و یوم تقوم الساعۃ یبلس المجرمون) ۔

"یبلس" مادہ "ابلاس" سے بنا ہے ۔ اِس کے معنی اُس غم و اندوہ کے ہیں جو انسان پر شدّت یاس و نااُمیدی سے طاری ہو جاتا ہے ۔

یہ امر بدیہی ہے کہ بالفرض انسان کسی چیز سے نااُمید ہو جاتا ہے تو اگر وہ شے بقائے حیات کے لیے اہمیت نہیں رکھتی تو اُس کی نااُمیدی بھی اہم نہیں ہے ۔ لیکن اگر وہ کسی لازمۂ زندگی سے مایوس ہوا ہے تو اُس پر غم و اندوہ کا طاری ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے ۔ اِس لیے بعض مفسّرین نے مادۂ "ابلاس" کا خاصہ "ضروری ہونا" بھی قرار دیا ہے ۔

"ابلیس" کو اسی مناسبت سے ابلیس کہتے ہیں کہ وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس اور غم ناک ہو گیا ہے ۔

بہرحال مجرم اسی کے مستحق ہیں کہ اُس روز مایوس اور غم ناک ہوں کیونکہ وُہ عرصۂ محشر میں اپنے ساتھ نہ تو ایمان اور عملِ صالح ہی لائے ہیں ۔ اور نہ اُس روز اُن کا کوئی مددگار و رفیق ہو گا ۔ نہ یہ امکان ہو گا کہ وہ پھر دُنیا کی طرف لوٹ جائیں اور اپنی گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کر لیں ۔

٭ ٭ ٭

لہٰذا آیت مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے ۔ اُن کے معبود اُس روز شفاعت نہ کریں گے : (ولم یکن لھم من شرکائھم شفعاؤا) ۔

آیت میں معبودوں سے وہی بُت مراد ہیں کہ جس وقت اُن کفار سے پُوچھا جاتا تھا کہ تم اِن بُتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو تو وہ جواب دیتے تھے :

هٰؤلاء شفعاؤنا عند الله

یہ بُت درگاہِ الٰہی میں ہمارے شفیع ہیں ۔ (یونس ۔ ۱۸)

اُن کفّار کی سمجھ میں اُس وقت یہ بات آئے گی کہ وہ پتھر کے بے قدر و قیمت ٹکڑے تو کسی قسم کا اختیار اور قدرت نہ رکھتے تھے ۔ اسی وجہ سے وہ اُن معبُودوں سے جنھیں وہ خدا کا شریک سمجھا کرتے تھے ۔ نفرت اور بیزاری کا اظہار کریں گے اور "اُن سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے انکار کر دیں گے" : (وکانوا بشرکائھم کافرین) ۔

بھلا کفّار معبودوں کا انکار کیونکر نہ کریں گے کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے ہوں گے کہ یہ معبُود نہ صرف یہ کہ اُن کی کسی مصیبت میں کام نہیں آسکتے بلکہ بقول قرآن وہ معبُود اپنے پرستاروں ہی کی تکذیب کرنے لگیں گے اور کہیں گے :

اے پروردگار ! "ما کانوا ایانا یعبدون"

یہ لوگ ہماری نہیں، بلکہ اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے ۔ (قصص ۔ ۶۳)

اِس سے بھی سوا یہ کہ وہ معبود اپنے پرستاروں کی دُشمنی پر کمر باندھ لیں گے ۔ جیسا کہ سُورۂ احقاف آیت ۶ میں ہے :

واذا حشر الناس کانوا لھم اعداءً و کانوا بعبادتھم کافرین

Marfat.com

جس وقت مشرکین محشور ہوں گے تو اُن کے جھوٹے معبود اُن کے دُشمن ہو جائیں گے اور اُن کی عبادت کا انکار کر دیں گے ۔

۞ ۞ ۞

آیت ۱۴ میں بروز قیامت لوگوں کے مختلف گروہ ہو جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ۔ بروز قیامت لوگ ایک دُوسرے سے جُدا ہو جائیں گے : (ویوم تقوم الساعة یومئذٍ یتفرّقون) ۔

۞ ۞ ۞

جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے اعمالِ صالح انجام دیئے وہ بہشت کے باغ میں نعماتِ الٰہی سے بہرہ مند اور سرُور و شادکام ہوں گے ۔ اس طرح سے کہ اُن کے چہروں سے مُسرت کے آثار ظاہر ہوں گے : (فاما الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فھم فی روضة یحبرون) ۔

" یحبرون " کا مادّہ " حبر " ہے (بروزن " قشر ") اس کا معنی ہے " اثرِ خُوب " ۔ یہ کلمہ اُس وقت بھی بولا جاتا ہے جب خوشی اور مُسرت کا اثر چہرے سے ظاہر ہو اور چونکہ اہلِ بہشت کا دل خوشی اور سرور سے ایسا معمور ہو گا کہ اُس کا اثر اُن کے تمام وجود سے ظاہر ہو گا اس لیے اِس مفہوم کے اظہار کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوا ہے ۔

" روضة " اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں پانی اور درخت بکثرت ہوں اِس لیے سرسبز و شاداب باغات کو بھی روضہ کہتے ہیں ۔

اگر اِس آیت میں یہ کلمہ بصورتِ اسم نکرہ اِستعمال ہوتا ہے تو اُس مقام کی عظمت اور بزرگی کو واضح کرنے کے لیے ہے یعنی مومنین بہشت کے بہترین خوبصورت اور سرُور انگیز باغات میں نعماتِ الٰہی سے لُطف اندوز ہوں گے ۔

۞ ۞ ۞

لیکن جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور اُنھوں نے ہماری آیات اور لقائے آخرت کی تکذیب کی ہے وہ ضرور عذابِ الٰہی میں حاضر کیے جائیں گے : (واما الذین کفروا وکذبوا باٰیاتنا ولقاء الاٰخرة فاُولٰئک فی العذاب محضرون) ۔

یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ اہلِ بہشت کے لیے کلمہ " یحبرون " استعمال ہوا ہے جو ہر لحاظ سے اُن کی مسرت کی علامت ہے لیکن دوزخیوں کے لیے کلمہ " محضرون " اِستعمال ہوا ہے ، جو اُن کی انتہائی کراہت اور ناراحتی کی دلیل ہے کیونکہ حاضر کیے جانے کا اطلاق ایسے موقع پر ہوتا ہے کہ کسی آدمی کو اُس کی دلی خواہش کے خلاف پکڑ کے لایا جائے ۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اہلِ بہشت کے معاملہ میں " ایمان " اور " عملِ صالح " دونوں کی قید لگائی گئی ہے ۔ جب کہ دوزخیوں کے متعلق صرف عدمِ ایمان (انکارِ مبدا و معاد) کا ذکر کیا گیا ہے ۔

اِس میں رمز یہ ہے کہ داخلِ بہشت ہونے کے لیے صرف ایمان کافی نہیں ہے ۔ اس کے ساتھ عملِ صالح بھی

Marfat.com

لازم ہے۔ مگر واصلِ جہنّم ہونے کے لیے عدم ایمان ہی کافی ہے۔ خواہ اُس آدمی نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ کیونکہ "کفر" بجائے خود گناہ عظیم ہے۔

٭ ٭ ٭

قیامت کا ایک نام "ساعت" کیوں ہے؟

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں قیامت کو "ساعت" کہا گیا ہے۔ اُن آیات میں زیرِ نظر آیات میں سے دو آیات (۱۲ - ۱۴) بھی شامل ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ "ساعت" کے حقیقی معنی زمانے کا ایک حصہ" یا لحظاتِ زودگزر ہے۔ اور چونکہ حادثۂ قیامت ناگہانی اور برق آسا طور پر واقع ہوگا۔ نیز یہ کہ خدا "سریع الحساب" ہے، اس لیے وہ اُس روز بندوں کا جلد حساب لے گا لہٰذا قیامت کو "ساعت" کہا گیا ہے۔ تاکہ لوگ یوم رستاخیز کی حیثیت و واقفیت کو ہمیشہ نظر میں رکھیں۔

ابنِ منظور "لسان العرب" میں لکھتا ہے کہ "ساعة" اُس وقت کا نام ہے جب کہ اس عالم کے اختتام کے لیے ایک چیخ ماری جائے گی اور اُس آواز کو سُن کر سب جاندار فوراً مرجائیں گے اور یہ اُس وقت کا نام بھی ہے جبکہ قیامت میں لوگ قبروں سے اُٹھائے جائیں گے۔

دُنیا کے اختتام اور وقوعِ قیامت کے لیے اس نام کا اس لیے انتخاب کیا گیا ہے کہ پہلی چیخ میں جیسا کہ خدا نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے:

اِن کانت اِلّا صیحۃً واحدۃً فاذا ھم خامدون [1]

سب کے سب بطور ناگہانی مرجائیں گے۔

اور جب دوبارہ صُور پھونکا جائے گا تو سب کے سب ناگہاں زندہ ہو جائیں گے اور پھر قیامت بپا ہوگی۔

"زبیدی" نے "تاج العروس" میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ "ساعة" تین قسم کی ہے:

۱۔ **ساعتِ کُبریٰ**: وہ دن جب لوگوں کو حساب کے لیے زندہ کیا جائے گا۔

۲۔ **ساعتِ وُسطیٰ**: جب خدا کی طرف سے نزولِ عذاب کی وجہ سے کسی مخصوص زمانے میں ناگہانی طور پر سب کے سب آدمی بہ یک وقت مرجائیں گے۔

۳۔ **ساعتِ صُغریٰ**: ہر انسان کی موت کا دن۔

٭ ٭ ٭

---

[1] یٰس - ۲۹۔

Marfat.com

۱۷۔ فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ۝

۱۸۔ وَلَهُ الۡحَمۡدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَعَشِيًّا وَّحِيۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ ۝

۱۹۔ يُخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَيُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَىِّ وَيُحۡىِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ وَكَذٰلِكَ تُخۡرَجُوۡنَ ۝

ترجمہ

۱۷۔ پاک و منزہ ہے وُہ خدا جس وقت کہ تم شام کرتے ہو اور صبح کرتے ہو۔

۱۸۔ آسمانوں اور زمینوں میں حمد و ستائش اُسی کے لیے مخصوص ہے۔ اور تسبیح و تنزیہ اُسی کے لیے ہے بوقتِ عصر بھی اور ظہر کے وقت بھی۔

۱۹۔ وُہ خدا زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے۔ اور زمین کو اُس کی موت کے بعد حیات بخشتا ہے اور اسی طرح تم بروزِ قیامت نکالے جاؤ گے۔

تفسیر

تسبیح و حمد ہر حال میں خُدا کے لیے ہے:

آیاتِ گزشتہ میں مبداء و معاد کے موضوع پر ایک طویل بحث گزری ہے اور کسی قدر مومنین کے اجر اور مُشرکین کی پاداشِ عمل کا ذکر آیا ہے۔

آیات زیرِ نظر میں خُدا کی حمد، تسبیح اور ہر قسم کے شرک، نقص اور عیب سے اُس کے منزّہ ہونے کا ذکر ہے۔

Marfat.com

چنانچہ خدا فرماتا ہے :

تسبیح و تنزیہ اُسی خدا کے لیے مخصوص ہے جس وقت کہ تم صبح کرتے ہو اور شام کرتے ہو: (فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون)۔

آسمان و زمین میں حمد و ستائش اُسی ذات پاک کے لیے مخصوص ہے اور بوقت عصر اور جب ظہر کا وقت ہوتا ہے: (ولہ الحمد فی السماوات والارض وعشیًا وحین تظھرون)۔

اِن دو آیات میں اس ترتیب سے تسبیح پروردگار کے لیے چار اوقات کا بیان ہے :

۱۔ آغازِ شب (حین تمسون)۔

۲۔ طلوعِ صبح (وحین تصبحون)۔

۳۔ وقتِ عصر (وعشیًا)۔

۴۔ زوال آفتاب یعنی ظہر کا وقت (وحین تظھرون)۔[۱]

لیکن بحیثیت مکان " ادائے حمد " میں عمومیت ہے۔ جس میں آسمانوں اور زمین کی وسعتیں شامل ہیں۔ آیات فوق میں مذکورہ بالا چار اوقات کے ذکر سے ممکن ہے بطور محاورہ یہ مراد ہو کہ ہمیشہ اور دائمی طور پر تسبیح کرتے رہو۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ " فلاں شخص کی صبح و شام دیکھ بھال کرتے رہو " اور مراد ہوتی ہے کہ ہمیشہ اور ہر وقت اُس کے نگران حال رہو۔

بعض مفسرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ مذکورہ چار اوقات سے نماز کے چار اوقات مراد ہیں۔ مگر وہ اس اعتراض کا جواب دینے سے قاصر رہے ہیں کہ پانچ اوقات کے بجائے صرف چار اوقات کا ذکر کیوں ہے ؟ (یعنی وقت عشا کا کوئی ذکر نہیں ہے)

لیکن ___ ممکن ہے کہ اس سوال کا یہ جواب دیا جائے کہ چونکہ مغرب و عشا کی نمازوں کا وقت نسبتًا نزدیک ہے اور اِن دونوں نمازوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ اِس لیے دونوں کا ذکر ایک ہی جگہ کر دیا گیا ہے جب کہ نمازِ ظہر و عصر کے اوقاتِ فضیلت میں چند گھنٹے کا فاصلہ ہے۔

لیکن ___ اگر ہم حمد و تسبیح کا وہ وسیع مفہوم لیں جو آیاتِ زیرِ بحث سے مترشح ہوتا ہے تو پھر یہ پانچ نمازوں میں محدود نہ رہے گی۔ ہر چند کہ ان نمازوں پر اُس کا واضح اطلاق ہوتا ہے۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی لازمی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ " سبحان اللہ " و " ولہ الحمد " کہہ کر خدا نے اپنی تسبیح و حمد خود ہی کی ہو۔ جیسا کہ سورہ مومنون کی آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے :

فتبارک اللہ احسن الخالقین

پُر برکت اور جاوید ہے وہ خدا جو خلق کرنے والوں میں بہترین ہے۔

یا ___ ممکن ہے کہ یہ حمد و تسبیح بمعنی امر ہو۔ یعنی "سبحوہ واحمدوا لہ" یعنی اُس کی تسبیح اور حمد کرو۔

یہ تفسیر اس مفہوم سے قریب تر معلوم ہوتی ہے کہ آیاتِ زیرِ بحث میں تمام بندوں کو ہر صبح و شام اور بوقت ظہر و عصر حمد و

---

[۱] ملحوظ خاطر رہے کہ " عشیًا " و " حین تظھرون " عطف ہے " حین تمسون " پر جس کا تعلق موضوع تسبیح سے ہے۔

Marfat.com

تسبیح کا حکم دیا گیا ہے ، خواہ نماز میں ہو یا اس کے علاوہ تاکہ اُن کے قلب و رُوح سے شرک و گناہ کے آثار پوری طرح محو ہو جائیں ۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ :

جو کوئی ان دو آیات اور اُس کے بعد کی آیت کو بوقت صبح پڑھے گا تو جو فریضہ بھی اُس سے دن میں فوت ہو گا ، خُدا اُسے اُس کا بھی صِلہ دے گا اور جو کوئی ان آیات کو آغاز شب میں پڑھے گا تو جو فریضہ بھی اس سے رات کو فوت ہو گا خُدا اُس کا اجر بھی دے گا ۔ (تفسیر نور الثقلین ۔ جلد ۴ ، صفحہ ۱۶۲)

❁ ❁ ❁

اس کے بعد کی آیت میں پھر مسئلہ معاد کا ذکر ہے اور منکرین جس بات کو بعید از عقل سمجھتے تھے اُس کا ایک اور طرح سے جواب دیا گیا ہے وُہ یہ کہ : سُنّتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے باہر نکالتا ہے اور زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے ۔ تم بھی اسی طرح بروز قیامت زندہ کیے جاؤ گے اور اپنی قبروں سے نکالے جاؤ گے :
(یخرج الحیّ من المیّت و یخرج المیّت من الحیّ ویحی الارض بعد موتها وکذالك تخرجون) ۔

یعنی معاد کے منظر اور اختتام دُنیا کے منظر کی بالترتیب یا ہمیشہ تمہاری آنکھوں کے سامنے تکرار ہوتی رہتی ہے ۔ جن میں سے ایک تو زندہ کو مُردہ سے نکالنا ہے اور دُوسرا مُردہ کو زندہ سے ۔

بنابراین یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے کہ دُنیا کے خاتمے پر تمام زندہ موجودات مرجائیں اور قیامت میں تمام انسان ایک نئی زندگی حاصل کرلیں ۔

لیکن قرآن شریف میں اس حقیقت کو کہ " مُردہ سے زندہ کو کیسے نکالا جاتا ہے " بارہا مردہ زمین کی مثال دے کر واضح کیا گیا ہے ۔

یہ امر سب پر روشن ہے کہ سردیوں کے موسم میں زمین مُردہ ہو جاتی ہے ۔ نہ اُس میں گھاس اُگتی ہے ۔ نہ کوئی پھول کھلتا ہے نہ کوئی شگوفہ[۱]

لیکن فصل بہار میں اعتدال ہوا اور حیات بخش بارش کے قطرات گرنے کی وجہ سے زمین میں ایک جُنبش پیدا ہوتی ہے ۔ ہر جگہ گھاس اُگ آتی ہے ۔ پھول کھلتے ہیں ، شاخوں پر شگوفے نمودار ہوتے ہیں ۔ یہ ہے معاد کا منظر جسے ہم دُنیا میں دیکھتے ہیں ۔

لیکن یہ کہ زندہ سے مُردہ کیونکر نکالا جاتا ہے ، یہ بات بھی پوشیدہ و پنہاں نہیں ہے ۔
کرۂ زمین کی سطح پر درخت مرجاتے ہیں اور خشک لکڑی کی صُورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح انسان اور حیوانات اپنی زندگی سے محروم ہو کر جسدِ بے جان بن جاتے ہیں ۔

---

[۱] یہ تشبیہ ایرانی موسم کے لحاظ سے ہے ۔ ہمارے مُلک میں زمین موسم گرما (مئی جون) میں مُردہ ہوتی ہے اور برسات اُسے زندہ کرتی ہے ۔

Marfat.com

لیکن ـــــ بعض مُفسّرین نے زندہ کو مُردہ سے نکالنے کی یہ تفسیر کی ہے کہ انسان و حیوان نُطفے سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اِس سے مُراد یہ ہے کہ کافر کے گھر میں مومن پیدا ہو جائے۔ بعض نے سونے والوں کا بیدار ہونا مُراد لیا ہے۔

لیکن یہ قطعی عیاں ہے کہ یہ تمام تعبیرات و تاویلات آیت کے لُغوی معنی سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ نُطفے ہی کو لیجیے تو وُہ مُردہ نہیں ہوتا بلکہ وُہ موجودِ زندہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح ایمان و کُفر کے اِستعارات کو آیت کے باطن سے تو اخذ کیا جا سکتا ہے لیکن ظاہری معنی اس طرف راجع نہیں ہیں۔

آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ خدا ہمیشہ مُردہ موجودات سے زندہ موجودات کو نکالتا ہے۔ اور زندہ موجودات کو بے جان موجودات میں بدل دیتا ہے۔ دَورِ حاضر میں انسان نے علوم میں تجربات اور مشاہدات سے جتنی بھی ترقی کی ہے اور معلومات کا جو ذخیرہ بہم پہنچایا ہے اُس کے مطابق یہ ہرگز نہیں دیکھا گیا کہ غیر ذی حیات سے زندہ وجُود پیدا ہو جائے۔ یعنی زندگی سے زندگی پیدا ہوتی ہے نہ کہ موت سے۔ بلکہ ہمیشہ زندہ موجودات بیج[1] سے یا کسی دوسرے زندہ وجُود کے نُطفے سے مُتولّد ہوتے ہیں۔

ابتداً میں یہ کُرّہِ زمین آگ کا ایک گولا تھا۔ اِس پر زندگی کا وجُود نہ تھا۔ بعد میں اُن مخصوص اسباب کی وجہ سے (جن کا علوم حاضر کے ذریعے سے اَب تک انکشاف نہیں ہو سکا ہے) اس بے جان زمین سے، ایک عظیم تحریک کے ساتھ زندہ مخلوقات پیدا ہو گئیں۔

لیکن جہاں تک موجودہ حالات ہیں، اِنسان کے علم و دانش کی رسائی ہے اُس کے ذریعے کُرّہِ زمین کے موجودہ حالات میں یہ تحریک نظر نہیں آتی۔ (ممکن ہے کہ سمندروں کی گہرائی میں اب تک یہ عظیم تحریکِ حیات موجُود ہو)۔

لیکن ہمارے لیے جو بات محسوس اور کاملاً قابلِ ادراک ہے وہ یہ ہے کہ بے جان موجودات زندہ موجودات کے اجسام کا جزو بن جاتے ہیں اور پھر خود بھی زندہ مخلوقات میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ہم جو آب و غذا کھاتے ہیں وہ زندہ مخلوق نہیں ہے۔ لیکن وہ جیسے ہی ہمارے جسم کا جزو بنتی ہے، ایک زندہ مخلوق بن جاتی ہے۔ غذا کی وجہ سے ہمارے بدن کے خلیوں CELLS پر مزید خلایا کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی طرح ایک طفلِ شیر خوار جوان ہو کر قوی ہیکل بن جاتا ہے۔

کیا یہ اصولِ تغذیہ موت سے زندگی کو برآمد کرنا نہیں ہے؟

بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ عالمِ طبیعی کے نظام میں دائماً ایک دَور جاری رہتا ہے کہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت خارج ہوتی رہتی ہے۔

---

[1] مصنف نے بیج کی مثال تو دی، مگر اس کی تشریح نہیں کی۔ ہر بیج میں قابلیت نشو و نما خفتہ ہوتی ہے۔ زمین کی قوت نامیہ اسے بیدار کرتی ہے اور رُوح پیدا کر دیتی ہے۔ صرف جدید علمائے حیاتیات BIOLOGIST ہی نے نہیں، قدما نے بھی یہ معلوم کر لیا تھا کہ نباتات میں بھی زندگی ہے۔ اُس کا نام اُنھوں نے رُوحِ نباتی رکھا تھا۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم قطعی واضح ہے کہ خُدا مُردہ شے سے زندہ کو وجود میں لاتا ہے۔ مفسّرین نے زندگی کی صرف ایک ہی صُورت کو پیشِ نظر رکھا۔ جو حیوانات میں ہے۔ اِسی وجہ سے انھوں نے اِدھر اُدھر کی تاویلات کی ہیں۔

Marfat.com

اسی دلیل سے وہ خدا جو خالقِ فطرت ہے اِس امر پر بھی قادر ہے کہ بروز قیامت مردوں کو زندہ کر دے۔

البتہ، جیساکہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے، معنوی اور باطنی لحاظ سے آیۂ زیرِ بحث کی اور تفاسیر بھی ہو سکتی ہیں مثلاً: کافر کی نسل سے مومن پیدا ہو جائے اور مومن کی اولاد کافر ہو جائے۔ جاہل کی اولاد عالم ہو جائے اور عالم کا فرزند جاہل رہ جائے۔ مُفسد کا خلف صالح ہو اور صالح کا خلف مُفسد ہو جائے۔ بعض اسلامی روایات میں اس طرف اشارہ بھی ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ بطُونِ آیت سے یہ معانی اخذ کیے گئے ہوں۔ کیونکہ آیاتِ قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مرگ و حیات کے ایک جامع اور وسیع معنی ہوں جن میں مادّی اور رُوحانی دونوں پہلو شامل ہوں۔

امام مُوسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے آیۂ "یحی الارض بعد موتھا" کی تفسیر میں ایک روایت مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لیس یحییھا بالقطر ولکن یبعث اللّٰہ رجالاً فیحیون العدل فتحی الارض لاحیاء العدل ولاقامۃ العدل فیہ انفع فی الارض من القطر اربعین صباحاً۔

آیت کا مقصود یہ نہیں ہے کہ خدا زمین کو بارش کے ذریعے زندہ کرتا ہے بلکہ مُراد یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو پیدا کرتا ہے جو اصولِ عدل کو زندگی بخشتے ہیں اور احیاءِ عدل سے زمین زندہ ہو جاتی ہے اور آگاہ رہو کہ زمین پر عدل کا قائم ہونا چالیس روز تک مسلسل بارش سے زیادہ نافع ہے۔[1]

امامؑ کے اِس قول سے کہ آیت کا مقصد "نزولِ باران" نہیں ہے اس آیت کے معانی کو محدود کرنے کی نفی ہو جاتی ہے یعنی آیت کی تفسیر کو بارش کے معنی ہی تک محدود نہ کرنا چاہیئے کیونکہ عدالت کے ذریعے زمین کی معنوی زندگی نزولِ باراں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

---

[1] نقل از کتاب کافی۔ نور الثقلین، جلد ۴، صفحہ ۱۷۳

Marfat.com

۲۰۔ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ ○

۲۱۔ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَجَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ○

۲۲۔ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ ○

ترجمہ

۲۰۔ اور اُس (خُدا) کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ اُس کے بعد جب تم انسان بن گئے تو رُوئے زمین پر پھیل گئے۔

۲۱۔ اور اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے ازواج کو پیدا کیا تاکہ تم اُن کی قُربت میں تسکین پاؤ اور اُس نے تمہارے درمیان مودّت اور مہربانی پیدا کر دی۔ اِس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر کرتے ہیں۔

۲۲۔ نیز اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور

Marfat.com

تمہاری زبانوں اور رنگ کا اختلاف ، اہلِ علم کے لیے اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

تفسیر

انفُس و آفاق میں خُدا کی آیات :

اِن آیات اور اِن کے بعد آنے والی آیات کے کچھ حصے میں نظامِ عالمِ ہستی میں خُدا کی نشانیوں اور دلائل توحید کے جاذبِ توجہ نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ اِس بیان سے گزشتہ مباحث کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی یہی آیات قرآن کی آیاتِ توحید کا ایک اہم حصہ ہیں۔

یہ آیات جو سب کی سب " من اٰیاتہٖ " (یعنی خدا کی نشانیوں میں سے ایک) سے شروع ہوتی ہیں اُن کا ایک مخصوص آہنگ ہے، لب و لہجہ دلچسپ اور دلکش ہے اور اُن کی تعبیرات مؤثر اور عمیق ہیں۔

مجموعی طور پر یہ آیات سات ہیں۔ اُن میں چھ تو مُسلسل ہیں اور ایک آیت نمبر ۴۶ الگ ہے۔

آیاتِ آفاقی و انفسی کے لحاظ سے ان آیات کی تقسیم دلچسپ ہے۔ اِس طرح سے کہ ان میں سے تین آیات میں آیات انفس کا ذکر ہے۔ (یعنی خود انسان کی ذات میں کون سی آیاتِ الٰہی ہیں)۔

اور تین آیات میں آیاتِ آفاق کا بیان ہے (یعنی عالمِ خارجی میں عظمتِ پروردگار کی کون کون سی نشانیاں ہیں)۔

جب کہ ایک آیت میں آیاتِ انفس و آفاق دونوں کا ذکر ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ وہ آیات جو "من اٰیاتہٖ" سے شروع ہوتی ہیں قرآن میں گیارہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ جن میں سے سات تو اِسی سورہ رُوم میں ہیں اور دو آیتیں سورہ حٰم سجدہ (۳۷ - ۳۹) میں اور دو آیات سُورۂ شوریٰ میں ہیں (۲۹ - ۳۲) اور حق یہ ہے کہ اِن گیارہ آیات کا مجموعہ اثباتِ توحید پر کاملاً حاوی ہے۔

آیات زیرِ نظر کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے ہم اِس نکتے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن مسائل اور رموزِ فطرت کی طرف قرآن کی اِن آیات میں اشارہ کیا گیا ہے وہ بظاہر عام آدمیوں کے لیے قابلِ ادراک اور قریب بفہم ہیں۔ لیکن انسانی علم و دانش کی ترقی کے ساتھ ساتھ اِن آیاتِ الٰہی کے تازہ رمُوز و نکات کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ اِس تفسیر میں ہم اُن میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

قرآن میں سب سے پہلے انسان کی آفرینش کا ذکر ہے اور تخلیق انسان اللہ کی پہلی اور سب سے اہم نعمت اور احسان ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیاتِ الٰہی میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ اِس کے بعد تم اِنسان بن گئے اور رُوئے زمین پر پھیل گئے۔ (و من اٰیاتہٖ ان خلقکم من تراب ثمّ اذا انتم بشر تنتشرون)۔

Marfat.com

اس آیت میں خدا کی دو نشانیوں کا ذکر ہُوا ہے :
اوّل انسان کی مٹی سے پیدائش کا۔ اس سے پہلے انسان یعنی آدم کی تخلیق مُراد ہے یا تمام انسانوں کی پیدائش مراد ہے کیونکہ وہ مواد غذائی جس سے انسان کا جسم پرورش پاتا ہے بلاواسطہ یا بالواسطہ زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔
دُوسری نشانی یہ ہے کہ نسلِ انسانی کثیر ہوگئی اور نسلِ آدم تمام رُوئے زمین پر پھیل گئی۔ اگر خدا آدم میں افزائشِ نسل کی خصوصیت نہ رکھتا تو اُس کی نسل کا سلسلہ کب کا منقطع ہو چکا ہوتا۔
مقامِ حیرت ہے کہ کثیف مٹی کہاں اور انسان جیسی لطیف ہستی کہاں ؟
مقامِ غور ہے کہ آنکھ کے نازک ترین پردے جو برگِ گل سے بھی لطیف تر، حسّاس تر اور نازک تر ہوتے ہیں، اسی طرح سے دماغ کے لطیف اور غیر معمولی حسّاس خلیات کو اگر ہم مٹی کے پاس رکھیں اور پھر دونوں کا مقابلہ کریں تو اُس وقت یہ راز سمجھ میں آئے گا کہ خالقِ کائنات نے کس حکمتِ بالغہ سے مٹی کے مادہ کثیف سے کس قسم کے نازک، دقیق اور قیمتی آلاتِ سریع الحس تخلیق کیے ہیں۔
مٹی میں نہ تو نور ہے ، نہ حرارت ہے ، نہ زیبائی ، نہ طراوت ، نہ حِس و حرکت ۔ مگر بایں ہمہ خلقتِ وجودِ انسانی کا خمیر اُسی سے اُٹھا ہے۔
جو ذات کہ ایسے بے جان مادہ سے (جو موجوداتِ عالم میں سب سے کہتر اور پست ترین شمار ہوتا ہے) ایسی عجیب و غریب مخلوق پیدا کر سکتی ہے ، وہی اِس قدرت اور لامحدود علم و دانش کے لیے ہر قسم کی تحسین و ستائش کی مستحق ہے :
تبارك الله احسن الخالقين
اِس بیان سے اس واقعیت کا علم بھی ہوتا ہے کہ بحیثیتِ نوعِ انسانوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اُن کا جوہرِ آفرینش ایک ہی ہے۔ خاک سے سب کا ناقابلِ انقطاع تعلق ہے اور طبعاً ، آخر کار سب کے سب خاک ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔
قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ لغتِ عرب میں کلمہ " اذا " امورِ ناگہانی کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔
اس مقام پر اس کلمہ کے استعمال سے ممکن ہے یہ مُراد ہو کہ خُدا نے آدم کو "تکثیرِ نسل" کی اتنی قُدرت دی کہ قلیل مُدت میں اُس کی نسل تمام رُوئے زمین پر پھیل گئی اور ایک انسانی معاشرہ وجود میں آگیا۔

☘ ☘ ☘

زیرِ بحث آیات میں سے دُوسری آیت میں تخلیقِ انسان کا حال بیان کرنے کے بعد اُن نشانیوں کا ذکر ہے جو انسان کے نفس میں موجود ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے ۔ آیاتِ الٰہی میں سے ایک اور بات یہ ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے ازواج کو پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم اُن کی قُربت میں سکون حاصل کرو ؛ (ومن اٰيٰتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا) ۔
اور چونکہ زن و شوہر کے درمیان رشتۂ محبت کی بقا کے لیے بالخصوص اور تمام انسانوں کے درمیان بالعموم ، ایک جذبہ اور رُوحانی و قلبی کشش کی ضرورت ہے ، اِس لیے آیت میں اِن الفاظ کا اضافہ کیا گیا ۔ تمہارے درمیان محبت اور رحمت

Marfat.com

کو پیدا کیا: (وجعل بینکم مودة ورحمة)۔

آیت کے آخر میں تاکید مزید کے لیے فرمایا گیا ہے۔ ان اُمور میں فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں: (ان فی ذالک لاٰیات لقوم یتفکرون)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں شادی کا مقصد سکون و راحت بیان کیا گیا ہے۔ اس کے لیے نہایت پُرمعنی لفظ "لتسکنوا" استعمال کیا گیا ہے۔ اس ایک لفظ میں بہت سے مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اس قسم کی تعبیر کی نظیر سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۹ میں بھی ملتی ہے۔

یہ حق ہے کہ ان خصوصیات کے ساتھ شریکِ حیات کا وجود کہ وہ ایک دوسرے کے لیے زندگی کی راحت کا باعث ہیں خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔

زندگی کے اس راحت و آرام کا باعث یہ ہے کہ یہ دونوں اصناف ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی اور ایک دُوسرے کی خوشی، مسرت اور پرورش کا وسیلہ ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک، ایک دُوسرے کے بغیر ناقص ہے اور یہ فطری امر ہے کہ ایک شخصیت موجود اور دُوسرے اُس کے باعثِ تکمیل وجُود میں اس قسم کا خوش آیند جذبہ موجود ہونا چاہیئے۔

اس اصولِ فطرت سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ جو لوگ اس سُنّتِ الٰہی کو ترک کرتے ہیں اُن کی شخصیت ناقص رہ جاتی ہے کیونکہ اُن کی تکمیلِ شخصیت کا ایک مرحلہ طے نہیں ہوا۔

تجرّد کی زندگی صرف اُن حالات میں جائز ہے جب انسان کسی خاص ضرورت یا شرائط کے تحت مجبور ہو۔

بہر حال زندگی کا یہ آرام و سکون، جسمانی، رُوحانی، انفرادی اور اجتماعی ہر حیثیت سے ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ترک ازدواج کی وجہ سے بعض جسمانی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مجرد افراد میں جو نفسیاتی اُلجھنیں اور رُوحانی اضطراب ہوتا ہے اُس کی وجہ بھی یہی ہے، جو سب پر روشن ہے۔

معاشرتی نُقطہ نگاہ سے مجرّد لوگوں کو اپنی ذمّہ داری کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ اسی لیے ان میں خودکشی کے واقعات بہت نظر آتے ہیں اور اُن سے خوفناک جرائم بھی سرزد ہوتے ہیں۔

جس وقت انسان تجرّد کی زندگی کو چھوڑ کر خانگی زندگی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک تازہ شخصیت کا احساس کرتا ہے نیز اُسے اپنی ذمّہ داری کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ حالتِ ازدواج میں انسان کو جو راحت ملتی ہے، اُس میں یہ امور بھی داخل ہیں۔

اَب رہا "مودّت اور رحمت" کا مسئلہ تو در حقیقت یہ دونوں چیزیں انسانی معاشرے کی عمارت کی تعمیر کا مسئلہ ہیں کیونکہ ہر معاشرہ افراد کے اجتماع سے بنتا ہے۔ اس کی مثال اُس عمارت کی سی ہے جو اینٹوں اور پتھروں کے ٹکڑوں سے مل کر تعمیر ہوتی ہے۔ اگر افرادِ انسانی پراگندہ حالت میں رہیں تو کوئی معاشرہ بھی وجُود میں نہیں آسکتا جیسے کہ اجزائے تعمیر اگر باہم مربوط نہ ہوں تو کوئی عمارت بھی وجود میں نہیں آسکتی۔

وُہ ذات جس نے انسان کو معاشرتی زندگی کے لیے پیدا کیا، اسی نے اُس کی فطرت میں باہمی تعاون اور اُلفت کا جذبہ بھی

Marfat.com

ودیعت کر دیا ہے۔

ممکن ہے کہ "مودّت" اور "رحمت" میں مختلف جہات سے فرق ہو:

۱۔ "مودّت" وُہ داخلی تحریک ہے جو ابتدا میں ارتباط کا سبب بنتی ہے۔ لیکن ـــــ عمر کے آخری حصّے میں اگر زوجین میں سے ایک ضعیف و ناتواں ہو جائے اور اُس میں اتنی طاقت نہ رہے کہ دوسرے کی خدمت کر سکے تو اس وقت "رحمت" مودت کی جگہ لے لیتی ہے۔

۲۔ "مودّت" کا تعلق سن رسیدہ لوگوں سے ہے جو ایک دُوسرے کی خدمت کر سکتے ہیں۔ لیکن اولاد اور چھوٹے بچّے سایۂ رحمت میں پرورش پاتے ہیں۔

۳۔ مودّت یک طرفہ نہیں ہوتی بلکہ اُس کے لیے طرف ثانی کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن "رحمت" میں ایثار ہوتا ہے۔ اِس لیے وہ یک طرفہ ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک معاشرے کی بقا کے لیے کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے تعاون سے خدمت کریں اور یہ جذبہ مودت سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خدمت کے صلہ کی توقع نہیں کی جاتی اسے "ایثار" کہتے ہیں، جو جذبۂ رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مگر آیت میں زوجین کے درمیان "مودّت" اور "رحمت" دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے اس تعبیر سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ خصوصیت جملہ بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ جن میں زوجین کا تعلق اِن جذبات کا واضح مصداق کہے جا سکتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے تمام معاشروں میں خاندانی زندگی ایسی چیز ہے جس کا وجود مودّت اور رحمت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اگر افراد خاندان کے درمیان یہ جذبات نہ رہیں یا کمزور ہو جائیں تو اس سے معاشرے میں ہزاروں اضطراب، بے چینیاں اور مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

٭ ٭ ٭

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت اُن مضامین کا ایک مجموعہ ہے جن کا اُن آیات میں ذکر ہوا ہے جن میں انفس و آفاق میں پائی جانے والی نشانیوں کا ذکر ہے۔

اس میں سب سے پہلے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے ـــــ خدا کی عظیم آیات میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق بھی ہے: (و من اٰیاتہ خلق السّماوات والارض)۔

آسمان پر سیاروں کے کرات ہیں۔ اُن کے نظامات، کہکشائیں اور اُن کی بلندی اور مسافت کا یہ عالم ہے کہ انسان کا بلند پرواز تخیل اُن کی عظمت کا ادراک کرنے سے عاجز ہے اور اُن کے مطالعے سے اِنسان تھک جاتا ہے۔ اِنسان کا علم و دانش جس قدر بھی ترقی کرتا جاتا ہے، اُسی قدر خدا کی عظمت کے تازہ نکات اُس پر آشکار ہوتے جاتے ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ انسان بلندی پر نظر آنے والے ستاروں کی تعداد صرف اِتنی ہی سمجھتا تھا جتنے اُسے نظر آتے تھے۔

ماہرین علم ہیئت نے اُن ستاروں کی تعداد جو بغیر دُوربین کے نظر آتے ہیں پانچ ہزار سے چھ ہزار تک بیان کی ہے۔

Marfat.com

لیکن جس رفتار سے بڑی بڑی دُور بینوں کی ایجاد میں اضافہ ہوا ہے اُسی رفتار سے مزید آسمانی عظیم الجثہ کرات دریافت ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ علمائے ہیئت کا خیال ہے کہ یہ کہکشاں جو ہم سے قریب تر ہے اور جو خلائے لامحدود میں موجود کثیر کہکشاؤں میں سے ایک ہے، اس میں ایک ارب سے زیادہ ستارے ہیں۔ جن میں سے ہمارا سُورج اپنی خیرہ کُن عظمت کے باوجود کہکشاں کے متوسط ستاروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ تو صرف خُدا ہی کو علم ہے کہ ان تمام کہکشاؤں میں جن کا ابھی تک شمار نہیں ہوسکا، کتنے ستارے ہوں گے۔

اسی طرح جس سُرعت سے سائنسی علوم مثلاً: علم الارض، علمِ نباتات، علم الحیات، علم تشریح اعضاء، طبیعیات علم النفس اور تحلیل نفسی ترقی کر رہے ہیں، اُسی رفتار سے آفرینش زمین کے متعلق تازہ انکشافات ہو رہے ہیں، جن میں سے ہر ایک عظمتِ الٰہی کی ایک آیت ہے۔

اس کے بعد کلام کا پہلو بدل کر انسان کے نفس میں من جُملہ آیاتِ عظیم کے ایک آیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اُس کی آیاتِ عظمت میں سے ہے: (واختلاف السنتکم والوانکم)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی افراد و اشخاص کی شناخت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ دُنیا کے تمام انسانوں کی شکلیں، قیافہ، قد اور ڈیل ڈول یکساں ہو جائے تو اُسی دن اُن کی زندگیوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ باپ اور بیٹے، اپنے اور غیر کی پہچان نہ ہوسکے گی۔ اور نہ مجرم و بے گناہ، قرض خواہ و مقروض، حاکم و محکوم رئیس و مرؤس، میزبان و مہمان اور دوست و دُشمن کی تمیز ہوسکے گی۔ ایسی حالت میں کیسا عجیب گھپلا اور گڑبڑ پیدا ہو جائے گی کبھی کبھی دو جڑواں بھائیوں کے، جو ہر جہت سے باہم مشابہ ہوتے ہیں، لوگوں سے ملنے اور اُن کی شناخت کے بارے میں یہ دُشواری پیش آتی ہے۔ چنانچہ ہم نے سُنا ہے کہ دو، ہم رنگ و ہم شکل بھائیوں میں سے ایک بیمار ہوا اور ماں نے دوا دُوسرے کو پلا دی۔

اس لیے معاشرہ کی تنظیم کے لیے خدا نے انسانوں کی آوازوں اور رنگوں کو مختلف بنایا ہے۔

جیسا کہ فخر الدین رازی نے آیت زیر بحث کے ذیل میں کہا ہے:

ایک انسان دوسرے انسان کو یا تو آنکھ سے دیکھ کر پہچانتا ہے یا اُس کی آواز سُن کر، اس لیے خدا نے بذریعہ چشم شناخت کرنے کے لیے انسانوں کے رنگ، صورتوں اور شکلوں کو مختلف بنایا ہے۔

اور بذریعہ گوش شناخت کرنے کے لیے آوازوں اور لہجوں میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔

یہاں تک کہ ــــ تمام دُنیا میں دو انسان بھی ایسے نہیں مل سکتے جو چہرے کی بناوٹ اور آواز کے لہجے میں ہر لحاظ سے یکساں ہوں۔ یعنی انسان کی صُورت جو ایک چھوٹی سی بات ہے اور اُس کی آواز کا لہجہ جو ایک سادہ سی چیز ہے، قدرت خدا سے کروڑوں آدمیوں کا بھی ایک دُوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ خدا کی عظیم آیات میں سے ہے۔

اس موقع پر ایک احتمال اور بھی ہے اور بعض مفسّرین نے اُس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ اختلافِ السنہ سے مُراد بولی جانے والی زبانوں کا فرق مراد ہے جیسے عربی، فارسی، تُرکی وغیرہ اور رنگوں کے اختلاف سے نسلوں کے رنگوں کا اختلاف مُراد ہے

Marfat.com

جیسے زرد نسلیں، سیاہ نسلیں، گوری نسلیں وغیرہ۔
لیکن آیت میں استعمال شدہ کلمہ " اختلاف " کے وسیع معنی بھی لیے جا سکتے ہیں۔ جن میں یہ تفسیر اور تفسیر ماقبل دونوں شامل ہوں۔ بہرکیف، خلقت کا یہ تنوع ہر جہت سے خدا کی قدرت اور عظمت کی نشانی ہے۔
فرید وجدی نے اپنی دائرۃ المعارف ENCYCLOPEDIA میں مغرب کے مشہور سائنس دان نیوٹن کا یہ قول درج کیا ہے:

"خالق کائنات خدا کے بارے میں ہرگز شک نہ کرو کیونکہ عقل اسے قبول نہیں کرتی کہ صرف بے شعور فطرت اور سلسلۂ علت و معلول سے موجودات ظہور میں آجائیں۔
کیونکہ اندھی فطرت BLIND NATURE (جو ہر زمان و مکان میں یکساں وجود رکھتی ہے) سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اُس سے یہ تمام نوع بہ نوع کائنات اور رنگارنگ موجودات صادر ہو سکیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اندھی فطرت سے کوئی ایسا عالم پیدا ہو جائے جس کے اجزا میں نظم و ترتیب ہو اور تغیراتِ زمان و مکان کے باوجود اُس کے تناسب اور ہم آہنگی میں کوئی فرق نہ آئے۔
اِس سے ثابت ہے کہ لازماً اِس کائنات کا مبدا کوئی ایسی ذات ہے جو صفاتِ علم و حکمت اور ارادہ سے متصف ہے۔[1]

قرآن شریف آیت کے آخر میں کہتا ہے:
اِن چیزوں میں اہلِ علم و دانش کے لیے آیاتِ الٰہی ہیں: (انّ فی ذٰلك لاٰیات للعالمین)۔
کیونکہ اہلِ علم ہی عامۃ النّاس کے مقابلے میں ان اسرار سے بہتر طور پر آگاہ ہوتے ہیں۔

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی، جلد اوّل صفحہ ۴۹۶ (مادہ اله)

Marfat.com

۲۳۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝

۲۴۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

۲۵۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۳۔ اور اُس کی آیات میں سے تمہاری رات اور دن کی نیند بھی ہے۔ اور تمہارا اُس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ تحقیق کہ اِن اُمور میں اُن کے لیے جو سُنتے ہیں بہت سی نشانیاں ہیں۔

۲۴۔ اور اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ وُہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جو خوف کا باعث بھی ہے اور (بارش کی) اُمید کا بھی اور وُہ آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے وُہ زمین کو اُس کی مَوت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ اِس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

Marfat.com

۲۵۔ اور اُس کی آیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آسمان و زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں
پھر جب وُہ تمہیں (قیامت میں) زمین سے بلائے گا تو تم فوراً نکل پڑوگے ¹ اور
میدانِ حشر میں حاضر ہو جاؤگے۔

تفسیر

انسان کے نفس اور خارجی دُنیا میں خُدا کی عظمت کی نشانیاں: گزشتہ بحثوں کے بعد جن میں انفس و آفاق میں آیات الٰہی کا ذکر تھا، زیرِ نظر آیات میں ان عظیم آیات کے ایک اور حصہ کا بیان ہے۔

سب سے پہلے نیند کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کیونکہ وُہ مظاہر فطرت میں سے ایک اہم مظہر اور نظام عالم میں اس کے خالق کی حکمت کا اظہار ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ تمہارا دن اور رات میں سونا نیز فضلِ الٰہی سے حصہ پانے کے لیے تمہاری سعی و کوشش اور ضروریاتِ زندگی کو پُورا کرنے کے لیے تمہاری بھاگ دوڑ اور اُن کا پُورا ہونا یہ سب آیاتِ الٰہی میں سے ہے:
(ومن اٰیاتہٖ منامکم باللیل والنھار وابتغاؤکم من فضلہٖ)۔

آیت کے اخیر میں یہ الفاظ ہیں۔ سُننے والوں کے لیے ان امور میں بہت سی نشانیاں ہیں: (ان فی ذٰلک لاٰیات لقوم یسمعون)۔

کسی سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ تمام "جان داروں" کو صَرف شُدہ طاقت کو بحال کرنے اور آئندہ محنت مشقت کے واسطے تیار ہونے کے لیے، آرام کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ استراحت اور نیند لازمی طور پر انسان پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ لوگ جو کسبِ معاش میں محنت اور مشقت کرتے ہیں وہ تو ناگزیر طور پر تھک کر سو جاتے ہیں۔

پھر سے تازہ دم ہونے کے لیے نیند سے بہتر اور کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے جو فطرتاً انسان پر طاری ہو جاتی ہے اور جو وقتی طور پر انسان کے تمام جسمانی، فکری اور دماغی اعمال کو مُعطّل کر دیتی ہے۔

صِرف بعض اعضا و قویٰ جن کا مصروفِ عمل اور بیدار رہنا ثباتِ حیات کے لیے لازم ہے نہایت آہستگی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ مثلاً حرکتِ قلب، روانیٔ تنفس اور دماغ کے بعض حصّے۔

یہ نعمتِ الٰہی اِس امر کا باعث ہوتی ہے کہ انسان کے جسم اور رُوح میں از سرِ نو قوّت کار آ جاتی ہے۔ انسان جب استراحت کرتا ہے تو وُہ اُس وقت کام سے فارغ ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر سونے سے اُس کی تھکن دُور ہو جاتی ہے اور اُس کے اعضا کو آرام مل جاتا ہے اِس طرح انسان میں ایک نئی زندگی، خوشی اور تازہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان سویا نہ کرتا تو اس کا جسم جلد ہی پژمُردہ اور فرسُودہ ہو جاتا اور بہت جلد ناتوان اور ضعیف ہو جاتا۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ مناسب و معتدل نیند انسان کے لیے نشاطِ جوانی کی بقا، طُولِ عمر اور صحت و سلامتی کا باعث ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں نیند کا ذکر "ابتغاؤکم من فضلہ" سے پہلے آیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں کہ اپنی روزی تلاش کرو۔ اس ترتیب میں مصلحت یہ ہے کہ "نیند" تلاشِ رزق کے لیے بُنیادی شرط ہے۔ کیونکہ اگر انسان نے کافی آرام نہ کیا ہو تو "ابتغاؤکم من فضلہ" بھی مشکل ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ بھی درست ہے کہ معمولاً انسان رات کو سوتا ہے اور دن کو اپنا رزق تلاش کرتا ہے مگر یہ لازمی نہیں ہے کہ انسان اپنے معمولاتِ حیات کو بدل نہ سکے۔ خدا نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ اپنی نیند کی عادت کو بدل سکتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں تغیر کر سکتا ہے۔ اسی لیے "منامکم باللیل والنھار" کہا گیا ہے (رات کا ذکر پہلے اور دن کا ذکر بعد میں ہے)۔

بے شک سونے کا اصل وقت رات ہی کا ہے اور تاریکی کے سبب شب کو سکون محسوس ہوتا ہے اس لیے آرام کرنے کے لیے اُسے اوّلیت حاصل ہے۔ مگر انسان کی زندگی میں بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ اس کے برعکس عمل کرنا پڑتا ہے مثلاً رات کو سفر کرنا پڑے تو دن کو آرام کرنا پڑے گا۔ اسی قیاس پر دیکھیئے کہ اگر سونے کے اوقات انسان کے اختیار میں نہ ہوتے تو کتنی دشواری پیش آتی۔

نیند کو آیاتِ الٰہی میں شمار کرنے کی اہمیت ہمارے زمانے میں اور بھی زیادہ واضح ہو گئی ہے کیونکہ فی زمانہ بعض صنعتی کارخانے اور ہسپتال رات دن کام کرتے اور کھلے رہتے ہیں اور اُن میں کام کرنے والے تین تین شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔

آدمی کے جسم اور رُوح کو نیند کی ضرورت اتنی زیادہ ہے کہ انسان میں بے خوابی کے تحمل کی توانائی بہت ہی کم ہے اور انسان چند شب و روز سے زیادہ بے خوابی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس لیے ظالم اور ستم شعار اہلِ اقتدار کسی کو بدترین سزا یہی دیتے ہیں کہ اُسے سونے نہیں دیتے۔ برعکس اس کے بہت سی بیماریوں کا مؤثر علاج یہ ہے کہ بیمار کو گہری نیند سُلا دیا جائے۔ اس طرح سے اس کی قوتِ مدافعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

لیکن عام انسانوں کے لیے نیند کی مقدار کو مُعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ طُولِ خواب کا انحصار انسان کے سن و سال اُس کے حالات، اس کی جسمانی بناوٹ اور نفسیاتی کیفیت پر ہے۔

البتہ ـــــ نیند کی اُس مقدار کو کافی کہہ سکتے ہیں جس کے بعد انسان اپنے اندر تازگی محسوس کرے۔ جس طرح پانی پی کر اور غذا کھا کر سیری محسوس کرتا ہے۔

یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ نیند کے لیے جس طرح طولِ زمان کا لحاظ ہے اُس کا گہرا ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات ایک گھنٹے کی گہری نیند، چند گھنٹوں کی اچٹتی ہوئی نیند کے مقابلے میں انسان کی رُوح اور جسم کو تازگی بخشنے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

لیکن ـــــ اگر کبھی موقع پر گہری نیند ممکن نہ ہو صرف خفیف اور اچٹتی ہوئی نیند اور غنودگی بھی خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔ جیسا کہ سورۂ انفال کی آیت ۱۱ میں مجاہدینِ بدر کے متعلق ذکر ہے کیونکہ میدانِ جنگ میں گہری نیند ممکن ہی نہیں ہے اور

Marfat.com

نہ مفید و سُود مند ہے۔

بہر حال ــــ نیند اور استراحت ـ اور اُس سے جو سکون، نشاط اور توانائی حاصل ہوتی ہے۔ خدا کی ایسی نعمت ہے جس کی کسی طرح بھی توصیف نہیں ہو سکتی۔

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد کی آیت میں آیاتِ الٰہی کی پانچویں قسم کو بیان کیا گیا ہے۔ اِس آیت میں بھی خدا کی اِن نشانیوں کا ذکر ہے جو نفسِ انسانی سے باہر عالمِ خارج میں پائی جاتی ہیں۔ اِس میں خصوصیت سے رَعد و برق، بارش اور زمین کی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیاتِ الٰہی میں سے ایک بجلی بھی ہے جو تمہارے لیے موجبِ خوف بھی ہے اور باعثِ اُمید بھی: (ومن اٰیاتہ یریکم البرق خوفاً وطمعاً)۔

بجلی کا خوف تو یہ ہے کہ وہ کبھی بصورتِ صاعقہ ٹوٹ پڑتی ہے اور ہر اُس چیز کو جو اُس کے احاطہ میں آجائے جلا خاک کر دیتی ہے۔ بجلی چمکنے سے " اُمید " یہ ہوتی ہے کہ عموماً گرج چمک کے بعد تند و تیز بارش ہوتی ہے۔ اِس بناء پر بجلی نزولِ بارش کا پیش خیمہ ہے۔ اِس کے علاوہ بجلی کے چمکنے میں جو فوائد ہیں اُنھیں اِس زمانے میں سائنس دانوں نے منکشف کیا ہے۔

ہم نے سُورۂ رَعد کے آغاز میں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے۔[1]

اِس کے بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ خدا آسمان سے پانی برساتا ہے جو زمین کو اُس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے: (وینزل من السمآء مآءً فیحیی بہ الارض بعد موتھا)۔

خشک اور جلتی بھنتی زمین میں جس سے مُوت کی بُو آتی ہے چند حیات بخش بارشوں کے بعد جان آجاتی اور وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اُس سے اُگنے والے پھُولوں، سبزے اور جڑی بُوٹیوں سے اُس کے آثارِ حیات نمایاں ہوتے ہیں۔ اِس کی حالت دیکھ کر کوئی یقین بھی نہیں کر سکتا کہ یہ وہی مُردہ زمین ہے۔

آیت کے آخر میں بطورِ تاکید اضافہ کیا گیا ہے کہ اِن چیزوں میں اُن لوگوں کے لیے جو فکر کرتے اور عقل سے کام لیتے ہیں خدا کی نشانیاں ہیں: (انّ فی ذٰلک لاٰیات لقوم یعقلون)۔

اہلِ عقل و فکر ہی یہ سمجھتے ہیں کہ اس مُرتب نظامِ فطرت کے پیچھے کسی قادرِ مطلق کا ہاتھ ہے جو اس نظام کو چلا رہا ہے۔ نیز یہ کہ یہ نظامِ فطرت محض اتفاقاً یا اندھی اور بہری حرکت و ضرورت سے ظہور میں نہیں آگیا۔

❊ ❊ ❊

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت میں، عالمِ خارج میں موجود آیاتِ الٰہی کے سلسلے میں زمین و آسمان کے نظام اور اُن کی ثبات و بقا کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیاتِ عظمتِ الٰہی میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان و زمین اُس کے امر سے قائم ہیں: (ومن اٰیاتہ ان تقوم السمآء والارض بامرہ)۔

---

[1] تفسیر نمونہ، جلد ۱۰ کی طرف رجوع فرمایئے۔

Marfat.com

یعنی صرف آسمان وزمین کی تخلیق ہی جیسا کہ آیت ۲۲ میں اشارہ ہوا ہے، آیتِ الٰہی نہیں بلکہ ان کے نظام کا باقی رہنا ایک دوسری نشانی ہے۔ کیونکہ یہ عظیم اجرام اپنی منظم گردش کے لیے اور چیزوں کی احتیاج بھی رکھتے ہیں جن میں سے سب سے اہم اُن کی باہم قوّتِ جاذبہ اور دافعہ ہے۔

خداوندِ عالم نے کراتِ سماوی میں ان دونوں قوتوں کو ایسے اعتدال پر رکھا ہے کہ لاکھوں سال گزرنے کے بعد بھی سرِمُو انحراف کے بغیر اپنے اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں۔

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو گزشتہ آیت میں یہ بیان ہے کہ خالقِ کائنات ذاتِ واحد ہے۔ اور — اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کارخانۂ عالم کی مُربّی اور مدبّر بھی ذاتِ احدیت ہی ہے۔

آسمان اور زمین کے لیے فعل " تقوم " کا استعمال جس سے اُن کا قیام اور ثبات مُراد ہے، ایک لطیف تعبیر ہے۔ جو انسان کے معمولاتِ حیات سے لی گئی ہے کیونکہ انسان کے کام کرنے کے لیے بہترین حالت، حالتِ قیام ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے تمام کام انجام دینے پر قدرت رکھتا ہے اور اپنے اطراف پر پُورا تسلط رکھتا ہے۔

کلمہ " امر " کے استعمال سے پروردگار کی انتہائی قُدرت مُراد ہے کہ اس عظیم و وسیع کائنات کے نظم اور دوامِ حیات کے لیے اُس کا ایک حُکم ہی کافی ہے۔

اِس آیت کے اخیر میں، معاد کے لیے توحید کو بُنیادی شرط قرار دیتے ہوئے، بحث کا رُخ اسی طرف موڑتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ جب وہ تمہیں زمین میں سے بُلائے گا تو تم سب کے سب باہر نکل آؤ گے: (ثم اذا دعاکم دعوة من الارض اذا انتم تخرجون)۔

قرآنِ کریم میں یہ بات بتکرار نظر آتی ہے کہ خدا معاد کو زمین و آسمان میں اُس کی قدرت کی نشانیوں کی بُنیاد پر ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ آیت زیرِ بحث بھی اُن ہی آیات میں سے ہے۔

کلمہ " دعاکم " سے یہ مُراد ہے کہ جس طرح اِس کائنات کی نظم و تدبیر کے لیے اُس کا ایک حکم کافی ہے، اسی طرح بروزِ قیامت دوبارہ جی اُٹھنے اور حشر و نشور کے لیے بھی اُس کا ایک دفعہ بُلانا ہی کافی ہوگا خصوصیت سے جب اس جُملے پر توجہ کی جائے " اذا انتم تخرجون "۔

عربی زبان میں کلمہ " اذا " مناجات کے لیے آتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ ایک ہی دفعہ پُکارنے سے سب کے سب ناگہانی طور پر قبروں سے باہر نکل آئیں گے۔

اِس ضمن میں " دعوة من الارض " کے الفاظ سے معادِ جسمانی ثابت ہوتی ہے کہ بروزِ قیامت انسان اسی زمین سے اُٹھایا جائے گا۔

چند اہم نکات

۱۔ **درسِ خُداشناسی کا ایک مکمل نصاب** : گزشتہ چھ آیات میں خُداشناسی کے مضمون کو مختلف انداز و

Marfat.com

عنوانات سے بیان کیا گیا ہے۔ جو درحقیقت اس درس کے لیے ایک مکمل نصاب ہے۔

اس مضمون میں آفرینش آسمان سے لے کر مٹی سے انسان کی تخلیق، اہل خانہ کی باہمی محبت، شب و روز کی راحت بخش نیند، نظامِ کائنات میں تدبیرِالٰہی، نزولِ باران اور اقوام عالم کی زبانوں اور اُن کے رنگوں کا اختلاف، غرض کہ انفس و آفاق میں خدا کی جو بھی آیات ہیں، اُن سب ہی کا ذکر ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ان آیات میں سے ہر ایک میں دلائل توحید کے دو حصے ہیں، ایک حصہ بطور تمہید ہے اور دُوسرے میں دعویٰ کا اثبات اور تاکید ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دو عادل گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے چھ آیات میں خدا کی بے پایاں قدرت کے اظہار کے لیے مجموعی طور پر بارہ۱۲ گواہ ہو گئے۔

۲۔ کون لوگ اِن آیات سے کسبِ حکمت کرتے ہیں؟ ان چھ آیات میں سے درمیان کی چار آیات میں تاکیداً کہا گیا ہے کہ اِن حوادثِ عالم اور اجزاءِ کائنات میں علماء، عقلاء، متفکرین اور سُننے والوں کے لیے روشن نشانیاں ہیں۔ مگر آیت ۲۰ اور ۲۵ میں یہ ذکر نہیں ہے۔

فخرالدین رازی نے اس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ آیت ۲۰ میں اِس امر کا ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آیات بیس اور اکیس ایک دُوسرے کے بعد آئی ہیں اور دونوں میں اُن آیات کا ذکر ہے جو انسان کے عالمِ انفس میں ہیں۔

اور آخری آیت میں مطلب اس قدر واضح ہے کہ اُس پر غور کرنے کے لیے تعقل و تفکر کی ضرورت ہی نہیں[1]۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ پہلے کلمہ "تفکر" استعمال ہوا ہے۔ اُس کے بعد "علم" کا ذکر ہے۔ کیونکہ علم کے لیے فکر کی بُنیادی حیثیت ہے۔ اُس کے بعد سُننے والے کان کا ذکر ہے۔ کیونکہ علم و آگاہی کے طفیل ہی انسان کلمۂ حق سُننے اور قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ جس طرح سے کہ قرآن میں مذکور ہے:

فبشر عباد الّذین یستمعون القول فیتّبعون احسنہٗ

میرے اُن بندوں کو بشارت دو جو باتوں کو سُنتے ہیں اور اُن میں سے بہترین پر عمل کرتے ہیں۔ (زمر۔ ۱۷-۱۸)

آیت ۲۴ میں "عقل" کا ذکر ہے۔ کیونکہ عقل کامل کی منزل پر وہی لوگ پہنچیں گے جو سُننے والے کان رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ نظر آیات میں سے آیت ۲۰ میں انسان کی خلقت اور اُس کی نسل کے زمین پر پھیلنے کا ذکر ہے:

ثمّ اذا انتم بشر تنتشرون

اور آخری آیت ۲۵ میں بروز قیامت زمین سے جی اُٹھنے کا ذکر ہے:

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

اذا انتم تخرجون۔
پہلی آیت ۔۲۰ میں آغازِ انسان کا ذکر ہے اور آخری ۲۵ میں اُس کے انجام کا ذکر ہے۔

☆ ☆ ☆

۳۔ **عالمِ خواب کے عجائبات** : علماء نے خواب اور اُس کی خصوصیات کے بارے میں جو بحثیں کی ہیں اُن کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس پُراسرار عالم کے تمام پہلو روشن نہیں ہوئے اور انسان کی اُس کی پیچیدہ حقیقتوں تک رسائی نہیں ہوئی۔

ابھی اہلِ علم میں یہ امر زیرِ بحث ہے کہ انسان کے جسم میں کون سا عمل اور ردِّعمل ہوتا ہے کہ ناگہانی طور پر اُس کے دماغ اور بدن کے عمل کا ایک حصّہ مُعطّل ہو جاتا ہے اور اُس کی رُوح اور جسم میں ایک نئی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض عُلماء کا یہ خیال ہے کہ انسان کے جسم میں تبدیلیاں نیند آنے کا باعث ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب دماغ سے جسم کے دُوسرے حصّوں میں خُون جاتا ہے تو یہ کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو مغز سے باقی اعضا کی طرف انتقالِ خُون کو ظاہر کرتا ہے۔

علماء کا ایک اور گروہ جسم میں کیمیائی تبدیلیوں کو نیند کا باعث سمجھتا ہے۔ اِن لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جس وقت انسان محنت مشقت کرتا ہے تو اُس کے جسم میں ایک زہر پیدا ہو جاتا ہے جو دماغ کے ایک حصّے کو بیکار کر دیتا ہے۔ اُس کے نتیجے میں انسان سو جاتا ہے اور جب یہ زہر جزوِ بدن بن کر زائل ہو جاتا ہے تو انسان بیدار ہو جاتا ہے۔ سائنس دانوں کی ایک اور جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ "نیند" کا ایک عامل اعصابی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دماغ میں بھی ایک خاص قسم کا فعّال نظامِ اعصاب موجُود ہے۔ جس کی مثال موٹر کے پیٹرول کی سی ہے۔ یہ نظامِ اعصاب تھک کر بیکار ہو جاتا ہے اور آدمی سو جاتا ہے۔

مگر اِن تمام نظریات پر اعتراضات کیے گئے ہیں جن کے ابھی تک شافی جوابات نہیں دیے جا سکے۔ اس لیے ابھی تک "نیند" ایک پُراسرار چیز ہی ہے۔

سائنس دانوں نے جن عجائباتِ خواب کا انکشاف کیا ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بوقتِ خواب جب دماغ کے خلیوں کا اکثر حصّہ اپنا کام ترک کر دیتا ہے تو بعض خلیے جنھیں "خلیاہائے نگہبان" کہنا چاہیئے، بیدار رہتے ہیں اور انسان عالمِ بیداری میں اُن خلیوں کو جو پیغام بھی دیتا یا جو نصیحت بھی کرتا ہے وُہ اُسے ہرگز فراموش نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ وُہ مغز کو بیدار کر کے اُسے متحرّک کر دیتے ہیں۔

مثلاً ـــــ ایک تھکی ماندی ماں جب رات کو سونے لگتی ہے اور اُس کا شیر خوار بچّہ اُس کے قریب ہی گہوارے میں محوِ خواب ہوتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر دماغ کے "نگہبان" خلیوں سے (جو رُوح اور جسم کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں) یہ کہتی ہے کہ "میرا بچّہ جس وقت بھی روئے تو مجھے جگا دینا۔ ماں کے نزدیک اُس کے علاوہ دُوسری آوازوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ بادل کی گرج اس ماں کو نیند سے بیدار نہ کرے۔ لیکن بچّے کی ہلکی سی آواز بھی اُسے جگا دیتی ہے اور دماغ کے

Marfat.com

نگہبان خلیئے اس فرض کو ادا کرتے ہیں۔

ہم نے اِس بات کو خُود اپنے اُوپر بارہا آزما کے دیکھا ہے کہ اگر ہم نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا ہے کہ صبح سویرے یا آدھی رات کو ہمیں کسی سفر یا کسی اہم پروگرام پر جانا ہے تو عین وقت پر آنکھ کُھل جاتی ہے۔ جب کہ دیگر مواقع پر ہم گھنٹوں پڑے سوتے رہتے ہیں۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ نیند ایک رُوحانی مظہر ہے اور رُوح ایک پُراسرار عالم ہے۔ لہذا ـــ کیا عجب ہے کہ اِس مسئلے کے بہت سے پہلو ایسے ہوں جو ابھی انسان پر منکشف نہ ہوئے ہوں۔ مگر انسان اس اسرار کی گرہ کُشائی میں جتنا بھی زیادہ غور و فکر کر رہا ہے اتنا ہی اُس پر اِس مظہر کے خالق کی عظمت واضح ہوتی جاتی ہے۔

٭ ٭ ٭

۴۔ میاں بیوی کی باہمی محبّت : اگرچہ ـــ انسان کا اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے رابطہ نسبی ہے جس کی بُنیاد رشتہ داری کے گہرے تعلق پر ہے۔ اس کے مقابلے میں زوجین کا باہمی تعلق صرف قانون اور معاہدۂ باہمی پر ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُن دونوں کے درمیان محبت رشتہ داری کے تعلق پر سبقت لے جاتی ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ " میں انسان کی اِسی فطرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

جناب رسالتمآبؐ سے ایک حدیث مروی ہے کہ : جنگِ اُحد کے بعد آپؐ نے بنتِ جحش سے فرمایا کہ " تیرے ماموں حمزہؓ شہید ہوگئے ہیں" تو اُس نے جواب دیا : "انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون " " مَیں خُدا سے اِس مصیبت کا اجر چاہتی ہوں"۔

آپؐ نے پھر اُس سے کہا ـــ " تیرا بھائی بھی شہید ہوگیا"۔

اُس لڑکی نے پھر " انّا للّٰہ " پڑھا اور اس کا اجر خُدا سے مانگا۔ مگر جناب رسالت مآبؐ نے جیسے ہی اُسے اُس کے شوہر کے مرنے کی خبر سُنائی، تو، وُہ سر پیٹنے اور فریاد کرنے لگی۔

ہاں ـــ یہ قول کتنا سچّا ہے :

" مایعدل الزوج عند المرأۃ شیءٌ "

عورت کے لیے کوئی شے بھی اُس کے شوہر کے مانند نہیں ہے۔[1]

---

[1] تفسیر نورالثقلین، جلد ۴، صفحہ ۱۷۴۔

Marfat.com

۲۶۔ وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝

۲۷۔ وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ
وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ
الْحَكِیْمُ ۝

۲۸۔ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ
مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِیْ مَا رَزَقْنٰكُمْ
فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِیْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ
كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

۲۹۔ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ یَّهْدِیْ
مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اُس کے سامنے جھکے ہُوئے ہیں
اور سب اُسی کے فرماں بردار ہیں۔

۲۷۔ اور وہی خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اُسے لوٹائے گا اور اُس کے لیے یہ کام آسان ہے

Marfat.com

اور اُس کے لیے آسمانوں اور زمین ہیں توصیف برتر ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۲۸۔ خُدا تمہارے لیے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان کرتا ہے (اگر تمہارے پاس لونڈیاں اور غلام ہوں تو) کیا وہ تمہارے غلام اور لونڈیاں تمہارے اِس مال ہیں جو ہم نے تمہیں دیا ہے شریک ہیں ؟ اور کیا اُس ہیں وہ تمہارے برابر کے حصہ دار ہیں؟ اور کیا اُن سے اجازت لیے بغیر تم اُس ہیں تصرف سے اسی طرح ڈرتے ہو جیسے آزاد حصہ داروں سے؟ ہم اِس طرح اپنی آیات کو اُن کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں کھول کر بیان کرتے ہیں۔

۲۹۔ بلکہ ظالم بغیر علم و آگاہی کے اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور خُدا جسے گمراہ کرے اُسے کون ہدایت کر سکتا ہے اور اُن کا کوئی یاور و مددگار نہ ہوگا۔

تفسیر

خُدائے واحد ہی مالکِ حقیقی ہے

گزشتہ آیات ہیں " توحید خالقیت " اور " توحیدِ رُبوبیت " کے متعلق بحث تھی۔ مگر زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت میں توحید کی ایک اور شاخ یعنی " توحیدِ مالکیت " کا ذکر ہے۔ چنانچہ خُدا فرماتا ہے : زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اُس کے لیے ہے (ولہ من فی السماوات والارض)۔ اور چونکہ سب اُس کی ملکیت ہیں، اِس لیے سب کے سب اُس کے سامنے فروتن اور مطیع ہیں (کلٌّ لہٗ قانتون)۔

یہ ظاہر ہے کہ اِس مقام پر مالکیت اور مطیع ہونے کا مفہوم مالکیت و اطاعتِ تکوینی ہے۔ یعنی قانونِ آفرینش کے لحاظ سے ہر شئے کی زمامِ امر اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ خواہ نہ خواہ اُس کے قوانین کا پابند ہے۔

یہاں تک کہ نافرمان، باغی اور قانون شکن گناہ گار بھی، خدا کے قوانین تکوینی کی پابندی پر مجبور ہیں۔ اِس مالکیت کی دلیل اُس کی وہی خالقیت اور رُبوبیت ہے۔ وہ ذات جس نے ابتدا میں کائنات کو خلق کیا اور اُس کا نظام و تدبیر بھی جس کی قدرت

Marfat.com

میں ہے ۔ لازماً اُس کا مالک اصلی بھی وہی ہے ۔

چونکہ جہانِ ہستی کی تمام موجودات اِس اَمر میں یکساں ہیں۔ (یعنی جہانِ تکوین میں جُملہ مخلوقات قوانینِ فطرت کی مطیع ہیں)۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کی مالکیت میں کوئی شریک نہیں ہے ۔ یہاں تک کہ مُشرکین کے خیالی معبُود بھی اُسی مالک الملوک کے مملوک اور مطیع فرماں ہیں۔

ضمناً یہ بھی ملحوظ رہے کہ " قانت " کا مادہ " قنوت " ہے ، جس کے معنٰی ہیں ایسی اطاعت جس میں عاجزی اور انکساری بھی شامل ہو۔ بقول راغب اصفہانی در مفردات :

جناب رسالت مآبؐ سے ایک حدیث مروی ہے :

کل قنوت فی القراٰن فھو طاعة

قرآن میں جہاں کہیں بھی کلمہ قنوت آیا ہے اس کے معنٰی اطاعت کے ہیں۔

اطاعت بھی دو طرح کی ہے ، تکوینی اور تشریعی۔

یہ جو بعض مفسّرین نے اِس مقام پر قانتون کے معنی " قائمون بالشھادة علی وحدانیته " کیے ہیں، درحقیقت یہ مفہوم بھی اطاعت کا ایک پہلو ہے ۔ کیونکہ وحدانیت خدا کی شہادت دینا بھی ایک قسم کی اطاعتِ خدا ہی ہے ۔[1]

آیاتِ گزشتہ اور آیاتِ آئندہ میں مبداء اور معاد کے مسائل تانے بانے کی طرح بُنے ہُوئے ہیں۔ چنانچہ زیرِ قلم آیات میں سے آیت ۲۷ میں پھر مسئلہ معاد کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ "اُسی کی ذات ہے جس نے آفرینش کا آغاز کیا اور وہ پھر اُسے لوٹائے گا اور یہ کام اُس کے لیے آسان تر ہے،" (وھوالذی یبدؤاالخلق ثم یعیدہٗ وھو اھون علیه)[2]

اس آیت میں مختصر ترین اِستدلال کے ساتھ اِمکانِ معاد کو ثابت کیا گیا ہے۔ رُوحِ بیان یہ ہے کہ :۔

جب تم یہ مانتے ہو کہ آغازِ آفرینش اُسی کی طرف سے ہے۔ تو بعد فنا " تجدیدِ حیات " جو تخلیقِ اوّل کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے، اُس پر وہ کیوں قادر نہیں ہو سکتا ؟

اعادہ تخلیق کے ، آغازِ تخلیق سے آسان تر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ابتدا میں سرے سے کسی چیز کا وجود ہی تھا اور خدا اُسے عدم سے وجُود میں لایا ہے مگر بعد فنا اعادہ کے لیے کم ازکم مواد اصلی تو موجود ہوگا۔ جس کا کچھ حصّہ مٹی میں ملا ہوگا اور کچھ حصّہ فضا میں پراگندہ ہوگا ۔ خدا کا کام تو اُن اجزائے منتشر کو صرف منظم کرنا اور اُنھیں صورت بخشنا ہی ہوگا۔

---

[1] آلوسی نے اپنی کتاب رُوح المعانی میں ، اس آیت کے تحت اِس رائے کو کسی ماقبل مفسر سے نقل کیا ہے۔

[2] فخر رازی نے تفسیر کے حوالہ سے یوں نقل کیا ہے کہ : خدا نے جناب مسیحؑ کی بغیر باپ کے پیدائش کے متعلق یہ کہا ہے " ھو علیّ ھین " اور علیّ کا مقدم ہونا حصر کی دلیل ہے ۔ یعنی یہ کام صرف میرے لیے آسان ہے نہ کہ میرے غیر کے لیے۔ اور زیرِ نظر آیت میں " ھواھون علیه " کہا ہے یہاں علیه حصر کے معنٰی نہیں دیتا مراد یہ ہے کہ جو شخص کسی کام کا آغاز کر سکتا وہ اُس کا اِعادہ بھی کر سکتا ہے۔

Marfat.com

اِس مقام پر ایک نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ کسی کام کا آسان یا سخت ہونا فکرِ انسانی کے مطابق ہے جب کہ ذاتِ لامحدود کے لیے سخت و آسان میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کام کا سخت و آسان ہونا اُس مقام پر متصور ہوتا ہے جہاں فاعل کی قدرت محدود ہو کہ وہ ایک کام کو تو آسانی سے کرسکے اور دوسرے کام کو دُشواری سے ۔ لیکن جب فاعل کی قدرت لامحدود ہو تو پھر سخت و آسان کے الفاظ بے معنیٰ ہیں ۔

درحقیقت کلمات " آسان " اور " دُشوار " کا مفہوم اضافی ہے۔ خدا کے لیے عظیم ترین پہاڑ کو اُٹھا لینا اُتنا ہی آسان ہے جتنا انسان کے لیے گھاس کے تنکے کو ۔

شاید اِسی وجہ سے آیت میں بلا فاصلہ یہ الفاظ ہیں : (ولہ المثل الاعلیٰ فی السماوات والارض) ۔
آسمانوں اور زمین میں خدا ہی کے لیے توصیف برتر ہے۔

کیونکہ آسمان و زمین میں کسی وجُود کے متعلق بھی جو وصفِ کمال تصوّر کیا جائے مثلاً : علم ، قدرت ، مالکیت عظمت جُود و کرم تو اُس کا مصداقِ اتم و اکمل خدا ہی ہے۔ کیونکہ صرف ذاتِ الٰہی ہی لامحدود ہے۔ باقی ماسوا اللہ محدود ہے۔ علاوہ بریں خدا کے اوصاف ذاتی ہیں اور دیگر ہر شے کے اضافی اور عارضی ہیں۔ نیز یہ کہ جُملہ کمالات کا منبع اصلی وہی ہے۔

ہماری زبان (ہر زبان جو انسان بولتا ہے) روزمرہ کے دُنیاوی مطالب کے افہام و تفہیم اور مقصد بر آری کے لیے ہے کوئی زبان بھی ماورائی حقائق اور ذاتِ باری تعالیٰ کے اوصاف بیان نہیں کرسکتی جس طرح کہ ہم نے کلمہ " اھون " کو دیکھا۔

جُملہ مافوق بھی اِن جُملوں کی مانند ہے جیسے سُورۂ اعراف آیہ ۱۸۰ میں ہے :

وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بہا

خدا کے لیے بہترین نام ہیں اسے ان ناموں سے پکارو ۔

یا جیسے سورۂ شُوریٰ کی آیت ۱۱ میں آیا ہے :

لیس کمثلہ شیءٌ

کوئی شے بھی دُنیا میں اُس کی مِثل نہیں ہے ۔

آیت کے اختتام پر بہ عنوان تاکید یا بطور دلیل فرمایا گیا ہے : اور وہی عزیز و حکیم ہے (وھو العزیز الحکیم) ۔
وہ عزیز اور شکست ناپذیر ہے ۔ لیکن قدرتِ نامحدود کے ہوتے ہوئے بھی وہ کوئی کام بے حساب انجام نہیں دیتا۔ اُس کے تمام کام حکمت پر مبنی ہیں ۔

❊ ❊ ❊

گزشتہ آیات میں توحید و معاد کے متعلق کچھ دلائل بیان کرنے کے بعد ایک مثال کی صُورت میں نفیٔ شرک کی دلیل دی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے : خدا خود تمہارے ہی حالات سے تمہارے لیے ایک مثال دیتا ہے (ضرب لکم مثلاً من انفسکم) ۔

وہ مثال یہ ہے کہ اگر تمہارے غلام اور خادم ہوں تو کیا یہ لوگ اس روزی میں جو ہم نے تمہیں دی ہے ، تمہارے

Marfat.com

شریک ہو جائیں گے؟ (هل لكم من ما ملكت ايمانكم من شركآء في ما رزقناكم) ۔
اس طرح کی شرکت کہ تم دونوں ہر طرح سے مساوی ہو (فانتم فيه سواء) ۔ اور اس طرح بے تکلف شریک ہوں کہ تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے مال میں تصرف کریں گے ۔ جس طرح کہ تم اپنے آزاد شرکا (یعنی رشتہ داروں) سے اپنے مال اور میراث کے متعلق ڈرتے ہو ۔ (تخافونهم كخيفتكم انفسكم) ۔ یا یہ کہ تمہارا یہ حال ہو جائے کہ تم اپنے مال میں اُن کی اجازت کے بغیر تصرف نہ کر سکو ۔

(مثال کا نتیجہ یہ ہے کہ) جب کہ تم اپنے غلاموں کی " جو تمہاری مجازی ملکیت ہیں " اپنے کاروبار اور اموال میں اس طرح شرکت کو نادرست سمجھتے ہو تو پھر ان مخلوقات کو جو خدا کی حقیقی ملکیت ہیں اُس کا شریک کس طرح سمجھتے ہو ؟ یا جب تم پیغمبروں کو (مثلاً مسیحؑ کو) یا ملائکہ کو ، یا ایسی مخلوق کو جیسے جنّات ہیں یا پتھر یا لکڑی کے بُتوں کو خدا کا شریک سمجھتے ہو تو بتاؤ کہ یہ تمہارا کیسا غیر منطقی اور غلط فیصلہ ہے ؟ یہ مجازی غلام جو ممکن ہے کہ بہت جلد آزاد ہو جائیں اور تمہاری ہی صف میں آکھڑے ہوں (چنانچہ اسلام میں اس مُساوات کی بُنیاد ڈال دی گئی ہے) جب تک غلام ہیں اپنے مالک کے مُساوی نہیں ہو سکتے اور اُس کے اختیارات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتے ۔

تو ــــ پھر تم نے اُن حقیقی غلاموں کو کیونکر خدا کا شریک سمجھ لیا ہے کہ جو اپنی ذات اور وجُود کے لیے خدا کے محتاج ہیں اور خدا کے ساتھ اُن کی احتیاج کا تعلق کبھی منقطع نہیں ہو سکتا ۔ اُن کے پاس جو کچھ ہے اُسی کا دیا ہوا ہے اور اُس کے فضل کے بغیر وہ ہیچ و پُوچ ہیں ۔

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں اُن کلمات کی طرف اشارہ ہے جو مشرکینِ قریش مراسم حج کے وقت جب " لبّیک " کہتے تھے تو کہا کرتے تھے ۔ وہ کہتے تھے :

لبّيك ، اللّهم لاشريك لك ، الا شريكاً هو لك تملكه وما ملك

لبّیک ، اے خدا ! تیرا کوئی شریک نہیں ہے ، مگر تیرا ایک شریک ہے جس کا تُو مالک ہے اور اُس کی املاک کا مالک بھی ہے[۱]

یہ امر بدیہی ہے کہ اس آیت کی یہ شانِ نزول دیگر آیات کی طرح اس کے معنیٰ کو محدُود نہیں کرتی ۔ ہر حال میں یہ آیت تمام مشرکین کے لیے جواب ہے جو اُن ہی کی زندگی سے لیا گیا ہے ، جس کا مدار غلامی کے رواج پر تھا ۔ اس آیت میں اس دلیل سے اُن پر اتمامِ حُجّت کی گئی ہے ۔

کلمہ " ما رزقناكم " کے استعمال سے مقصود یہ ہے کہ تم حقیقت میں نہ تو اِن غلاموں کے حقیقی مالک ہو اور نہ اُس مال کے جو تمہارے پاس ہے کیونکہ اِن سب چیزوں کا مالکِ حقیقی خدا ہے ۔ لیکن اس علم کے باوجود تم اس بات کے لیے تیار نہیں ہو کہ اپنے مجازی مال و دولت کو ایسے افراد کے سپرد کر دو جو بطور مجاز تمہارے مملوک کہلاتے ہیں اور اُنہیں اپنی دولت میں شریک سمجھو ۔ حالانکہ عام فطرتِ انسانی کے نقطۂ نگاہ سے یہ امر محال نہیں ہے ۔ کیونکہ اگر غلام پر اعتبار ہو تو

[۱] تفسیر المیزان و تفسیر مجمع البیان و تفسیر نور الثقلین ، زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

اُسے مال میں حق تصرّف دیا جا سکتا ہے۔

لیکن خدا اور مخلوقات میں خالق اور مخلوق کا ناقابل تغیّر فرق ہے۔ یہ امر محال ہے کہ مخلوق، خالق کے اختیارات میں شریک ہو سکے۔

علاوہ بریں ـــ جب کسی ذات یا شئے کی پرستش کی جاتی ہے تو اُس کے دو ہی سبب ہوتے ہیں۔ یا تو اُسے اُس کی عظمت کی وجہ سے پُوجا جاتا ہے۔ یا بہ تمنّائے سُود یا بخوفِ زیاں (جو اُس سے اِنسان کو پہنچ سکتا ہے) مگر اِن خُود ساختہ معبودوں میں تو اِن میں سے ایک بات بھی نہیں۔[۱]

آیت کے اخیر میں اِس مسئلے پر زیادہ غور و خوض کرنے کے لیے بطور تاکید فرمایا گیا ہے: ہم اِس طرح اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں اپنی آیات کی تشریح کرتے ہیں (كذالك نفصّل الآيات لقوم يعقلون)۔

البتہ ـــ تمہاری ہی زندگیوں سے واضح مثالوں کا ذکر کرکے ہم تمہیں بہ تکرار حقائق سمجھاتے ہیں تاکہ تم اُن پر غور کرو۔ کم از کم اتنا تو سمجھو کہ جو بات تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ ربُّ العالمین کے لیے بھی پسند نہ کرو۔

٭　٭　٭

مگر یہ آیاتِ بیّنات اور اِس قسم کی واضح اور روشن مثالیں صاحبانِ فکر کے لیے ہیں۔ نہ کہ بے دانش نفس پرست ظالموں کے لیے، جن کے دِلوں پر جہل و نادانی کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ایامِ جاہلیّت کی خرافات اور تعصبات نے اُن کی فضائے فکر کو تیرہ و تار کر دیا ہے۔ اِس لیے آیہ بعد میں یہ اضافہ کرتی ہے: ظالم، علم و آگاہی کے بغیر اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرتے ہیں۔ اُن کا عمل کسی دلیل کے تحت نہیں ہے (بل اتّبع الّذين ظلموا اهواءهم بغير علم)۔

خدا نے ایسے لوگوں کو اُن کی بداعمالیوں کی وجہ سے وادیٔ ضلالت میں پہنچا دیا ہے۔ بھلا اُن لوگوں کی ہدایت کون کر سکتا ہے جنہیں خدا نے گمراہ کیا ہو (فمن يهدي من اضلّ الله)۔

آیت نمبر ۲۹ میں "اشركوا" کے بجائے "ظلموا" استعمال ہوا ہے۔ اِس میں نکتہ یہ ہے کہ "شرک" بجائے خود بہت بڑا ظلم ہے۔ یہ خالق پر ظلم ہے۔ کیونکہ مشرکین خدا کی مخلوق کو اُس کا ہم پایہ بنا دیتے ہیں۔

نیز یہ خلقِ خدا پر بھی ظلم ہے۔ کیونکہ مشرکین اُنھیں راہِ توحید سے جو درحقیقت راہِ خیر و سعادت ہے، گمراہ کرتے ہیں۔

"شرک" اپنی ذات پر بھی ظلم ہے۔ کیونکہ مُشرک اپنی زندگی کو برباد کرکے گمراہی میں سرگرداں رہتا ہے۔

ضمناً ـ کلمہ "ظلموا" کا استعمال مُؤخّر جملہ کے لیے بطور مقدمہ ہے۔ یعنی اگر خدا نے اُن ظالموں کو راہِ حق سے گمراہ کر دیا ہے تو یہ اُن کے ظلم کا نتیجہ ہے۔ جس طرح کہ ہم سُورۂ ابراہیم کی آیت ۲۷ میں پڑھتے ہیں:

ويضلّ الله الظالمين
خُدا ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے۔

---

[۱] بعض مفسّرین نے جملہ "تخافونهم كخيفتكم انفسكم" کی کچھ اور تفسیر کی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ اِن خُود ساختہ معبودوں میں اِتنی قدرت نہیں ہے کہ تم اُن سے ڈرو۔ اتنا بھی نہ ڈرو جتنا ایک دُوسرے سے ڈرتے ہو۔ اِس سے زیادہ ڈرنے کا کیا موقع ہے کہ ہم نے جو تفسیر ابتدا میں کی ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔

Marfat.com

یہ مسلّم ہے کہ خدا جن لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دے تو اُن کا کوئی بھی یاور و ناصر نہ ہوگا (وما لهم من ناصرین)۔ خُدا نے اِس عنوان سے گروہِ ظالمین و مُشرکین کی منحوس سرنوشت کو بیان کیا ہے۔ اور جیسا کہ فرمایا گیا ہے، وہ اِسی کے مستحق ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ عظیم ترین مظالم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اِنہوں نے اپنی عقل و فکر سے دست کش ہوکر آفتابِ علم و دانش کی طرف سے مُنہ موڑ لیا ہے اور ظلمتِ ہوا و ہوس کی طرف رُخ کرلیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ فطری امر ہے کہ خدا اُن سے اپنی توفیق سلب کرلے اور اُنھیں کفر و شرک کی تاریکیوں میں چھوڑ دے جہاں اُن کا کوئی یاور و ناصر نہ ہوگا۔

Marfat.com

۳۰۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ڎ

۳۱۔ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ۙ

۳۲۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۰۔ تو اپنا رُخ پروردگار کے خالص دین کی طرف کرے کیونکہ یہ فطرت ہے کہ جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی آفرینش میں کوئی تغیّر اور تبدیلی نہیں ہوتی اور یہی محکم و استوار دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

۳۱۔ تم اسی خدا کی طرف رجوع کیے رہو، اُس سے ڈرتے رہو، نماز قائم کرتے رہو اور مُشرکین میں سے نہ ہو جانا۔

۳۲۔ (اور نہ اُن لوگوں میں سے ہونا) جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقوں میں بٹ گئے۔ (تعجب یہ ہے کہ) ہر گروہ اُسی سے (وابستہ ہے اور) خوش ہے

Marfat.com

جو کچھ اُس کے پاس ہے۔

تفسیر

اِس مقام تک، مشاہدۂ کائنات سے توحید و خداشناسی کا سبق حاصل کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس عالمِ مادی کے ماوراء ایک ایسی ذات ہے جو مبداءِ علم و قدرت ہے، بہت سی بحثیں ہوئی ہیں اور اس سُورۃ میں جو آیاتِ توحید سے متعلق آئی ہیں اُن سے بھی یہی سبق حاصل کیا ہے۔

اَب جو نئی آیات زیرِ بحث ہیں اُن میں سے پہلی آیت میں اُس توحید کا ذکر ہے جو عالمِ فطرت میں موجود ہے یعنی اُسی مسئلۂ توحید کو مشاہدۂ عالمِ مظاہر کے بجائے مشاہدۂ نفس، مشاہدۂ باطن اور کیفیتِ عالمِ وجدان کے زاویہ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا کے پاک اور خالص دین کی طرف رُخ کرو (فاقم وجھك للدّین حنیفًا)۔

کیونکہ یہی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا کے عمل تخلیق میں تغیر نہیں ہوتا (فطرت اللّٰہ الّتی فطر النّاس علیھا لا تبدیل لخلق اللّٰہ)۔

اور یہی محکم و اُستوار دین و آئین ہے (ذالك الدّین القیّم)۔

مگر اکثر لوگ اِس حقیقت کو نہیں جانتے (ولٰکنّ اکثر النّاس لا یعلمون)۔

"وجه" کے لغوی معنی ہیں "صورت" مگر یہاں صورتِ ظاہری نہیں بلکہ صورتِ باطنی اور "رُوئے دل" مراد ہے۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ تم دین کی طرف اپنا مُنہ کر لو بلکہ قلبی توجہ مطلوب ہے۔ توجہ قلبی کو بطور استعارہ "وجه" کہا گیا ہے کیونکہ یہ جسم کا سب سے اہم عضو ہے۔

"اقم" کا مادہ "اقامه" ہے۔ جس کے معنی ہیں صاف اور مستقیم کرنا اور کھڑا کرنا۔

"حنیف" کا مادہ "حنف" ہے۔ جس کے معنی ہیں "باطل سے حق کی طرف میلان" یا "کجی سے راستی کی طرف" اس کی ضد "جنف" ہے یعنی راستی سے گمراہی کی طرف میلان۔

"دینِ حنیف" وہ دین ہے جو تمام انحرافات، خرافات، کجی اور گمراہیوں سے جُدا ہوا اور راستی اور درستی کی طرف مائل ہوا ہے۔

مجموعی طور پر اس جُملہ کے یہ معنی ہیں کہ اپنی توجہ دائماً اُس دین کی طرف رکھو جو ہر قسم کی کجی اور ناراستی سے پاک ہے وہی آئینِ اسلام اور وہی خدا کا پاک اور خالص آئین ہے[1]۔

اِس آیت میں بطور تاکید یہ سمجھایا گیا ہے کہ "دینِ حنیف" جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہے، وہ دین ہے جو خدا نے

---

[1] "الدّین" میں الف و لام عہد کے معنی دیتا ہے۔ یعنی وہی دین و آئین جس کی تبلیغ پر پیغمبر اسلام مامور تھے۔

Marfat.com

تمام بنی نوعِ انسان کی سرشت میں ودیعت کیا ہے اور فطرتِ انسانی جاودانی اور تغیر ناپذیر ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

اِس آیت میں اور بھی چند حقایق ہیں :

۱۔ صرف خدا شناسی ہی نہیں بلکہ دین و آئین بطورِ کلّی تمام جہات سے ایک امر فطری ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ جب ہم حقیقتِ توحید پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُمورِ تکوینی اور اُمورِ تشریعی کے درمیان ہم آہنگی ہونی چاہیئے مُراد یہ ہے کہ احکامِ شریعت فطرتِ انسانی کے مطابق ہوں اور انسان کی فطرت سے بھی شریعت کے قوانین کی تائید ہوتی ہو۔

اِس مطلب کو بالفاظ دیگر یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ "تکوین" (فطرتِ انسانی) اور "تشریع" (اُمورِ شرعی) دونوں قوی بازوؤں کی مانند ہیں، جو اعمالِ انسانی میں ہم آہنگی کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی امرِ شریعت ایسا ہو جو فطرتِ انسانی کے خلاف ہو۔ بخلاف اس کے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ انسان کی فطرتِ سلیم میں کوئی میلان ہو اور شریعت اُس کی مخالفت کرے۔

اِس میں شک نہیں کہ "شریعت" فطرتِ انسان کی عناں گیر رہتی ہے اور اسے منحرف راستوں سے روکنے کے لیے اُس پر حدود و قیود اور شرائط عائد کرتی رہتی ہے۔ مگر سلامت رو فطری خواہشات کی ہرگز مخالفت نہیں کرتی بلکہ اُنہیں مشروع طریقوں سے پُورا کرنے کی ہدایت کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو "تکوین" اور "تشریع" میں تضاد پیدا ہو جائے، جو اساسِ توحید سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ خدا ایسے کام نہیں کرتا جو ایک دوسرے کے ضد و نقیض ہوں۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اُس کا فرمانِ تکوینی تو یہ ہو کہ یہ کام کر اور فرمانِ تشریعی یہ ہو کہ نہ کر۔

۲۔ دین اپنی خالص اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک صُورت میں انسان کے تحت الشعور میں موجود ہے۔ انسان کا راہِ مستقیم سے منحرف ہونا ایک عارضی امر ہے۔ اس بناء پر پیمبروں کا فرض یہ ہے کہ وہ انسان کو ان عارضی الخرافات سے روک دیں اور اُس کی اصلی فطرت کو اظہار کا موقع فراہم کریں۔

۳۔ نیز جملہ "لاتبدیل لخلق اللّٰہ" اور اُس کے بعد جملہ "ذالك الدین القیم" مذہب اور دین کے فطری ہونے اور فطرتِ الہٰی کے عدمِ امکانِ تغیر پر تاکید ہے۔ ہر چند کہ بہت سے لوگ کافی استعداد نہ ہونے کی وجہ سے اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

اِس نکتے کی طرف بھی توجہ لازم ہے کہ کلمہ "فطرت" کا مادہ "فطر" (بوزن بذر) ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو اُس کے طول سے چیرنا۔ یہ کلمہ مجازی طور پر بمعنی خلقت استعمال ہوتا ہے۔ گویا کہ موجوداتِ عالم کی آفرینش کے وقت پردۂ عدم شگافتہ ہوا اور مخلوقات ظاہر ہو گئیں۔

بہرحال جب انسان روزِ اوّل عالمِ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو اُسی دن سے یہ نُورِ الٰہی اُس کے دل میں چمکنے لگتا ہے ہم نے جو کچھ سطورِ بالا میں کہا ہے اُس کی وہ متعدد روایات تائید کرتی ہیں جو اِس آیت کی تفسیر میں مذکور ہوئی ہیں۔

Marfat.com

ہم اُن کا اس وقت ذکر کریں گے جب اس آیت کے نکات لکھیں گے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی بیان کریں گے کہ "توحید" ایک فطری شے ہے۔

٭ ٭ ٭

اِس کے بعد کی آیت میں یہ اضافہ ہے کہ دینِ حنیف یعنی خالص و فطری دین کی طرف تمہاری توجہ اس حال میں ہے کہ تم خدا کی طرف لوٹو گے (منیبین الیه)۔ تمہارے وجود کی اصل و اساس توحید پر ہے اور آخر کار تم اسی بُنیاد کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

کلمہ "منیبین" کا مادہ "انابه" ہے جس کے وضعی معنیٰ ہیں "پھر لوٹ آنا"۔ اِس مقام پر اس لفظ کا مفہوم ہے "خدا کی طرف لوٹ آنا" یا "توحیدی فطرت کی طرف لوٹ آنا"۔ یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ ہمیشہ ایسے اسباب پیدا ہونے کا امکان ہے جو انسان کو عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مرکز توحید سے منحرف کر دیں۔ اِس حالت میں انسان کو خدا کی طرف لوٹنا چاہیئے اور جتنی مرتبہ بھی اس عمل کی تکرار ہو گی، فطرتِ توحید محکم و استوار ہوتی جائے گی اور اسباب انحراف کمزور اور ضعیف ہوتے جائیں گے یہاں تک کہ ہمیشہ کے لیے انسان کا عقیدۂ توحید مستحکم ہو جائے گا اور وہ "فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا" کا مصداق ہو جائے گا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ "اَقِمْ وَجْهَكَ" میں صیغہ واحد ہے اور "منیبین" میں صیغہ جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا حکم اگرچہ مفرد صورت میں ہے اور اس کے مخاطب جناب رسالت مآبؐ ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس سے تمام مسلمان اور مومنین مراد ہیں۔

"انابت" اور "بازگشت" کے ذکر کے بعد "تقویٰ" کا حکم ہے کہ جو تمام اوامر و نواہی کا جامع ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا سے پرہیز کرو (واتقوه) یعنی اُس کے احکام کی مخالفت سے پرہیز کرو۔

اُس کے بعد تمام اوامر میں سے سب سے زیادہ زور اور تاکید نماز پر ہے۔ فرمایا گیا ہے: نماز قائم کرو (واقیموا الصلوٰة)۔

کیونکہ نماز ہر جہت سے شرک کے ساتھ مبارزہ کا بہترین لائحہ عمل ہے اور عقیدۂ توحید اور ایمان باللہ کو مستحکم کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

اِس لیے ذکرِ صلوٰۃ کے بعد ہی شرک کے بارے میں فرمایا گیا ہے: مشرکین میں سے مت ہو جانا (ولا تکونوا من المشرکین)۔ کیونکہ "شرک" عظیم ترین گناہ اور اکبر کبائر ہے۔ ممکن ہے روزِ حساب خدا ہر قسم کے گناہوں کو بخش دے مگر وہ گناہِ شرک کو کبھی نہ بخشے گا۔ جیسا کہ سورۂ نسا کی آیت ۴۸ میں مذکور ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

خدا گناہِ شرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ لیکن اگر وہ چاہے گا تو اس سے کمتر گناہوں کو بخش دے گا۔

Marfat.com

یہ واضح ہے کہ اس آیت میں چار احکام آئے ہیں (یعنی توبہ و بازگشت بسوئے خدا، تقویٰ، اقامت نماز اور پرہیز از شرک) یہ سب مسئلۂ توحید اور اُس کے آثارِ عملی پر تاکید کے لیے ہیں۔

❖ ❖ ❖

زیر نظر آیت میں علامات و نتائج شرک میں سے ایک کو نہایت مختصر اور پُرمعنیٰ عبارت میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ وہی لوگ جنہوں نے اپنے دین کو پارہ پارہ کر لیا ہے اور مختلف فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم ہوگئے ہیں: (من الذین فرقوا دینهم وکانوا شیعاً)۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ اُن فرقوں میں باہم جو تضاد و اختلاف ہے، اس کے باوجود ہر گروہ اپنے عقاید اور مسلمات سے خوش ہے (کل حزب بما لدیهم فرحون)۔

یہ مُسلّم ہے کہ علاماتِ شرک میں سے ایک پراگندگی اور باہمی تفرقہ بھی ہے کیونکہ مختلف معبودوں کی پرستش سے متفاوت عقاید اور منتشر روشِ فکر پیدا ہوتی ہے اور یہ چیزیں باہمی تفرقہ اور پراگندگی کا موجب ہو جاتی ہیں۔ شرک کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ہوائے نفس، تعصب، کبر، خودخواہی اور خودپسندی اُس کے سایہ بسایہ رہتی ہے۔ اس لیے کسی قوم میں اتحاد و وحدت صرف خدا پرستی، تواضع و ایثار اور عقلی روش ہی کے تحت باقی رہ سکتی ہے۔

منطقِ استخراجی کے اصول سے ہمیں جہاں بھی اختلاف اور پراگندگی نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہاں کسی نہ کسی قسم کا شرک ضرور موجود ہے۔ اخذ نتائج کے اعتبار سے اِس مضمون کو بصُورت تکرار یوں کہا جا سکتا ہے کہ شرک کا نتیجہ کسی قوم میں تفرقہ، تضاد، ذہنی توانائیوں کا ضیاع اور آخر کار اُس قوم کا ضعف و ناتوانی اور تباہی ہے۔

لیکن یہ کہ مشرکین اور منحرفین راہِ راست میں سے ہر گروہ نے اپنے لیے جو راہ انتخاب کر لی وہ اسی کو حق سمجھتا ہے اور اور اُسی سے خوش ہے۔ اُن کی یہ روش کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ ہوا و ہوس انسان کی دلی خواہشات کو اُس کی نظر میں مزین کر کے جلوہ گر کرتی ہے اور خواہشات کی اس جلوہ آرائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس طریقِ حیات سے جو اس نے اختیار کر لی ہے زیادہ دل بستگی اور راحتِ قلب محسوس ہونے لگتی ہے۔ خواہ وہ راہِ عمل قطعی گمراہی ہی کیوں نہ ہو۔

جب انسان کی چشمِ بصیرت پر خواہشاتِ نفس کا پردہ پڑ جاتا ہے تو وہ چہرۂ حقیقت کو اُس کی اصل شکل میں نہیں دیکھ سکتا اور حُب و بُغض سے غیر جانبدار ہو کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

سُورۂ فاطر آیت ۸ میں یوں مذکور ہے:

افمن زین له سوء عمله فراٰه حسناً

وہ شخص جس کی نظر میں اُس کے اعمالِ قبیح مُزیّن ہوگئے ہیں اور وہ اُسے حسین نظر آتے ہیں، کیا وہ اُس شخص کی مانند ہے جو راہِ خدا میں قدم اُٹھاتا ہے اور حقائق کو اصل صورت میں بے نقاب دیکھتا ہے؟

❖ ❖ ❖

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ **توحید انسان کی داخلی قوی قوتِ جاذبہ ہے:** جس طرح کہ دلائلِ عقلی و منطقی انسان کے طرزِ عمل کو معین کرتے ہیں اسی طرح اُس کے نفس میں ایسے جذبات اور تمائلات موجود ہیں کہ جو کبھی تو شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اُس کے طرزِ عمل کا تعین کرتے ہیں۔

نسلِ انسانی کے بقا کا راز ہی یہ ہے کہ انسان مسائلِ حیات میں ہمیشہ ہی دلائلِ عقلی و منطقی سے کام نہیں لیتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو بہت سے مقاصدِ زندگی مُعطّل ہو کے رہ جائیں۔ مثلاً اگر انسان غذا کھانے یا آمیزشِ جنسی کے لیے طبّی اور منطقی دلائل دینے لگے۔ یعنی غذا کھانے سے "بدل ما یتحلل" ہوتا ہے اور توالد و تناسل بقائے نسلِ انسانی کا باعث ہے، تو اُس کی نوع اَب سے پہلے کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ لیکن جنسی جذبہ و جبلّت اور غذا کھانے کی خواہش خواہ نہ خواہ اُس سے یہ اعمال سرزد کراتی ہے اور یہ مقاصد جس قدر بقائے حیاتِ فرد اور بقائے نوع کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں یہ جذبات بھی اتنے ہی زیادہ قوی ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ کشش اور میلان دو قسم کا ہے۔ کبھی تو غیر شعوری ہوتا ہے۔ جیسے کہ حیوانات عقل و فکر کے بغیر ہی غذا اور جنسِ مخالف کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اور کبھی یہ میلان شعوری ہوتا ہے یعنی یہ جبلّت عقل و شعور سے کام لے کر اپنا عمل کرتی ہے۔

قسمِ اوّل کے جذبات کو "جبلّت" اور قسمِ دوم کو "فطرت" کہتے ہیں۔

خدا پرستی اور اُس کی ذات کی طرف میلانِ قلب ہر شخص کی فطرتِ اصلیہ ہے۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات ہماری اِس بات کو ایسا اِدّعا سمجھیں جو خدا پرست لوگوں کی طرف سے تراش لیا گیا ہے۔ مگر ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جن سے نہ صرف انسان کا میلان ذاتِ الٰہی کی طرف فطری ثابت ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اپنے تمام اصولوں کے ساتھ ایک فطری امر ہے، مثلاً:

(۱) انسان کی پُر ہنگامہ طویل تاریخ میں ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کا مذہبی اعتقاد اور ماورائے فطرت طاقت پر ایمان ضرور رہا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ فطرتِ انسانی ہے۔ کیونکہ اگر اعتقاد و ایمان باللہ صرف انفرادی رجحان اور عادت ہوتا اور یہ جذبہ عمومیت نہ رکھتا اور نہ دائمی اور ہمیشگی ہوتا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ یہ عارضی واقعہ ہے۔ مگر اس کی عمومیت اور دوام اس کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔

بڑے بڑے مؤرخین کی رائے ہے کہ اُنھوں نے جہاں تک انسانی تاریخ کا کھوج لگایا ہے اور زمانۂ ماقبل تاریخ کا جس حد تک انکشاف ہوا ہے، اُنھوں نے انسانی معاشرے میں "لادینیت" کا بجز استثنائی صورت کے کہیں نشان نہیں پایا۔

عصرِ حاضر کا مشہور مؤرخ ویل ڈیورنٹ کہتا ہے:

Marfat.com

اگر ہم مذہب کی یہ تعریف کریں کہ وہ "مافوق الطبیعت" قوتوں کی پرستش کا نام ہے۔ تو ابتدائے بحث ہی سے یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ بعض ابتدائی اقوام کا ظاہراً کوئی مذہب نہ تھا۔

اس کے بعد وہ اس قسم کی اقوام کی مثالیں دے کر لکھتا ہے کہ یہ مثالیں نادرات میں سے ہیں۔ اور یہ قدیم اعتقاد مطابق حقیقت ہے کہ :-

"دین ایک ایسا مظہر ہے جو ہر انسان کی فطرت سے اُبھرتا ہے۔"

اس کے بعد وہ یہ اضافہ کرتا ہے کہ ایک فلاسفر کی نظر میں مذہب کے وجود کا مسئلہ، نفسیات اور تاریخ کے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ وہ اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ تمام ادیان میں لغو اور خلافِ عقل عقائد موجود ہیں۔ بلکہ وہ اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ جب سے تاریخ انسانی شروع ہوتی ہے۔ اُسی وقت سے "دین" بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔

اختتامِ کلام پر وہ اپنی گفتگو کو اس پُرمعنی سوال پر ختم کر دیتا ہے:

"یہ تقویٰ جسے کسی طرح بھی انسان کے دل سے محو نہیں کیا جا سکتا اُس کا منبع کہاں ہے ؟" [1]

یہی مؤرخ اپنی ایک اور تحقیق میں (جو اُس نے ادیان ماقبل تاریخ کے متعلق کی ہے) یوں لکھتا ہے :

اگر ہم ماقبل تاریخ میں وجود مذہب کا تصور پیشِ نظر نہ رکھیں تو ہم اُس کے وجود کو موجودہ تاریخی دَور میں بھی نہیں سمجھ سکتے [2]

ماقبل تاریخ انسانوں کے متعلق آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں، اُن سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور عالم علمِ معاشرت SOCIOLOGIST سموایل کینگ اپنی کتاب بنام "جامعہ شناسی" میں لکھتا ہے:

موجودہ نسلِ انسانی کے اسلاف بھی یقیناً کسی مذہب کے معتقد تھے۔

وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اُن آثار کو پیش کرتا ہے جو آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے منکشف ہوئے ہیں کہ وہ :-

اپنے مُردوں کو ایک مخصوص وضع سے دفن کرتے تھے اور اُن کے ساتھ ایسی اشیاء بھی رکھتے تھے جو اُن کے عقیدے کے مطابق بروز قیامت کام آئیں [3]

بہر حال کوئی محقق بھی مذہب کو انسان کی تاریخِ حیات سے جُدا کرنا قبول نہیں کرتا۔

(۲) آج کی دُنیا کے مشاہدے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے کی بعض مُستبد طاقتوں نے اپنی پُوری کوشش اور طاقت صرف کرکے لوگوں کے دلوں سے مذہب کو محو کرنا چاہا۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئیں۔

چنانچہ ہم خُوب جانتے ہیں کہ رُوس کی برسرِ اقتدار پارٹی، ساٹھ برس سے بغیر کسی وقفے کے مسلسل پروپیگنڈے اور معاشرے کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے جملہ وسائل سے کام لے کر یہ کوشش کر رہی ہے کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں سے مذہبی

---

[1] تاریخ تمدن، جلد اول صفحہ ۸۰ تا ۸۹ -

[2] تاریخ تمدن، جلد اول صفحہ ۱۵۶ -

[3] جامعہ شناسی، صفحہ ۱۹۲ -

Marfat.com

اعتقادات کو بالکل ختم کر دے۔ لیکن اس آہنی پردے سے کبھی کبھی جو خبریں پھوٹ نکلتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام پروپیگنڈے اور سخت گیری کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ حالیہ دنوں میں رُوس کی بعض ریاستوں میں مذہبی جوش و خروش زیادہ نظر آنے لگا ہے۔ جس نے حکومت کے حکام بالا کو حیران کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی روز یہ سختی اور گلوگیری ختم ہو گئی تو مذہب پھر اپنی جگہ لے لے گا۔ یہ امر اس بات کا شاہد ہے کہ مذہب ایک فطری چیز ہے۔

(۳) علاوہ بریں ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ تجزیہ نفسی PRYCHO ANALYST نے ابعادِ رُوحِ انسانی PRYCHO DIMINSIMS کے بارے میں جو انکشافات کیے ہیں وہ بھی مذہب کے فطری ہونے پر شاہد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نفسِ انسانی کے مختلف ابعاد کے متعلق تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس میں ایک جوہر قدسی یا یزدانی بھی ہے جسے جبلت مذہبی کہنا چاہیئے۔ بعض ماہرینِ نفسیات اس امر کے قائل ہیں کہ انسان میں "راستی، علم، نیکی اور زیبائی کے جذبات کا سرچشمہ یہی جوہر قدسی ہے۔

علمائے نفسیات کا قول ہے کہ نفسِ انسانی میں اصولی اور اساسی محرکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ حسِ راستی: انسان میں یہ حس ہر قسم کے علوم و فنون کا سرچشمہ ہے۔ یہی انسان کو رموزِ کائنات کی تحقیق اور انکشاف پر آمادہ کرتی ہے۔

۲۔ حسِ نیکی ETHICAL INSTINCT یہ حس انسان کو فضائل اخلاق مثلاً عدالت، شجاعت، قربانی اور ان جیسے دیگر اُمور کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان میں بذاتِ خود یہ صفات نہ ہوں تو وہ ایسے فضائل کے حاملین کو ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی طینت میں نیکی کا میلان موجود ہے۔

۳۔ حسِ زیبائی (جبلتِ حُسن) AESTHETIC INSTINCT یہ جبلت انسان کو فنونِ لطیفہ، جمالیات، ادبیات، ذوقی اور وجدانی اُشواق کی طرف مائل کرتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد اور معاشرے کو متغیر کر دیتی ہے۔

۴۔ حسِ مذہبی RELIGIOUS INSTINCT یعنی یہ ایمان رکھنا کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اُس کی عبادت اور حمد و ثنا کرنا۔ اس موضوع پر کوڈن ٹائم نے جو مقالہ سپردِ قلم کیا ہے اُس میں وہ لکھتا ہے:

سگمنڈ فرائڈ نے انسان کے لاشعور کے متعلق جو تحقیقات شروع کی تھیں (جسے اَلفرڈ ایڈلر اور جنگ نے ترقی دی) اُس سے علم نفسیات کے دائرہ علم میں ایسی قوتیں آئی ہیں جو انسان کے نفس کی گہرائیوں میں مستور ہیں، جو ادراکِ حقائق کرتی اور ماوراء عقل رُموز کی معرفت حاصل کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ انسان میں "حسِ دینی" موجود ہے اور اس کا راز کیا ہے۔ ہر چند کہ ابھی اس (حسِ دینی) کے متعلق ماہرینِ نفسیات میں اتفاق نہیں ہے، تاہم اس مسئلے پر غور و فکر کا سلسلہ جاری ہے۔ اور مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے نفسیات "حسِ دینی" کی اس تعریف پر متفق ہیں جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"حسِ دینی" نفسِ انسانی کے فطری اور مستقل عناصر اولیہ میں سے ہے۔ یہ احساس نفس کا حقیقی اور زیبا ترین حصہ ہے۔

Marfat.com

نفس پر جو دوسری کیفیات طاری ہوتی ہیں یہ اُن میں سے کسی سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس احساس کا چشمہ لاشعور کی گہرائی سے پھوٹتا ہے۔

انسان کے اندر جو ذوقِ جمال، نیکی اور راستی کا رجحان موجود ہے اس کی علت بھی یہی احساس ہے جسے مفہوم دینی یا زیادہ صحیح الفاظ میں مفہوم مُقدّس کہنا چاہیئے۔

اگر ان چاروں احساسات بالا کو "مقولاتِ اربعہ" کہا جائے تو حس دینی ہی ایک ایسا مقولہ ہے، جس میں باقی ہر سہ احساسات مع اپنی خصوصیات کے شامل ہیں[1]

تانہ گی۔ دوکینٹین[2] کے محققانہ مقالہ کا جو تلخیص اور ترجمہ کیا گیا ہے، اُس میں مذکور ہے:

جس طرح کہ عصرِ حاضر کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے کہ عالمِ مادی میں طول، عرض و عمق کے علاوہ ایک چوتھا بُعد "زمانہ" یا "مکان" بھی بیان کیا جاتا ہے[3]

جو فضا کے ابعاد ثلاثہ سے منفرد ہوتے ہوئے اُن تین ابعاد کا جامع بھی ہے۔

اسی طرح اس زمانے کے ماہرینِ نفسیات نے نفسِ انسانی میں حسِّ جمال، حسِ خیر اور حسِ راستی کے علاوہ ایک حسِ قدسی یا یزدانی (کہ جسے حقیقت میں نفسِ انسانی کا بُعدِ چہارم کہنا چاہیئے) کو دوبارہ ثابت کیا ہے[4]

نفس کا یہ بُعدِ چہارم (یعنی حسِ قدسی) باقی احساسات سے منفرد ہے۔ ممکن ہے احساسات سہ گانہ اسی سے پیدا ہوئے ہوں۔

(۴) انسان کی یہ جبلت بھی کہ وہ مصائب کے طوفان میں اپنی مشکلات کے حل اور شدائدِ زندگی سے نجات حاصل کرنے کیلئے کسی نادیدہ اور ماورائی طاقت سے لَو لگاتا ہے، اِس حقیقت کی شاہد ہے کہ اُس کے اندر ایک اندرونی جذبہ اور فطری الہام موجود ہے جو اُسے وجودِ خدا کا یقین دلاتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات انسان کے اس مَیلان کو اُس مذہبی پروپیگنڈے کا ردِّ عمل سمجھیں جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ہم عمر بھر اُس سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اِس جذبے کے مظاہر تمام انسانوں یہاں تک کہ اُن لوگوں میں بھی موجود ہیں جو عام طور پر مذہبی ذوق نہیں رکھتے، تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ شک واعتراض غلط ہے۔ بلکہ کسی ماورائی طاقت پر اعتقاد رکھنا انسان کے نفس کی گہرائی میں موجود ہے، جو کہ کسی پروپیگنڈے کا نتیجہ نہیں ہے۔

(۵) انسان کی زندگی میں ایسے واقعات بھی نظر آتے ہیں جن کی حِسِ مذہبی کے منہاج کے سوا اور کوئی تاویل وتفسیر نہیں ہوسکتی۔

---

[1] مقالہ کودل ٹائم۔ ترجمہ مہندس بیانی۔ درکتاب "حس مذہبی یا بعد چہارم رُوحِ انسانی"۔

[2] ایرانی اہلِ قلم انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ناموں کے اِملا اس طرح بگاڑ دیتے ہیں کہ اُن کی اصلیت کا پتا چلانا دُشوار کیا امرِ محال ہو جاتا ہے مذکورہ نام کا آخری حصہ تو KANTAIN ہے۔ اول کے دو لفظوں کی تحقیق نہ ہو سکی۔

[3] بُعدِ چہارم کا محقق البرٹ آئن شٹائن ہے (۱۹۵۵ - ۱۸۰۹) یہ محقق ماہرِ ریاضیات تھا۔ اُس کا نظریہ ہے کہ کسی شے کی مکان و زمان میں پوزیشن چوتھا بعد ہے۔

POSITIONN IN SPACE AND TIME

[4] مصنف نے جملے میں کلمۂ "دوبارہ" اس لیے اضافہ کیا ہے کہ رہبرانِ دین تو نفس کی اس قوت کو پہلے ہی بتا چکے تھے جیسے کہ قرآن میں ہر مقام پر خطاب "نفس" سے ہے۔

Marfat.com

مثلاً ـــــ ہم ایسے انسانوں کو دیکھتے ہیں کہ جو نہایت جوش کے ساتھ اپنے تمام مالی وسائل کسی مذہبی مقصد یا نظریے پر قربان کر دیتے ہیں۔ اُن کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ بے نظیر طور پر مذہب پر نثار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

وہ شہداء جنہوں نے مقاصدِ الٰہی کو پُورا کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں ذوق و شوق سے شربتِ شہادت نوش کیا، صرف اسلامی تاریخ ہی میں ایسے افراد کی مثالیں بکثرت نہیں پائی جاتیں بلکہ دُوسری اقوام اور ملتوں کی تاریخ میں بھی کم نہیں ہیں۔ یہ مثالیں اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں کہ انسان کے نفس کی گہرائی میں حسِ مذہبی موجود ہے۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر یہ سوال بھی اُٹھایا جائے کہ کمیونسٹ لوگ جو اپنے الحاد اور مذہبی مخالفت کو چھپاتے تک نہیں اُن میں بھی اپنے معتقدات اور افکار کے لیے ایسا ہی قربانی کا جذبہ موجود ہے۔

لیکن اگر قدرے غور کیا جائے تو یہ اعتراض پا در ہوا ثابت ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ کمیونسٹ حضرات جو مذہب کی کلیتہً نفی کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مذہب اساطیر الاوّلین میں سے ہے اور انسان کی ابتدائی سرگزشت کی یادگار ہے، جب کہ وہ عالمِ طفلی تھا۔ اس لیے کمیونسٹ معاشرے میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے لاشعوری طور پر اپنے اس عقیدے کو مذہب بنا لیا ہے۔ وہ لوگ اپنے قومی رہنماؤں کو اسی نظرِ عقیدت سے دیکھتے ہیں جیسا کہ مصر کے بُت پرست اپنے بُتوں کو دیکھتے تھے۔ چنانچہ لینن کی قبر کی زیارت کے آئے دن جو اوصاف وضع کیے جاتے ہیں وہ اس کا ثبوت ہیں۔

وہ لوگ "مارکس ازم" کے اُصولوں کو مثلِ وحی آسمانی اور نقص سے پاک اور مُقدس سمجھتے ہیں۔ وہ مارکس اور لینن کو معصومین کی طرح منزہ عن الخطا تصور کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اِن اصولوں میں اِصلاح اور تجدیدِ نظر ناقابلِ معافی گناہ سمجھتے ہیں۔ نیز اپنے مخالفین کو اہلِ دین ہی کی اصطلاح میں "مُرتد" کہتے ہیں۔ گویا کہ اُن کے لیے لادینی (منحرف شکل میں) ایک دین بن گئی ہے اور اُن کے افکار، مراسم اور اعتقادات مذہبی رنگ اختیار کر گئے ہیں۔

۲۔ احادیثِ اِسلامی میں فطرتِ خُداشناسی کا ذکر: صرف قرآن ہی میں نہیں بلکہ احادیثِ اسلامی میں بھی "معرفتِ الٰہی" اور توحید کے ایک امرِ فطری ہونے کے بارے میں خوب بحث کی گئی ہے۔ اِن میں سے بعض احادیث میں "فطرتِ توحیدی" اور بعض میں عنوانِ "معرفت" کے تحت، بعض میں "فطرتِ اسلامی" یہاں تک کہ بعض میں اس جذبے کو "ولایت" کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

مُحدث بزرگوار جناب کُلینی نے "اصولِ کافی" میں ہشام ابن سالم کے واسطے سے ایک نہایت معتبر حدیث نقل کی ہے۔ ہشام کا قول ہے کہ اُس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ:- "فطرت اللّٰه التی فطر الناس علیها" میں فطرت سے کیا مُراد ہے؟ آپؑ نے فرمایا کہ "توحید" مراد ہے۔[۱]

---

[۱] اصولِ کافی جلد ۲ صفحہ ۱۰ (باب فطرة الخلق علی التوحید)۔

Marfat.com

نیز اُسی کتاب "کافی" میں امام جعفر صادقؑ کے ایک صحابی سے ایک اور حدیث منقول ہے کہ اُس صحابی نے جب آیت مذکور کی تفسیر دریافت کی تو آپؑ نے فرمایا کہ "فطرت" سے مُراد "اسلام" ہے[۱]

امام باقر علیہ السلام سے ایک اور حدیث اسی کے مشابہ منقول ہے کہ آپؑ کے ایک صاحبِ علم صحابی زرارہ نے جب اِس آیت کی تفسیر دریافت کی تو آپؑ نے فرمایا کہ :-

فطرھم علی المعرفة به

خدا نے فطرتِ انسانی میں اپنی معرفت و شناخت کا جذبہ رکھا ہے۔[۲]

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث منقول ہے جو مشہور ہے :

کُلّ مولود یولد علی الفطرة الاسلام حتی لیکون ابواہ هما اللذان یھودانه وینصرانه

ہر بچّہ نوزاد فطرتِ اسلام اور شرک سے خالی دین پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اُس کے ماں باپ اُس پر یہودیت یا نصرانیت جیسے انحرافی عقائد کا رنگ چڑھا دیتے ہیں[۳]

اصولِ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث اِسی آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپؑ سے جب آیت مذکور کی تفسیر دریافت کی گئی تو جواب میں فرمایا کہ "فطرت" سے مراد ولایت اور اولیائے الٰہی کی رہبری کو قبول کرنا ہے۔[۴]

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ میں (جو کہ نہج البلاغہ میں مندرج ہے) مختصر مگر بلیغ الفاظ میں یوں ارشاد فرمایا ہے: فبعث فیھم رسله و واتر الیھم انبیائه لیستأدوھم میثاق فطرته ویذکروھم منسی نعمته ویحتجوا علیھم بالتبلیغ ویثیروا لھم دفائن العقول

خدا نے انسانوں کی طرف اپنے رسول بھیجے اور یکے بعد دیگرے انبیا کو مامور کیا تاکہ وہ اُن سے پیمانِ فطرت کے ایفا کا مطالبہ کریں اور اُنھیں خُدا کی وہ نعمتیں یاد دلائیں جنھیں وہ بھول گئے ہیں اور بذریعہ تبلیغ اُن پر اتمامِ حُجت کریں اور اُن کے لیے عقل کے خزانوں کو فاش کر دیں۔

مذکورہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرشتِ انسانی میں صرف "معرفتِ الٰہی" ہی نہیں بلکہ کُل اسلام بصورت ایجاز ودیعت کیا گیا ہے۔ جس میں توحید سے لے کر پیشوایانِ الٰہی کی رہنمائی، پیغمبر کے سچّے جانشین یہاں تک کہ فروعاتِ دین سب کچھ شامل ہے نہج البلاغہ سے جناب امیر المومنینؑ کا جو قول سطور بالا میں نقل کیا گیا ہے، اُس کی اساس پر پیغمبروں کا فرض فطرتِ انسانی کی گرہ کُشائی، خدا کی فراموش کردہ نعمتوں کو یاد دلانا، انسان کی فطرت توحیدی کو بیدار کرنا اور نفسِ انسانی کے لاشعور میں معرفتِ الٰہی کے جو خزینے مخفی و مستور ہیں، انھیں واشگاف کر کے حالتِ شعور میں لانا ہے۔

یہ نکتہ مستحقِ توجہ ہے کہ دُنیاوی زندگی میں انسان کو جو مشکلات، تکالیف اور دردناک حادثات پیش آتے ہیں، قرآن شریف

---

[۱]،[۲] کافی ج ۲ ص ۱۱۔ [۳] تفسیر جمع الجوامع از مرحوم طبرسی ذیل آیت موردِ بحث۔

[۴] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ صفحہ ۱۸۴۔

Marfat.com

ہیں ان امور کا اس پہلو سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ انسان کے اندر حسِ مذہبی کو بیدار کرنے کے وسائل ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے :

فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین فلمّا نجّاھم الی البرّ اذا ھم یشرکون ۝

جس وقت وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور سمندر میں خطرات میں گھر جاتے ہیں تو بڑے خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں۔ مگر جب اُنھیں خدا سلامتی کے ساتھ خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ پھر مُشرک ہو جاتے ہیں۔ (عنکبوت۔ ۶۵)

اِس مضمون کے متعلق اسی سُورۃ کی (جو کہ سورۂ عنکبوت سے مشابہ ہے) آیات مابعد کی تفسیر کرتے ہوئے اور باتوں کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۳۳۔ وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا
أَذَاقَهُم مِّنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ۝
۳۴۔ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝
۳۵۔ أَمْ أَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ ۝
۳۶۔ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ
بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ ۝

ترجمہ

۳۳۔ جس وقت لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے تو وُہ اپنے ربّ کو پُکارتے اور اس کی طرف رجُوع ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ اُنھیں اپنی رحمت کا مزہ چکھاتا ہے تو اُن میں سے ایک فریق اپنے پروردگار کی نسبت مُشرک ہو جاتا ہے۔

۳۴۔ (انہیں رہنے دو تاکہ) ہم نے اُن کو جو کچھ بخشا ہے اس کی ناشکر گزاری کریں اور (دُنیا کی زُود گزر نعمتوں سے) فائدہ اُٹھالو مگر جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا (کہ تمہارے کُفران اور خُود غرضیوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے)۔

۳۵۔ کیا ہم نے اُن پر کوئی ایسی محکم دلیل نازل کی ہے جو اُنھیں شرک کرنا سکھاتی ہے اور اس کی توجیہ کرتی ہے؟

Marfat.com

۳۶۔ اور جب ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وُہ اُس سے خوش ہوجاتے ہیں۔ اور جب اُن کے اعمال کے سبب اُنھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اچانک مایوس ہو جاتے ہیں ۔

تفسیر

زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت گزشتہ آیات کے مضمون پر استدلال اور تاکید ہے یعنی تصورِ توحید ایک فطری امر ہے اور مصائب اور شدائد کے وقت یہ نُورِ الٰہی دل میں چمکتا ہے۔ چنانچہ خداوندِ عالم فرماتا ہے : جب انسانوں کو کوئی ضرر پہنچتا ہے تو وُہ خُدا کو یاد کرتے ہیں اور اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں (واذا مسّ الناس ضرٌّ دعوا ربھم منیبین الیه)۔
لیکن یہ لوگ اس قدر کم ظرف ، کوتاہ فکر ، اسیرِ تعصب اور اپنے بزرگوں کے ایسے اندھے مُقلّد ہیں کہ جیسے ہی اُن کے اُوپر سے سخت حادثات گزر جاتے ہیں اور نسیم راحت و آرام چلتی ہے اور خدا اُن پر اپنی طرف سے رحمت کی بارش کرتا ہے تو اُن میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے معاملے میں مُشرک ہوجاتا ہے : (ثمّ اذا اذاقھم منه رحمة اذا فریق منھم بربّھم یشرکون)۔
اِس مقام پر " مسّ الناس ضرٌّ " سے مُراد معمولی تکلیف ہے ۔
اِسی طرح " اذاقھم منه رحمةً "
(جب وہ اپنی طرف سے رحمت چکھاتا ہے) سے بھی اشارہ نعمت کی مقدار قلیل ہے۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر کلمۂ "اذاق" (چکھانا) کا استعمال کسی شے کی مقدارِ قلیل کے لیے ہوتا ہے۔ بالخصوص جب کہ کلمات " ضرّ " اور " رحمة " ہردو اسم نکرہ استعمال ہوئے ہیں۔
اِس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب اُنھیں کوئی معمولی مشکل بھی پیش آتی ہے تو اُن کی فطرة توحید پر سے پردہ اُٹھ جاتا ہے ۔ مگر مختصر سی نعمت پاکر اُن کی راہ فکر مُتغیّر ہوجاتی ہے اور وہ غافل ہو جاتے ہیں اور سب کچھ بھُول جاتے ہیں۔
پہلی حالت کے متعلق بطورِ کُلیہ یہ کہا گیا ہے کہ تمام انسانوں کا یہ حال ہے کہ وہ مشکلات کے وقت خدا کو یاد کرتے ہیں کیونکہ " فطرة توحیدی " کا وجود سب کے اندر یکساں ہے ۔
لیکن ـــــ دُوسری صُورت (یعنی نعمت پاکر غافل ہوجانا) میں صرف اِن لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے راہ شرک کو اختیار کیا ہے۔
کیونکہ دُنیا میں اس کے ایسے بندے بھی ہیں کہ راحت و زحمت ہر حال میں شکرِ خدا کرتے ہیں اور زندگی کے عارضی تغیرات اُنھیں یادِ حق سے غافل نہیں کرتے ۔

Marfat.com

"منیبین الیہ" کا مفہوم جیسا کہ ہم نے سابقاً ذکر کیا توجہ طلب ہے۔ کیونکہ "انابۃ" مادہ "نوب" سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں، کسی چیز کی طرف پھر لوٹ جانا۔ اس سے اس معنیٰ کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ انسان کی فطرت میں جذبہ توحید و خدا پرستی بنیادی طور پر موجود ہے اور شرک ایک عارضی صورت ہے کہ انسان کسی وقت خدا سے اُمید منقطع کر لیتا ہے۔ مگر پھر خواہ نہ خواہ ایمان باللہ اور توحید کی طرف لوٹتا ہے۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ آیت بالا میں "رحمت" کا انتساب خدا کی طرف ہے۔ لیکن "ضُر" یعنی زحمت و تکلیف کو اس کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ کیونکہ بہت سی سختیاں اور تکلیفیں خود ہمارے ہی اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مگر تمام رحمتیں من جانب اللہ ہیں خواہ وہ عارضی ہوں یا مستقل ہوں۔

اس آیت میں کلمہ "ربھم" دو بار آیا ہے۔ یہ اس حقیقت کی تاکید کے لیے ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اُس کی تدبیر کو اپنے نفس میں محسوس کرتا ہے بشرطیکہ غلط تعلیم و تربیت اُس کا راستہ شرک کی طرف نہ موڑ دے۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ "اذاقهم منه" میں ضمیر "منه" کا مرجع ذاتِ الٰہی ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ تمام نعمتیں اُسی کی طرف سے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے (مثلاً مصنفین المیزان، تبیان، ابوالفتوح رازی) اس ضمیر کا یہی مفہوم لیا ہے۔ اگرچہ بعض دیگر مفسرین نے (جیسے کہ فخر رازی) اس ضمیر کا مرجع "ضُر" بتایا ہے اور آیت کے یہ معنی سمجھے ہیں:۔

"خدا جس وقت مضرت اور تکلیف کے بعد اُن کی طرف اپنی رحمت بھیجتا ہے۔ تو ایک گروہ مشرک ہو جاتا ہے"۔

اگر آیت کا یہ مفہوم سمجھا جائے تو اس مقام پر حرف "من" بدلیت کے معنی دیتا ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ آیت کے ظاہری معنی کے لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

☆ ☆ ☆

اس کے بعد کی آیت میں اُن کم ظرف مشرکین کی تنبیہ و تہدید کے لیے کہ جو نعماتِ الٰہی کے حصول کے بعد اللہ کو بھول جاتے ہیں، فرمایا گیا ہے: اُنھیں ہماری نعمتوں کا انکار کرنے دو اور جو کچھ اُن کے امکان میں ہے اُنھیں کرنے دو۔ (لیکفروا بما اتیناهم)۔

جتنا بھی تمہارے امکان میں ہے اس دُنیا کی زُود گزر نعمتوں سے فائدہ اُٹھا لو: (فتمتعوا)۔

مگر تم جلد ہی اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ دیکھ لو گے: (فسوف تعلمون)۔[1]

---

[1] آیت ۳۴۔ "لیکفروا" کی ابتداء میں لام "امر" کا ہے اور یہ امر تہدید کے لیے ہوتا ہے اور "تمتعوا" بھی دوسرا امر ہے۔ اس میں بھی تہدید کا پہلو موجود ہے۔ ہر چند کہ اوّل (یعنی "لیکفروا") امر غائب کی صورت میں ہے اور دوسرا (یعنی "تمتعوا") امر حاضر کی صورت میں ہے۔ گویا کہ خدا نے مشرکین کو ابتداء میں غائب فرض کیا۔ اُس کے بعد تہدید شدید کے لیے اُنھیں حاضر قرار دے کر خطاب کرتا ہے مگر بعض مفسرین نے اس لام کو لام عاقبت سمجھا ہے۔ یعنی آخر کار اُنھوں نے خدا کی نعمتوں کا انکار کیا۔ مگر پہلے معنی زیادہ موزوں ہیں۔

Marfat.com

اگرچہ بظاہر آیت کے مخاطب مُشرکین ہی ہیں۔ لیکن اگر آیت کا مفہوم وسیع ہو تو کچھ بعید نہیں کہ اس میں وہ سب لوگ شامل ہوں جو نعماتِ الٰہی سے فائدہ اور لُطف تو اُٹھاتے ہیں، مگر اِن نعمتوں کے مُنعم اور بخشنے والے کو بُھول جاتے ہیں۔
یہ واضح ہے کہ اس موقع پر فعل امر کا استعمال تہدید کے لیے ہے۔

⁂

آیت مابعد میں گروہ مشرکین کو قصوروار ثابت کرنے کے لیے اُن کے خلاف سرزنش کو سوال کے پیرائے میں ادا کیا گیا ہے: کیا ہم نے اُن پر کوئی دلیل محکم نازل کی ہے، جو اُنھیں راہِ شرک پر چلنے کی لفظاً ترغیب دیتی ہے۔ (ام انزلنا علیھم سُلطانًا فھو یتکلم بما کانوا بہ یشرکون)۔

کلمہ "ام" یہاں استفہام کے لیے ہے۔ یہ استفہام انکاری برائے توبیخ ہے۔
یعنی انسان راہ و رسمِ شرک کا اتباع یا تو ندائے فطرت کی وجہ سے کرتا ہے یا بحکم عقل، یا ہدایتِ الٰہی کی وجہ سے، اور یہ تینوں باتیں محال اور ناشدنی ہیں کیونکہ جب وہ مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اُن کی فطرتِ اصلیہ ظاہر ہوتی ہے اور وہ خدائے واحد کو پکارتی ہے۔ نیز عقل بھی انھیں سلامت روی کا مشورہ دیتی ہے کہ اُس کا سہارا تلاش کرو کہ جو "واھب النعم" ہے۔ (بدون احسان نعمتیں بخشنے والا ہے)۔
آخر میں حکمِ الٰہی کا معاملہ رہ جاتا ہے۔ سو اس آیت میں اس کی بھی نفی کی گئی ہے کہ ہم نے اُنھیں ہرگز ایسا حکم نہیں دیا۔ اس بنا پر اعتقادِ شرک کے لیے اُن کے پاس کوئی قابلِ قبول بنیاد نہیں ہے!
کلمہ "سُلطان" کا معنی وہ شے ہے جو فتح مندی اور تسلط کا موجب ہو مگر اس مقام پر یہ کلمہ ایسی دلیل کے لیے استعمال ہوا ہے جو محکم اور قلب کو مطمئن کرنے والی ہو۔
کلمہ "یتکلم" (یعنی کلام کرتی ہے) ایک مجازی اُسلوب ہے۔ جو کسی دلیل کے واضح ہونے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی دلیل ہے جو انسان سے کلام کرتی ہے۔
بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس مقام پر کلمہ "سلطان" کے معنی فرشتہ ہیں۔ اگر یہ معنی درست سمجھے جائیں تو "تکلم" کے مجازی نہیں بلکہ حقیقی معنی لیے جائیں گے یعنی ہم نے اُن کی طرف کوئی ایسا فرشتہ نہیں بھیجا جو شرک کا پیغام لے کر گیا ہو اور اس موضوع پر اُس نے اُن سے گفتگو کی ہو۔
مگر پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے۔

⁂

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت (۳۶) جس میں اِن (مُشرک) کم ظرف جُہلا کی طرزِ فکر اور نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے) کے الفاظ یہ ہیں کہ: ہم جس وقت لوگوں کو اپنی رحمت سے سرفراز کرتے ہیں تو وہ خوش اور مغرور ہو جاتے ہیں۔ مگر جب، اُنھوں نے جو اعمال انجام دیئے ہیں اُن کے نتیجے میں اُنھیں رنج اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مایوس اور نااُمید ہو جاتے ہیں:

Marfat.com

(واذا اذقنا الناس رحمۃً فرحوا بھا وان تصبھم سیئۃ بما قدمت ایدیھم اذا ھم یقنطون)۔

جب کہ راست باز مومنین وہ ہیں کہ نہ تو وہ نعمت و غناء کے وقت غرور و غفلت میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ مصیبت کے وقت اُن پر یاس و ناامیدی طاری ہوتی ہے۔ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نعمت عطیۂ الٰہی ہے۔ اس لیے وہ اس کے لیے خدا کا شکر کرتے ہیں اور مصیبت کو وہ آزمائش و امتحان یا اپنے اعمال کا نتیجہ سمجھتے ہیں لہٰذا وہ صبر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں۔ جب کہ بے ایمان لوگ "غرور" اور "یاس" کے درمیان بے قرار ہوتے ہیں تو با ایمان افراد "شکر اور صبر" کے درمیان مطمئن ہوتے ہیں۔

اِس آیت سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ کم از کم انسان کو پیش آنے والی مصیبتوں اور پریشانیوں کا ایک حصہ اُس کے اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور خدا اس ذریعے سے اُن کی اصلاح اور اُن معصیت سے پاک کر کے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ جملہ "فرحوا بھا" صرف نعمت پا کر شادمان ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایسی خوشی مراد ہے جس میں ایک قسم کی مستی اور بے خبری بھی شامل ہو جیسے کہ اُن کم مایہ لوگوں کی حالت ہوتی ہے جن کے پاس اچانک دولت آجائے۔ ورنہ ایسی خوشی اور مسرّت جس میں شکرِ خدا اور توجہ الی اللہ بھی شامل ہو بُری چیز نہیں ہے بلکہ اُس کا تو حکم دیا گیا ہے۔

قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذالک فلیفرحوا (یونس ـ ۵۸)۔

اِس کے بعد "بما قدمت ایدیھم" کہہ کر گناہوں کو ہاتھوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اکثر کام ہاتھ ہی سے انجام دیتا ہے۔ اگرچہ دل، آنکھ اور زبان سے بھی گناہ ہوتے ہیں۔ لیکن اُن اعمال کی کثرت ہے جو ہاتھوں سے کیے جاتے ہیں۔ اِس لیے کلمہ "ایدی" کو منتخب کیا گیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت اور آیت ۳۳ کے مضمون میں تضاد نہیں ہے ؟

کیونکہ اس آیت میں مُشرکین کی مایوسی کا ذکر اُس حالت میں ہے، جب کہ وہ مصائب میں مُبتلا ہوں جب کہ آیت گزشتہ (۳۳) میں یہ بیان ہے کہ وہ سختیوں اور مشکلات کے وقت خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ایک ہی کیفیت حال کا نتیجہ اُس آیت (۳۳) میں ذاتِ الٰہی سے اُمید و رجا ہے اور اس آیت میں مایوسی ہے۔

لیکن اگر ایک نکتے پر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ آیت میں تمام زیاں رساں امور شامل ہیں مثلاً: طوفان، زلزلہ یا اور قسم کی آفاتِ ارضی و سماوی کہ اُن کے نزول کے وقت عام آدمی خواہ وہ موحد ہوں یا مشرک خدا کو پکارتے ہیں اور یہ فطرتِ توحیدی کی ایک علامت ہے۔

زیرِ بحث آیت میں یہ مذکور ہے کہ گناہوں کا انسان کے ضمیر پر کیا ردِّ عمل ہوتا ہے اور اُس سے مایوسی پیدا ہوتی ہے کیونکہ بعض افراد ایسے بھی ہیں کہ اگر اُن سے عملِ خیر سرزد ہوتا ہے تو مغرور ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو عذابِ الٰہی

Marfat.com

سے محفوظ سمجھنے لگتے ہیں اور جب وہ کوئی عمل بدانجام دیتے ہیں تو اُن کے جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں اور اُن پر سرتا سر رحمتِ خدا سے مایوسی چھا جاتی ہے۔

جب کہ وہ عجب اور غرور بھی مذموم ہے اور رحمتِ خدا سے یہ یاس اور نا اُمیدی بھی نازیبا ہے۔

اِس لیے دونوں آیات میں جو مضامین ادا کیے گئے ہیں وہ مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۳۷۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

۳۸۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ
خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

۳۹۔ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِىْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا
عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝

۴۰۔ اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ
مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَىْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ ع

ترجمہ

۳۷۔ کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ اور تنگ کر دیتا ہے، بے شک اس میں ایماندار لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۳۸۔ پس تو قریبیوں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتا رہ۔ یہ امر اُن لوگوں کے لیے

Marfat.com

جو رضائے خدا کے طالب ہیں بہتر ہے اور ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

۳۹۔ اور تم جو سُود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو خدا کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی اور تم جو بطور زکوٰۃ ادا کرتے ہو اور صرف رضائے الٰہی کے طلب گار ہوتے ہو، جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی دوگنا اَجر پانے والے ہیں۔

۴۰۔ خدا کی ذات ہی وُہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر رزق دیا۔ پھر وہ تمہیں مار دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ تم نے خدا کے لیے جو شریک قرار دیئے ہیں، کیا اُن میں سے کوئی ایسا ہے کہ اِن کاموں میں سے کوئی کام کر سکے؟
اِس سے برتر و مُنزّہ ہے کہ اس کے لیے شریک قرار دیں۔

تفسیر

پہلی زیرِ بحث آیت میں بھی گزشتہ مقامات کی طرح "توحید ربوبیت" کا تذکرہ ہے۔ اور جیساکہ آیات ماقبل میں آچکا ہے بعض کم ظرف لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ہم اُنھیں اپنی نعمتیں عطا کرتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور جب وہ کسی بلا یا مصیبت سے دوچار ہو جاتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ اسی نسبت سے اِس آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ (اولم یروا اَنّ اللہ یبسط الرزق لمن یشآءُ ویقدر)۔

جب انسان نعمتوں سے غنی ہو جائے تو یہ حالت اُس کے لیے غرور، سرکشی اور یادِ الٰہی کی فراموشی کا باعث نہ ہو جائے اور سلب نعمات یاس اور نااُمیدی کا باعث نہ ہو جائے کیونکہ: روزی کی وسعت اور تنگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی اس کی مصلحت فراخی میں ہوتی ہے اور کبھی تنگی میں۔

یہ درست ہے کہ یہ عالم عالمِ اسباب ہے، جو لوگ محنتی اور سخت کوش ہیں، عام طور پر وہ زیادہ کماتے ہیں اور خوشحال ہیں۔ بخلاف ازیں کاہل اور کم کوش لوگ عُسرت میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیّہ نہیں ہے۔ کیونکہ کبھی ایسا بھی دیکھنے آتا ہے کہ نہایت لائق اور جدوجہد کرنے والے لوگ جتنی بھی زیادہ کوشش کرتے ہیں، کامیاب نہیں ہوتے۔ اس کے بالکل ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو کسبِ معاش میں بہت کوشش نہیں کرتے، مگر اُن کے لیے ہر طرف سے روزی کے دروازے کھلے ہُوتے ہیں۔

Marfat.com

یہ مستثنیات اِس لیے ہیں تاکہ خدا یہ بتادے کہ اس عالمِ اسباب میں جو ترغیبات TEMPTATIONS ہیں ان کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ انسان عالمِ اسباب ہی میں گم ہو جائے۔ انسان کو یہ نہ بھُولنا چاہیئے کہ اِس کارخانے کی پُشت پر ایک قوی ہاتھ ہے جو اُسے چلا رہا ہے۔

اِس عالمِ نیرنگ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی مقصد کے لیے خواہ کتنی ہی کوشش کرلے اور ہر دروازے پر دستک دے لے مگر اُس کے لیے ہر راستہ بند ہوتا ہے اور کبھی اُس کے لیے اتنی آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہنوز وہ کسی دروازے کے قریب بھی نہیں آتا کہ اُس کے لیے کھُل جاتا ہے۔

ہم اپنی زندگی میں اِس قسم کے واقعات دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک شخص کو نعمت کا غرور ہے اور دُوسرا آدمی غربت اور افلاس کی وجہ سے مایوس ہے۔ یہ اس اَمر کی دلیل ہے کہ ہمارے ارادوں اور خواہشات کے پیچھے ایک قوی ہاتھ ہے جو کام کر رہا ہے۔ اِس لیے آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: اِن معاملات میں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں خدا کی قدرت اور عظمت کی نشانیاں ہیں۔ (انّ فی ذالک لاٰیات لقومٍ یؤمنون)۔

بعض مفسّرین نے اس مضمون کی ایک حکایت بیان کی ہے :

کسی نے ایک عالم سے سوال کیا :

ماالدلیل علی ان للعالم صانعاً واحداً

اِس امر کی کیا دلیل ہے کہ اِس عالم کا ایک صانع یکتا ہے ؟

اُس عالم نے جواب دیا : تین دلیلیں ہیں۔

ذل اللبیب، و فقر الادیب، وسقم الطبیب

اوّل یہ کہ اہلِ خرد و حکمت دُنیا میں ذلیل ہیں۔

دوم یہ کہ اہلِ علم و اُدب فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔

سوم یہ کہ طبیب بھی بیمار ہوتے ہیں [۱]

بے شک اِن مستثنیات کا وجود اِس امر کی دلیل ہے کہ چارہ کار کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

چنانچہ امیرالمومنین حضرت علیؑ سے ایک حدیث مروی ہے :

عرفت اللّٰہ سُبحانہٗ بفسخ العزائم وحل العقود ونقض الھمم

مَیں نے اپنے خدا کو اس بات سے پہچانا کہ عزائم محکم فسخ ہو جاتے ہیں اور کبھی گرہیں کھُل جاتی ہیں اور کبھی قوی ارادے ٹوٹ جاتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں [۲]

اور چونکہ ہر نعمتِ الٰہی اپنے ساتھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی لاتی ہے، اس لیے آیت مابعد میں رُوئے سخن پیغمبرؐ کی

---

۱ تفسیر رُوح البیان ، جلد ، صفحہ ۲۹ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲ نہج البلاغہ ، کلمات قصار جملہ ۲۵۰ ۔

Marfat.com

طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جب کہ ایسا ہے تو تم اپنے اعزا و اقارب کا حق ادا کرو۔ اسی طرح مسکینوں اور مسافروں کی مدد کرو (فاٰت ذاالقربیٰ حقه والمسکین وابن السّبیل)۔

جب تمہارا رزق وسیع ہو تو یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ بلا شرکت غیرے تمہارا ہی ہے۔ بلکہ تمہارے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں۔ اُن میں سے تمہارے اعزا ہیں اور وہ حاجت مند لوگ ہیں جو شدتِ فقر سے ناتوان ہو گئے ہیں، اسی طرح وہ آبرومند لوگ ہیں جو وطن سے دُور حالتِ مسافرت میں حادثات پیش آنے کی وجہ سے محتاج ہو کر سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔

کلمہ "حقه" سے اس واقعیت کا اظہار مقصود ہے کہ مذکورہ بالا لوگ انسان کے مال و دولت میں شریک ہیں۔ اگر انسان انھیں کچھ بطور امداد دیتا ہے تو درحقیقت وہ اُن کا حق ادا کر رہا ہے اور اُن پر کچھ احسان نہیں کر رہا۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کا مخاطب خصوصیت سے جناب رسالت مآب اور اُن کے اعزا و اقارب ہی کو سمجھا ہے۔

جناب ابوسعید خدری اور دوسرے اصحاب سے ایک مشہور روایت میں یہ نقل ہوا ہے :

جس وقت یہ آیہ نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے "فدک" جناب فاطمہؑ کو بخش دیا۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں :

لما نزلت هٰذه الاٰیة علی النبیّ اعطی فاطمة فدکًا وسلمهٗ الیها[1]

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے بھی اس مضمون کو بعینہٖ بیان کیا ہے[2]۔ امام جعفر صادقؑ کی زبانی ایک روایت ہے جس میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو بانئ اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت ابوبکر کے درمیان ہوئی تھی۔ اُس میں یہ مضمون نہایت تفصیل سے مذکور ہے[3]۔

مگر مفسرین کی ایک اور جماعت نے اس آیت میں خطاب کے عمومی معنیٰ مُراد لیے ہیں۔ جس میں جناب رسول اللہؐ اور اُن کے علاوہ سب لوگ شامل ہیں۔

اِس تفسیر کے مطابق ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اعزا و اقارب کے حق کو فراموش نہ کرے۔

مگر اِن دونوں تفاسیر میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ دونوں قابلِ تسلیم اور اپنے مقام پر درست ہیں۔ باین وجہ کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور جنابِ پیغمبرؐ، اُن کے اقربا، بالخصوص جناب فاطمہ زہراؑ اُس کی مصداقِ کامل ہیں۔

یہ امر واضح ہے کہ مذکورہ بالا تفاسیر میں سے کوئی بھی اِس آیت کے مکی ہونے کی تردید نہیں کرتی۔ کیونکہ آیت کا مفہوم جامع ہے جس پر مکہ میں بھی عمل ہو سکتا تھا اور مدینہ میں بھی یہاں تک کہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اِس آیت کی اساس پر فدک کی جاگیر عطا کرنا کاملاً قابلِ قبول ہے۔

---

[1] و [2] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۸۶ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

Marfat.com

اِس مقام پر صرف جملہ " لما نزلت ھٰذہ الاٰیۃ " کے مفہوم کی وضاحت باقی رہ جاتی ہے۔

جناب ابو سعید خدری کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے فدک کی جاگیر جناب فاطمہؑ کو اس آیت کے نازل ہونے کے بعد عطا کی لیکن اگر اس مقام پر (لمّا) کے معنی علّت کے لیے جائیں تو نہ کہ زمانۂ خاص کے لیے تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور روایت کا یہ مفہوم ہو جائے گا کہ :

پیغمبرؐ نے خدا کے اِس حکم کے مطابق فدک جناب فاطمہؑ کو عطا کر دیا۔

علاوہ ازیں بعض آیات کبھی دو دفعہ بھی نازل ہوئی ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر قسم کے مستحق اور نیازمند افراد میں سے صرف ان تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہی کیوں ہوا ہے ؟ ممکن ہے کہ یہ اِس وجہ سے ہو کہ اِن تین قسم کے افراد کی اہمیت زیادہ ہے۔ کیونکہ رشتہ داروں کا حق تو سب سے فائق ہے اور محروم اور حاجت مند لوگوں میں سے مساکین اور راہِ سفر میں درماندہ لوگ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

فخر رازی نے اِس سوال کی توجیہ میں ایک نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ آٹھ قسم کے لوگ جنہیں زکوٰۃ کی رقم دینی چاہیئے ، اُنھیں اسی صورت میں دی جا سکتی ہے جب کہ صاحبِ مال پر ادائے زکوٰۃ واجب ہو ۔ مگر آیت میں جن تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے، ہر حالت میں اُن کی مدد کرنا لازم ہے۔ کیونکہ بعض رشتہ دار تو واجب النفقہ ہوتے ہیں اور " مسکین " وہ محروم فقیر ہے کہ اگر اُس کی مدد نہ کی جائے تو اکثر اوقات اُس کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی مسافر ایسے حالات میں گرفتار ہو کہ مدد نہ پہنچنے کی صورت میں اُس کی جان پر بن جائے۔ علاوہ بریں آیت میں ان تین قسم کے لوگوں کا جس ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے وہ اُن کے رُتبہ کی اہمیت کی مناسبت سے ہے۔

بہر حال آیت کے اخیر میں نیکو کار لوگوں کی تشویق اور ضمناً اِس بخشش کی شرطِ قبولیت کے طور پر فرمایا گیا ہے : یہ کام اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو صرف رضائے الٰہی کے طالب ہیں۔ (ذالک خیرٌ للذین یریدون وجہ اللّٰہ)۔

اور جو لوگ کہ ایسے کارہائے خیر انجام دیتے ہیں وہ نجات یافتہ ہیں۔ (واولٰئک ھم المفلحون)۔

وہ اِس جہان میں نجات یافتہ ہوں گے۔ کیونکہ " انفاق " دُنیاوی زندگی میں بھی عجیب برکات کا مُوجب ہوتا ہے اور آخرت میں خدا کی ترازو میں انفاق وزنی ترین اعمال میں سے ہوگا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت بالا میں کلمہ " وجہ اللّٰہ " سے خدا کی جسمانی صُورت مراد نہیں ہے کیونکہ وہ صورت جسمانی نہیں رکھتا بلکہ اِس کلمہ سے مُراد خدا کی ذات ہے۔

اِس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف انفاق اور رشتہ داروں اور دیگر صاحبانِ حقوق کا حق ادا کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ اخلاص اور پاک نیّت کے ساتھ ہو۔ اُس میں کسی قسم کی ریاکاری اور خُودنمائی نہ ہو اور نہ احسان وتحقیر کا جذبہ ہو دینے والا کسی قسم کے بدلے کا منتظر بھی نہ رہے۔

اِس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض مفسّرین کے قول کے خلاف جنھوں نے یہ لکھا ہے کہ داخلِ بہشت ہونے کے لیے " انفاق " " وجہ اللّٰہ " کا مصداق نہیں ہے ، حقیقتِ امر یہ ہے کہ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے اُس کا

Marfat.com

کسی نہ کسی طرح خدا سے کچھ تعلق ہوتا ہے۔ وہ کام خواہ اس کی رضا کے لیے ہو یا حصولِ اجر و ثواب یا اُس کے عذاب سے نجات پانے کے لیے ہو۔ یہ سب کام وجہ اللہ ہیں۔ اگرچہ انسان کے لیے مرحلہ عالی و کامل یہ ہے کہ ہر کام کرتے وقت اُس کی نظر میں خدا کی عبودیت اور اطاعت کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہو۔

آیت مابعد میں اُس بحث کی مناسبت سے جو انفاقِ خالص کے متعلق جاری تھی، انفاق کی دو صُورتوں کا ذکر ہے اوّل تو وہ انفاق ہے جو محض لوجہ اللہ کیا جائے اور دوسرے وہ جو حصولِ مالِ دُنیا کے لیے کیا جائے۔ اِس سلسلے میں خدا فرماتا ہے: تم جو مال اِس مقصد سے خرچ کرتے ہو کہ اُس سے افزائش ہو اور لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو جائے تو خدا کے نزدیک اُس میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ البتہ تم جو بطورِ زکوٰۃ صرف رضائے الٰہی کے لیے دیتے ہو، اس قسم کے لوگ کئی گنا اجر و ثواب کے مستحق ہیں۔ (وما اٰتیتم من ربًا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما اٰتیتم من زکٰوۃ تریدون وجہ اللہ فاولٰئک ھم المضعفون)۔

اِس آیت میں جملۂ دوم کا مفہوم - یعنی زکوٰۃ دینا اور راہِ خدا میں انفاق کرنا اجر و ثواب کثیر کا موجب ہے - واضح ہے لیکن جملۂ اول کے مفہوم کی کہ "ربا" درحقیقت بمعنی افزائش ہے۔ مفسّرین نے گوناگوں تفاسیر کی ہیں۔

اُن میں سے پہلی تفسیر جو سب سے زیادہ واضح اور آیت کے مفہوم سے ہم آہنگ تر، اور اُن روایات سے ہم ساز ہے جو اہلِ بیتؑ سے منقول ہیں، یہ ہے کہ اس مقام پر "ربا" سے مراد وہ تحائف ہیں جو بعض لوگ دوسروں کے لیے بالخصوص صاحبانِ دولت و ثروت کے لیے لے جاتے ہیں اور اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن اہلِ دولت سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر منفعت حاصل کریں۔

یہ امر بدیہی ہے کہ اُمراء کو جو ہدیے پیش کیے جاتے ہیں اُنھیں مستحقِ امداد سمجھ کر تو نہیں پیش کیے جاتے اور نہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ حاجت مند ہیں اس لیے پہلے ان کی مدد کرنی چاہیئے بلکہ مدِّ نظر یہ ہوتا ہے کہ یہ ہدیہ ایسی جگہ دیا جائے جہاں سے زرِ کثیر حاصل ہو سکے۔ یہ فطری امر ہے کہ اس طور کے تحائف جن میں شائبہ اخلاص نہیں ہوتا، اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اُن کی کوئی قدر نہیں ہے۔ اس بنا پر اس آیت میں "ربا" سے مراد ہدیہ اور عطیہ ہی ہے اور جملہ "لیربوا فی اموال الناس" کا مفہوم لوگوں سے زیادہ فائدہ اُٹھانا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ اِس قسم کا فائدہ حاصل کرنا حرام تو نہیں ہے کیونکہ اِس معاملے میں (ہدیہ دینے اور لینے والے کے درمیان) کوئی شرط اور قرارداد نہیں ہوتی۔ مگر اخلاقاً اس کی کوئی قدر نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے متعدد احادیث میں مروی ہے کہ اس ربا سے مراد "ربائے حلال" ہے۔ بمقابلہ ربائے حرام" کیونکہ اُس میں شرط و قرارداد ہوتی ہے۔

آیت بالا کی تفسیر میں ایک حدیث کتاب تہذیب الاحکام میں امام جعفر صادقؑ سے یوں منقول ہے:

ھو ھدیتك الی الرجل تطلب منه الثواب افضل منها فذالك ربی یؤکل۔

Marfat.com

اگر کسی کو ہدیہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ تم اُس آدمی سے زیادہ منفعت حاصل کرو تو یہ ربائے حلال ہے۔

امام جعفر صادقؑ ہی سے ایک اور حدیث یوں منقول ہے:

الرّبا ربابان احدهما حلال، والاٰخر حرام، فامّا الحلال فهوان يقرض الرجل اخاهُ قرضاً يريد ان يزيده ويعوضه باكثر مما يأخذه بلا شرط بينهما، فان اعطاه اكثر ممّا اخذه على غير شرط بينهما فهو مباح له وليس له عند الله ثوابٌ فيما اقرضه، وهو قوله فلا يربوا عند الله، وامّا الحرام فالرجل يقرض قرضاً ويشترط ان يرد اكثر ممّا اخذه فهذا هو الحرام۔

"ربا" دو طرح کا ہے۔ ایک حلال اور دوسرا حرام۔ حلال وہ ہے کہ انسان اپنے کسی مسلمان بھائی کو اِس اُمید پر قرض دے کہ جب وہ یہ رقم واپس دے گا تو اصل پر کچھ اضافہ کر دے گا۔ مگر قرض دہندہ اور مقروض کے درمیان اس قسم کی کوئی شرط نہ ہو۔ اِس صُورت میں اگر قرض لینے والا غیر مشروط طور پر اصل زر پر کچھ اضافہ کر کے واپس کرتا ہے تو فاضل رقم قرض دہندہ کے لیے حلال ہے۔ لیکن اِس صُورت میں اُسے وہ ثواب نہیں ملے گا جو ایک مسلمان بھائی کی بوقت ضرورت مدد کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ آیۂ قرآنی "فلا يربوا عند الله" کا یہی مفہوم ہے مگر۔ حرام ربا وہ ہے کہ انسان کسی کو اس شرط پر قرض دے کہ وہ اصل زر پر اتنی رقم اضافہ کر کے واپس کرے گا۔ یہ "ربا" حرام ہے۔

اِس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان کی گئی ہے کہ یہاں "ربا" سے مراد ربائے حرام ہے۔

اِس تفسیر کے مطابق مفہومِ قرآنی یہ ہے کہ "ربا" اور مخلصانہ انفاق میں موازنہ و مقابلہ کیا جائے۔ وہ یہ کہ "ربا" اگرچہ بظاہر افزائش مال کا موجب ہے مگر یہ افزائش خدا کے نزدیک بے قدر ہے۔ حقیقی قدر و منزلت انفاق فی سبیل اللہ کی ہے اِن مطالب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس آیت کو حرمتِ سُود کے مسئلے کی تمہید یا مقدمہ سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبرؐ کی ہجرت سے قبل وہ صرف ایک اخلاقی نصیحت کے طور پر بیان ہوا تھا۔ مگر ہجرت کے بعد قرآن کی تین سُورتوں (سورہ بقرہ، آل عمران و نساء) میں بتدریج اُس کی حُرمت بیان ہوئی ہے۔ (اسی بنا پر ہم نے بھی تفسیر نمونہ کی جلد دوم صفحہ ۲۰۹، (اُردو ترجمہ) پر اس کا ذکر کیا ہے)۔

لیکن ان دو معانی میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ البتہ آیت مذکور کی تفسیر ایسے وسیع معنی میں کی جا سکتی ہے کہ جس میں ربائے حلال اور ربائے حرام ہر دو شامل ہیں اور یہ دونوں "انفاق فی سبیل اللہ" کے مقابلے میں رکھے جا سکیں لیکن آیت

Marfat.com

کے الفاظ پر نظر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تفسیر اوّل ہی زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ایسا کام کیا گیا ہے جس کا کوئی ثواب تو نہیں مگر وہ مباح ہے۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ خدا کے نزدیک اس عمل کی پاداش نہیں ہے۔

اس کلام کی رُوح سے روشن ہے کہ یہ ربائے حلال ہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے، جس میں نہ کوئی ثواب ہے نہ گناہ اور اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو خدا کے خشم و غضب کا باعث ہو۔ روایاتِ اسلامی میں اس قسم کے معاملات کی مثالیں موجود ہیں۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ آیت میں جو کلمہ " مضعفون " استعمال ہوا ہے، اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن اس مقام پر " مضاعف کنندہ یعنی بڑھانے والا " کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اُس فرد کے معنی میں ہے جو مضاعف اور کئی گنا اجر پانے والا ہے۔ کیونکہ زبانِ عربی میں بعض اوقات اسم فاعل " مالکِ شے " کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے " موسر " وہ شخص جس کے پاس مال بکثرت ہو۔

یہ امر بھی نظر سے پس پردہ نہ رہے کہ کلمہ " ضعف و مضاعف " عربی زبان میں صرف دوچند کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ دوگنا کے علاوہ کئی گنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے اور لسند آیت کم از کم دس گنا مفہوم ہے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

من جآء بالحسنة فلهٗ عشرُ امثالها (انعام - ۱۶۰)

اور یہ اجر بصورت قرض اٹھارہ گنا تک ملتا ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے:

علی باب الجنة مکتوب القرض بثمانیة عشر والصدقة بعشر

بہشت کے دروازے پر تحریر ہے کہ قرض کا اجر اٹھارہ گنا ہے اور صدقے کا دس گنا ہے۔[1]

اور یہ اجر انفاق فی سبیل اللہ کی صورت میں سات سو گنا تک پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۱ سے یہ ثابت ہے۔

۞ ۞ ۞

زیر بحث آخری آیت میں بار دیگر مبدأ و معاد کا ذکر ہے جو کہ اس سورہ کی بہت سی آیات کا بنیادی موضوع ہے۔ اس آیت میں خدا کو چار اوصاف سے متصف کیا گیا ہے تاکہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات ہو اور وقوعِ معاد پر بھی دلیل قائم ہو۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا ہی کی وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اُس کے بعد تمہارے لیے رزق مہیا کیا، پھر تمہیں وہ مار دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ (الله الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم)۔ جن کو تم نے خدا کا شریک قرار دیا ہے کیا اُن میں سے کسی میں بھی یہ قدرت ہے کہ وہ یہ کام کرسکے؛ (هل من شرکائکم من یفعل من ذالکم من شیء)۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۴ صفحہ ۱۹۰۔

Marfat.com

خدا کی ذات اُن شرکاء سے جو تم اُس کے لیے تجویز کرتے ہو منزّہ اور برتر ہے: (سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون)
یہ اَمر مسلّم ہے کہ مشرکین میں سے کسی کا بھی یہ اعتقاد نہ تھا کہ فاعلِ تخلیق بُت ہیں، یا یہ کہ اُنھیں رزق پہنچانا بُتوں کے اختیار میں ہے یا اُن کی حیات و مرگ کے مُختار وہ ہیں کیونکہ وہ اُن خود ساختہ معبُودوں کو اپنے اور خدا کے درمیان اور شفاعت کنندہ سمجھتے تھے، نہ کہ خالق آسمان و زمین اور نہ روزی دہندہ۔ اِس لیے قرآن میں یہ سوالات استفہام انکاری ہیں اور سوالات کی رُوح جواب میں نفی کی متقاضی ہے۔
اِس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس عہد کے مُشرکین جن سے یہ خطاب ہے وہ حیات بعد الموت کے معتقد نہ تھے تو پھر قرآن کی اِس آیت میں خدا کی تین صفات بیان کر کے حیات بعد الموت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟
ممکن ہے کہ یہ اُسلوب بیان اس وجہ سے ہو کہ (ہم نے مسئلہ معاد کی بحثوں میں ثابت کیا ہے) معاد اور حیات بعد از مرگ ایک فطری امر ہے۔ اِس لیے قرآن نے اُن مشرکین کے معتقدات کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ فطرت انسانی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔
علاوہ بریں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ماہر خطیب جب کسی ایسے شخص سے ہم کلام ہوتا ہے جو کسی مسئلے کا منکر ہے تو وہ اثباتِ حق کے لیے اُس مسئلے کو دُوسرے ایسے حقائق کے ساتھ ملا کر ذکر کرتا ہے جو مدِّ مقابل کے لیے قابلِ قبول ہوتے ہیں اور جب وہ دیکھتا ہے کہ اُس کا نفس اثر پذیری کے لیے آمادہ ہو چکا ہے تو پھر وہ اُس اثبات طلب مسئلے پر قاطعیت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ تاکہ وہ مخاطب کے ذہن نشین ہو جائے اور اُس سے انکار بن نہ پڑے۔
اِن سب اُمور کے علاوہ خدا کی اُس قدرت خلاقی میں جس نے بارِ اوّل زندگی بخشی ہے اور اُس اختیار میں جس سے وہ بعد از مرگ زندگی عطا کرے گا ناقابلِ انقطاع تعلق ہے اور اسی منطقی رابطے کی وجہ سے دونوں زندگیوں کا ایک ہی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔
بہرحال قرآن کہتا ہے: جب کہ (تخلیق رزق، حیات و موت) یہ جُملہ اُمور خدا کے اختیار میں ہیں تو عبادت و پرستش بھی صرف اُسی کی ہونی چاہیئے۔
نیز "سُبحانہٗ و تعالیٰ عما یشرکون" سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اُن مشرکین نے ذاتِ احدیت کے مرتبے کو غیر معمولی طور پر اُس کے مقامِ ارفع سے نیچے گرا دیا تھا اور اس ذات کو اپنے خُود ساختہ معبُودوں کی صف میں جگہ دے دی تھی۔

❁　❁　❁

Marfat.com

۴۱۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ
لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝
۴۲۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ۝
۴۳۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا
مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ۝
۴۴۔ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ
يَمْهَدُونَ ۝
۴۵۔ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ
لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ اُنھیں اُن کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے۔ شاید کہ وہ خُدا کی طرف رجوع کریں۔
۴۲۔ ان سے کہہ دو : زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو تم سے

Marfat.com

پہلے تھے۔ اُن میں سے اکثر مُشرک تھے۔

۴۳۔ تم اس دن سے پہلے جو خدا کی طرف سے آکر رہے گا اور اُسے کوئی روک نہیں سکتا اپنا رُخ مستقیم اور پائیدار دین کی طرف کیے رہو۔ اور اس روز لوگ مختلف جماعتوں میں بٹ جائیں گے۔

۴۴۔ جس شخص نے کفر کیا اُس کا کفر اسی کے لیے زیاں رساں ہے اور جو لوگ کہ اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں وہ (خدا کے اجر و ثواب کو) اپنے ہی فائدے کے لیے مہیا کرتے ہیں۔

۴۵۔ یہ اس لیے ہے تاکہ خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں اپنے فضل سے جزا دے۔ یقیناً وہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

لوگوں کے اعمال ہی سرچشمۂ فساد ہیں:

گزشتہ آیات میں شرک کا ذکر تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ مفاسد کی جڑ توحید کو فراموش کر دینا اور شرک اختیار کرنا ہے۔ اِس لیے زیرِ نظر آیات میں اوّل یہ کہا گیا ہے کہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں خشکی اور تری میں فساد ظاہر ہو گیا ہے۔ (ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس)۔

خدا چاہتا ہے کہ لوگ اپنے اعمال کا ردِّ عمل دیکھیں اور جو کام اُنھوں نے کیے ہیں اُن میں سے بعض کا نتیجہ چکھیں۔ (اس طرح) شاید اُن کی آنکھیں کھُلیں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں: (لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون)۔

یہ آیت فساد اور گناہ کے باہمی ربط کے متعلق ایک وسیع معنیٰ کی حامل ہے۔ انسانوں کے گناہ اور بد اعمالیوں کا یہ نتیجہ نہ تو سرزمینِ مکّہ و حجاز کے لیے مخصوص ہے اور نہ عصرِ پیغمبرؐ کے لیے بلکہ منطقی اصطلاح میں "قضیہ حقیقیہ" ہے جس میں محمول کا موضوع سے ربط و تعلق بیان کیا جاتا ہے۔

بہ الفاظِ دیگر۔ زمین پر جہاں بھی فساد ظاہر ہوتا ہے، وہ لوگوں کی بد اعمالیوں کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ اگر انسان غور کرے تو اس نتیجے میں بھی تربیت کا ایک پہلو ہے تاکہ لوگ اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ دیکھ کر ہوش میں آئیں اور خدا کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت کا پس منظر وہ قحط اور خشک سالی ہے جو پیغمبر کی بد دعا کے نتیجے میں مشرکین مکہ کو پیش آئی تھی۔ اس وقت بارش ہونا بند ہو گئی تھی، بیابان خشک سے خشک تر ہو گئے تھے یہاں تک کہ انھیں بحیرۂ احمر میں مچھلی کا شکار بھی نہیں ملتا تھا۔

بالفرض اگر یہ واقعہ تاریخی طور پر صحیح بھی ہو، تب بھی ایک جزوی واقعہ ہے جس پر آیت صادق آتی ہے اور یہ واقعہ اس آیت کو کسی مخصوص قوم یا جماعت کے فساد و گناہ تک محدود نہیں کرتا، نہ اس کا مصداق کسی خاص زمان و مکان تک ہے اور نہ اِمساکِ باران اور خشک سالی تک محدود ہے۔

اس آیت کے متعلق جو نقطہ نگاہ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اُس سے آشکار ہے کہ اس آیت کی تفسیر کے تحت اہل قلم نے جن محدود اور مقامی واقعات کو اس کا مصداق قرار دیا ہے وہ قابل قبول نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض مفسرین نے زمین پر فساد (" فساد فی البر) سے مُراد قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل مراد لیا ہے اور سمندر میں فساد (فساد فی البحر) سے وہ واقعہ مراد لیا ہے جو حضرت موسیٰ اور خضرؑ میں ہوا کہ ایک بادشاہ نے ملاحوں کی کشتیاں ضبط کر لی تھیں۔

یا یہ کہ بعض مفسرین نے " فساد فی الارض و فساد فی البحر " کے معنی لکھتے ہوئے بانیانِ فساد کا ذکر کر دیا ہے اور ایسے حکمران مراد لیے ہیں جو اپنی اغراض کے لیے زمین اور سمندر کو فساد سے بھر دیتے ہیں۔

اس مقام پر یہ امکان ہے کہ اس قسم کے افراد موجب فساد ہوں، جو دنیا پرست اور خوشامد پسند ہوں اور ان کے زور کی وجہ سے لوگ اُن کی اطاعت اور فرماں برداری کی ذلت کو قبول کر لیں۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ آیت کا احاطۂ مصداق اتنا محدود نہیں ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے " فساد فی البحر " کے معنی میں بھی اختلاف کیا ہے۔ اُن میں سے بعض کا یہ قول ہے کہ " بحر " سے مُراد وہ شہر ہیں۔ جو سمندر کے کنارے واقع ہیں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ " بحر " سے مُراد حاصل خیز، پُر باغ و زراعت کے علاقے ہیں۔ ہمارے نزدیک کلمہ " بحر " کے معنی میں یہ تکلفات بلا دلیل ہیں کیونکہ اس کلمہ کے معنی مشہور ہیں۔ " بحر " سمندر کو کہتے ہیں۔ سمندروں میں کئی طرح سے فساد رُونما ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ سمندر سے جو فوائد پہنچتے ہیں وہ کم ہو جائیں، دُوم یہ کہ اُس کے طوفان و تلاطم سے نقصان پہنچے۔ سوم یہ کہ سمندری لڑائیاں ہوں جیسا کہ آج کل جنگی بحری بیڑے لڑتے ہیں۔ آبدوزیں ہیں جو تباہی لاتی ہیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے :

حیات دواب البحر بالمطر فاذا کف المطر ظہر الفساد فی البحر والبر و ذالک اذا کثرت الذنوب والمعاصی۔

سمندر میں رہنے والی مخلوق کی زندگی کا مدار بارش پر ہے۔ جب بارش نہیں ہوتی سمندر اور خشکی دونوں میں فساد برپا ہو جاتا ہے اور یہ اُس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کے گناہ کثیر ہو جاتے ہیں۔ [1]

---

[1] تفسیر قمی طبق نقل تفسیر المیزان، جلد ۱۶، صفحہ ۲۱۰

Marfat.com

حدیث مذکورہ بالا میں سمندری حیوانات کی زندگی کا جو ربط نزولِ باراں سے بیان کیا گیا ہے وہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جب بارش کم ہوتی ہے تو سمندر میں مچھلیوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے بعض ساحل نشینوں کو کہتے سُنا ہے کہ :-

سمندر کو بارش کا فائدہ صحرا سے زیادہ پہنچتا ہے۔

یہ امر کہ بر و بحر میں فساد رُونما ہونے کا انسانوں کے گناہوں سے کیا ربط ہے، ہمارے پاس اس کی اور توجیہات بھی ہیں۔ جن کا ان شاء اللہ نکات کی بحث میں ذکر آئے گا۔

٭ ٭ ٭

آیت مابعد میں زمین پر سیر کا حکم بایں مصلحت دیا گیا ہے کہ قوموں کے ارتکاب گناہ کی وجہ سے زمین پر ظہور فساد سے جو نتائج رُونما ہوئے اُس کے شواہد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اس ضمن میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو : تم زمین میں سفر کرو اور گزشتہ اُمتوں کے حالات کی تحقیق کرو اور اُن کے اعمال اور اُن کے نتائج کی تفتیش کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ تم سے پہلے جو قومیں ان مقامات میں آباد تھیں اور شرک و انکار پر مُصر تھیں اُن کا انجام کیا ہوا :

(قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة الذین من قبل کان اکثرهم مشرکین) ۔

اُن کے ویران شدہ قصور و محلات کو بہ نظرِ عبرت دیکھو اور دیکھو کہ اُنھوں نے جو خزانے جمع کیے تھے وہ لُٹ چکے ہیں۔ مشاہدہ کرو کہ اُن کی وہ جماعت جسے اپنی قوّت اور توانائی پر ناز تھا پراگندہ ہو گئی ہے اور دیکھو کہ اُن کی قبریں ٹوٹ پھوٹ کر ویران ہو گئی ہیں اور اُن کی ہڈیاں گل سڑ گئی ہیں۔

ذرا دیکھو اور غور کرو کہ اُن قوموں کے شرک اور ظلم و ستم کا انجام کیا ہوا۔ جائے عبرت ہے کہ اگر وہ پرندوں کے آشیانے جلاتے تھے تو اِن صیّادوں کے گھر بھی کیسے برباد ہوئے ہیں۔

" البتہ اُن میں سے اکثر افراد مُشرک تھے": (کان اکثرهم مشرکین) اور یہ شرک اُم الفساد اور اُن کی تباہی کا باعث ہُوا۔

اِس مقام پر یہ امر توجہ طلب ہے کہ آیات ماقبل میں جہاں خدا کی نعمتوں کا ذکر تھا اُس وقت ترتیب یہ تھی کہ پہلے انسان کی تخلیق کو بیان کیا، پھر اُسے روزی دینے کا ذکر کیا (اللہ الذی خلقکم ثم رزقکم) مگر آیات زیرِ نظر میں جب خدا کے عذاب و سزا کا ذکر ہو رہا ہے تو پہلی تنبیہ یہ ہے کہ خدا قوموں کے گناہوں کی سزا میں پہلے تو اُن سے اپنی نعمتیں سلب کر لیتا ہے۔ اُس کے بعد اُن کے شرک کی وجہ سے اُنھیں ہلاک اور نابود کر دیتا ہے۔

یہ ترتیب بایں معنیٰ ہے کہ نعمتِ الٰہی کی پہلی منزل تخلیق ہے اُس کے بعد اپنے بندوں کو روزی رسانی ہے مگر جب وہ اپنی بخشش کو واپس لیتا ہے تو پہلے اُن سے وہ نعمات جو وجہِ حیات ہیں سلب کر لیتا ہے۔ اُس کے بعد اُن سرکش اور گمراہ اقوام کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اِس آیت میں " اکثرهم مشرکین " کہا گیا ہے۔ اِن الفاظ کی وجہ یہ ہے کہ یہ سُورہ مکّی ہے اور اُس

Marfat.com

زمانے میں مسلمان بحیثیت تعداد و شمار اقلیت میں تھے اس لیے اکثرھم مشرکین کہہ کر مسلمانوں میں یہ اطمینانِ قلب پیدا کرنا مقصود تھا کہ مشرکین کی کثرت سے ہراساں نہ ہوں۔ کیونکہ خدا نے گزشتہ زمانوں میں ان جیسے مشرکین کی بڑی بڑی جماعتوں کو تباہ و نابود کر دیا ہے۔ نیز اِن الفاظ میں اُس عہد کے اہلِ طغیان کے لیے تنبیہ بھی ہے کہ جاؤ زمین میں چل کر دیکھو کہ تمہاری ہم مسلک ماقبل قوموں کا کیا انجام ہوا۔

٭ ٭ ٭

چونکہ نصیحت حاصل کرنا، خوابِ غفلت سے بیدار ہونا اور پھر خدا کی طرف رجوع کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے آیت مابعد میں خدا پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف رُوئے سخن کر کے یہ فرماتا ہے: تم اپنا رُخ مستقیم اور پائیدار دین (وہ دین جو توحیدِ خالص کی تعلیم دیتا ہے) کی طرف کیے رہو، اُس دن کے آنے سے قبل جسے ارادۂ الٰہی سے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ خدا کا پروگرام مُعطّل ہو سکتا ہے۔ اُس روز لوگ پراگندہ اور گروہ در گروہ ہو جائیں گے۔ ایک گروہ بہشت میں اور دوسرا گروہ دوزخ میں جائے گا۔ (فاقم وجهك للدين القيم من قبل ان يأتي يوم لا مرد له من الله يومئذ يصدعون)[1]۔

اس آیت میں دین کی صفت "قیّم" بیان کی گئی ہے۔ "قیّم" کے معنی ثابت اور استوار کے ہیں۔

لہٰذا "فاقم وجهك للدين القيم" جملہ تاکیدی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ چونکہ آئینِ اسلام اہلِ عالم کے نظامِ حیات کو استوار اور اُن کی مادی اور رُوحانی حوائج کو پورا کرنے والا ہے۔ لہٰذا اس سے منحرف نہ ہونا۔

نیز یہ کہ آیت کے مخاطب جنابِ رسالت مآبؐ ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبرؐ کو یہ تاکید ہے تو دوسرے سمجھ لیں کہ پھر اُن کی کیا حیثیت ہے۔

نیز یہ کہ آیتِ فوق میں کلمہ "يصدعون" استعمال ہوا ہے۔ یہ فعل مضارع ہے جس کا مادہ "صدع" ہے جس کے وضعی معنیٰ برتن کو توڑنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ کلمہ ہر قسم کی پراگندگی اور تفرقہ کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا۔

اس آیت میں اِس کلمہ کا مفہوم یہ ہے کہ بروزِ قیامت اہلِ بہشت اور مستحق النار لوگوں کے گروہ الگ الگ ہو جائیں گے۔

پھر اِن دونوں جماعتوں کی بھی بہشت کے اور دوزخ کے درجات کے لحاظ سے درجہ بندی ہو جائے گی۔

اس کے بعد آنے والی آیت میں اس امر کی تشریح ہے کہ بروزِ قیامت لوگ کس طرح جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: جس نے کفر کیا اس کا نقصان خود اُسی کو پہنچے گا۔ (من كفر فعليه كفره)۔

---

[1] آیت کے جز "لا مرد له من الله" میں کلمہ "مرد" مصدر میمی ہے مگر اس جگہ بمعنی اسم فاعل استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اس کے یہ معنیٰ ہوں گے "لا راد له من الله" اس مقام پر ضمیر "له" کا مرجع "یوم" ہے لہٰذا اجمالاً جملے کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص بھی خدا کو اس دن کے برپا کرنے سے روک نہیں سکتا۔ یعنی خدا کو بروزِ قیامت کوئی بھی دادرسی، اعمال کی جزا و سزا دینے سے روک نہیں سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو خدا ہی اپنے وعدہ سے پھرنے والا ہے کہ اُس روز حساب کو موقوف کر دے اور نہ کسی غیر ہی میں یہ طاقت ہے۔ پس اُس روز کا آنا حتمی ہے۔ (غور کیجئے گا)

٭ ٭ ٭

Marfat.com

لیکن وہ لوگ جو اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں، وہ اِن اعمال کے ذریعے اجرِ الٰہی کو اپنے لیے مہیا کرتے ہیں:
(ومن عمل صالحاً فلانفسھم یمھدون) ۔
راغب نے مفردات میں لکھاہے کہ " یمھدون " کا مادہ " مھد " (بروزن "عہد") ہے ۔ یہ اسم ہے۔ گہوارہ اور جھولے کو یا شیر خوار بچہ کے سُلانے کی جگہ کو کہتے ہیں ۔
بعدازاں اس کے معنیٰ وسیع ہوگئے اور مھد و مھاد ہر آرام دہ اور آسائش بخش جگہ کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا۔ اسی جہت سے مومنین صالح اور اہلِ بہشت کے لیے یہ کلمہ استعمال کیا گیا ہے ۔
خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ انسان یہ گمان نہ کرے کہ اُس کے ایمان وکفر یا اعمالِ زشت وزیبا کا خدا پر کچھ اثر ہوتا ہے ۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے اعمالِ صالح سے شاد و خوشنود اور اعمالِ سیئہ سے غمگین ہوتا اور تکلیف اُٹھاتا ہے ۔

٭ ٭ ٭

یہ امر توجہ طلب ہے کہ جہاں کفّار کا ذکر ہے، جملہ " من کفر فعلیہ کفرہٗ " پر ہی اکتفا کی گئی ہے لیکن جب اہلِ ایمان کا ذکر آتا ہے تو آیت مابعد میں بالوضاحت یہ بیان ہے کہ اُنھیں صرف بوزن اعمال ہی جزا نہیں ملے گی بلکہ خدا اُنھیں ایسی نعمات کثیر عطا فرمائے گا جو اُس کے فضل وکرم کے شایانِ شان ہیں ۔
مقصود یہ ہے کہ خدا اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں اپنے فضل وکرم سے جزائے خیر دے گا: (لیجزی الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات من فضلہ) ۔
یہ امر مسلم ہے کہ خدا کے اِس فضل سے کفّار مستفید نہ ہو سکیں گے ۔ کیونکہ خدا کفّار کو دوست نہیں رکھتا (انہٗ لایحب الکافرین) ۔
بہرکیف یہ امر بدیہی ہے کہ خدا عادل ہے اِس لیے وہ کفّار اور مشرکین کے ساتھ بھی عدل کے ساتھ سلوک کرے گا۔ اور اُنھیں اتنی ہی سزا ملے گی جتنی کے وہ مستحق ہیں ۔ مگر وہ خدا کے فضل اور اس کی نعمات سے محروم رہیں گے ۔

چند اہم نکات

۱۔ گناہ و فساد کا باہمی ربط : انسان سے جو بداخلاقی یا بداعمالی بھی سرزد ہوتی ہے اُس کا معاشرے کی حالت پر اور اس ذریعے سے افراد کی حالت پر اثر پڑتا ہے اور یہ اثر معاشرے کے اجتماعی نظام میں فساد کا باعث ہوتا ہے ۔
اخلاقی گناہ ، بداعمالی اور قانون شکنی غیر صحت بخش اور مسموم غذا کی مانند ہے جس کا انسان کے نظامِ جسمانی پر مُضر اثر پڑتا ہے اور اُس کے ردِ عمل سے کسالتِ صحت میں مُبتلا ہو جاتا ہے ۔ مثلاً :
دروغ گوئی سے انسان کا اعتماد جاتا رہتا ہے ۔
امانت میں خیانت سے معاشرتی تعلقات خراب ہو جاتے ہیں ۔ آزادی سے ناجائز فائدہ اُٹھانا اِس سے انسان

Marfat.com

میں استبداد اور خود سری کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو آخر کار رنگ لاتا ہے۔ انسان اپنے فرض کو فراموش کر دیتا ہے اور کمزوروں اور زیردستوں کے حقوق سلب کرتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں اُس کے خلاف کینہ اور عداوت کے جذبات اُبھرتے ہیں اور جس معاشرے میں ہر طرف کینہ اور عداوت مسلط ہو اُس کی بُنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔

خلاصۂ تحریر یہ ہے کہ : ہر بدعملی خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر، اُس کا ردِ عمل معاشرہ اور فرد دونوں کے حق میں مُضر ہوتا ہے۔ اِسی لیے آیت " ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس " کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے۔ ("گناہ اور فساد میں یہی فطری ربط ہے")۔

لیکن اِسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو مذکورہ بالا مضرتوں کے علاوہ ایسے زیاں آور اثرات کا سلسلہ بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں کہ نگاہِ ظاہر بیں یہ پہچان بھی نہیں ہوسکتی کہ اُن اثرات کا گناہوں سے کیا ربط ہے۔

مثلاً : روایات میں مذکور ہے کہ " قطع رحم " عمر کو کوتاہ کر دیتا ہے۔ مالِ حرام کھانا قلب کو سیاہ اور زناکاری اور فحاشی کا چلن انسانوں کی فنا کا باعث ہوتا ہے اور روزی کو کم کر دیتا ہے۔[1]

اِس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

من یموت بالذنوب اکثر ممن یموت بالاجال

جو لوگ بسبب گناہ مرتے ہیں اُن کا شمار اُن سے زیادہ ہے جو طبعی موت سے مرتے ہیں۔[2]

قرآن شریف میں ایک اور مقام پر اس مضمون کو ایک اور پہلو سے بیان کیا گیا ہے :

ولو ان اهل القرٰی اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء والارض ولٰکن کذبوا فاخذناهم بما کانوا یکسبون

اگر وہ لوگ جو شہروں اور آبادیوں میں بستے ہیں ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی برکات کھول دیتے۔ لیکن اُنھوں نے تو ہماری آیات کی تکذیب کی تو ہم نے بھی اُنھیں اُن کے اعمال کی سزا دی۔ (اعراف ۹۶)

زیرِ بحث آیت میں کلمہ " فساد " میں مفاسدِ اجتماعی، بلائیں اور سلبِ برکات، تمام چیزیں شامل ہیں۔ اس مقام پر ایک اور نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ زیرِ بحث آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آفات اور بلاؤں کے نزول سے

---

[1] رسول اللہؐ سے ایک حدیث منقول ہے کہ :۔
زنا کی چھ سزائیں ہیں جن میں سے تین دنیا میں ملتی ہیں اور تین آخرت میں۔ دُنیاوی سزائیں یہ ہیں کہ انسان سے نورانیت سلب ہو جاتی ہے اُسے موت جلد آجاتی ہے نیز اس کی روزی منقطع ہو جاتی ہے اور آخرت کی سزائیں یہ ہیں کہ اس سے حساب میں سختی ہوگی، اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ (سفینۃ البحار مادہ زنیٰ)

[2] سفینۃ البحار (مادہ ذنب)

Marfat.com

انسانوں کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح کہ وہ جب اپنے اعمال کے نتائج کو دیکھیں گے تو خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے اور تقویٰ و طہارت اختیار کریں گے۔

ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ جملہ آفات و مصائب اِسی قسم کے ہیں۔ لیکن اُن میں کچھ اس قسم کے فلسفے کے حامل ہیں۔

البتہ ان کے دیگر پہلو بھی ہیں جن کے بارے میں ہم نے متعلقہ مقام پر بحث کی ہے۔[1]

۲۔ **زمین پر سیاحت میں پوشیدہ حکمتیں** : قرآن مجید میں زمین پر سیاحت کا چھ مقام پر ذکر ہے اور وہ ہے سورہ آلِ عمران، انعام، نحل، نمل، عنکبوت اور سُورۂ رُوم میں۔

اِن میں ایک مقام پر یعنی سورۂ عنکبوت کی آیہ بیس میں تو انسانوں کو سیاحت کا اس لیے حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ اُن اسرار و رمُوز کا مشاہدہ کریں جو اللہ کی مخلوقات میں پنہاں ہیں۔

او —— دیگر پانچ مقامات پر یہ ہدایت اس لیے کی گئی ہے تاکہ لوگ دُنیا کی جابر، ستم شعار اور عصیاں کوش اقوام کے دردناک اور بلازدہ انجام کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔

انسانوں کی رُوحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے قرآن میں خصوصیت سے کائنات کی محسوسات و ملموسات کا ذکر کیا گیا ہے قرآن مسلمانوں کو خصوصاً یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی زندگی کے محدُود دائرے سے باہر نکل کے اِس وسیع دُنیا کی سیر و سیاحت کریں۔ وہ دوسری قوموں کے اعمال، اسلوبِ حیات اور رفتارِ زندگی کو دیکھیں اور اس پر بھی غور کر کے عبرت حاصل کریں کہ اقوام و ملل کی کج رفتاری اور عصیاں کوشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر میں شیطانی طاقتوں (طاقتور اقوام) نے اپنے نفع اندوزی کے دامنِ حرص کو پھیلانے کے لیے دُنیا کی تمام اقوام، تمام ممالک اور زمین کے ہر حصّے کی تحقیق کی ہے اور اُن کی تہذیب و تمدن، مادّی ذرائع، صنعت و حرفت اور عسکری صنعت و قوّت غرض ہر پہلو سے تفتیش کی ہے اور پھر اُن کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

قرآن یہ درس دیتا ہے کہ اِن جبّار اور خُون آشام قوموں کے بجائے (اے مسلمانو!) تم زمین پر پھیل جاؤ اور اُن کے شیطانی منصوبوں کے بجائے رحمانی درس حاصل کرو۔

دوسروں کی زندگی سے عبرت حاصل کرنا شخصی تجربے سے زیادہ اہم اور زیادہ قدر رکھتا ہے۔ کیونکہ شخصی تجربہ تو نقصان اُٹھا کر ہی حاصل ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کی زندگی سے زیان و نقصان برداشت کیے بغیر عبرت حاصل ہوتی ہے۔

زمین پر سیاحت کے بارے میں قرآن کا حکم عین اُن اصولوں کے مطابق ہے جو آج کل علمائے علم الانسان نے اختیار کیے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کتاب میں اصولی مسائل پڑھانے کے بعد طلبا کو سیاحت کے لیے لے جاتے ہیں تاکہ وہ بچشمِ خُود مطالعہ کریں۔

البتہ آج کل ایک اور قسم کی سیاحت کا رواج ہوا ہے۔ اس کا نام ٹُورزم TOURISM رکھا ہے۔ اِس سیاحت کا

---

[1] آفریدگارِ جہان — بحث آفات بلاہا۔

Marfat.com

رواج شیطانی تہذیب کی مالک قوموں کی طرف سے کسبِ دولت اور ثروتِ حرام کمانے کے لیے ہوا ہے۔ اُن کے زیادہ تر مقاصد غیر اخلاقی ہوتے ہیں۔ مثلاً نازیبا و ناشائستہ ثقافت کی ترویج، عیاشی، ہوس رانی، عادات کی بے لگامی اور دوسرے ناشائستہ مشاغل۔ اس قسم کی سیاحت تباہ کُن ہے۔

اِس کے برخلاف اسلام اُس قسم کی سیاحت کا حامی ہے جس کا مقصد صحت مند تہذیب کی اشاعت، تجربات سے باہمی استفادہ، جہانِ انسانیت میں اسرارِ تخلیق کی جستجو، عالمِ طبیعی کی تحقیق اور فاسد و ستمگر اقوام کے دردناک انجام سے عبرت حاصل کرنا ہو۔

اِس مقام پر اِس نکتے کا ذکر بے محل نہیں ہے کہ اسلام میں ایک اور قسم کی "سیاحت" اور جہاں گردی کی ممانعت ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے:

لاسیاحۃ فی الاسلام

اسلام میں سیاحت نہیں ہے[1]

اِس حدیث کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے کہ جو تمام عمر یا زندگی کے ایک حصے کے لیے معاشرتی زندگی سے منقطع ہو جاتے تھے اور کوئی حاصل خیز مشغلہ اختیار نہ کرتے تھے۔ بلکہ شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ مارے مارے پھرتے تھے۔ رہبانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور معاشرے پر بوجھ بنے رہتے تھے۔

بہ الفاظ دیگر یہ لوگ "راہبانِ سیار" تھے۔ اُن راہبوں کے بالعکس جو گرجوں میں مقیم رہ کر معاشرتی تعلقات ترک کرکے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جنہیں "راہبانِ ثابت" کہا جاسکتا ہے۔ مگر اسلام ایک عملی دین ہے وہ رہبانیت اور ترکِ دنیا کا مخالف ہے۔ اس لیے وہ اِس قسم کی سیاحت کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

۴۔ دینِ قیّم اور آئینِ محکم : زیرِ بحث آیات میں پیغمبر اکرمؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی کُلّی توجہ اُس آئین کی طرف رکھیں جو مستقیم، محکم اور اُستوار ہے۔ اور جس میں کسی قسم کی کج روی اور راہِ راست سے منحرف ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ نیز اُس کی بُنیادیں غیر متزلزل ہیں۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیات میں "دین" کے اور اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں مثلاً:
سُورۂ یونس کی آیہ ۱۰۵ میں دین کو کلمہ "حنیف" سے متصف کیا گیا ہے۔ (یعنی وہ دین جس میں کسی قسم کی کج روی نہیں ہے)۔

---

[1] مجمع البحرین تحت مادہ سیح۔

رسول اللہؐ سے ایک اور حدیث منقول ہے:

سیاحۃ امتی الغزو والجہاد

یعنی اگر میری اُمت مادی زندگی سے منہ موڑنا چاہتی ہے تو پھر کیوں جہاد کی طرف نہ جاتے اور کیوں بیابانوں میں فضول مرتی پھرے۔

Marfat.com

سورہ زمر کی آیت ۳ میں اُسے " خالص " کہا گیا ہے۔

الا للّٰہ الدّین الخالص

سورہ نحل کی آیت ۵۲ میں کلمۂ " واصب " استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں وہ آئین جو تغیر ناپذیر اور فنا و زوال سے بری ہے: (ولہ الدّین واصبًا)۔

سورہ حج کی آیت ۷۸ میں اسلام کو ایسا آئین بتایا گیا ہے۔ جس میں کسی قسم کی سخت گیری نہیں ہے:

وما جعل علیکم فی الدّین من حرج

اِن صفاتِ مذکورہ میں سے ہر صفت جسم اسلام کا ایک پہلو ہے۔ یہ تمام پہلو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

اِس لیے تتبع کے لیے ایسے ہی دین کو منتخب کرنا چاہیئے اور اُس کی تعلیمات کی تحصیل میں سعی کرنی چاہیئے اور اُس کے تحفظ میں جان لڑا دینی چاہیئے۔

۴۔ **روزِ قیامت ٹل نہیں سکتا** : آیات مذکورہ بالا میں روزِ قیامت کے متعلق یہ ذکر آیا ہے کہ " یومٌ لا مردّ لہ من اللّٰہ " وہ ایسا دن ہے کہ خدا کو اس کے برپا کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ اس کے عمل وقوع میں کوئی حائل ہو سکتا ہے۔ اور نہ کسی میں یہ قدرت ہوگی کہ اُس روز کے محاسبے سے فرار ہو کر پھر دنیا میں آ جائے۔

قرآن کی دُوسری آیات میں بھی روزِ قیامت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ شوریٰ آیت ۴۴ میں مذکور ہے کہ جب ظالم خدا کے دردناک عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے:

ھل الیٰ مردّ من سبیل

کیا کوئی ایسی راہ ہے کہ ہم پھر دُنیا کی طرف لوٹ جائیں ؟

اِسی طرح سورہ شوریٰ کی آیت ۴۷ میں قیامت کی تعریف میں " یوم لا مردّ لہٗ من اللّٰہ کہا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمِ ہستی میں انسان متعدد مراحل سے گزرتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مرحلہ مابعد سے مرحلہ ماقبل کی طرف عود کر جائے، نہ صرف انسان بلکہ جملہ کائنات کے لیے، یہ خدا کی تخلف ناپذیر سنت ہے۔

مثلاً: ایک بچہ جو شکمِ مادر سے عالمِ وجود میں آیا ہے خواہ وہ باعتبارِ ترکیب جسمانی کامل ہو یا ناقص کیا یہ ممکن ہے کہ وہ پھر بصورتِ جنین واپس لوٹ جائے ؟ یا وہ میوہ جو شاخ درخت سے ٹوٹ کر گر گیا ہے، خواہ پختہ ہو یا خام، کیا وہ پھر واپس ہو کر اُسی شاخ سے متوصل ہو سکتا ہے ؟

اِنسان کا اِس جہانِ فانی سے اُس جہانِ باقی کی طرف منتقل ہونا بھی ایسا ہی ہے۔ یعنی یہاں سے انتقال کے بعد پھر کسی طرح بھی اس کی بازگشت نہیں ہو سکتی اور یہی وہ حقیقت ہے کہ انسان اس پر غور کرے تو وہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور یہی حقیقت اُسے خوابِ غفلت سے بیدار کرتی ہے۔

Marfat.com

۴۶۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ
رَّحْمَتِہٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ○

۴۷۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ
بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا
عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

۴۸۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ
كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ
مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ
یَسْتَبْشِرُوْنَ ○

۴۹۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ ○

۵۰۔ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ
اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

Marfat.com

ترجمہ

۴۶۔ اس کی (عظمت و قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو بشارت دہندہ بنا کر بھیجتا ہے تاکہ تمہیں اپنی رحمت کے لطف سے آشنا کرے (اور سیراب کرے) اور اسی کے حکم سے کشتیاں چلیں۔ تم اُس کے فضل سے استفادہ کرو ممکن ہے کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

۴۷۔ ہم نے تم سے پہلے اُن کی قوم کی طرف رسُول بھیجے۔ وُہ اُن کے پاس ہماری روشن دلیلیں لے کر گئے (مگر جب پند و نصائح نے کوئی فائدہ نہ بخشا تو) ہم نے مجرمین سے انتقام لیا (اور ہم نے مومنین کی مدد کی) اور مومنین کی مدد کرنا ہم پر ہمیشہ فرض ہے۔

۴۸۔ وہ خدا ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں پھر اُنہیں آسمان کی وسعت میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور پھر اُنہیں تہ در تہ کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن بادلوں کے بیچ میں سے بارش کے قطرے گرنے لگتے ہیں۔ جب خدا (اس حیات بخش بارش کو) اپنے بندوں میں جنہیں وہ چاہتا ہے، اُن پر برساتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

۴۹۔ ہر چند کہ وہ اس سے قبل کہ اُن پر بارش نازل ہو، مایوس تھے۔

۵۰۔ رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھو کہ وہ زمین کو اُس کی موت کے بعد کس طرح زندہ کر دیتا ہے اور وہی ذات (جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا، بروزِ قیامت) مُردوں کو زندہ کرے گی اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

خدا کے آثارِ رحمت کو دیکھو:

ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ میں دلائل توحید باری تعالیٰ کا قابل لحاظ حصّہ سات آیتوں میں بیان ہوا ہے۔ اُن میں سے ہر آیت "ومن اٰیاتہٖ" کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ ان آیات میں سے چھ پر صفحاتِ ما قبل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اب آخر میں ہم سب سے آخری ساتویں آیت پر غور کرتے ہیں۔

آیت ماقبل الذکر میں ایمان اور عمل صالح کا بیان تھا۔ دلائل توحید بھی اس سلسلے میں برائے تاکید ہوں گے۔

خداوند کریم فرماتا ہے کہ: خدا کی عظمت و قدرت کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہواؤں کو بشارت دہندہ بنا کر بھیجتا ہے۔ (ومن اٰیاتہٖ ان یرسل الریاح مبشرات)۔

وہ ہوائیں بارش کے جلو میں حرکت کرتی ہیں، بادل کے ٹکڑوں کو گھیر کر لاتی ہیں اور باہم پیوست کرتی ہیں۔ پھر اُنہیں خشک اور پیاسی زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ بادل صفحہ آسمان پر چھا جاتے ہیں اور فضا کا درجہ حرارت تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر بارش ہونے لگتی ہے۔

ممکن ہے کہ شہروں میں رہنے والے امیر لوگوں کے لیے بشارت دہندہ ہواؤں کی پیش قدمی زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔ لیکن بیاباں گرد تشنہ کام لوگ جو قطرات باراں کے منتظر اور نیازمند رہتے ہیں اُن کی ذہنی کیفیت مختلف ہے۔

جیسے ہی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور بادلوں کو اپنے ہمراہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ اور دوسرے مقامات کی نباتات پر جو بارش ہو چکی ہے، اس کی خوشبو اپنے ساتھ لاتی ہیں تو اُن ساکنان بیابان کے دل میں برق اُمید چمکنے لگتی ہے۔

اگرچہ آیاتِ قرآنی میں ہواؤں کے عملِ بشارت کو اکثر مقامات پر محض نزولِ باراں سے مختص کیا گیا ہے۔ لیکن — کلمۂ "مبشرات" کو صرف ان ہی معانی میں محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہوائیں اپنے ساتھ دیگر خوش خبریاں بھی لاتی ہیں۔ مثلاً: ہوائیں — فضا کی گرمی اور سردی کو معتدل کر دیتی ہیں۔

ہوائیں — فضا میں پھیلے ہوئے تعفن کو وسیع فضا میں بکھیر کر فضا کو صاف کر دیتی ہیں۔ علاوہ بریں

ہوائیں — سُورج کی تپش کو کم کر دیتی ہیں اور نباتات کو شدتِ حرارت سے جلنے سے محفوظ رکھتی ہیں۔

درختوں سے جو آکسیجن گیس خارج ہوتی ہے، ہوا اُسے انسانوں تک سوغات کی صُورت میں پہنچاتی ہے۔ اور — انسان اپنی سانس سے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج کرتے ہیں اسے نباتات کی خوراک بنا دیتی ہے۔

ہوائیں بہت سی نباتات میں مادۂ تولید کو داخل کرتی ہیں۔ یعنی نر و مادہ کے نطفوں کو باہم محلول کر دیتی ہیں۔

ہوائیں چکیاں چلاتی ہیں اور کاشتکار اُن کے وسیلے سے گندم کو بھوسے سے صاف کرتے ہیں۔

ہوائیں قدرتی نباتات کے بیجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑا کے لے جاتی ہیں اور اُنھیں بیابانوں میں پھیلا دیتی ہیں۔

Marfat.com

ہوائیں ـــ بادبانی کشتیوں کو مسافروں اور بارِ گراں سمیت ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتی ہیں۔ ـــ یہاں تک کہ اِس زمانے میں جب کہ بحری جہاز مشینی ذرائع سے چلنے لگے ہیں، جہازوں کی رفتار پر بادِ شُرطہ یا بادِ مخالف کا اثر پڑتا ہے۔

دریں صُورت ہوائیں مختلف جہات سے انسان کے لیے بشارت آور ہیں۔

آیت کے آخری الفاظ یہ ہیں: خدا چاہتا ہے کہ وہ تمہیں اپنی رحمت کا ذائقہ چکھائے اور یہ کہ کشتیاں اُسی کے حکم سے چلیں اور تم اُس کے فضل سے بہرہ یاب ہو ممکن ہے کہ اس طرح تم اُس کا شکر ادا کرو۔ (ولیذیقکم من رحمتہ ولتجری الفلك بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون)۔

ہوائیں مویشیوں کی پرورش اور کاشتکاری کے لیے گوناں گوں نعمات کا باعث ہیں، نیز وہ حمل و نقل کا وسیلہ بھی ہیں۔ نتیجتہً تجارتی امور میں پیش رفت کا سبب ہوتی ہیں۔ قرآن میں ان فوائد کی طرف تین جُملوں سے اشارہ کیا گیا ہے:

اوّل: لیذیقکم من رحمتہ

دوم: لتجری الفلك بامرہ

سوم: لتبتغوا من فضلہ

توجہ طلب یہ امر ہے کہ یہ سب برکات اُس وقت نمودار ہوتی ہیں جب ہوا کرۂ زمین پر حرکت کرتی ہے۔

مگر انسان کسی نعمت کی بھی اُس وقت تک قدر نہیں کرتا جب تک وہ اس سے سلب نہ ہو جائے۔ جب تک ہوا بند نہیں ہو جاتی تو اُس وقت تک انسان کو شعور نہیں ہوتا کہ اُس پر کون سی نعمت نازل ہو رہی ہے۔ اگر انسان خوبصورت ترین باغ میں بھی بیٹھا ہو اور ہوا چلنی بند ہو جائے تو وہ جگہ اُس کے لیے نمونہ زنداں بن جاتی ہے۔ اور اگر قید خانے میں بھی نسیم جاں بخش چلے تو وہ جگہ راحت بخش ہو جاتی ہے۔ قید خانے میں تکلیف کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہاں تازہ ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔

اگر سمندروں کی سطح پر ہوا بند ہو جائے اور تموّج بحر ساکت ہو جائے تو سمندری مخلوق کی زندگی آکسیجن کی کمی کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے۔ اور سمندر ایک گندے پانی کا تالاب بن جائے۔

فخرالدین رازی کہتے ہیں کہ "ولیذیقکم من رحمتہ" میں نکتہ یہ ہے کہ چکھائی تھوڑی سی چیز جاتی ہے۔ جس سے مُراد یہ ہے کہ خدا کے نزدیک یہ تمام دنیا اور اس کی نعمتیں نہایت قلیل ہیں اور خدا کی رحمت واسعہ دوسری دُنیا کے لیے مخصوص ہے۔

* * *

اِس کے بعد کی آیت میں پیغمبرانِ الٰہی کی بعثت کا ذکر ہے۔ مگر آیت ۴۸ میں پھر ہواؤں کے چلنے کا بیان آجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آیت ۴۷ کا ایسی دو آیات کے درمیان واقع ہونا جن میں ہواؤں کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے، محض جملہ معترضہ کے طور پر ہو۔ جیسا کہ اس کے متعلق بعض مفسّرین کی بھی یہی رائے ہے۔

علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ ان مباحث کے ساتھ مسئلہ نبوّت کا ذکر مبدأ و معاد کے مسائل کی تکمیل کے نقطۂ نظر

Marfat.com

سے ہو۔ جن کا اس سورہ میں مکرر ذکر ہوا ہے (جیسا کہ بعض دیگر مفسرین کی رائے بھی ہے)۔
نیز یہ امکان بھی ہے کہ یہ ذکر اُن لوگوں کی تنبیہ کے لیے ہو جو خدا کی نعمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہوئے بھی کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔
بہر حال آیت نمبر ۴۷ میں فرمایا گیا ہے : ہم نے تم سے پہلے بھی اُن کی قوم کی طرف رسول بھیجے۔ (ولقد ارسلنا من قبلك رسلاً الی قومھم)۔
اور یہ رسول اُن اقوام کے پاس معجزات اور روشن و آشکار عقلی دلائل لے کر آئے۔ (فجاءوھم بالبینات)۔
اُن اقوام میں سے ایک جماعت تو ایمان لائی اور ایک گروہ مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن جب اِن کفار پر پندو نصائح اور تنبیہات کا کچھ اثر نہ ہوا تو پھر ہم نے مجرموں سے انتقام لیا: (فانتقمنا من الذین اجرموا)۔
مگر ہم نے مومنین کی مدد کی اور مومنین کی مدد کرنے کا فرض ہم پر ہمیشہ عائد ہوتا ہے: (وکان حقاً علینا نصر المؤمنین)۔
جملہ بالا میں کلمہ "کان" استعمال ہوا ہے جو اس سُنّتِ الٰہی کے محکم ہونے کی علامت ہے۔ اس کے بعد کلمہ "حق" استعمال ہوا ہے اور پھر "علینا" جو کہ حق کی توضیح کرتا ہے۔ کلمات کی یہ ترتیب درحقیقت اس موضوع کے لیے پے درپے تاکیدات ہیں۔
ترتیب الفاظ میں "حقاً علینا"۔ "نصر المؤمنین" پر مقدم ہے۔ جو حصر کی دلیل ہے اور تاکید مؤکد ہے۔ اس مقام پر حصر و تاکید سے مراد یہ ہے کہ بطور مسلّم ہم نے مومنین کی مدد کرنا اپنا فرض قرار دیا ہے اور مومنین کے لیے کسی اور کی مدد کی احتیاج کے بغیر ہم اپنے وعدے کو عملی جامہ پہنائیں گے۔
یہ جملہ ضمنی طور پر اُن مسلمانوں کی دلجوئی اور تسلّی کے لیے ہے جو اُس زمانے میں کفارِ مکہ کی ایذا رسانیوں کے تحت سخت مبتلائے مصائب تھے۔ یہ کفار تعداد اور وسائل میں بہت آگے تھے۔
اگر نفسیاتی نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دشمنانِ خدا کا گناہ و عصیان میں مبتلا ہونا ہی مومنین کی فتح و نصرت کی دلیل ہے۔ کیونکہ یہی گناہ اور انحراف ازراہِ راست بطور کیفر کردار اُن کفار کے وجود کا استیصال کر دے گا یعنی اُن کا گناہ ہی اُن کی نابودی کے اسباب مہیا کر دے گا اور اُن پر خدا کا عذاب نازل ہو گا۔

ٌ　ٌ　ٌ

اس کے بعد آیت ۴۸ میں پھر ہوا چلنے کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : وہ خدا ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لائیں: (اللہ الذی یرسل الریاح فتثیر سحاباً)۔
پھر وہ بادلوں کو آسمان کی وسعت میں اپنی مصلحت کے مطابق پھیلا دیتا ہے: (فیبسطہ فی السماء کیف یشاء)۔
پھر اُن بادلوں کے ٹکڑوں کو مجتمع کر کے تہ بہ تہ کر دیتا ہے: (ویجعلہ کسفاً)[1]۔

---

[1] کسف جمع کِسفَہ (بروزنِ جلد) بمعنی قطعہ اس مقام پر بادل کے وہ ٹکڑے مراد ہیں جو تہ در تہ ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے بادل بھاری ہو کر برسنے لگتا ہے۔

Marfat.com

تم دیکھتے ہو کہ اُس بادل کے ہجوم میں سے قطراتِ باراں خارج ہوتے ہیں: (فتری الودق یخرج من خلاله)[1]

قدرت نے نزول باراں کے لیے ہوا کو ایک پورا منصوبہ سونپ دیا ہے۔ اس پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ سمندر سے بادلوں کے ٹکڑوں کو خشک اور پیاسی زمین کی طرف لاتی ہے۔ پھر اُنھیں صفحۂ آسمان پر پھیلا دیتی ہے۔ بعدازاں اُن کو الگ الگ تہ درتہ جمع کردیتی ہے۔ پھر بادلوں کے اطراف کے ماحول کو سرد کرکے بادلوں کو برسنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

بادلوں کی مثال تجربہ کار " چوپانوں" کی سی ہے کہ وہ جنگل میں چرنے والی بھیڑوں کو اِدھر اُدھر سے جمع کرتے ہیں۔ پھر اُنھیں معین راستے پر ہانکتے ہیں۔ پھر باڑے میں لاکر اُن کا دُودھ دوہتے ہیں۔

جملہ — فتری الودق یخرج من خلاله

جس کے معنٰی یہ ہیں کہ " تو بارش کے خرد ترین قطرات کو دیکھتا ہے جو گھنگور گھٹا سے برستے ہیں۔"

ممکن ہے کہ اِس بیان سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہو کہ بادلوں کا حجم اور ہوا کی شدّتِ حرکت اس حد تک نہیں ہے کہ وہ قطرات باراں کو ٹپکنے اور زمین پر آنے سے روک لیں۔ بلکہ پانی کے یہ چھوٹے چھوٹے ذرات اُس طوفان اَبرو باد کے باوجود جس نے فضائے آسمان کو گھیر رکھا ہے، زمین پر آنے کے لیے اپنا راستہ بنا لیتے ہیں۔ یہ قطرات باراں پیاسی زمین پر آہستہ آہستہ اس طرح گرتے ہیں کہ زمین سیراب ہو جاتی ہے اور کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچتا۔

ہوا کا وہ طوفان جو بڑے بڑے درختوں کو اُکھاڑ پھینکتا اور پہاڑوں کی چٹانوں کو ہلا دیتا ہے، وہ بارش کے لطیف اور ننھے ذرات کو اپنے درمیان سے گزرنے دیتا ہے تاکہ وہ زمین تک پہنچ جائیں۔

اِس مقام پر یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں تو آنکھ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ الگ الگ ٹکڑے ہیں۔ لیکن — جس وقت ہم ہوائی جہاز کے ذریعے بادلوں کے بیچ میں سے گزرتے ہیں یا اُن کے اُوپر پہنچ جاتے ہیں تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اِن کے ٹکڑے الگ الگ ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا اس حیات بخش بارش کو اُن بندوں تک پہنچاتا ہے (جنہیں وہ یہ نعمت بخشنا چاہتا ہے) تو وہ خوش ہو جاتے ہیں: (فاذا اصاب به من یشآء من عباده اذا ھم یستبشرون)۔

❊ ❊ ❊

ہر چند کہ وہ لوگ نزولِ باراں سے قبل مایوس اور نااُمید تھے: (وان کانوا من قبل ان ینزّل علیھم من قبله لمبلسین)[2]

اس مایوسی اور اس بشارت کا وہی لوگ اچھی طرح ادراک کرسکتے ہیں کہ جن کی زندگیوں کا انحصار بیاباں گرد عربوں کی طرح اِن قطرات باراں ہی پر ہے۔

جس وقت یاس اور نااُمیدی نے ایسے لوگوں پر اپنا منحوس سایہ ڈالا ہوا ہوتا ہے اور وہ خود، اُن کے پالتو جانور اور

---

[1] وَدْق (بروزن حلق) پانی کے غبار کی مانند چھوٹے چھوٹے ذرات۔ یا بارش کے پراگندہ قطرات۔
[2] مبلس مادہ "ابلاس" بمعنی یاس و نا امیدی

Marfat.com

مزروعہ زمین بوجہ قحط آب تشنہ ہوتی ہیں کہ اتنے میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلتا ہے جو بارش کا پیش رو ہوتا ہے۔ وہ ہوائیں بارش کی خوشبو اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ چند لمحے ہی گزرتے ہیں کہ آسمان پر بادل پھیل جاتے ہیں، وہ گھنگور اور بھاری ہو جاتے ہیں اور برسنے لگتے ہیں۔ گڑھے صاف پانی سے بھر جاتے ہیں۔ چھوٹی بڑی ندیاں اس نعمت سماوی سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ خشک زمینوں اور ان بیابان گرد لوگوں کے دلوں میں تازہ زندگی کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، دلوں میں اُمید کی بجلی چمکنے لگتی ہے۔ دلوں سے نا اُمیدی اور مایوسی ڈھل جاتی ہے۔

اِس آیت میں کلمہ "قبل" کی تکرار غالباً تاکید کے لیے ہے۔ منشاء یہ ہے کہ بارش سے چند لمحے پہلے جی ہاں چند لمحے پہلے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ لیکن جیسے ہی بارش ہوتی ہے، اُن خشک لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ دیکھیے! انسان کتنا کمزور موجود ہے اور اس کا خدا کس قدر مہربان ہے۔

فارسی زبان میں تاکید کے لیے زمانے کا مکرر ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً ـــــ ہم کہتے ہیں کہ "کل تک" جی ہاں کل ہی تک" فلاں شخص میرا دوست تھا۔ مگر اب سخت دشمن ہو گیا ہے۔ اس تکرار سے انسان کی تغیر حالت کا اظہار منظور ہوتا ہے۔

ﷺ ﷺ ﷺ

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت میں پیغمبر اسلامؐ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ : رحمتِ الٰہی کے آثار کو دیکھو کہ وہ زمین کو اُس کی موت کے بعد کس طرح زندہ کرتا ہے۔ (فانظر الٰی اٰثار رحمۃ اللہ کیف یحی الارض بعد موتھا)۔

کلمہ "فانظر" استعمال کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ نزولِ باراں کے سبب سے جب مُردہ زمین زندہ ہوتی ہے تو اُس میں رحمتِ الٰہی کے آثار اِس قدر نمایاں اور آشکار ہیں کہ انسان کو بغیر جستجو سرسری نظر سے دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ بارش کو "رحمتِ الٰہی" کہا گیا ہے۔ یہ باعتبار نتیجہ ہے کیونکہ وہ مختلف جہات سے باعثِ برکت ہے۔ مثلاً:

بارش ـــ خشک زمین کی آبیاری کرتی اور نباتات کے بیجوں کی پرورش کرتی ہے۔

بارش ـــ درختوں کو حیات تازہ بخشتی ہے۔

بارش ـــ ہوا کو گرد و غبار سے پاک کر دیتی ہے اور انسان جس ماحول میں جیتا ہے اُسے دھو کر صاف کر دیتی ہے۔

بارش ـــ نباتات کو دھو کر اُنھیں طراوت بخشتی ہے۔

بارش ـــ ہوا کو مرطوب و ملائم اور ہلکا کر کے انسان کے سانس لینے کے قابل بنا دیتی ہے۔

بارش کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد چشموں اور کاریز کی صورت میں زمین پر بہنے لگتا ہے۔

بارش سے سیلاب آتا ہے۔ نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ یہ پانی جب ڈیم میں جمع ہو جاتا ہے تو اس سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ جس سے روشنی حاصل ہوتی ہے اور مشینوں کو حرکت دی جاتی ہے۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی بارش کو "رحمت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اِن مقامات میں سے سورہ فرقان کی آیت ۴۸ اور سورہ نمل کی آیت ۶۳ ہے۔

Marfat.com

سورہ شوریٰ کی آیت ۲۸ میں مذکور ہے :-

وھوالذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ

وہ خدا ہی کی ذات ہے جو بارش کو نازل کرتی ہے۔ اس کے بعد کہ لوگ
نااُمید ہوگئے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے۔

اس کے بعد اس تعلق کی جہت سے جو مبدأ و معاد کا اس قسم کے مسائل سے ہے، آیت کے آخر میں اس بات کا اضافہ کیا گیا ہے : جس ذات نے مردہ زمین کو نزولِ باراں سے زندہ کر دیا وہی بروز قیامت مردوں کو بھی زندہ کرے گا۔ اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ (ان ذالك لمحی الموتیٰ وھو علیٰ کل شیءٍ قدیر)۔

اس مقام پر فعل مضارع کے بجائے " محی " اسم فاعل استعمال ہوا ہے۔ جس کے پہلے لام تاکید ہے۔ اس سے انتہائی تاکید مقصود ہے۔

آیاتِ قرآنی میں ایسا بارہا نظر سے گزرا ہے کہ مسئلہ معاد کو ثابت کرنے کے لیے یہ واقعہ بطور شہادت پیش کیا گیا ہے کہ مُردہ زمین نزول باراں کے بعد زندہ ہو جاتی ہے ـــــ چنانچہ ـــ سورہ ق کی آیت ۱۱ میں مُردہ زمینوں کی زندگی کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے :

کذالك الخروج

بروز قیامت مردوں کا زندہ ہونا بھی اسی کی مانند ہے۔

نیز سورہ " فاطر " کی آیت ۹ میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے :

کذالك النشور

بروز قیامت نشور اسی طرح ہوگا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ قانونِ حیات و مرگ ہر مقام پر یکساں ہے۔ اللہ کی ذاتِ پاک جو بارش کے چند قطرات سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور اُس میں جوشِ نمو اور حرکتِ بالیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ قدرت کے اس عمل کی ہر سال اور کبھی ہر روز تکرار ہوتی رہتی ہے۔ اُسی ذات میں یہ قدرت ہے کہ موت کے بعد انسانوں کو بھی زندہ کر دے۔ حق یہ ہے کہ ہر شکل میں موت و حیات اُسی کے اختیار میں ہے۔

یہ درست ہے کہ ظاہراً زمین زندہ نہیں ہوتی بلکہ " حیاتِ ارض " کا مفہوم یہ ہے کہ نباتات کے جو بیج زمین میں پنہاں ہوتے ہیں وہ پرورش پاتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے بیج زمین کے اجزاء کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور یہ اجزاء رُوحِ نباتی بن کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ نیز ان ہی نباتات کے منتشر اور پاشیدہ اجزاء از سرِنو زمین کو قوتِ حیات بخشتے ہیں۔

درحقیقت منکرین معاد کے پاس بجز استبعاد کے اور کوئی دلیل نہ تھی اور قرآن مجید میں ان کے استبعاد کی نفی اور شکست کے لیے ایسی مثالیں دی گئی ہیں۔

❊ ❊ ❊

Marfat.com

۵۱۔ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ۝

۵۲۔ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا
مُدْبِرِيْنَ ۝

۵۳۔ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ
اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

۵۴۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ
ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ
مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ۝

ترجمہ

۵۱۔ اگر ہم (گرم اور جلانے والی) ہوا بھیجیں کہ اُس کے اثر سے وہ اپنی زراعت اور باغات کو زرد اور پژمردہ دیکھیں تو وہ ناشکری کرنے لگتے ہیں۔

۵۲۔ اور تم مُردوں کو اپنی بات نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں کو جب وہ مُنہ موڑ لیں۔

۵۳۔ اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گم راہی سے نکال کر ہدایت کر سکتے ہو۔ تم صرف اُن ہی لوگوں کو اپنی بات سُنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

۵۴۔ وہ خدا ہی ہے جس نے تمہیں کمزور حالت میں پیدا کیا۔ پھر کمزوری کے بعد اُس نے قوت عنایت کی۔ پھر قوت کے بعد کمزوری اور پیری کا وقت دیا۔ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ علیم و قدیر ہے۔

تفسیر

مُردے اور بہرے تیری بات نہیں سُنتے:

ازبسکہ گزشتہ آیات میں بابرکت ہواؤں کا ذکر تھا جو پُر برکت بارشوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں مگر زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت میں زیاں رساں ہواؤں کا ذکر ہے۔ اِس ضمن میں خدا فرماتا ہے اگر ہم ہوا بھیجیں (کہ جو گرم اور جُھلسا دینے والی یا سرد و خشک ہو) اور اُس کے اثر سے یہ لوگ اپنے باغات اور زراعت کو زرد اور پژمردہ دیکھیں تو ناشکر گزاری کرنے لگتے ہیں اور اِس روش پر قائم رہتے ہیں: (ولئن ارسلنا ریحاً فرأوہ مصفرًا لظلوا من بعدہ یکفرون)۔

یہ لوگ کم ظرف ہیں۔ اِن کا حال یہ ہے کہ نزولِ باراں سے قبل مایوس اور شکستہ خاطر ہوتے ہیں اور جب مینہ برس جاتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی دن لُو چلنے لگے اور وقتی طور پر وہ اذیت میں مبتلا ہو جائیں تو فریاد کرنے لگتے ہیں اور خدا کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔

اِس کے برعکس راست باز مومنین کا یہ حال ہے کہ جب اُنھیں خدا کی کوئی نعمت ملتی ہے تو شکر کرتے ہیں اور مصیبتوں میں صبر کرتے ہیں۔ مادّی زندگی کے نشیب و فراز سے اُن کے ایمان میں ذرہ بھر خلل نہیں پڑتا۔ اور ضعیف الایمان کور دلوں کی طرح ہوا کے ایک موافق جھونکے سے مومن اور دوسرے مخالف جھونکے سے کافر نہیں ہو جاتے۔

کلمہ "مصفرًا" کا مادہ "صفرہ" (بوزن "سفرہ") ہے۔ اِس کے معنیٰ زرد رنگ کے ہیں۔ بعض مفسّرین کے نزدیک "راٰوہ" کی ضمیر کا مرجع درخت اور گھاسیں ہیں جو مضرت رساں ہوائیں چلنے سے بہت جلد پژمردہ اور زرد ہو جاتی ہیں۔

بعض مفسّرین کا یہ خیال ہے کہ "راٰوہ" کی ضمیر کا مرجع اَبر ہے کیونکہ زرد رنگ کے بادل نازک ہوتے ہیں جو برستے نہیں ہیں۔ ان کے برخلاف کالے اور گھنے بادل خُوب برستے ہیں۔

بعض مفسّرین اِس ضمیر کا مرجع "ریح" (ہوا) کو سمجھتے ہیں کیونکہ معمول کی ہوائیں تو بے رنگ ہوتی ہیں لیکن بادِ سموم جو بیابان کا گرد و غبار بھی اپنے ساتھ اُڑا لاتی ہے، زرد رنگ کی ہوتی ہے۔

اِس مقام پر ایک اور احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کلمہ "مصفر" کے معنیٰ "خالی" بھی ہیں۔ جیسا کہ راغب اصفہانی

Marfat.com

نے مفردات میں لکھا ہے کہ خالی برتن، غذا سے خالی پیٹ یا خون سے خالی رگوں کو " صفر " (بروزنِ سفر) کہتے ہیں۔
بنا برایں " مصفر " کا معنیٰ ہے " وہ ہوائیں جو بارش سے خالی ہوں۔
اس صورت میں " رأوہ " کی ضمیر کا مرجع " ریح " (ہوا) ہے (یہ مقام غور طلب ہے)۔ ہمارے خیال میں تفسیرِ اوّل سب سے زیادہ مشہور ہے۔
اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ برسنے والی اور مفید ہواؤں کے لیے " ریاح " کلمہ جمع استعمال ہوا ہے۔ لیکن زیاں رساں ہوا کے لیے کلمہ مفرد " ریح " آیا ہے۔
اس کی یہ وجہ ہے کہ اکثر ہوائیں مفید ہی ہوتی ہیں اور بادِ سموم کبھی کبھی مہینوں یا سالوں میں ایک مرتبہ چلتی ہے۔ لیکن مفید ہوائیں تو ہمیشہ چلتی ہی رہتی ہیں۔
یا ممکن ہے کہ " ریاح " بصورتِ جمع اس لیے استعمال کیا گیا ہو کہ مفید ہواؤں کا اس صورت میں مفید اثر ہوتا ہے کہ پے در پے چلتی رہتی ہیں۔ جب کہ مُضر ہوا ایک ہی مرتبہ چل کر اپنا تباہ کن اثر چھوڑ جاتی ہے۔
اس آیت کے ذیل میں ایک آخری نکتہ قابلِ ذکر یہ ہے کہ آیت نمبر ۴۸ میں کلمہ " یستبشرون " جو نفع بخش ہواؤں کے ذکر میں استعمال ہوا ہے اور جملہ " لظلوا من بعدہ یکفرون " (اس کے بعد وہ اپنے کفر پر قائم رہتے ہیں) اس آیت میں آیا ہے۔ ان دونوں کا فرق قابلِ لحاظ ہے۔
ان کلمات کے استعمال میں جو تفاوت ہے اُس سے ثابت ہے کہ ایسے بندے بھی ہیں کہ جب وہ خدا کی پے در پے نعمتوں کو دیکھتے ہیں تو خوش ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ ایک دن کے لیے یا صرف ایک بار کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں تو شکایت کرنے اور رونے دھونے لگتے ہیں اور کفر کی طرف اس طرح مائل ہو جاتے ہیں۔ گویا اُنھوں نے کبھی اسے چھوڑا ہی نہ تھا۔
ان لوگوں کی مثال ایسے افراد کی سی ہے کہ جو ساری عمر صحت مند اور سلامتی سے رہتے ہیں۔ مگر کبھی خدا کا شکر ادا نہیں کرتے۔ لیکن — اگر کبھی ایک رات کے تیز بخار میں مبتلا ہو جائیں تو جو کفر اور اَن کہنی بھی اُن کی زبان پر آتی ہے، بکتے رہتے ہیں اور بے دانش اور ضعیف الایمان لوگوں کا یہی حال ہے۔
اس موضوع پر ہم نے اسی سورہ کی آیت ۳۵ اور سورہ ہُود کی آیت ۹، ۱۰ اور سُورہ حج کی آیت ۱۱ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

❁ ❁

اس کے بعد کی دو آیات میں آیت ما قبل کے مضمون کی مناسبت سے انسانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:
اوّل: وہ لوگ جو اگرچہ جسمانی اعتبار سے زندہ ہیں لیکن باعتبار قلب و رُوح مُردہ ہیں کہ وہ ادراکِ حقائق سے قاصر ہیں۔
دوم: وہ لوگ کہ اُن کے کان تو ہیں مگر وہ کلمۃ الحق سُننا نہیں چاہتے۔

Marfat.com

سوم : وہ گروہ جن کی آنکھیں چہرۂ حق کو دیکھنے سے محروم ہیں
چہارم : راست باز مومنین کا گروہ جو دلہائے دانا، گوشہائے شنوا اور چشم ہائے بینا رکھتے ہیں ۔
پہلی بات یہ کہی ہے کہ : اپنی حق باتیں مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور جن کے قلب مُردہ ہو چکے ہیں اُن پر تمہاری نصیحتوں کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ (فانك لا تسمع الموتٰی) ۔
نیز یہ کہ "تم اپنی بات بہروں کو بھی نہیں سُنا سکتے۔ بالخصوص اُس وقت کہ جب وہ کلمۂ حق سُننے سے پُشت پھیر لیں" (ولا تسمع الصمّ الدعآء اذا ولوا مدبرین) ۔
اسی طرح تمہارے امکان میں یہ بھی نہیں کہ تم اندھوں کو گمراہی سے نکال کر راہِ راست کی ہدایت کرو: (وما انت بهادی العمی عن ضلالتهم) ۔
تم اپنے کلماتِ حق صرف اُن لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں: (ان تسمع الّا من یؤمن بایاتنا فهم مسلمون) ۔
جس طرح کہ ہم نے اس سے قبل بھی کسی مقام پر کہا ہے کہ قرآن مادی حیات و مرگ اور ۔ ظاہری بینائی اور سماعت کے علاوہ ایک برتر حیات و مرگ اور دید و شنید کا قائل ہے کہ انسان کی سعادت اور بدبختی کا انحصار ان آخرالذکر حواسِ باطنی پر ہے ۔
جس شخص کا دل بیدار ہے اس کی نظر مادی اور جسمانی فوائد پر نہیں رہتی بلکہ اُس کا نقطۂ نگاہ رُوحانی اور معنوی ہوتا ہے ۔
ادراکِ حقیقت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کا قلب آمادہ ہو اور اُس کی آنکھ بینا اور کان سُننے والے ہوں ۔
اگر کسی شخص کا دل کثرتِ گناہ ، دماغ کی سنگینی اور غرور کی وجہ سے مُردہ اور اس کی رُوح خوابیدہ ہو چکی ہے اور اُس میں ادراکِ حقیقت اور امتیازِ حق و باطل کی استعداد ہی نہیں رہی ، تو اگر تمام انبیاء اور اولیاء بھی جمع ہو کر تمام آیاتِ الٰہی اُسے سُنائیں تو اُس پر کچھ بھی اثر نہ ہو گا ۔
اگر قرآن میں حواسِ خمسہ میں سے صرف دو حواسِ ظاہر کا اور قوّتِ ادراک کا ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عالمِ خارجی سے جو معلومات حاصل کرتا ہے اُن کا بیشتر حصہ اِن ہی دو حواس (بصارت و سماعت) یا وجدان اور تحلیلِ عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ۔
یہ امر توجہ طلب ہے کہ آیاتِ بالا میں راہِ راست سے انحراف اور عدمِ ادراکِ حقیقت کے تین مراحل بیان کیے گئے ہیں جن میں سے مرحلہ اول یعنی حالتِ مرگ ، شدید ہے اور مرحلہ سوم یعنی نابینائی خفیف ہے ۔
مرحلہ اول : " دل کی موت " ہے کہ قرآن میں مُردہ دل لوگوں کو " موتی " کہا گیا ہے کہ اُن کے اندر نفوذِ حق کا کوئی امکان ہی نہیں ہے ۔
مرحلہ دوم : " عدمِ سماعت " ہے ۔ بالخصوص وہ بہرے کہ جنھوں نے کلمۃ الحق سے رُوگردانی کر لی ہے اور دُور بھاگ رہے ہیں ۔ اُن کی گراں گوشی کا یہ حال ہے کہ نزدیک کی شدید چیخ پکار اُن کے کانوں پر جس کے اثر ہونے کا امکان

Marfat.com

ہو سکتا تھا اُن پر اُس کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

البتہ ان بہروں کا گروہ مردوں کے مانند نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کبھی علامت یا اشارے سے اُنھیں کوئی بات سمجھائی جاسکے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے حقائق ایسے ہیں کہ اُنھیں ایماء و اشارہ سے سمجھایا نہیں جاسکتا۔ بالخصوص اس حالت میں کہ مخاطب پُشت پھیر لے۔

مرحلہ سوم: عدم بصارت (نابینائی) ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اندھوں کے ساتھ، مُردوں کی نسبت، زندگی بسر کرنا آسان تر ہے کیونکہ کم ازکم ان کے کان تو کھلے ہوتے ہیں اور اُن کے سامنے بہت سے مطالب بیان کیے جاسکتے ہیں۔

مگر ـــ پھر بھی:

دیکھنا اور سُننا برابر تو نہیں۔

علاوہ بریں اندھے کے سامنے کسی شے کی کیفیت کا بیان کر دینا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ مادی اشیا کی حقیقت اُن کے دیکھے بغیر سمجھ میں نہیں آتی۔ بعض بسیط تصورات کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً اندھے سے کہا جائے کہ دائیں طرف یا بائیں طرف چلو تو اس حکم پر عمل کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات معمولی سی غلطی سے وہ کسی گڑھے میں جا گرے گا۔

قرآن مجید میں "موت و حیات" کا جو تصور ہے ہم نے اُسے سورہ نحل کی آیات ۸۰ اور ۸۱ کے تحت بالتشریح بیان کیا ہے۔ اور وہابیوں کے اس کمزور اعتراض کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو وہ پیمبر اکرمؐ اور آئمہؑ سے توسل کے خلاف ان آیات زیرِ بحث اور دیگر آیات کے حوالے سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان آیات سے ثابت ہے کہ مُردے مُطلقاً کچھ نہیں سمجھتے مگر ہم نے ثابت کیا ہے کہ "انسان" اور خصوصاً پیشوایانِ بزرگ اس دُنیا سے سفر کرنے کے بعد ایک "برزخی زندگی" گزارتے ہیں۔ قرآن اور احادیث کی بہت سی اسناد اِس پر گواہ ہیں اور حیاتِ برزخی میں اُن کی استعدادِ ادراک و بصیرت حیاتِ دُنیاوی کی نسبت وسیع تر ہو جاتی ہے۔

(مزید توضیح کے لیے جلد ۱۵ میں آیات مذکورہ کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے)۔

اس مقام پر ہمیں اس جُملے کا اضافہ بھی کرنا چاہیئے کہ تمام مسلمان اپنی نمازوں میں تشہد پڑھتے وقت پیمبر گرامیؐ کو مخاطب کر کے اُن پر اِن الفاظ سے سلام بھیجتے ہیں: "السلام علیك ایها النبی و رحمة الله و برکاته"۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ تخاطب حقیقی ہے نہ کہ مجازی اور سلام اُس ذات کے لیے ہے جو سُنتی اور ادراک کرتی ہے۔ اس لیے پیمبر اکرمؐ کو بصورتِ خطاب سلام کرنا اِس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کی رُوحِ مقدس ہم سب کے سلاموں کو سُنتی ہے۔ اور کسی جہت سے بھی ہم اِن خطابوں کو مجاز پر محمول نہیں کرسکتے۔

⁂

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت جس میں توحید باری تعالیٰ کی دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو دلیل فقر و غنا کہلاتی ہے اِس دلیل سے خُدا اِن تمام دلائل کی جو اثباتِ توحید کے لیے اس سورۃ میں بیان ہوئے ہیں تکمیل کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے: ذاتِ الٰہی وہی ہے جس نے تم کو جب پیدا کیا تو تم ضعیف و ناتوان تھے۔ اسی نے تمہیں اس ضعف و ناتوانی کے عرصے کے

Marfat.com

بعد قوت اور توانائی عطا کی کہ تمہارے شباب اور جوانی کا زمانہ آگیا۔ اس دور کے بعد پھر اضمحلال قویٰ کا زمانہ آیا اور تم پر ضُعفِ پیری غالب آگیا۔ (اللہ الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعفٍ قوۃ ثم جعل من بعد قوۃ ضعفاً و شیبۃً)۔

وہی خدا ہے کہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور وہی عالم و قادر ہے۔ (یخلق ما یشآء وھو العلیم القدیر)۔

تم آغازِ حیات میں اتنے ضعیف و ناتوان تھے کہ اپنے اُوپر سے مکھی بھی نہیں اُڑا سکتے تھے اور نہ اپنے منہ کی رال کو صاف کر سکتے تھے اور تمہاری یہ حالتِ جسمانی اور فکری لحاظ سے "لا تعلمون شیئاً" کے مصداق تھی (یعنی تم کچھ نہیں جانتے) یہاں تک کہ تم اپنے ماں باپ کو جو دائماً تمہاری نگہداشت کرتے تھے نہیں پہچانتے تھے۔

لیکن ــــ رفتہ رفتہ تم میں نمو، بالیدگی اور توانائی پیدا ہوگئی۔ تمہارا جسم قوی ہوگیا۔ اور ـ تم میں عقل، قوت متفکرہ اور وسیع ادراک پیدا ہوگیا۔

تاہم ــــ تم اس طاقت و توانائی کا تحفظ نہیں کر سکتے تھے۔ تمہاری مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی دامنِ کوہ سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے اور وہ پھر وہاں سے نیچے آجائے۔ تمہارا حال بھی ایسا ہی ہے کہ عہدِ طفلی کے ضُعف و ناتوانی سے جوانی کی توانائی تک ترقی کرتے ہو۔ پھر زوال شروع ہو جاتا ہے اور جسمانی و رُوحانی ضُعف و ناتوانی کے قعر میں گر پڑتے ہو۔

زندگی میں یہ تغیّرات اور نشیب و فراز اِس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ نہ تو وہ قوت و توانائی تم نے اپنے ارادے سے پیدا کی تھی اور نہ اِس ضعف و ناتوانی پر تمہیں اختیار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اِن جملہ تغیّرات کا منبع کوئی اور ہی ذات ہے۔ اور تمہاری ہر جہت بے بسی اس امر کی دلیل ہے کہ تمہارے وجُود کے پہیئے کو کوئی اور ذات ہی گھماتی ہے اور تمہاری ہر کیفیتِ حیات عارضی ہے۔

امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ نے اپنے نورانی اقوال میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

عرفت اللہ سبحانہٗ بفسخ العزائم وحل العقود ونقض الھمم[1]

مَیں نے اپنے خدا کو محکم ارادوں کے فتح ہونے، مشکلات کے حل ہونے اور قوی ارادوں کے ٹوٹنے اور ناکام ہونے سے پہچانا۔

مَیں اِن تغیّرات سے سمجھ گیا کہ اختیارِ مطلق کسی اور ہی ذات کے اختیار میں ہے۔

ہمیں اپنے معاملات میں کچھ اختیار نہیں۔ مگر اُتنا ہی جتنا اُس نے بخشا ہے۔

یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ ــــ آیت ۵۴ میں جب بارِ دوم کلمہ ضُعف آیا ہے تو اُس کے ساتھ کلمہ "شیبۃ" کا اضافہ بھی ہے جس کے معنی پیری ہیں۔ لیکن جب بارِ اوّل "ضعف" کہا تھا تو وہاں طفولیت کا ذکر نہیں ہے۔

غالباً اِس ترتیب میں یہ مصلحت ہے کہ ضُعفِ پیری بہت اذیت رساں ہے۔ کیونکہ ضُعفِ طفلی کے برعکس ضُعفِ پیری کا انجام مرگ و فنا ہے۔ دوم یہ کہ تجربہ کار اور سال خوردہ لوگوں سے جو توقعات وابستہ ہوتی ہیں وہ بچوں سے نہیں ہوتیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ٢٥٠۔

Marfat.com

حالانکہ بعض اوقات بلحاظِ ضُعف و ناتوانی اُن کی حالت یکساں ہوتی ہے۔ یہ مقام بہت عبرت انگیز ہے۔
آیت ۵۴ کا آخری جُملہ، جس میں خدا کے علم اور قدرت کا ذکر ہے وہ معناً بشارت بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ تنبیہ اِس جہت سے ہے کہ خدا تمہارے جملہ اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے اور اُن اعمال کی جزا و سزا دینے پر قادر ہے۔

۞ ۞ ۞

Marfat.com

۵۵۔ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ ۙ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ ۚ
كَذَٰلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ ○
۵۶۔ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ
إِلَىٰ يَوْمِ الْبَعْثِ ۖ فَهَٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلَٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا
تَعْلَمُونَ ○
۵۷۔ فَيَوْمَئِذٍ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ
يُسْتَعْتَبُونَ ○
۵۸۔ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ
وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا
مُبْطِلُونَ ○
۵۹۔ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ○
۶۰۔ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ
لَا يُوقِنُونَ ○ ع

Marfat.com

ترجمہ

۵۵۔ اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو گناہ گار قسمیں کھائیں گے کہ وُہ (عالمِ برزخ میں) ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ وہ اسی طرح ادراکِ حقیقت سے محروم رہے تھے۔

۵۶۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ تم فرمانِ خُدا کے مطابق روزِ قیامت تک (عالمِ برزخ میں) رہے ہو اور اَب یہ اُٹھنے کا دن ہے مگر تم جانتے نہ تھے۔

۵۷۔ اُس روز ظالموں کا عُذر کچھ فائدہ نہ دے گا اور اُن کی توبہ بھی قبول نہ کی جائے گی۔

۵۸۔ ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں۔ اگر تم اُن کے سامنے کوئی آیت پیش کرتے ہو تو یہ کافر کہتے ہیں کہ تم تو جھُوٹے ہو (اور یہ سب جادو ہے)۔

۵۹۔ اس طرح خُدا اُن لوگوں کے دلوں پر جو علم نہیں رکھتے مہر لگا دیتا ہے۔

۶۰۔ جب کہ حالت یہ ہے تو تم صبر کرو کیوں کہ خدا کا وعدہ حق ہے اور جو لوگ ایمان نہیں رکھتے وہ تمہیں غضب ناک نہ کریں (اور اپنی جگہ سے ہلا نہ دیں)۔

تفسیر

وُہ دن جب کہ عُذر خواہی بے سُود ہو گی :

ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس سُورہ میں " مبدأ و معاد " کی بحثیں کپڑے کے تانے بانے کی طرح باہم یک دگر مربوط ہیں۔ زیرِ نظر آیات میں مبدأ و معاد کی اُن بحثوں پر جو قبل ازیں گزر چکی ہیں، مسئلہ قیامت کا مزید اضافہ کیا گیا ہے اور اُس روز مجرموں کا جو دردناک حال ہوگا، اُس کی منظر کشی کی گئی ہے۔

Marfat.com

چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ : جس روز قیامت برپا ہوگی۔ مجرمین قسمیں کھائیں گے کہ ہم تو عالم برزخ میں فقط ایک گھنٹہ ہی رہے ہیں : (ویوم تقوم الساعة یقسم المجرمون مالبثوا غیر ساعة)۔

البتہ وہ اپنی گزشتہ زندگی میں بھی اسی طرح ادراکِ حقیقت سے محروم رہے تھے : (کذالك کانوا یؤفکون).

روزِ قیامت کو قرآن میں " ساعة " کہا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کسی ماقبل مقام پر کہا ہے کہ یہ کلمہ یا تو اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ قیامت ایک لحظے میں ناگہانی طور پر آجائے گی۔ یا یہ مُراد ہے کہ بندوں کے اعمال کا حساب سریع الوقوع ہوگا کیونکہ خدا جلد حساب لینے والا ہے۔ کلمہ " ساعت " عربی زبان میں زمانے کے ایک خفیف جزء کے لیے بولا جاتا ہے۔[1]

" مالبثوا غیر ساعة " میں مقام توقف کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے بعض مفسّرین کا یہ خیال ہے کہ " توقف در دُنیا " مُراد ہے کہ حقیقت میں یہاں کی زندگی ایک لحظۂ زُودگزر سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن آیہ مابعد اس امر کی روشن دلیل ہے کہ " توقف " سے مُراد جہانِ برزخ میں ٹھہرنا ہے یعنی وہ عالم مُراد ہے جو موت کے بعد اور یوم قیامت کے درمیان ہوگا کیونکہ " لقد لبثتم فی کتاب اللہ الیٰ یوم البعث " سے ثابت ہے کہ مُقیم اور مقام دونوں کی انتہا روزِ قیامت تک ہے۔ اس لیے برزخ ہی صحیح ہے۔ (غور کیجیے گا)

یہ بھی ملحوظ رہے کہ عالمِ برزخ سب کے لیے یکساں نہ ہوگا۔ ایک گروہ ایسا ہے جو برزخ میں باشعور زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن دوسرا گروہ ایسا ہے کہ گویا سو رہا ہے اور قیامت میں خواب سے بیدار ہوگا اور ہزارہا سال کو ایک ساعت سمجھے گا۔[2]

اِس مقام پر دو باتوں کا ذکر اور ضروری ہے۔ اول یہ کہ مجرمین ایسی جھوٹی قسم کیونکر کھا لیں گے ؟

اِس کا جواب بالکل واضح ہے۔ وہ یہ کہ :۔

وہ مجرمین درحقیقت یہی سمجھیں گے کہ زمانۂ قیام برزخ بہت قلیل تھا کیونکہ اُس مقام پر ان کی حالت محوِ خواب کی طرح ہوگی۔ مثلاً :

کیا اصحابِ کہف نے جو مومن اور صالح لوگ تھے طویل خواب سے بیداری کے بعد یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ ایک دن یا اُس کا کچھ حصّہ سوتے رہے ہیں ؟

نیز یہ کہ انبیائے ماسلف میں سے ایک نبی (جن کا حال سُورہ بقرہ کی آیت ۲۵۹ میں آیا ہے) جو دُنیا سے سفر کرنے کے بعد ایک سو سال کے بعد پھر زندہ ہو گئے تھے۔ کیا اُنھوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان دونوں زندگانیوں کے درمیان فاصلہ ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ ہے۔

---

[1] اس مضمون کے متعلق مفصل بحث اسی سورہ رُوم کی آیت ۱۴ کے تحت کی گئی ہے۔

[2] " برزخ " کے متعلق جلد چودہ سورہ مؤمنون کی آیت نمبر ۱۰۰ کے تحت مفصل بحث کی گئی ہے اور اس آیت میں جو نکتہ ہے وہ بھی تشریح سے بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

اندریں حال اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ برزخ کی مخصوص حالت کے پیشِ نظر مجرموں کا تصور بھی بوجہ ناواقفیت ایسا ہی ہو۔

اسی لیے آیت مابعد میں یہ مضمون ہے کہ مومنینِ آگاہ اُن سے کہیں گے کہ تمہیں غلط فہمی ہے۔ تم تو برزخ میں روزِ قیامت تک رہے ہو اور آج ہی وہ روزِ قیامت ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ نکتہ بالا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جُملہ "کذالک کانوا یؤفکون" کی تفسیر بھی واضح ہوجاتی ہے۔ کیونکہ کلمہ "افک" کے وضعی معنیٰ حقیقت کو دگرگوں کرنا اور حق سے منحرف ہونے کے ہیں۔ یہ مجرمین بھی برزخ میں اپنی وضع کی وجہ سے، حقیقت کا ادراک نہ کرسکیں گے اور انہیں اس مقام پر مُدّتِ قیام کا اندازہ ہی نہ ہوگا۔

وہ مطالب جو ہم نے سطور بالا میں بیان کیے ان کو نظر میں رکھا جائے تو ان طولانی بحثوں سے اعتنا کی ضرورت نہیں ہے؛ جو اُنھوں نے اس امر کو موضوع قرار دے کر کی ہیں کہ "مجرمین بروز قیامت عمداً جھُوٹ کیوں بولیں گے"؟

کیونکہ آیت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے "دروغ عمدی" ثابت ہو۔

البتہ قرآن میں بروز قیامت مجرمین کے دروغ و کذب کا ذکر بھی نظر آتا ہے۔ جس کا مفصّل جواب ہم نے جلد پنجم میں سُورۃ انعام کی آیت ۲۳ کے تحت دیا ہے۔ دیگر یہ کہ اس بحث کا ان آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

❊ ❊ ❊

آیت مابعد میں اُس جواب کا ذکر ہے جو حق آگاہ مومنین اُن مجرمین کو دیں گے جو عالمِ برزخ اور قیامت کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: وہ لوگ کہ جنھیں علم و ایمان دیا گیا ہے کہیں گے کہ تم لوگ حکمِ خدا کے مطابق روزِ قیامت تک عالم برزخ میں رہے ہو اور آج روزِ قیامت اور قبروں سے اُٹھنے کا دن ہے مگر تم اس حقیقت کو نہ جانتے تھے۔ (وقال الذین اوتوا العلم والایمان لقد لبثتم فی کتاب الله الیٰ یوم البعث فهٰذا یوم البعث ولٰکنکم کنتم لا تعلمون)۔

اِس آیت میں کلمہ "علم" کو "ایمان" پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم ہی اساسِ ایمان ہے۔

دیگر یہ کہ "فی کتاب الله" سے ممکن ہے کہ "کتابِ تکوینی" مُراد ہو یا کُتبِ آسمانی مُراد ہوں یا دونوں مراد ہوں۔ یعنی خدا کے تکوینی اور تشریعی حکم کے مطابق یہ مقدر تھا کہ تم اتنی مُدّت برزخ میں رہو۔ اس کے بعد تم بروزِ قیامت محشور ہو۔[1]

اِس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "الذین اوتوا العلم والایمان" کا مصداق کون لوگ ہیں؟

بعض مفسّرین نے اس سے فرشتے مراد لیے ہیں۔ جو علم اور ایمان دونوں رکھتے ہیں اور ایک دوسری جماعت نے

---

[1] آیا اس آیت کے کلمات کی نسبت میں تقدیم و تاخیر ہے؟ اس بارے میں اہلِ علم میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ فی کتاب الله جملہ "اوتوا العلم والایمان" سے متعلق ہے۔ تب معنیٰ یہ ہوں گے کہ: جو لوگ کہ کتاب اللہ کا علم رکھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہ بات کہتے ہیں مگر بعض مفسّرین جملہ مذکور کو "لبثتم" سے متعلق سمجھتے ہیں۔ ہم نے بھی سطور بالا میں یہی مفہوم مراد لیا ہے۔ کیونکہ تقدیم و تاخیر کے لیے کوئی واضح قرینہ ہونا چاہیئے اور اس مقام پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

Marfat.com

مومنین حق آگاہ مراد لیے ہیں۔ ہمارے نزدیک دوسرے معنی زیادہ واضح ہیں۔

بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "الذین اوتوا العلم والایمان" سے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام اور آئمہ طاہرین مُراد ہیں۔ اِس تفسیر میں جن ذوات کو آیت کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے وہ اس کا روشن مصداق ہیں۔ مگر اِس سے آیت کا وسیع مفہوم، محدود نہیں ہو جاتا۔

اِس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ عالمِ برزخ کے متعلق دو گروہوں میں وجہِ اختلاف کا سبب یہ ہے کہ گروہ اول جو عالمِ برزخ میں وقتِ قیام کو صرف ایک ساعت سمجھتا ہے، وہ عذابِ الٰہی کا خوف بھی اور یہ خواہش رکھتا ہے کہ جتنی بھی زیادہ دیر ہو جائے اچھا ہے اور دُوسرا گروہ جو طولِ وقت کی حقیقت سے آگاہ ہے وہ چونکہ جنت اور اُس کی جاودانی نعمتوں کا منتظر ہے اسے یہ مدتِ قیام بہت طویل معلوم ہوتی ہے[1]

* * *

بہرحال جس وقت مجرمین یہ دیکھیں گے کہ روزِ قیامت کے دردناک عواقب اُن کے رُوبرو ہیں تو وہ عذر خواہی اور توبہ کرنے لگیں گے۔ لیکن قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ: اُس روز ظالموں کو اُن کی عذر خواہی کچھ فائدہ نہ دے گی اور اُن کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی۔ (فیومئذٍ لا ینفع الذین ظلموا معذرتھم ولا ھم یستعتبون[2])۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں بہ تصریح بیان کیا گیا ہے کہ مجرموں کو عذر خواہی کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی:

ولا یؤذن لھم فیعتذرون (مرسلات - ۳۶)

لیکن اِس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے: اُن کی عُذر خواہی کچھ مفید نہ ہوگی۔ اِس جُملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عذر خواہی تو کریں گے مگر اُنھیں اُس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

ان آیات میں کچھ تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ قیامت کے مختلف مراحل ہوں گے۔ کسی ایک مرحلے میں ان مجرمین کو عذر خواہی اور بولنے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی اور اُن کے مُنہ پر مہر لگا دی جائے گی۔ البتہ اُن کے دست و پا، اعضا و جوارح اور وہ زمین جس پر اُنھوں نے گناہ کیا ہے اُن کے اعمال کا حال بیان کریں گے۔ لیکن دوسرے مرحلے میں اُن کی زبان کُھل جائے گی اور عذر خواہی کرنے لگیں گے۔ مگر بے سُود۔

اُن کا عُذر یہ ہوگا کہ اپنے گناہوں کو کفر و نفاق کے آئمہ ضلالت کے سر تھوپیں گے اور اُن سے کہیں گے کہ "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مؤمن ہوتے۔"

---

[1] تفسیر فخر رازی، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] "یستعتبون" کا مادہ "عتب" (بروزن "حتم") ہے۔ اس کے وضعی معنی دل بے چینی کے ہیں۔ جب یہ کلمہ باب افعال میں آتا ہے (اعتاب) تو اس کے معنی بے چینی کو دُور کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ "لسان العرب" میں یہ تصریح ہے کہ جب یہ کلمہ استفعال (استعتاب) میں جائے تب بھی اس کے معنی دل بے چینی کو دُور کرنے کے ہی ہیں۔ اس کے مجازی معنی "استرضا" یعنی کسی کی رضا طلب کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں اور آیت زیرِ بحث میں انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی مجرمین قیامت میں توبہ نہ کر سکیں گے۔

Marfat.com

سورہ سبا آیت ۳۱ :

لولا انتم لکنا مؤمنین

لیکن وہ ائمہ ضلالت اُن کے جواب میں کہیں گے :

انحن صددناکم عن الھدٰی بعد اذ جاءکم

کیا ہم نے تمہیں اُس وقت ہدایت سے روک دیا تھا جب وہ تمہارے قریب آگئی تھی اور تم اُسے کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ؟ (سبا - ۳۲)

یہ مجرمین کبھی اپنی عذر خواہی میں کوشش کرتے ہوئے راہِ راست سے اپنے انحراف کو شیطان کے سر تھوپیں گے اور اُس نے اُن کے دل میں جو وسوسے ڈالے ہیں اُن پر اُسے ملامت کریں گے ۔ مگر ابلیس اُنھیں یہ جواب دے گا :

فلا تلوموني ولوموا انفسکم

تم مجھے نہیں بلکہ اپنے نفوس کو ملامت کرو۔ (ابراہیم - ۲۲)

میں نے تمہیں کسی کام پر مجبور تو نہیں کیا تھا ۔ میں نے تو تمہیں صرف دوستانہ دعوت دی تھی - اور - تم نے اُسے قبول کر لیا۔

☆ ☆ ☆

اگلی آیت میں اُن تمام مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس سُورۃ میں بیان ہوئے ہیں ۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے : ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں (مثلاً وعدہ و وعید ۔ امر و نہی ۔ بشارت و انذار ، آیاتِ آفاق و انفس ۔ دلائل مبدا و معاد اور غیب کی خبریں ۔ حاصل کلام یہ کہ قرآن میں ہر اُس بات کا ذکر ہے جس کا انسانی نفوس پر اثر ہو سکتا ہے) (ولقد ضربنا للناس فی ھٰذا القراٰن من کل مثل) ۔

درحقیقت قرآن کلیۃً اور بالخصوص سُورۃ رُوم کہ ہم جس کی تفسیر کے اختتام کے مرحلے میں ہیں ، ایسے مسائل کا مجموعہ ہے جو انسانوں کے ہر طبقہ اور ہر گروہ اور ہر طرزِ فکر اور ہر عقیدے کے لوگوں کو بیدار کرنے والے ہیں ۔

قرآن ـــــ درس ہائے عبرت ، مسائل اخلاقی ، عملی پروگرام اور امورِ اعتقادی کا ایسا مجموعہ ہے جس میں یہ مسائل اس اُسلوب سے بیان کیے گئے ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے سے فکرِ انسانی میں نفوذ کر جائیں اور اُنھیں راہِ سعادت پر گامزن کر دیں ۔

مگر اس کے باوجود ایک گروہ ایسا ہے کہ اُن کے تاریک اور سیاہ دلوں پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا ۔ لہٰذا تم اُن کے سامنے جو آیت اور حق کی نشانی بھی پیش کرو گے تو یہ کفار یہی کہیں گے کہ تم اہلِ باطل ہو اور تم جو کچھ کہتے ہو بے بُنیاد باتیں ہیں ؛ (ولئن جئتھم باٰیۃ لیقولن الذین کفروا ان انتم الا مبطلون) ۔

آیت میں کلمہ " مبطلون " ایک جامع لفظ ہے جس میں مُشرکین کے تمام ناروا الزامات ، تہمتیں اور لیبل شامل ہیں مثلاً ؛ دروغ ، سحر اور جنون کا اتہام ، کلام الٰہی کو خرافاتی افسانے اور اساطیر الاوّلین کہنا ۔ یہ جملہ اُمورِ باطل اس ایک کلمہ میں جمع ہیں یہ مُسلّم ہے کہ کفار کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ پیغمبرانِ خدا کو ان اتہامات میں سے کسی ایک سے متہم کرتے رہے ہیں

Marfat.com

تاکہ چند روز تک اس وسیلے سے پاک دل لوگوں کو حق سے غافل رکھ سکیں۔

آیت میں کلمہ " انتم " ضمیر جمع استعمال ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے پیغمبر اور راست باز مومنین ہر دو مراد ہوں اور ممکن ہے کہ جملہ انبیاء، پیشوایانِ الٰہی اور طرفدارانِ حق مراد ہوں۔ کیونکہ کفار کا ہٹ دھرم گروہ تو مکتب دین کے تمام طرفداروں ہی کا مخالف تھا۔

٭ ٭ ٭

آیہ مابعد میں اس گروہ کی مخالفت حق کی وجہ بالوضاحت بیان کی گئی ہے۔ گروہ کفار کی خیرہ سری، اُن کے قلب کا قبولِ حق سے گریز اور ہر حقیقت سے دُشمنی اس وجہ سے ہے کہ کثرتِ گناہ اور کج فکری کی وجہ سے ان کی حس قبولِ حق و امتیاز مُردہ ہوگئی ہے۔ اَب اُن کو کسی طرح بھی ادراکِ حقیقت ہوتا ہی نہیں ہے۔

خدا ایسے لوگوں کے دلوں پر جو علم و آگاہی نہیں رکھتے مُہر لگا دیتا ہے: (كذالك يطبع الله على قلوب الذين لا يعلمون)۔

کلمہ "یطبع" کا مادہ "طبع" ہے۔ اس کے معنی ہیں مُہر لگانا۔

یہ دستور پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے کہ ہم کسی شئے کو اس طرح محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی اسے نہ چھوئے اور اس میں مطلقاً تصرف نہ کرے تو اگر اُسے کسی کپڑے میں سیتے یا کاغذ میں لپیٹتے ہیں تو اُس کے جوڑ پر اور اگر صندوق میں بند کرتے ہیں تو قفل پر لاکھ سے مُہر لگا دیتے ہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ اُس بنڈل یا صندوق کو بغیر مہر توڑے کھولنا ممکن نہیں ہے۔ اور اگر مہر توڑی جائے گی تو فوراً بات کُھل جائے گی۔

قرآن میں ایسے قلوب کی حالت کو جن میں قبولِ حق کی صلاحیت ہی نہیں رہی اور ایسے لوگوں کی کیفیت کو جن میں نہ عقل ہے، نہ علم، نہ وجدان نیز جن کے ہدایت یافتہ ہونے کی کوئی توقع ہی نہیں رہی بطور کنایہ مُہر کردہ ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیاتِ گزشتہ میں علم کو ایمان کی اساس کہا گیا ہے اور اس آیت میں جہل کو کفر اور عدم قبول حق کی بُنیاد قرار دیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

سورۂ رُوم کی آخری آیت میں (جو زیربحث آیات میں سے آخری آیت بھی ہے) پیغمبرؐ گرامی اسلام کو دو اہم احکام اور ایک عظیم بشارت دی گئی ہے۔ تاکہ آں جناب کو اُس جنگ وپیکار میں جو اُس زمانہ میں جاہل، بے خرد اور سنگ دماغ کفار سے مسلسل جاری تھی، استقامت اور استقلال عطا ہو۔

پہلا حکم یہ ہے کہ آپ جملہ حوادث، تمام آزار و زحمات اور ہر قسم کی ناروا تہمتوں کے مقابلے میں صبر کیجئے: (فاصبر)۔

کیونکہ صبر و شکیبائی اور استقامت ہی کامیابی کی اصلی کلید ہے۔ اور اس غرض سے کہ پیغمبرؐ اکرم تبلیغ اسلام کی راہ میں زیادہ سرگرم ہو جائیں اضافہ کیا گیا ہے: خدا کا وعدہ یقیناً حق ہے (ان وعد الله حق)۔

Marfat.com

خدا فرماتا ہے کہ ہم نے آپ سے اور مومنین سے فتح و کامرانی، زمین کی خلافت اور کفر پر اسلام کے غلبے کا وعدہ کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ نور کو ظلمت پر اور علم کو جہل پر غلبہ حاصل ہو گا۔

اس مقام پر کلمہ " وعد " سے مُراد وہ وعدے ہیں جو قرآن میں مومنین کی فتح یابی کے بارے میں بار بار کیے گئے ہیں۔ مِن جملہ اُن کے ہم اسی سُورہ کی آیت ۴۷ میں پڑھتے ہیں :

وكان حقاً علينا نصر المؤمنين

مومنین کی مدد کرنا ہمیشہ ہم پر فرض رہا ہے اور ہے۔

اسی طرح سورہ مؤمن کی آیت ۵۱ میں ہے :۔

انا لننصر رسلنا والذين أمنوا في الحياة الدنيا ويوم يقوم الاشهاد

ہم اپنے رسُولوں اور مومنین کی اس دنیا کی زندگی میں اور بروز قیامت جب کہ گواہ پیش ہوں گے مدد کریں گے۔

نیز سُورۂ مائدہ کی آیت ۵۶ میں ہے :

فان حزب الله هو الغالبون

بہ تحقیق حزب خدا ہی فتح مند ہے

دُوسرا حکم الٰہی یہ ہے کہ آپ کفار سے اِس سخت اور مسلسل جنگ میں اپنے اعصاب پر قابو رکھیں اور طبیعت کی متانت اور اطمینانِ قلب کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : جو لوگ ایمان نہیں رکھتے وہ تمہیں غصہ ور اور تندخو نہ بنا دیں۔ (ولا يستخفنك الذين لا يوقنون)۔

اس قسم کے لوگوں کے مقابلے میں آپ کا فرض بردباری، تحمّل، حوصلہ اور حفظِ متانت ہے کہ جو ایک پیغمبر کے شایانِ شان ہے۔ " لا يستخفنك " کا مادہ خفت " ہے بمعنیٰ " سُبکی "۔

رسُولِ کریمؐ کو ہدایت ہے کہ آپ اِس قدر ثابت قدم اور خوددار رہیں کہ یہ لوگ آپ کو سبک نہ سمجھنے لگیں اور آپ کو اپنے مقصد کی راہ سے ہٹا نہ سکیں۔ آپ اپنی راہِ نصب العین میں محکم اور استوار رہیے۔ کیونکہ وہ لوگ تو یقین نہیں رکھتے اور آپ یقین و ایمان کا مرکز ہیں۔

اس سورہ کا مومنین کی دُشمنوں پر فتح کے وعدے سے آغاز ہوا تھا اور کامیابی کے وعدے ہی پر اس کا اختتام ہوتا ہے مگر اس فتح مبین کی شرط اصلی رسولؐ اور مومنین کا صبر و استقامت بیان کی گئی ہے۔

* * *

- پروردگارا تو ہمیں بھی ایسا صبر اور استقامت عطا کر کہ مشکلات و حوادث کے طوفان ہمارے استقلال میں خلل انداز نہ ہو سکیں۔
- خداوندا ۔ ہم تیری ہی ذات پاک کے دامن تحفظ میں پناہ لیتے ہیں۔

Marfat.com

تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا شمار اُن لوگوں میں ہو جن پر کسی وعظ ، نصیحت ، عبرت اور تخویف کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

- بارالٰہا ۔ دُشمن باہم مربوط اور متحد ہیں اور طرح طرح کے شیطانی اسلحے سے مسلح ہیں۔ ہم دُعا کرتے ہیں کہ تو ہمیں بیرونی دُشمنوں اور اندرونی شیطانوں پر فتح عنایت کر۔ آمین ۔ یارب العالمین !

سُورہ روم کی تفسیر اور تفسیر نمونہ کی جلد ۱۶ کا اختتام ہوتا ہے ۔ ۲۱ ذیقعدہ ۱۴۰۳ ہجری

تفسیر نمونہ ــــــــــــ جلد ۱۶

کے ترجمے کا اختتام ــــــــــــ

اس حقیر پُر تقصیر ــــــــــــ سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم

کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوا ۔

بروز ــــــــــــ جمعہ

بوقت ــــــــــــ ساڑھے دس بجے صبح

بتاریخ ــــــــــــ ۸ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ ہجری

بمطابق ــــــــــــ ۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ء عیسوی

بر مکان ــــــــــــ سیٹھ نوازش علی ۔ ۸۱ ۔ ای

(ان کے بیٹے محمد رضا موسٰی کی شادی خانہ آبادی کے روز)

والحمد للہ اولًا و اٰخرًا والصّلوٰۃ علی النبیّ واٰلہ سرمدًا ابدًا

سید صفدر حسین نجفی

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۶)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / منیجر
امامیہ قرآت کالج
اندرون موچی دروازہ - لاہور

Marfat.com